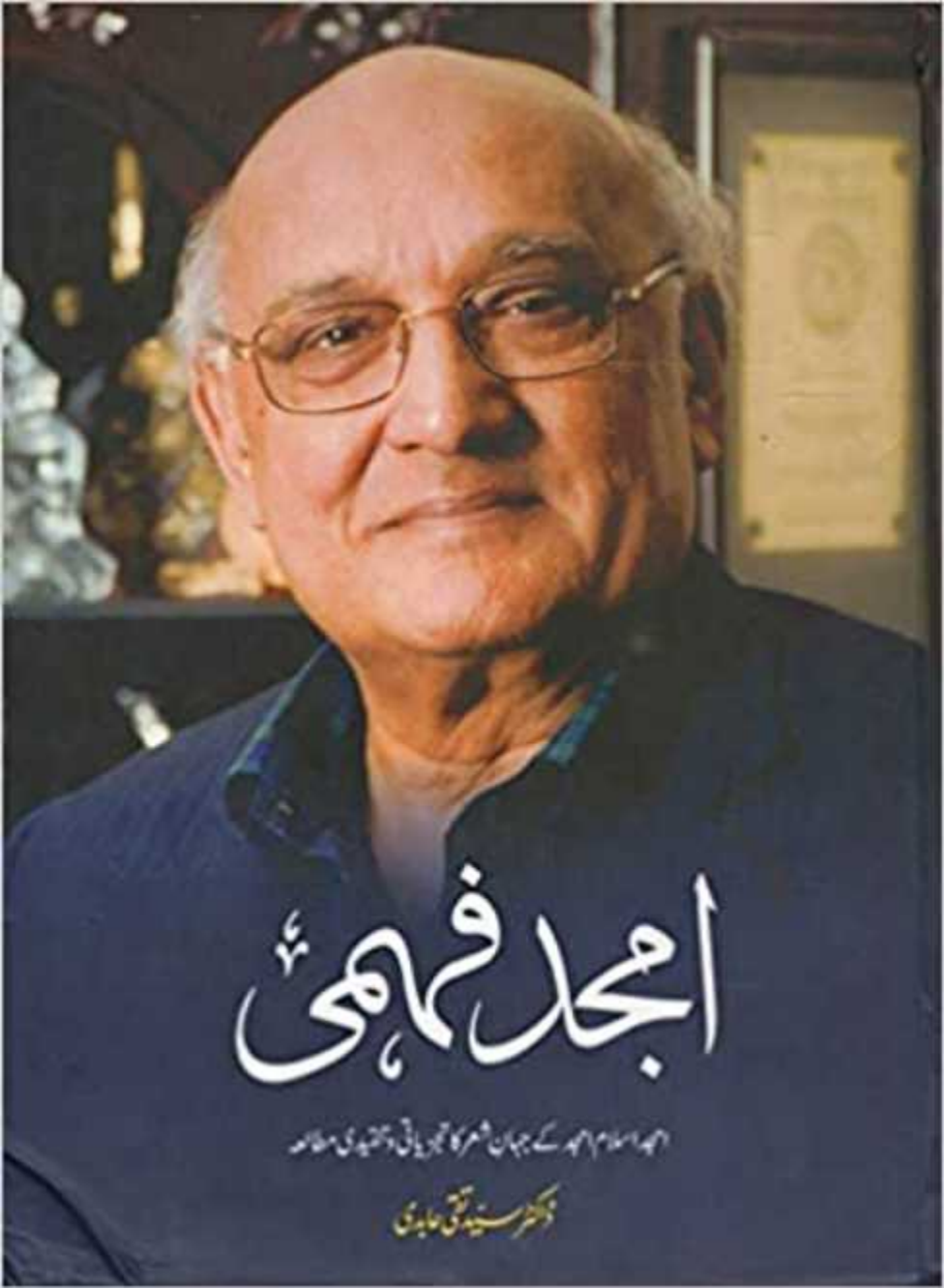
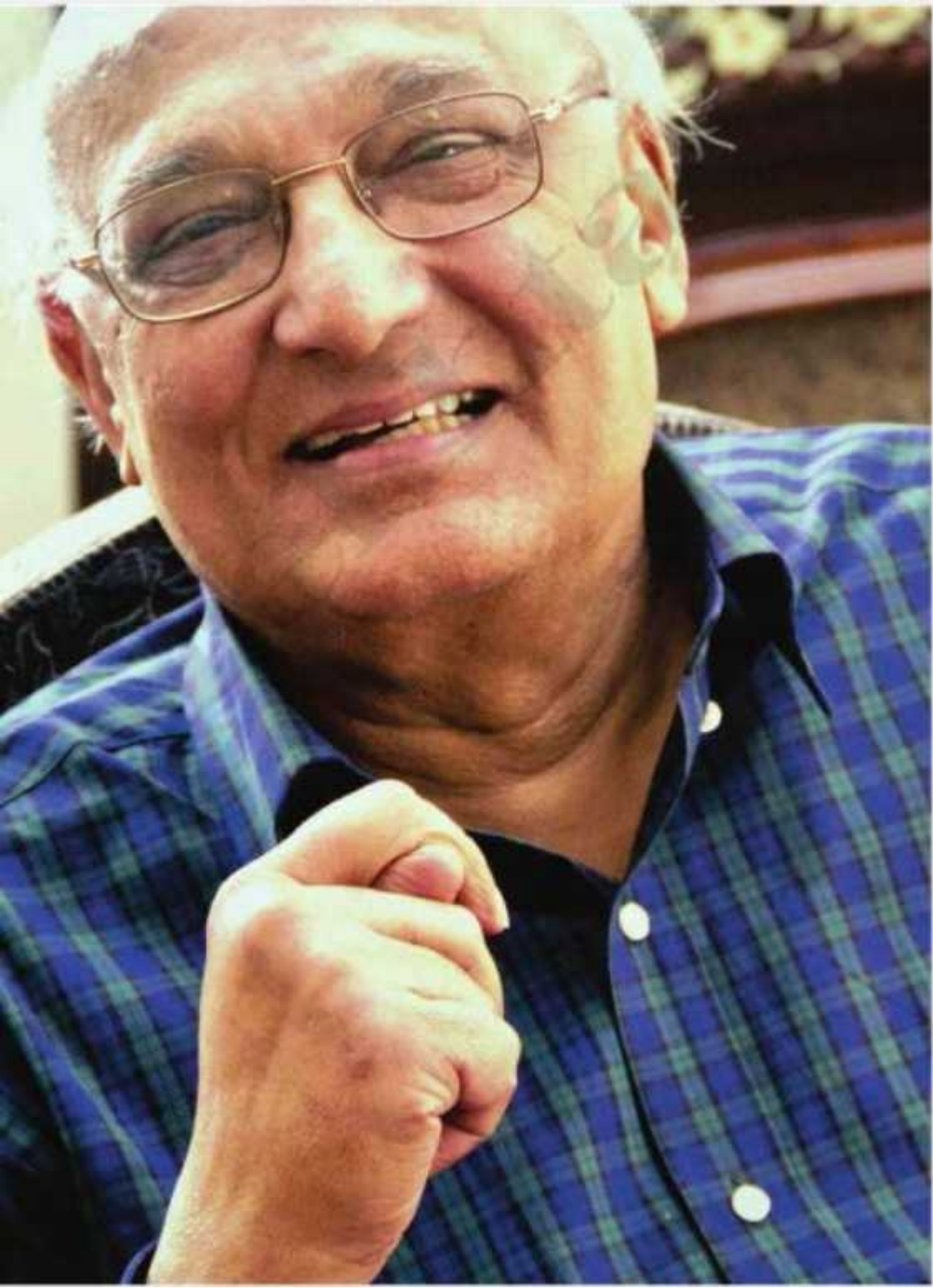


امجد فہمی

امجد اسلام امجد کے جہانِ شعر کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی



برصغیر کی مشترکہ اُردو تہذیبی اقدار

اور

ان کے پرستاروں کے نام

rekhta

رو میں ہے رخشِ عمر

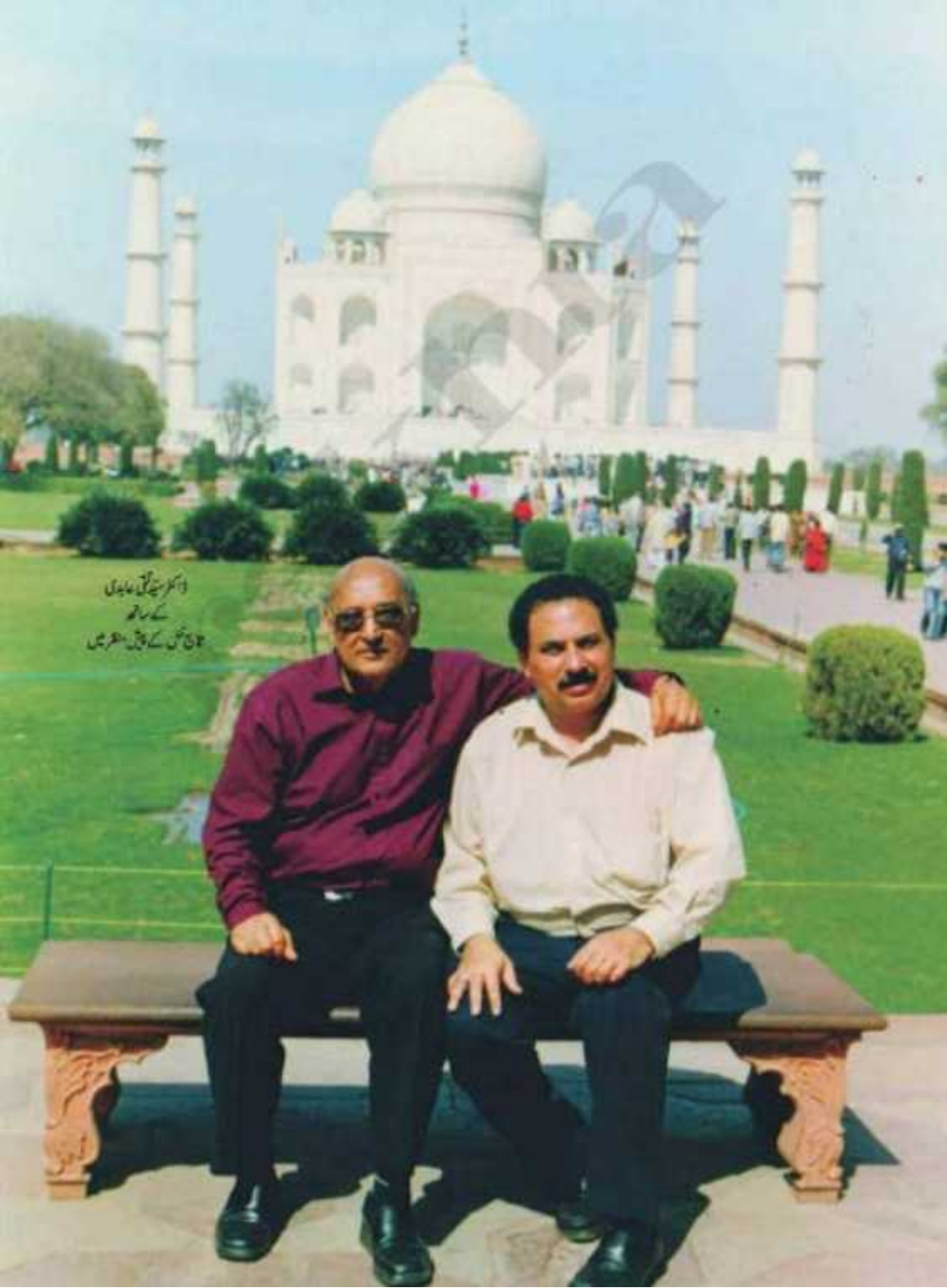
نام	:	سیّد تقی حسن عابدی
ادبی نام	:	تقی عابدی
تخلص	:	تقی
والد کا نام	:	سیّد سبط نبی عابدی (مرحوم)
والدہ کا نام	:	سجیدہ بیگم (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	:	یکم مارچ 1952ء
مقام پیدائش	:	دہلی۔ انڈیا
تعلیم	:	ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا)۔ ایم ایس (برطانیہ)
	:	ایف سی اے پی (امریکہ)۔ ایف آر سی پی (کینیڈا)
پیشہ	:	طبابت
ذوق	:	شاعری، ادبی تحقیق و تنقید
شریکِ حیات	:	گیتی
اولاد	:	دو بیٹیاں (معصومہ اور رویا)
		دو بیٹے (رضا و مرتضیٰ)

تصانیف : 61 شہید، 1982 جوشِ مودّت، گلہائے رویا، اقبالؔ کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاؔ، رموزِ شاعری، اظہارِ حق، مجتہد نظم مرزا دبیرؔ، طالع سعد، سلکِ سلام و بیر، تجزیہ یادگار انیسؔ، ابوابُ المصائب، ذکرِ یارانِ عزادارِ سخن، مصحفِ قاری و بیر، مشویاتِ دبیر، کائناتِ نظم، روپ کنور کماری، دربارِ رسالت ﷺ، فکرِ سلمانیہ، خوشۂ انجم، ذرّہ دریائے نجف، تاثیرِ ماتم، مجلی مایا، رموزِ انتخاب، مصحفِ غزل، ہوائے نظم، تحقیقِ لکھنوی، ادبی معجزہ، غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت، بچوں مرگ آید، رباعیاتِ دبیرؔ، سبدِ سخن، دیوانِ غالبؔ قاری، تشریحِ نظمی، مطالعہ دبیر کی روایت، اردو کی دو شاہکار نظمیں، رباعیاتِ رشیدہ لکھنوی، رباعیاتِ انیسؔ، فیضِ شناسی، حالیؔ نظمی، مسدسِ حالیؔ، کلیاتِ حالیؔ، بچوں کے حالیؔ، کلامِ سلام انیسؔ، کلیاتِ سعید شہیدیؔ، ترویی۔

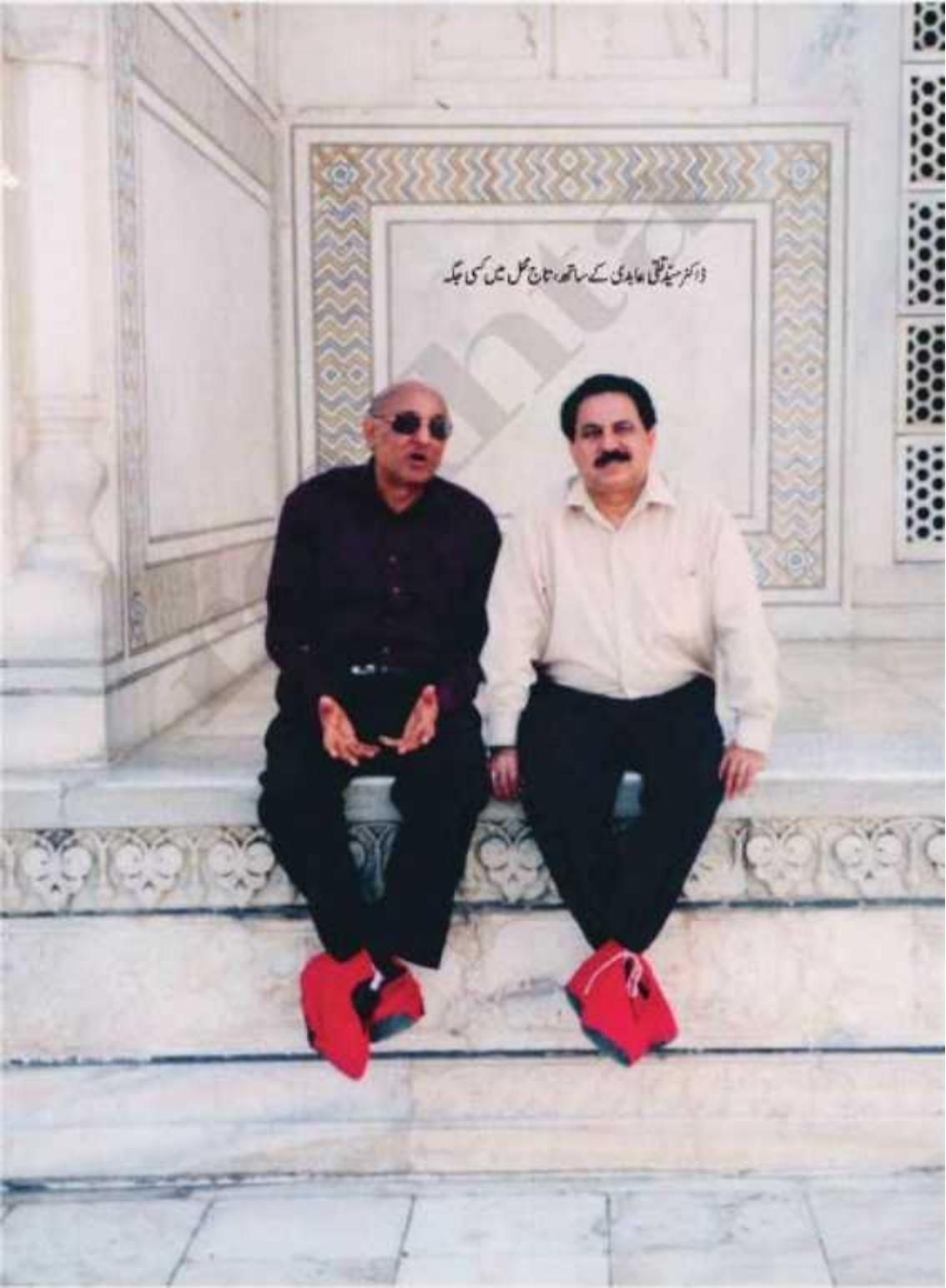
زیرِ تالیف : رباعیاتِ حالیؔ، حالیؔ کی نعتیہ شاعری، حالیؔ کی نظمیں، قطعاتِ حالیؔ، حالیؔ کے قصیدے اور حالیؔ کے نظمی مرثیے، تجزیۂ شکوہ جوابِ شکوہ، غالبؔ لاغالبؔ، تجزیہ رباعیاتِ فراقؔ گورکھپوری، اقبالؔ کے چار مصرعے، رباعیاتِ بیدلؔ، باقیاتِ فیضؔ۔

Dr. Syed Taqi Abedi

rekhta



ڈاکٹر سید تقی عابدی
کے ساتھ
تاج محل کے پیش منظر میں



ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ساتھ، تاج محل میں کسی جگہ

فہرست

پیش لفظ	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	11
زندگی نامہ۔ امجد اسلام امجد	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	13
عکس باطن	امجد اسلام امجد	21
جدول تخلیقات	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	23
امجدؔ اسلام امجد کے بہتر نشتر	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	29
امجدؔ اسلام امجد کے زرّیں فقرے	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	38
دورِ حاضر کے حمدیہ موضوعات کا جائزہ	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	39
حمدوں میں ''کُن فیکون'' کا تجسس اور تلقین	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	58
حمدوں میں مناجاتی اور دُعائیہ تجلّیات	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	63
حمدوں میں کعبے کی قبلہ نمائی	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	82
نعتیہ کلام کی معجز بیانی	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	91
سلاموں کی اہمیت اور افادیت	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	112

10

علامت نگاری میں خوابوں کی کرشمہ سازی	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	122
برگزیدہ اور امجدی نظموں کا تجزیہ	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	148
غزل میں خیال اور لفظ کے اتّصال کا جمال وکمال	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	161
کلامِ امجدؔ میں وقت کی تصویر کشی	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	177
کلام میں رِزق کی فراوانی	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	187
شعری آہنگ میں محبت کے ڈھنگ	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	192
اشعار میں آنکھوں کی جلوہ گری	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	199
''سحر آثار'' کی سحر نمائی	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	208
شعریاتِ امجدؔ کے چند ہنری نکات	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	213
اقربا اور مشاہیر پر دلکش نظمیں	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	219
امجد کا شاعر اور شاعری پر منظوم تبصرہ	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	237
امجدؔ کا کلاسیک شعرا پر ریویو اور شعری انتخاب	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	243
امجدؔ کی شاعری پر مشاہیرِ شعر وادب کے تاثرات	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی	276
شعری انتخاب امجد اسلام امجد (68 منظومات)		299
نثری انتخاب امجد اسلام امجد		421

پیش لفظ (عابدی صاحب)

12

13

زندگی نامہ

نام	:	امجد اسلام امجد
والد کا نام	:	محمد اسلام
پیدائش	:	۴/اگست ۱۹۴۴ء
رہائش	:	275، این، ڈی۔ ایچ۔ اے، لاہور
خانوادہ	:	فردوس امجد (شریکِ حیات)
		روشین امجد (بیٹی)
		تحسین امجد (بیٹی)
		علی ذیشان امجد (بیٹا)
رابطہ	:	رہائش: 924235734096+ موبائل: 923334231606+
ای میل	:	amjadislam@gmail.com
ویب سائٹ:		www.amjadislamamjad.com

پیشہ وارانہ سرگرمیاں

1 سینئر وزیٹنگ پروفیسر کریٹو ولیج۔ یو۔ او۔ یل 2012-2013

2 مشاور دینا ٹی وی چینل 2010-2011

3 ڈائریکٹر پنجاب ٹکسٹ بورڈ، لاہور۔ 2004-2008

4 پروجیکٹ ڈائریکٹر چلڈرن لائبریری، کمپلکس لاہور۔ 2000-2004

5 ڈائرکٹر جنرل، اردو سائنس بورڈ، لاہور۔ 1997-99

6 ڈپٹی ڈائرکٹر (ڈراما اینڈ لٹریچر)، پنجاب کونسل آف آرٹس، لاہور۔ 1975-79

7 ایسوسی ایٹ پروفیسر، ایم اے او کالج، لاہور۔ 1968-75 1979-97

14

ایوارڈ اور اعزازات

1 ستارۂ امتیاز 1998

2 پرائڈ آف پرفامینس 1987

3 شاعری کی کتاب فشار پر نیشنل ہجرہ (اقبال) ایوارڈ 1403ھ (پاکستان میں یہ اعلیٰ ترین ادبی ایوارڈ ہے)

4 رائٹرز گلڈ ایوارڈ کتاب عکس 1976، (بہترین ترجمہ)

5 بیسٹ پلے رائٹ پاکستان ٹیلی ویژن ایوارڈ، برائے سال 1980-1984-1998-1999-2001

6 کے اے سی ایوارڈ نثر کی بہترین کتاب ''نئے پرانے'' کے لیے۔1991

7 خصوصی پریذیڈنٹ ایوارڈ برائے ٹی وی سیریل ''وارث'' 1980

8 نگار ایوارڈ 1982-1987 بہترین فلم رائٹر

9 اگفا ایوارڈ 1987

10 بولان ایوارڈ 1987-1995

11 ٹی وی سیریل ''وارث'' چینی زبان میں چھپا۔(1986)

12 ٹی وی سیریل ''وارث'' چینی زبان میں ڈب ہوکر چائنیز ٹی وی نیشنل نیٹ ورک پر ٹیلی کاسٹ ہوا۔(1987)

13 پی ٹی وی سلور جوبلی ایوارڈ 1989

14 گریجویٹ ایوارڈ، 1975-2000 (16 مرتبہ)

15 خصوصی شمارہ ''چہارسو'' 2001

16 خصوصی شمارہ ''بیاض'' 2003

17 جشن امجد اسلام امجد دوحہ، دبئی۔2001

18 امجد اسلام فن اور شخصیت 1989

19 نگار ایوارڈ نظم 2005

20 نیشنل ایوارڈ (بہترین شاعری (ساحلوں کی ہوا) 2000

21 احمد ندیم قاسمی ایوارڈ شاعری (یہیں کہیں) 2006

22 ڈاکومینٹری احمد ندیم قاسمی (پروڈیوسر ڈائریکٹر) 1994

23 ستارے مرے ہم سفر 2003

24 ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ 2006

25 وثیقہ اعتراف ''ہمدرد'' 1991

26 امجد اسلام کی شاعری کا ترجمہ انگریزی میں، (تین کتابیں)1990–2017، ترکی ہندی عربی

27 ہن ریک ابسن ایوارڈ 2011 (ناروے)

28 فراق گورکھ پوری ایوارڈ 2012 (انڈیا)

29 سب سے پسندیدہ شاعر 2013 (گیلپ سروے)

30 بیگم اختر ایوارڈ (انڈیا)2014

31 امجد اسلام امجد روڈ EME سوسائٹی۔ لاہور 2015

32 انٹرنیشنل میڈیا ایوارڈ۔ لندن 2015

33 مجلس فروغ اردو ایوارڈ (قطر)2016

34 خالد احمد بیاض ایوارڈ 2016

35 حکیم سعید ایوارڈ 2017

36 ایشیا سوسائٹی ایوارڈ (نیویارک) 1997

ممبر شپ

- ممبر بورڈ آف گورنرز، پنجاب کونسل آف آرٹس
- ممبر فلم سنسر ایوارڈ
- ممبر، ایگزیکٹو کمیٹی الحمرا آرٹس کونسل، لاہور
- ممبر پنجاب گورنمنٹ کمیٹی برائے رائٹرز فنڈ
- ممبر بورڈ آف گورنرز قائداعظم لائبریری، لاہور
- ممبر مجلس ترقی ادب، لاہور
- ممبر کمیٹی ویلفیئر فنڈ، پنجاب
- ممبر NACTA، اسلام آباد
- ممبر دلکش لاہور کمیٹی، لاہور
- ممبر سنڈیکٹ یونیورسٹی ہیلتھ سائنس، لاہور
- ممبر بورڈ آف گورنرز اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور

تھیسس اور تحقیقی مقالات

تیس (30) سے زیادہ تھیسس اور مقالے (ایم اے۔ ایم فل۔ پی ایچ ڈی) امجد اسلام امجد کے فن اور شخصیت پر تکمیل کیے گئے۔ یہ مقالات پاکستان، انڈیا، مصر اور ترکی کی مختلف یونیورسٹیوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

16

مطبوعات

1	برزخ	شاعری
2	عکس	جدید فلسطینی مزاحمتی شاعری کا منظوم اردو ترجمہ
3	وارث	ٹی وی سیریل
4	ساتواں در	شاعری
5	کالے لوگوں کی روشن نظمیں	یو ایس اے اور افریقہ کی بلیک شاعری کا اردو ترجمہ
6	دہلیز	ٹی وی سیریل
7	فشار	شاعری
8	شہر در شہر	سفر نامہ
9	ذرا پھر سے کہنا	شاعری
10	آنکھوں میں ترے سپنے	گیت
11	چشم تماشا	کالموں کا مجموعہ
12	لہو میں پھول	ماخوذ ڈرامے
13	نئے پرانے	کلاسیکی اردو شاعری پر ایک نئی نگاہ
14	اپنے لوگ	طویل ڈرامے
15	In The Last Days of Autumn	منتخب اردو شاعری کا انگریزی ترجمہ
16	خزاں کے آخری دن (چار کتابیں)	شاعری
17	یہ افسانے	افسانوں کا انتخاب اور تنقید
18	کہکشاں	اردو شاعرات کا منتخب کلام
19	اُس پار	شاعری
20	ریشم ریشم	سفر نامہ
21	وقت	ٹی وی سیریل
22	اتنے خواب کہاں رکھوں گا	شاعری
23	کھٹے میٹھے	کالموں کا مجموعہ
24	یا نصیب کلینک	مزاحیہ کھیل
25	سپنے بات نہیں کرتے	گیت
26	دن	ٹی وی سیریل

17

27	امجد اسلام امجد	فن اور شخصیت (تالیف)
28	رات	ٹی وی سیریل
29	سمندر	ٹی وی سیریل
30	بارش کی آواز	شاعری
31	دیکھتے چلے گئے	کالموں کا مجموعہ
32	سحر آثار	شاعری
33	نئی آنکھیں پرانے خواب	کالموں کا مجموعہ
34	سپنے کیسے بات کریں	گیت
35	جہنم کی دسویں گہرائی	ترجمہ
36	میرے بھی ہیں کچھ خواب	نظموں کا مجموعہ
37	ہم اس کے ہیں	غزلوں کا مجموعہ
38	بندگی	ٹی وی سیریل
39	ساحلوں کی ہوا	شاعری
40	چھاؤں	کالموں کا مجموعہ
41	پھر یوں ہوا	شعری مجموعہ
42	محبت ایسا دریا ہے	نظموں کا انتخاب
43	ستارے مرے ہم سفر	فن و شخصیت (تالیف)
44	Love Encompasses All	انگریزی تراجم
45	سات دن	سفرنامہ
46	یہیں کہیں	شاعری
47	تیسرے پہر کی دھوپ	کالم
48	خواب جاگتے ہیں	ڈرامے
49	سپنوں سے بھری آنکھیں	کلیات گیت
50	چلو جاپان چلتے ہیں	سفرنامہ
51	اسباب	حمد و نعت
52	یہ میرا شہر سخن	انتخاب پروین شاکر
53	نزدیک	شاعری
54	دُھند کے اس پار	کالم

18

55	رات سمندر میں	منتخب غزلیں
56	شام سرائے	شاعری
57	کوئی دن اور	تعزیتی کالم
58	Shifting Sands	انگریزی ترجمہ
59	باتیں کرتے دن	شاعری
60	Kara Bayu	ترکی ترجمہ
61	Cento Poesis Damore	اطالوی ترجمہ
62	گیت ہمارے (بچوں کے گیت)	تین جلد
63	گرہ	ٹی وی سیریل
64	چراغ رہ گزر	کالم
65	سفر پارے	سفرنامہ
66	زندگی کے میلے میں	شاعری
67	سچ کی تلاش	تنقید
68	الحب و ناہر	عربی ترجمہ

سیاحت

● امریکہ ● انگلستان ● ہندستان ● متحدہ عرب امارات ● قطر ● مسقط ● فرانس ● ناروے ● سعودی عرب ● کنیڈا ● چین ● تھائی لینڈ ● سنگاپور ● ڈنمارک ● سویڈن ● ازبیکستان ● بحرین ● آسٹریلیا ● جرمنی ● کویت ● جاپان ● اٹلی اسپین ● سویٹزرلینڈ ● ہالینڈ ● تانگ کانگ

T.V سیریل

● وارث (۱۳) ● دہلیز (۱۸) ● سمندر (۱۸) ● وقت (۱۳) ● فشار (۱۳) ● رات (۱۳) ● دن (۱۳) ● ایندھن (۱۳) ● انکار (۱۳) ● اگر (۱۳) ● گرہ (۱۳) ● زمانہ (۱۳) ● شیرازہ (۸۰) ● بندگی (۱۸) ● سلطنت (۱۳) ● جگا (۹) ● دامن کی آگ (۴)

طویل دورانیے کے ڈرامے

● باز دید ● دُکھوں کے چادر ● اپنے لوگ ● لیکن ● دُھند کے اُس پار ● شام سے پہلے ● نظام لوہار ● گھنٹی ● ٹی وی۔ ٹی وی ● یہ کنارا چلا کہ ناؤ چلی ● بازگشت ● ابھی تو میں جوان ہوں ● مٹھی سے پھسلتی ریت ● آگ سب کو جلاتی ہے ● جوہر ● نزدیک

انفرادی ڈرامے (۵۰ منٹ)

• آخری خواب • پارس پتھر • برزخ • دوسرا قدم • موم کی گڑیا • اپنے حصے کا بوجھ • خواب جاگتے ہیں • تاوان
• یا نصیب کلینک • اسی کا نام دنیا ہے • بالکنی • غیروں سے کہا تم نے • سودا • ادھر اُدھر سے • اہلِ نظر • ابھی
نہیں۔ کبھی نہیں • شب زاد • تسلسل • رُوبرو • گرتی ہوئی دیوار • سراغِ سحر • آخری ٹمائر • پچھلی رات کا چاند
• قافلۂ سخت جاں • سوال • گھر • میرے بھی ہیں کچھ خواب • پیوستہ رہ شجر سے • گردش • پھر یوں ہُوا • جرس
• اپنی خودی پہچان • بچوں کا باغ • مرے خواب ریزہ ریزہ • احساسِ زیاں • بکرے کی شادی • اپنا گھر • بشارت
• زندگی کے میلے میں • زیرو پوائنٹ • اُلٹی چھری • بڑا اندھیرا ہے • سورج بھی تماشائی • برف میں لگی آگ۔

ڈرامائی تشکیلات

• گن رس	(غلام عباس)	• بندگی بے چارگی	(احمد ندیم قاسمی)
• بُرا آدمی	(ریاض بٹالوی)	• عکس اور آئینے	(ریاض بٹالوی)
• دہکتے خواب	(ریاض بٹالوی)	• وارث	(ریاض بٹالوی)
• منزل ہے کہاں!	(ریاض بٹالوی)	• گردبادِ حیات	(ریاض بٹالوی)
• رِفی کی دنیا	(ریاض بٹالوی)	• احسان	(احمد ندیم قاسمی)
• سناٹا	(احمد ندیم قاسمی)	• بیٹے بیٹیاں	(احمد ندیم قاسمی)
• امربیل	(بانو قدسیہ)	• حساب	(نیلوفر اقبال)
• گھنٹی	(نیلوفر اقبال)	• لہو میں پھول (فلسطینی کہانی)	سہیل ادریس
• چچا عبدالباقی	(محمد خالد اختر)	• سمندر کے نیچے (مصری کہانی)	توفیق الحکیم
• دو گز زمین	(ٹالسٹائی)	• نمک حرام	(فرحت پروین)
• بڑا اندھیرا ہے	(چیک کہانی)	• برف میں لگی آگ	(دوستوفسکی)

مختصر ڈرامے

• جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا	• آپ کل آیئے	• طالع مند کی پریشانیاں
• دیوار کے اِس پار۔ اُس پار	• مکان کی تلاش میں	• شوق بہت ہے
		• شیشہ و سنگ

بچوں کے لیے ڈرامے

• جادو کی شیشی • بہادر شہزادہ • دال میں کالا

20

اسٹیج ڈرامے

- گھر آیا مہمان
- دستک
- کس کو کہہ رہے ہو!

پنجابی ڈرامے

- نہلے تے دہلا
- کھوٹا سکّہ
- بھُکھ

فلمیں

- قربانی (مکالمے)
- حق مہر
- نجات
- چوروں کی بارات
- جوڑ گیا وہ مر گیا
- سلاخیں (مکالمے)
- امانت

میزبان

- ٹی وی پروگرام ''غزل سرائے''
- گستاخی معاف
- بیسویں صدی کی اردو غزل (۸۰ پروگرام)

آڈیو البم

- محبت ایسا دریا ہے
- رات سمندر میں
- ارژنگ (حمیرا چنّا)
- ہم اس کے ہیں
- میرے بھی ہیں کچھ خواب

عکس باطن

(ایک سوالنامے کے جواب میں)

میرا مزاج..... جیو اور جینے دو

میرے خون کا رنگ..... تادمِ تحریر سفید نہیں ہوا

میری کمزوری..... بلا پرکھے کسی پر اعتماد کر لینا

میرا آئیڈیل..... کچھ ایسی صفات جن کا کسی فردِ واحد میں یکجا ہونا ممکن نہیں

میرا دشمن..... وہ شخص جو زندگی کے ارتقا پر یقین نہیں رکھتا

میرا دوست..... اللہ کے فضل سے بہت سے ہیں

میں حسد کرتا ہوں..... حسد ایک انتہائی مذموم جذبہ ہے۔ میں حسد اور حاسد دونوں کو پسند نہیں کرتا

میں قدر کرتا ہوں..... ہر اس شخص کی جو محنت کی عظمت پر یقین رکھتا ہے

میں ہنستا ہوں..... کیونکہ انسان ایک حیوانِ ظریف ہے

میں اجتناب کرتا ہوں اُس صحبت سے جہاں انسان کا مرتبہ اس سے زیادہ اہم ہو

میں رو پڑتا ہوں موت کے سامنے انسان کی بے بسی پر

مجھے نفرت ہے اعتماد کا خون کرنے والے سے

میں رہ نہیں سکتا دوستوں کے بغیر

مجھے خوف آتا ہے تخلیقِ عمل کے جمود سے

میرے خواب دھنک کے رنگوں کی طرح شوخ اور اتنے ہی پائیدار

میری پسندیدہ کتاب دیوانِ غالب

میری غیر ادبی مصروفیات کرکٹ

میں سوچتا ہوں کہ میں اتنا زیادہ کیوں سوچتا ہوں؟

میری سالگرہ ۴/ اگست

22

میں اقرار کرتا ہوں — اس قوت کی عظمت کا جس نے آنکھوں کو خواب اور آنسو دیے ہیں
میرے حسن کا معیار — حسن وہ حسن جسے دیکھو تو چپ لگ جائے
مجھے غصہ آجاتا ہے — بعض اوقات بہت معمولی سی بات پر
میرا ماضی — ان تینوں سوالوں کا جواب T.S. Eliot کی وساطت سے یوں ہے
میرا حال — Time past and time present are Both present

in the time future

میرا مستقبل — یوں سمجھئے کہ بس ٹھیک ہی ہے
ادب کا مقصد — زندگی کو بہتر طریقے سے سمجھنا
میں ترجیح دیتا ہوں — اپنی شاعری کو ڈراما نگاری پر
میرے اندیشے — گونا گوں
مرغوب غذا — دال چاول
کاش — میں اپنے آپ کو سمجھ سکوں

جدول۔تخلیقات

24

27

امجدؔ اسلام امجد کے بہتّر نشتر

اُس حرفِ کُن کی ایک امانت ہے میرے پاس
لیکن یہ کائنات مجھے بولنے تو دے

سمے کے سمندر، کہا تُو نے جو بھی، سُنا پَر نہ سمجھے
جوانی کی ندّی میں تھا تیز پانی، ذرا پھر سے کہنا

میں ایسے لفظ لکھوں گا جو سب کے دل میں ہیں
فقط وہ بات کروں گا جو سب سمجھتے ہیں

ہوا کا رنگ درختوں پہ حرف لکھتا ہے
سکوں کے حرف کہ جیسے سفر تمام ہوا

عجب کشش تھی سمندر کی سبز آنکھوں میں
ہر ایک چشمہ اُسی کی طرف روانہ تھا

وہ ایک لمحۂ پُراں بھی تتلیوں کی طرح
ہتھیلیوں پہ فقط رنگ چھوڑ جائے گا

30

میں جانتا ہوں اب ان زمینوں پہ آنے والے ہیں ایسے موسم
جو خواب جیسے حسیں ہیں لیکن حقیقتوں کے لباس میں ہیں

اے خدا میرے پیڑوں کو سائے کی توفیق دے
گرد بادوں کی دہلیز پر سوچکے خواب کو اس کی تعبیر دے

عجب اصول ہیں اس کاروبارِ دنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اتارا ہے

حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

افکار پہ پہرا ہے قانون یہ ٹھہرا ہے
جو صاحبِ عزّت ہے وہ شہر بدر ہوگا

دھیان میں میلہ سا لگتا ہے بیتے لمحوں کا
اکثر اس کے غم سے دل کی صحبت رہتی ہے

یہ خواب ہے کہ حقیت خبر نہیں امجدؔ
مگر ہے جینا یہیں پر یہیں پہ مرنا ہے

جاگتی آنکھ کا ہر بھید پتہ ہے اس کو
یہ الگ بات کہ کچھ منہ سے نہیں بولتی رات

31

وہی نہیں تو ورق کس لیے سیاہ کریں
سخن تو عرضِ تمنّا کا اک بہانہ تھا

اپنی ہی شکل ہے جس سمت نظر پڑتی ہے
شہرِ آئینہ میں آنکھوں کو سزا کس نے دی

اب تک نہ کُھل سکا کہ مرے رُو برو ہے کون
کس سے مکالمہ ہے! پسِ گفتگو ہے کون

خدا کا رزق تو ہرگز زمیں پر کم نہیں یارو
مگر یہ کاٹنے والے، مگر یہ بانٹنے والے

امجدؔ نہ قدم روک کہ وہ دُور کی منزل
نکلے گی کسی روز اسی گردِ سفر سے

مری بے گھری کو پناہ دی مری جستجو کو نشاں دیا
جو یقین سے بھی حسیں ہے مجھے ایک ایسا گماں دیا

زمیں سے آسماں تک جس قدر اچھے مناظر ہیں
محبت کے کنائے ہیں وفا کے استعارے ہیں

ہر مسافت کی دوری کا سمٹاؤ ہے
جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

محرابِ جاں کی شمعیں بجھانے کے واسطے
ہر رات کنجِ غم میں پگھلنا پڑا ہمیں

32

ڈرتا ہوں آنکھ کھولوں تو منظر بدل نہ جائے
میں جاگ تو رہا ہوں مگر جاگتا نہیں

تاریخ کے چکّر میں وہ موڑ نہیں آیا
جب شاد مکیں ہوں گے آباد نگر ہوں گے

گلیوں گلیوں بھٹک رہا ہے ایک سنہرا خواب جسے
میرے بڑوں نے اپنی لاکھوں نیندیں بیچ کے پالا تھا

خوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
اک نظم ترے واسطے لکھیں گے کسی دن

جگنو، ستارے، آنکھ، صبا، تتلیاں، چراغ
سب اپنے اپنے غم کے کسی سلسلے میں تھے

امجدؔ کتاب جاں کو وہ پڑھتا بھی کس طرح
لکھنے تھے جتنے لفظ ابھی حافظے میں تھے

ویسے تو ہر شخص کے دل میں ایک کہانی ہوتی ہے
ہجر کا لاوا، غم کا سلیقہ، درد کا لہجہ ہو تو کہو

ہَوا کے پہلے ہی جھونکے میں ہار مان گئے
وہی چراغ جو ہم نے بچا کے رکھے تھے

کچھ ایسی برف تھی اُس کی نظر میں
گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا

33

تھی پوری شکل اس کی یاد مجھ کو
مگر میں نے اسے دیکھا نہیں تھا

زندگی کے سفر میں ملتے ہیں
مستقل درد، عارضی آرام

کہاں آ کے رُکنے تھے راستے، کہاں موڑ تھا اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اُسے یاد رکھ جو نہیں ملا اسے بھول جا

امجدؔ نزولِ شعر کے کیسے بنیں اصول
سیلاب کے لیے کوئی ہوتی ہے راہ کیا

سارا فساد بڑھتی ہوئی خواہشوں کا ہے
دل سے بڑا جہان میں امجدؔ عدو ہے کون

محبت نے رگوں میں کس طرح کی روشنی بھر دی
کہ جل اٹھتا ہے امجدؔ دل، چراغِ شام سے پہلے

پلٹ کے آنے لگے شام کے پرندے بھی
ہمارا صبح کا بھولا مگر نہیں آیا

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھونڈتے ہیں لوگ
امجد یہ کون شہر کا نقشہ بدل گیا

کسی کو پھر نہ ملا رنگ میرؔ و غالبؔ کا
اگرچہ یوں تو ہزاروں ہی خوش بیاں گزرے

34

ہر اک دعا کے مقدر میں کب حضوری ہے
تمام غنچے تو امجدؔ کھلا نہیں کرتے

کبھی کبھی یونہی امجدؔ کسی سبب کے بغیر
ہم اپنی ذات کے اندر بدلتے رہتے ہیں

عوام سے ہے ہمیں گفتگو خواص سے بھی
ہماری بات ہے سب سے بھی اور سب سے نہیں

دل کو گواہ کرکے لکھا جو بھی کچھ لکھا
کاغذ کا پیٹ بھرنے کو لکھتا نہیں ہوں میں

تخت سے تختہ بہت دور نہیں ہوتا ہے
بس یہی بات ہمیں آپ کو بتلانی ہے

دوست کی بزم ہی وہ بزم ہے امجدؔ کہ جہاں
عقل کو ساتھ میں رکھنا بڑی نادانی ہے

فقط اک لفظ سے امجدؔ یہ کیسے ہوگیا سب کچھ
کہانی کُن کی اُس کے رازداں سے کس طرح پوچھیں

اُسے اندازہ ہی امجدؔ نہیں ہے
اُسے اک شخص کتنا چاہتا ہے

آدم کی آل جسم ہے، اعضا ہیں آپ ہم
وابستہ ہے کسی کی ضرورت کسی کے ساتھ

35

حرف بھی اُسی سے ہے صَوت بھی اُسی سے ہے
وہ صدائے کُن ہی تو نغمۂ کردگار ہے

نہ تلاشِ آب و دانہ نہ کشاکشِ زمانہ
نہ ہو شوق پَر کشائی تو قفس میں کیا نہیں ہے

جڑیں جن کی ہوں مستحکم وہی پودے پنپتے ہیں
دلوں میں جو اتر جائے اسی کا نام عزت ہے

بات کوئی سمجھ میں نہیں آتی
بات اتنی سمجھ میں آتی ہے

جب تلک باقی رہے منہ میں زباں
اپنے حق کے واسطے بولا کریں

اک دریا کے تین کنارے
ماضی حال اور مستقبل

ایک ٹہنی کے پھول ہیں دونوں
موت اور زندگی میں ناتا ہے

موت ہی زندگی کی دشمن ہے
موت ہی زندگی بچاتی ہے

نہیں اس کے لیے الفاظ کوئی
جو دل میں نعت باقی رہ گئی ہے

36

ماں کی آنکھیں چراغ تھیں جس میں
میرے ہمراہ وہ دعا بھی تھی

زندگانی جاودانی بھی نہیں
لیکن اس کا کوئی ثانی بھی نہیں

دوستی کی زباں ہوئی متروک
نفرتوں کے نصاب تازہ ہیں

کوئی بھی آدمی پورا نہیں ہے
کہیں آنکھیں کہیں چہرا نہیں ہے

لذتِ پَر کشادگی کے سوا
باغ میں کیا ہے جو قفس میں نہیں

ہم چڑھتے سورجوں کو سلامی نہ دے سکے
سو دوپہر کی دھوپ میں چلنا پڑا ہمیں

خواہش جو شاخِ حرف پہ چٹکی بکھر گئی
آنسو جو دل میں بند ہوا وہ گہر ہوا

تمنا اور حسرت میں ہے فرق اظہار کا یعنی
جو شعلہ جل نہیں سکتا اُسے پتھر میں رہنا ہے

عکس در عکس فقط حیرت تھی
عقل جب آئینہ خانہ میں گئی

37

در تھا کُھلا پہ بیٹھے رہے پَر سمیٹ کر
کرتے بھی کیا کہ جائے اماں ہی قفس میں تھی

کہنے کو ایک صحن میں دیوار ہی اٹھی
گھر کی فضا مکان کا نقشہ بدل گیا

اس کام سے فارغ دلِ ناکام تو ہولے
نکلے گا نیا چاند ذرا شام تو ہولے

38

امجدؔ اسلام امجد کے زرّیں فقرے

☆ خواہش ایسا اسم اعظم ہے جو سب بھیدوں کی کنجی ہے۔

☆ اس خاک دانِ جاں میں اس شعلہ نوائی کو بہرحال جلنا، چمکنا، دمکنا، سلگنا اور بجھنا ہے۔ان سب کیفیتوں کا کون سا تناسب کس کے حصے میں آتا ہے اور کیوں آتا ہے۔ یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جنھیں حل کرنے میں عقل و دانش اور ادراک و وجدان اپنے اپنے طور پر سرگرداں رہتے ہیں۔

☆ لطیفہ نسل آدم کی میراث ہوتا ہے اسی لیے جہاں تک ہو سکے اسے خلقِ خدا تک پہنچانا چاہیے۔ اتنی Tense اور پریشان زندگی میں کچھ تو اپنے ہونے کا احساس ہو۔

☆ میرؔ کا پرابلم یہ ہے کہ اس کی دستار ہمیشہ خطرہ میں رہی ہے۔ (نئے پرانے)

☆ سوداؔ ہماری کلاسیکی شاعری کا پرابلم چائلڈ ہے۔ (نئے پرانے)

☆ نظیر اکبرآبادی ایک اعتبار سے اردو شاعری کا محمد تغلق ہے۔ (نئے پرانے)

☆ اسلام کو اپنے دو ناموں کے بیچ میں رکھا ہے تاکہ جو آنچ بھی آئے میرے نام پر آئے، اسلام پر نہ آئے۔

☆ شاعری میں ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو ایک وقت میں سچ اور دوسری میں جھوٹ کا روپ دھار لیتی ہیں۔

☆ جو کچھ ہمارے اردگرد ہے اور جن چیزوں سے زندگی عبارت ہے اس کا احساس محبت کا جذبہ ہی تو ہے یعنی جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے۔

☆ شاعر اور قاری ایک ہی دنیا میں اور ایک دوسرے میں زندہ کرتے ہیں۔

☆ یہ کلیات ابھی نا تمام ہے شاید۔

☆ جہاں تک زمانے اور تجربے کا تعلق ہے اس کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ازل سے ایک منظر ہے فقط آنکھیں بدلتی ہیں۔

☆ زندگی جیسی نظر آتی ہے ویسی ہے نہیں، اور جیسی ہے ویسی نظر نہیں آتی۔

☆ موضوعات اپنا اسلوب ساتھ لے کر آتے ہیں لیکن شاعر کا اصل کمال انہیں اپنے فطری اسلوب سے ہم رنگ اور ہم آواز کرنا ہے اور یہ وہ وصفِ خاص ہے جو ہر زبان کے تمام بڑے شاعروں کا مشترک ورثہ ہے۔

دورِ حاضر کے حمدیہ موضوعات کا جائزہ

امجدؔ کا شعری انکسار اور فکری اجتہاد

ہمارا یہ مضمون امجد اسلام امجدؔ کی حمدیہ منظوم نگارشات کا تجلیلی، تحلیلی، تشریحی، توصیفی، مذہبی، قرآنی عقیدتی، علمی، ادبی اور شعری جائزہ ہے جو شریعت، طریقت اور حقیقت کے نقش و نگار کے ساتھ ساتھ اکیسویں صدی کے سماجی تہذیبی اور تربیتی قدروں کا صحیفہ بھی ہے۔ چنانچہ اس گلستان کی سیر اور گل چینی آسان اور محدود اس لیے بھی نہیں کہ یہ ذکر و بیان اُس رب العالمین سے مربوط ہے جو نہ صرف لا الٰہ کا الا اللہ ہے بلکہ اس کے صفات لامحدود کمالات برکات لاانتہا اور اس کی ذات پر انسانی عقل لاعاقل اور عاجز ہے پھر بھی اس محدودیت میں ہماری یہ توفیق کی فراوانی ہے کہ اس رب العالمین کی حمد، تعریف، ثنا، تسبیح اور تحلیل کے کچھ پھول امجد کے گلشنِ حمد سے گل گشت کے دوران گل چیں کر کے گلدستۂ عشق کی شکل میں پیش کریں تا کہ عامی و عالم، مسلم اور غیر مسلم سب اس کی خوشبو اور رنگینی سے فیض یاب ہوسکیں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اگر سمندر روشنائی، تمام اشجار قلم اور تمام جن و انس کاتب بن جائیں تب بھی اس رب العزت کی حمد بیان نہیں ہوسکتی۔

اس مفصل مضمون کی ضرورت یہ بھی ہے کہ پہلے حمد پر مختلف جہتوں اور عنوانوں کے تحت گفتگو ہوجائے تا کہ عامی اور عالم اس روشنی کے ساتھ امجدؔ کی حمدوں کا مطالعہ کرسکیں۔ یہاں پہلے ہم نے مختصر مگر اجمالی طور پر ذیلی عناوین قائم کر کے مطالب پیش کیے ہیں۔

الف۔ حمد کیا ہے؟
ب۔ حمد کی تاریخ
ج۔ حمد شعر و ادب کی روشنی میں
د۔ حمد کا ارتقا
ھ۔ امجد کی حمدیں

(ا) حمد کیا ہے؟

(i) ''حمد'' ''حمد'' ہے جس کو کامل طور پر الفاظ میں بیان نہیں کرسکتے۔ جس طرح ''نور'' ''نور'' ہے، ''رحمت'' رحمت ہے۔

(ii) ''حمد'' کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے سمجھنے کے لیے ''حمد'' کی ترجمانی ہوسکتی ہے۔ الحمد للّٰہ رب العالمین' سب تعریف رب العالمین کے لیے ہے ترجمہ نہیں۔ کیونکہ تعریف خود عربی لفظ ہے ورنہ خدا کہتا ''التعریف للّٰہ رب العالمین''

(iii) ''حمد'' کے لغوی معنی صفت یا وصف کے ہیں۔ ''حمد کرنا'' یعنی صفات اور اوصاف کا اظہار کرنا ہے۔ ''حمد'' کے اصطلاحی اور مروجہ معنی اللہ تعالیٰ کے اوصاف کے بیان، ان کی تعریف اور توصیف کرنا۔ ''حمد'' میں تقدس اور شکر اس کے لازمی جزو ہیں۔ حمد کا لفظ صرف اللہ کی ذات سے منسوب ہے بالکل اسی طرح جیسے نعت کا لفظ ذاتِ اقدس ختمی مرتبت پیغمبرِ اکرم ﷺ کے لیے مختص ہوگیا ہے۔

(iv) ''حمد'' چونکہ حدیث دل ہے یہ عبد اور معبود کا رمزی تعلق اور رشتہ ہے اس لیے اس کی مختلف توجہات اور تعریفات نظر آتی ہیں۔

- ''حمد'' ثنائے جمیل اور دراصل خدا کے اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ کی تعریف ہے۔
- حضرت آدمؑ نے عدم سے وجود میں آنے کے بعد جو پہلا کلمہ اپنی زبان سے ادا کیا ''الحمد للہ'' تھا۔
- ''حمد'' ایک ایسا جامع اور کامل لفظ ہے جو معانی اور مطالب کے لحاظ سے رب العزت کی طرح لامحدود، لا انتہا اور بلند ترین قدروں کا حامل ہے۔
- ''حمد'' کے لفظ پر ''ال'' سے جو ''الحمد'' لفظ بنتا ہے اس میں وسعت، جامعیت کے ساتھ ساتھ عظمت اور خصوصیت بھی شامل ہوجاتی ہے۔

(v) عربی کا یہ سہ حرفی لفظ ''حمد'' دوسرے سہ حرفی الفاظ ''علم، رحم، رثا، دعا، رضا وغیرہ کی طرح کئی دوسرے الفاظ کا مصدر ہے جس سے حامد، محمود، احمد، تحمید، حمید وغیرہ اسی حمد کے مختلف زاویوں کو روشن کرتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے سب سے زیادہ حمد کی اس لیے وہ ''احمد'' کہلائے اور وہ ''محمود'' کے مقام پر فائز ہوئے اور وہ قیامت تک محمد ﷺ اسی لیے ہیں کہ ان کا ہر عمل اور قول قابلِ تعریف تجلیل اور تقلید ہے۔

علمائے اسلام نے حمد کے ذیل میں یہ بھی بتایا ہے کہ حضور ﷺ کے مبارک ناموں کا اشتقاق بھی ''حمد'' کے مادّے سے ہوا ہے۔ چنانچہ حضور محمد ﷺ (حرف میم کی زبر کے ساتھ) جو محمود کے معنی میں ہے اور آپ حرف میم کی زیر کے ساتھ محمد حامد کے معنی میں ہیں حضور ﷺ کے اسم احمد میں بھی یہ دونوں صورتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی خارج از موضوع نہیں کہ دورِ جاہلیت میں یعنی اسلام سے قبل الفاظ ''رب'' الٰہ جس سے ''اللہ'' کا مبارک لفظ ہے موجود تھے لیکن ''احد'' اللہ کی ذات کے لیے پہلی بار قرآن میں استعمال ہوا۔ مولانا مودودی ''تفہیم القرآن'' جلد ششم میں لکھتے ہیں:

> ''قرآن سے پہلے کی عربی میں اس امر کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ محض لفظ ''احد'' وصف کے طور پر کسی شخص یا چیز کے لیے بولا گیا ہو اور نزولِ قرآن کے بعد یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے کسی کے لیے بھی استعمال

نہیں کیا گیا۔ اس غیر معمولی طرزِ بیان سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یکتا و یگانہ ہونا اللہ کی خاص صفت ہے۔ موجودات میں سے کوئی دوسرا اس صفت سے متصف نہیں۔''

(vi) قرآن مجید کی ابتدا ہی اللہ کی حمد سے ہوتی ہے۔ سورہ حمد یا سورہ فاتحہ درحقیقت سورہ دعا اور مناجات بھی ہے جس کو سبعہ مثانی بھی کہتے ہیں۔ الحمد للہ رب العالمین سے شروع ہوتا ہے۔ اس سورہ حمد میں رب العالمین کی عظمت، فضیلت، رحمانیت اور حاکمیت کے ساتھ اس کی وحدانیت کا اقرار اور صراطِ مستقیم کی ہدایت کے ساتھ گمراہوں سے اجتنابیت کی دعا بھی شامل ہے۔ چنانچہ اس سورہ حمد سے معلوم ہوا کہ خدا کی حمد میں معرفت ثنایت کے ساتھ مناجات شکر اور دعا بھی شامل ہے جس کو ہر روز حمد عملی یعنی نماز میں پڑھنے کا حکم بھی ہے۔

(vii) قرآن میں (۳۸) سے زیادہ بار الحمد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن کو حمدِ الٰہی کا خزانہ کہا گیا ہے۔ اللہ کی تعریف تجلیل اور توصیف خصوصی طور پر سورہ اخلاص، سورہ الحشر، سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی کے علاوہ قرآن میں کئی مقامات پر حمد الٰہی کا تذکرہ ہے۔ جیسے ''ابواب الدعوات'' میں نشان دہی کی گئی ہے ہم چند آیات یہاں رقم کرتے ہیں۔

- الحمد للہ رب العالمین (سورۃ فاتحہ آیت) سب تعریف رب العالمین کی ہے۔
- قل الحمد للہ (سورۃ النمل، آیت ۵۹) کہو اللہ ہی کے لیے حمد ہے۔
- انہ حمید مجید (سورۃ ھود آیت ۷۳) یقیناً اللہ بڑی تعریف اور شان والا ہے۔
- ولہ الحمد فی السمٰوات والارض (سورۃ روم آیت ۱۸)، آسمانوں اور زمین میں حمد اسی کے لیے ہے۔
- وان اللہ لھو الغنی الحمد (سورۃ الحجہ آیت ۶۴) اللہ بے شک غنی اور حمید ہے۔
- لہ الحمد فی الاولیٰ والاخرۃ (سورۃ القصص، آیت ۷۰)، دنیا اور آخرت میں حمد اللہ کے لیے ہے۔
- وسبح بحمد ربک حین تقوم (سورۃ الطور۔ آیت ۴۸) تم جب اٹھو اپنے اللہ کی حمد اور تسبیح کرو۔

(ب) حمد کی تاریخ

دبستانِ مذاہب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائے وجود انسان سے کم وبیش خدا کی پرستش اور گوناگوں تصوراتِ خدائی کا وجود تھا۔ قدیم تہذیبوں یعنی یونان، روم، مصر، ایران، ہند اور چین میں خدا کے وجود اور اس کی پرستش کی کئی صورتیں موجود تھیں جن پر مزید گفتگو کیے بغیر ہم عربی فارسی حمد کے خدوخال بیان کرتے ہوئے اردو حمد کو اپنا موضوع سخن بنائیں گے۔

- اسلامی لٹریچر کے مطابق حضرت آدمؑ کو سب سے پہلے جن الفاظ کی تعلیم دی گئی وہ ''الحمد للہ'' تھی۔
- یونانی حکما اور فلاسفر انسانوں اور دیوتاؤں کے اوپر وجودِ خدا کے معترف تھے جس کو وہ خیر کا مبدا تصور کرتے تھے۔
- رومیوں نے بھی تمام کائنات کا مالک خدا کو قرار دیا تھا۔
- مجوسیوں یعنی قدیم ایرانیوں نے خیر کا خدا (یزدان) اور شر کا خدا (اہرمن) کو قرار دیا تھا۔
- ویدوں، اپنشدوں میں برہما یعنی خدا کا ذکر ملتا ہے اسی سے متاثر ہوکر شنکر اچاریہ (۸۲۲ء) نے کہا تھا خدا کی شکل و

صورت نہیں اس کی تعریف وثنا ممکن نہیں وہ ہر جگہ موجود ہے۔

- عیسائیوں ، یہودیوں کے علاوہ چینیوں وغیرہ نے بھی مختلف عقائد رکھتے ہوئے خدائے بزرگ کے وجود کا کم وبیش اقرار کیا ہے۔
- جہاں تک عرب مشرکین اور بت پرستوں کے عقائد کا تعلق ہے وہ بت دیوتاؤں کو خدا کا شریک مانتے تھے۔ ان کے قصیدوں اور نثری تحریروں میں خدا کے لیے رب اور الٰہ جیسے الفاظ موجود ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کے مبارک دور میں لا الٰہ الا اللّٰہ نے اللہ کی وحدانیت کا ایسا سکّہ جاری کیا جو آج بھی پوری آب و تاب سے جاری وساری ہے اور قرآن مجید، صحیفہ وحدت، خزینۂ حمد اور کتاب شریعت کی شکل میں اسی طرح سے موجود ہے جیسا کہ (۱۴۰۰) چودہ سو سال پہلے تھا۔

- حضرت امام زین العابدینؒ فرماتے ہیں۔ بندہ جب الحمد للہ کہتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے۔ اللہ کے انعامات، احسانات اور الطاف پر غور وفکر کرنے سے انسان اس کا شکر بجالاتا ہے جو انسان کی اعلیٰ قدر ہے جبکہ اس کے مقابل انکار کفر ہے جو بدترین خصلت ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

شکر نعمت نعمت ات افزوں کند
کفر نعمت از دستت بیروں کند

- ''حمد'' نہ صرف اسلامی شعار ہے بلکہ ایسی عبادت ہے جس کے کرنے کی تاکید بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ حمد نگاری ثواب اور حمد خوانی اور حمد کو سننا بھی ثواب اور توفیقات میں شامل ہے۔
- حمد معرفتِ کردگار کا وسیلہ ہے۔ حمد انفس اور آفاق کی تفہیم کا ذریعہ ہے۔

(ج) حمد شعر وادب کی روشنی میں

(۱) حمد منظوم سخن ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات، ان کے صفات کمالات کے ذکر کے ساتھ ان کی عظمتِ وحدت سے لبریز حدیثِ دل ہے۔ جس میں دعا مناجات کے ہمراہ حمد نگار کا عجز وانکسار بھی شامل ہے۔ اگرچہ عموماً حمد نظم کی شکل میں ہوتی ہے لیکن نثر میں بھی حمد کے کچھ نمونے دستیاب ہیں۔

(۲) حمد موضوع کے لحاظ سے مستقل صنفِ سخن ہے۔

(۳) حمد کی کوئی خاص ہیئت یا فورم نہیں۔ حمد قطعوں، رباعیوں، دوہوں، غزلوں، مثنویوں، مسمطوں، قصیدوں، پابند اور آزاد نظموں، معریٰ اور نثری نظموں، ماہیوں، گیتوں، ترینوں کے علاوہ ثلاثی ہائیکو، ترائیلے سانیٹ، یک مصرعہ وغیرہ یعنی کسی بھی ہیئت میں کہی جاسکتی ہے۔ اردو شاعری میں فوق الذکر ہیئتوں میں حمد کے نمونے موجود ہیں۔

(۴) عربی اور فارسی کی طرح اردو میں بھی نعتوں کے مقابل حمدیں کم کہی گئی ہیں۔

(۵) مقبول حمد کے لیے تخلیق کار کا علم عرفان عقیدہ اور ایمان لازم ہے تاکہ حمد میں قلبی واردات اور والہانہ جذات کا سوز وگداز شامل ہوسکے۔ سچ تو یہ ہے کہ معرفت کے جادہ پر گامزن عارف ہی حمد گوئی کا حق ادا کرسکتا ہے۔

(۶) حمد چونکہ رب العالمین سے منسوب اور متعلق ہے اسی لیے حمدوں میں مدحیہ، ثنائیہ، مناجاتیہ، نعتیہ، دعائیہ اشعار بھی نظر آتے ہیں۔ اس لیے حمد مناجات اور دعا کو الگ الگ حصوں میں پوری طرح سے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

(۷) باخدا دیوانہ باش سے حمد میں ہر قسم کی آزادی اور راہ روی نہیں ملتی بلکہ اُس حاکم کائنات کے حضور میں مطالب کی صداقت اور فن کی صحت بھی ضروری ہے اس لیے تنقید کا عمل حمد میں بھی اسی حیثیت سے معتبر ہے۔ جب ہم اپنے مجازی اور خیالی محبوب پر شاعری کرتے ہوئے فن کے کمال کی نمایش کرتے ہیں تو کیسے گوارا کریں کہ رب العالمین کی مدحت میں اس طرف توجہ نہ کریں۔ جہاں تک قبولیت کا تعلق ہے وہ حمد نگار اور اس کے ممدوح کا تعلق ہے۔

(۸) اردو حمد کی تاریخ اور اس کے ارتقا کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے سے اس پر قرآن کا اثر، تصوف کا اثر، اور فلسفیانہ اثر بھی رہا ہے۔ اس میں دعا اور مناجات اور معرفت کے سطحی اور عمیق مضامین قدیم دکنی اردو حمدوں سے آج کی حمدوں تک نظر آتے ہیں۔

(د) حمد کا ارتقا

چونکہ قرآن مجید حمد باری تعالیٰ کا خزانہ ہے اس لیے صدر اسلام کے دور میں اتنی حمدیں نہیں کہی گئیں جتنی بعد میں رقم ہوئیں۔ پھر بھی اہل سیر نے ان صحابہ کرام کی تعداد جنھوں نے کچھ حمدیں اور زیادہ نعتیں کہی ہیں سو سے زیادہ بتائی ہے جنھیں صحابہ ''شاعرِ رسول ﷺ'' کہتے تھے اور انھی شاعرِ رسول ﷺ میں چند خوش نصیب شاعروں کو جن میں حسان بن ثابتؓ، کعب بن مالکؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ شامل تھے، جنھیں شاعرِ دربارِ رسالت ﷺ کہتے تھے۔ ان شعرا کی نظموں میں حمد، مناجات، دعا، نعت کے ساتھ ساتھ کچھ منقبت کے اشعار بھی حضور ﷺ کی عترت کی مدح میں رقم ہوئے آج بھی موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ عربی شعرا کی زیادہ حمدیں ہمارے درمیان نہیں اور عربی شاعری میں بھی فارسی اور اردو کی طرح نظموں کے شروع میں حمدیہ اور نعتیہ اشعار لکھنے کا روج نہیں پھر بھی بعض ممتاز عربی شعرا نے شاعرِ دربارِ رسالت ﷺ کے بعد حمدیں لکھیں جن میں ابوالعتاہیہ (۸۴۸-۸۲۶ء) ابونواس (۷۶۳-۸۱۴ء) اور اسماعیل صابری (۱۸۵۴-۱۹۲۳ء) شامل ہیں۔

قدیم فارسی یعنی پہلوی زبان میں اسلام سے قبل مجوسیوں کی کتاب اوستا میں خدائے خیر یزداں کی تعریف و تمجید میں نظمیں موجود ہیں لیکن مسلمان فارسی شعرا نے گلزار حمد و نعت میں ایسی گل کاری کی ہے کہ یہ گلزار عقیدت، عقیدت مندوں کے لیے گلزار ارم بن گیا ہے لیکن یہاں بھی نعتوں کے مقابل حمدوں کی کمی ظاہر ہے اور یہی حال کم و بیش اردو حمدوں کا ہے جو تقریباً چھ سو سال سے قدیم اردو یعنی دکنی میں لکھی جا رہی ہیں۔ فخر دین نظامی کی تصنیف 'کدم راؤ پدم راؤ' ۱۴۲۱ء کی پہلی مستند اردو تصنیف ہے جس کا آغاز حمدیہ اشعار سے ہوتا ہے جس میں سورہ الکہف کی آیت کو نظم کیا گیا ہے۔ نظامی کہتا ہے۔ اللہ اس کائنات میں ہر کوئی تیری حمد (سیوا) کرتا ہے۔ اگر وہ نہ بھی کریں تو تیری تعریف میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اگر سات سمندروں کا پانی روشنائی ہو جائے، تمام درختوں کو قلم میں بدل دیا جائے اور تمام فرشتے کاتب بن جائیں پھر بھی وہ تیری حمد اور احدیت کو لکھ نہیں سکتے۔

کرے آگلا تجہ کریں سیو کوے
کہ جب نہ کرے سیو تجہ کم نہوے

سپت سمندر پانی جو مس کر بھریں
قلم اک اک پان پتر کریں
جمارے لکھیں سب فرشتے کہ جے
نہ پورن لکھن تو توحید تے

اشرف بیابانی نے اٹھارہ سو اشعار کی مثنوی نوسرہار ۱۵۰۳ء میں سانحۂ کربلا کے مضمون پر تصنیف کی جس کا آغاز بھی حمد سے ہے۔

اللہ واحد حق سبحان
جن یہ مرحبا بہو میں سمان

اردو کا سب سے پہلا کلیات محمد قلی قطب شاہ نے مرتب کیا جس میں ان کی پانچ سے زیادہ حمدیں شامل ہیں اور ان حمدوں میں مناجاتی، دعائیہ اور نعتیہ اشعار بھی شامل ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کی ایک جداگانہ مناجات بھی معروف ہے جس میں وہ کہتا ہے یا سمیع میری مناجات سُن اور مجھے تو دن رات خوش رکھ، زمین پر میرا تخت سلطنت اس طرح سجا، جس طرح انگوٹھی میں نگینہ۔ میرے شہر کو لوگوں سے آباد رکھ، جس طرح تو نے سمندروں میں مچھلیاں بھر دی ہیں۔

مناجات میرا توں سن یا سمیع
مجے خوش توں رک رات دن یا سمیع
سکل تخت پر میرا یوں تخت کر
انگوٹی پہ جوں ہے نگیں یا سمیع
میرا شہر لوگاں سو معمور کر
رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

حمد نگاری کی روایت آگے بڑھتے ہوئے شمالی ہند میں باوائے اردو ولی دکنی (م ۱۷۲۰ء) تک پہنچی۔ انہوں نے بھی اپنے دیوان کا آغاز بھی حمدیہ اشعار سے کیا۔

کتیا ہوں تیرے ناووکوں میں ورد زباں کا
کتیا ہوں تیرے شکر کوں عنواں بیاں کا

اے ولیؔ غیر آستانہ یار
جبہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

اسی طرح حمد نگاری ولیؔ کے ہم عصروں سراجؔ اور ترابؔ وغیرہ سے ہوتے خدائے سخن میر تقی میرؔ اور ان کے ہم عصر سوداؔ سے ہوتی ہوئی متقدمین متوسطین اور متاخرین کے ساتھ بیسوی صدی کے شعرا علامہ اقبال کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے گزر کر امجد اسلام امجد تک پہنچی۔ ہم نمونہ کے طور پر چند شعر یہاں رقم کرتے ہیں۔

عجب صاحبی ہے خداوند کی
نہیں یہاں رسائی خرد مند کی
علیم اور بصیر اس کی ہے شان میں
قضا اور قدر اس کے فرمان میں (سراج)

الک نام اللہ نرنجن ہری ہے
صفت اس کی ہر شے میں دائم بھری ہے
وہی ذوالجلال اور اکرام ہیگا
وہی ساقیٔ بزمِ گلفام ہیگا (تراب)

ایک اللہ کا بہت ہے نام
جمع باطل ہوں سو الٰہ تو کیا (میرؔ)

اشجار ہوویں خامہ اور آب سیہ بحار
لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اس کی صفات کا (میرؔ)

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا (سوداؔ)

(ھ) امجدؔ کی حمدیں

امجد کے کلام میں پینتیس (۳۵) سے زیادہ حمدیں، چار مناجاتیں، چھ نظمیں کعبے اور مناسکِ حج سے متعلق موضوعات پر نظر آتی ہیں۔ امجد کی حمدیں غزل کی ہیئت مردف اور غیر مردف، مثنوی، قطعات، ماہیے اور نظموں کی شکل میں ملتی ہیں۔ نظموں میں پابند نظم، نظم معریٰ اور آزاد نظم دکھائی دیتی ہے۔ امجدؔ نے یہ تمام حمدیں اپنے مجموعے ''اسباب'' میں نعت اور سلام کے ساتھ جمع کردی ہیں۔ امجدؔ ایک پُرگو شاعر ہیں اور ان کا کلام تقریباً ایک ہزار سے زیادہ نظموں، غزلوں، گیتوں اور ماہیوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں حمدیہ اشعار نہ صرف حمد و مناجات میں محدود ہیں بلکہ ان کی تمام تر شاعری میں جواہرات کی طرح جڑے ہوئے ہیں اسی لیے ان کی پوری حمدیہ شاعری کا جائزہ اس لیے بھی ممکن نہیں کہ حمدیہ مضامین کی توصیف اور تشریح کے لیے زبان عاجز بیان محدود اور زمان مختصر ہے۔

یہاں یہ بات بھی فخر و مباہات اور مبارک باد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ امجدؔ کا شمار اردو ادب کے ان چند شعرا میں ہوتا

ہے جنھیں حمدیں لکھنے کی خاص توفیق ہوئی۔ اتنا زیادہ حمدیہ کلام مرثیہ گویوں اور نعت نگاروں کے دفاتر میں تو نظر آتا ہے لیکن دوسرے غزل اور نظم کے ممتاز شعرا کے پاس موجود نہیں۔ ہم صرف یہاں امجدؔ کی زبانی یہی کہہ سکتے ہیں۔ ھذا من فضل ربی۔

امجدؔ نے حمد کو نیا لہجہ اور نئی وسعت دی ہے۔ اردو حمد میں ایسے اکثر مطالب ہمیں نظر آتے ہیں۔ امجدؔ حمد نگاری کو موجودہ دور اور اس کے موجودہ مسائل سے جوڑ رہے ہیں جن میں سائنسی ترقیاں، خلائی اطلاعات اور کہکشاؤں کی ہر روز نئی نئی موشگافیاں شامل ہیں۔ ذیل کی نظم ایک آزاد نسبتاً طولانی نظم ہے۔ اس حمد کا بیانی حُسن خود اس نظم کی لسانی کرافٹ ہے اگرچہ بظاہر نظم کے مصرعے اور فقرے ذہن میں شعری رنگ و بو بکھیرتے ہیں لیکن باطناً ان میں تمام صفاتِ کبریا کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ امجدؔ نے اس حمد میں خوبصورت پیکر تراشے ہیں جو زیادہ تر کائناتی یا فطری ہیں جیسے خلا، جہان، کہکشاں، سورج، روشنی وغیرہ انسانی پیکر جیسے آنکھیں، پتلیوں، میٹھوں، لہو وغیرہ کے ساتھ چرند اور پرند کی پیکر سازی سے مضمون میں ندرت پیدا کی ہے۔

حمد کا آغاز شاعر کے خیالات کے پیچ وخم سے جو خلاؤں میں گردش کرتے ہوئے افلاک تک پھیلے ہوئے ہیں ہوتا ہے، اور پھر ان میں صفات کبریا کی روشنی کی جھلک بھی نظر آتی ہے:

جہان اندر جہان بے انت گردشوں کا جو سلسلہ ہے
یہ سب اُسی ایک ذاتِ واحد کا آئینہ ہے
وہ ذات واحد
کہ جس کے اثبات کے جلو میں وہ کہکشائیں بھی چل رہی ہیں

یہاں شاعر نے اثبات وجود اور اقرارِ وحدت کا ذکر کیا ہے جو حمد کے اصلی موضوعات ہیں۔ رب عالمین کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ:

کہ میری آنکھیں تو روشنی کے بس ایک ذرّے
بس ایک سورج کی سلطنت میں بھٹک رہی ہے
یہ ایک سورج کہ جس کی مٹی سے میرے دن رات پھوٹتے ہیں
یہ اُس کے گھوڑے کی گرد پا ہے
یہ میری ہستی کا حاشیہ ہے

شاعر یہاں ذہنِ انسانی کی حیرت اور حسرت کا مرقع پیش کر رہا ہے کہ مخلوق عاجز ہے مگر اس کی صفات کی خوشبو سے اس کی ذات کا قرب حاصل ہوسکتا ہے۔

میں اس کو آواز دے رہا ہوں
جو صوت و آہنگ کے وسیلوں سے ماورا ہے
جو میری بے سمت خواہشوں کا قطب نما ہے
کبھی کبھی جب مری صدائیں
مرے لہو کی جو وادی میں گونجتی ہیں

میں اپنے ہونے کے اور نہ ہونے کے مخمصے میں یہ سوچتا ہوں
میں اس کے اندر ہوں
اس کا حصّہ ہوں
یا کہ کیا ہے!

وجودِ باری تعالیٰ اور وجود کائنات میں تصوفی رجحانات فلسفیانہ خیالات ہمہ اوست یا ہمہ از اوست میں ہیں۔ ہر چیز معبود ہے یا ہر چیز معبود سے ہے۔ لاموجود الا اللہ کوئی موجود نہیں سوائے اللہ کے۔ امجدؔ نے فوق کے مصرعوں فقروں میں صفات اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے ہونے اور نہ ہونے کے مخمصے پر گفتگو کی ہے۔ امجدؔ کی اس پوری حمد کو پڑھا جائے تا کہ اس کی زبان اور اس کے بیان کا لطف اٹھایا جا سکے۔

ایک اور حمد میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ رب العالمین کی عظمت ہے اور چونکہ ساری کائنات اس کی تخلیق ہے۔ اس لیے ہر شئے اسی کو پکارتی اور اسی سے مدد کی خواستگار رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کا مالک، سبھوں کے دکھ کا چارہ گر، وہ ہر بستی کا روشن ستارہ ، ہر راستے کی منزل ہے۔ اسی لیے مخلوقات سے جڑ کر شاعر بھی کہتا ہے:

اے آنکھیں اور آنکھوں کو یہ نیندیں دینے والے
میں نے ہر اک خواب میں چھپ کر تجھے پکارا ہے

امجدؔ کی پیکر سازی میں آنکھ، نیند اور خواب مختلف معنی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ حمد میں یہ مضامین بالکل جدید ہیں اور جدید حمد کی قلمرو میں ان کا مقام اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام اسمائے حسنیٰ حرفوں سے بنے ہیں اور جب یہ الفاظ زبان پر آتے ہیں تو آواز بن جاتے ہیں چنانچہ پڑھنے والا ہی نہیں بلکہ خود حروف اور اس کے اندر لبریز صدا نے بھی معبود حقیقی کو ہر قدم پر پکارا ہے۔ یہ ندرت بیانی ہے۔

اے حرفوں اور آوازوں کو شکلیں دینے والے
تیرے حرفوں آوازوں نے تجھے پکارا ہے

امجدؔ کی حمد یہاں ایک خوبصورت موڑ لیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ رب عالمین ہے ہر موجود یعنی تمام جمادات ، نباتات ، حیوانات اس کی عبادت میں مشغول ہیں تو پھر انسان کیوں اُسے اپنے مذہب اور اپنی ذات تک محدود کر دیتا ہے۔

امجدؔ کا مقطع ذہن انسانی کو جھنجھوڑتا ہے کہ اُس کی مخلوق سورج، دریا، ہوا تو سب پر تواضع شفقت اور مرحمت کرتی ہے تو کیسے خالق صرف محدود ہو کر کسی خاص گروہ کا ہو جائے گا۔

کیسے بندے ہیں وہ امجدؔ جو یہ سوچتے ہیں
مولا سب دنیا کا نہیں ہے، صرف ہمارا ہے

کبھی کہتے ہیں:

کُھلا کہ اُس کا ٹھکانہ نہ دیر ہے نہ حرم
ہر ایک در پہ میں امیدوار ہو کے گیا

ہم یہاں گفتگو کریں گے امجدؔ کی ایک آٹھ شعروں کی حمد جو مثنوی ہیئت میں ہے۔ قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ اللہ کا دین

اسلام ہے اور یہ بھی کہ دین انسان کی فطرت پر استوار کیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آدم سے خاتم محمد ﷺ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیامبر دنیا کے مختلف حصوں میں بھیجے گئے اور کئی آسمانی صحیفے بھی مختلف زمانوں میں بھیجے گئے۔ چنانچہ آخری صحیفہ جو پوری طرح کامل اور محفوظ ہے۔ قرآن کی شکل میں موجود ہے۔ جو حتمی مرتبت حضور اکرم ﷺ پر وحی کی صورت نازل ہوا۔

اسی مطلب کو امجدؔ نے حمد کے مطلع میں یوں ادا کیا ہے۔

آدم سے تا محمد ﷺ عالی مقام سب
لائے یہی پیام کہ ہے ایک سب کا رب

یعنی دینِ اسلام کی ازل سے یہی تعلیم تھی کہ اللہ ایک ہے پھر اللہ نے حضور ﷺ کو خاتم النبیین کا خاص مقام عطا کیا کہ وہ حبیب اللہ، خلقِ عظیم کے حامل رحمت اللعالمین کہلائے۔ ع: حق سے ہے مصطفیٰ ﷺ کو ملا خاص یہ مقام

اس حمد کا حُسن یہ ہے کہ اس میں تصوفی اور بھگتی کے شعرا کی جھلک اور مہک بھی ہے۔ کائنات کا مبدا اور اصل اللہ ہے اور اسی کے نور کی مظہر یہ کائنات ہے جس کو قرآن میں اللہ نور السمٰوات والارض کہا ہے۔ ذیل کے شعر میں امجدؔ نے آیت کی ترجمانی کی ہے۔

وہ ایک ذاتِ پاک جو اصل حیات ہے
مظہر اسی کے نور کی یہ کائنات ہے

مکان اور لامکان اُسی کا ہے۔ سب منزل فنا میں ہیں وہی صرف باقی اور حیّ قیوم ہے۔ وہ تمام مخلوقات کا خالق اور مالک ہے۔ امجدؔ نے ذیل کے تین مصرعوں میں اللہ کے صفات کی روشنی پھیلائی ہے۔

دارِ فنا میں ہستیٔ مطلق وہی تو ہے
عالم ہیں سب اُسی کے اسی کا ہے لامکاں
مالک ہر ایک سانس کا بے شک وہی تو ہے

فارسی اور اردو کے شاعروں نے مختلف مذاہب کو ایک رب کے سائبان میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
تو گبر، آتش پرست و بت پرستی باز آ
ایں درگہہ ما درگہہ نامیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

یعنی پلٹ کر آجا پلٹ کر آجا تو کچھ بھی ہے تو گبر آتش پرست یا بت پرست ہے پلٹ کر آجا۔ یہ (اللہ کی بارگاہ) ناامیدوں کی درگاہ نہیں اگر تو نے سو بار توبہ بھی توڑی ہے پلٹ کر آجا۔

سوداؔ کہتے ہیں۔

پروانۂ تجلّیِ وحدت ہو اور دیکھ
نورِ چراغِ دیر ہے شمعِ حرم کے ساتھ

خدائے سخن میر تقی میرؔ نے بھی اسی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

امجدؔ کہتے ہیں:

گوتم، کرشن، رام جی، نانک، بھگت کبیر
یہ بھی اُسی کے بندِ محبت کے ہیں اسیر

پھر کہتے ہیں اگرچہ ظاہری طور پر ان لوگوں میں شرق وغرب کا فرق معلوم ہوتا ہے لیکن ان تمام راستوں پر چلنے والوں کی منزل ایک ہے ان کی بولیاں جدا جدا ہیں لیکن سب کا مطلب ایک جیسا ہے چنانچہ خوبصورت، پہاڑی راستوں سے مثال دے کر کہتے ہیں:

وہ ہے کسی پہاڑ کی چوٹی سا سر بسر
اس کی طرف روانہ ہے دنیا کا ہر بشر
آتے ہیں شرق وغرب وجنوب وشمال سے
گاتے مگر ہیں گیت اُسی بے مثال کے
رستے ہیں اپنے اپنے پہ منزل نما ہے ایک
مذہب جدا جدا سہی لیکن خدا ہے ایک

تمام حمد دلوں کو جوڑنے اور فاصلوں کو کم کرنے کی مستند دستاویز ہے۔ جب کلیم اللہ حضرت موسیٰؑ نے چرواہے کی جاہلانہ گفتگو اللہ کے بارے میں سُن کر اس کی تنبیہ کی تو ندا آسمانی آئی جسے مولانا رومؔ نے یوں رقم کیا کہ تو جوڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے نہ کہ توڑنے کے لیے۔

تو برای وصل کردن آمدی
نے برای فصل کردن آمدی

حمد سلیس اور سادہ ہے۔ صنعت تضاد فنا، ہستی اور صنعت جمع گوتم، کرشن رام نانک کبیر یا شرق وغرب شمال جنوب نے مصرعوں کو دلکشی دی ہے۔

امجدؔ کی بہت سی نظموں کو کھنگالیں تو حمدیہ ٹکڑے ان میں چمکتے نظر آتے ہیں۔ کہیں صفات سے گفتگو ہے کہیں ذات سے سروکار ہے اور کہیں اسمائے حُسنیٰ سے لگاؤ۔ ''ایک عجیب خیال'' میں نظم کا رخ حمدیہ بیان کی طرف یوں موڑتے ہیں۔

ہے زمانوں کا، جہانوں کا خدا
خالقِ ارض و سما، حیّ و صمد
جس کے دروازے پہ رہتے ہیں کھڑے
مثلِ درباں ازل اور ابد
جس کی رفعت کا ٹھکانہ ہے نہ حد

(خالق، رب السمٰوات، حیّ، صمد، اول، آخر، وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے) یہی نہیں بلکہ امجدؔ نے بعض نظموں کے نام

ہی اسمائے حُسنیٰ پر رکھے ہیں جیسے ''رب غفار۔ یا سمیع یا بصیر۔

شاعر ذیل کے اشعار میں نئے نئے پیکر تراشتا ہے، آنکھوں سے خواب، راستوں سے گھر، حیرت سے آئینے، یقیں سے گماں، جبیں سے سجدہ، آسماں سے زمیں یہاں سارے مرئی اور نامرئی پیکروں کو نئے معنی دیتا ہے۔ مصرعوں سے ہمارا مدعا ظاہر ہے۔

اُس کی حیرت کے ہیں آئینے شش جہت
سب زمانے اسی کے یقیں کا گماں
سارے رستوں کا رخ اُس کے گھر کی طرف
ساری آنکھیں اُسی خواب کی باندیاں

اللہ کا ذکر قلب کی تسکین کا واحد ذریعہ ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ ''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب'' یعنی کوئی چیز قلب کو سکون فراہم نہیں کرسکتی سوائے ذکر اللہ کے اور یہاں وہی ذکر ''خواب حسیں'' ہے۔

اس کا خواب حسیں
سجدہ گاہ جہاں میں جبیں در جبیں
ہر جگہ جلوہ گر اور موجود ہے
وہ جو مسجود ہے

جہاں تک پیکر سازی کا تعلق ہے امجد کا کلام اس سے بھرا پڑا ہے اور اس میں ان کی ڈرامہ نگاری کا فیض بھی شامل ہے۔

قرآن کریم میں تکرار کے ساتھ ذکر ہوا ہے کہ ''اکثرھم لا یعقلون'' زیادہ تر لوگ تعقل یعنی سوچ وچار نہیں کرتے اگر وہ فکر کو مہمیز کریں تو بہت سے ان کے گمان یقین میں بدل جائیں۔ امجد کی حمدوں میں سوالات کی پیکر تراشی کچھ اس ہنرمندی کے ساتھ ہے کہ سوال خود جواب بن جاتے ہیں۔ اکیسویں صدی افلاک پر کمین ڈال رہی ہے۔ انسانی ذہن خورشید، چاند اور تاروں کے ساتھ ساتھ کہکشاؤں کے مطالعے میں مصروف ہے۔ امجد جب زمین کی بات کرتے ہیں تو سرزمین پاک کی گفتگو کرتے ہیں اور جب افلاک کا ذکر کرتے ہیں تو خورشید، قمر، انجم سے اپنی شاعری کی کہکشاں کو منور کردیتے ہیں۔

امجد کی ایک حمد جو آزاد نظم کی شکل میں ہے نئے مطالب اور مضامین سے بھری پڑی ہے۔ اس حمد میں جو نکات ہیں اس سے مربوط چند مصرعے اور فقرے ہم یہاں بیان کررہے ہیں۔

☆ اللہ شہ رگ سے قریب ہے۔

تو وہ سچ مچ ہمارے اس قدر نزدیک لگتا ہے
کہ جیسے ہم اگر چاہیں تو اس کو چھو بھی سکتے ہیں

☆ اسمائے حُسنیٰ کی قدر سے کہکشائیں اپنے اپنے محور پر گامزن ہیں۔

فلک کی بے کرانی میں
ستارے اس کے ناموں کا دلوں میں ورد کرتے ہیں

☆ اللہ نور السمٰوات والارض (قرآن) قرآن مجید میں جہاں بھی زمین کا ذکر ہوا واحد طور پر ہوا کیونکہ زمین صرف ایک ہے اور ہر جگہ قرآن میں آسمان سمٰوات یعنی جمع کے صیغے میں استعمال ہوا ہے کیونکہ کہکشائیں افلاک کئی ہیں اور اللہ رب العالمین ہے۔

مرے مالک مرے معبود تیری یہ زمیں یوں تو
کروڑوں کہکشاؤں کے مقابل میں کچھ ایسے ہے
کہ جیسے ریت کا اک بے نشاں بے خانماں ذرہ

☆ انسان کو زمین پر اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا۔ (فضیلت انسان۔ احسن التقویم)

اسے جب سے لکھا اس آدمی زادے کی قسمت میں
شرف بخشا نیابت کا

☆ حدیثِ قدسی کی طرف اشارہ ہے کہ مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ مجھے پہچانا جائے تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا تا کہ پہچانا جاؤں۔

کہ مخفی جو خزانہ تھا وہ سب پر منکشف ہو لے

☆ انسان مختار اور مجبور کے درمیان ہے اسی لیے جزا و سزا کا مستحق اور جبر و قدر کا پابند ہے۔ شاعر نے ان فلسفوں کو ایک ہی مصرعے میں حل کیا ہے۔

کہ اپنا ہر عمل انساں تری میزان پر تولے

☆ کائنات ''کن فیکون'' کا نتیجہ ہے یہی سربستہ راز ہے جو انسانی فکر و ذہن سے بلند و بالا ہے شاعر اقرار کرتا ہے کہ قطرہ میں سمندر کو سمجھنے کی طاقت نہیں۔

مگر مالک اجازت ہو
تو میں بہ عجز یہ پوچھوں
ترے ''کن'' کی حقیقت کو یہ بندہ کس طرح کھولے

امجد کی ایک اور حمدیہ نظم فضیلتِ انسان میں ہے جو نائب اللہ فی الارض ہے اور احسن التقویم ہے۔ قرآن کی آیت ہے۔ انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ جس کے لیے کائنات سجائی گئی اور جس کے لیے حدیثِ قدسی کی زبانی معبود اور ربِ عالمین نے اپنے کو متعارف کروایا۔ شاعر نے اس حمدیہ نظم میں پہلے سائنسی علمی گفتگو کی ہے پھر مخلوقات سے اس زمین کو سجایا ہے اور آخر میں الہام غیب اور ایمان کی قوت سے کعبے کے اعتکاف اور طواف کے درمیان یہ راز معلوم کیا کہ اس آرایش، آلایش اور نمایش کا سارا بندوبست انسان کی آسایش اور معبود کی پرستش کے لیے ہے۔ یہاں شاعر نے نظم کا محور قرآن مجید کی آیات کو بنایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ ساری کائنات ''کن فیکون'' کا نتیجہ ہے۔ یہاں وقت کی گیرائی اور گہرائی کا بیان بھی ہے۔ عقل کی

مجبوری اور عجز بھی یہاں عیاں ہے۔ اس موقع پر ہم اس حمدیہ نظم کے کچھ مصرعے چُن کر پیش کرتے ہیں تا کہ مطلب عیاں ہوجائے۔

کہتے ہیں ایک آگ کا گولہ تھی زمیں
اور اس کو سرد ہونے میں اربوں برس لگے
وہ حرف ''کُن'' کہ جس سے ہوا سلسلہ شروع
کیا جانے، کب، کہاں پہ اور کیسے کہا گیا
دیتی نہیں ہے عقل تو اس کا کوئی جواب
یہ وقت جس سے آج عبارت ہیں ماہ و سال
کہتے ہیں یہ توخود ابھی پیدا ہوا نہ تھا
سو کیا کریں حساب
ششدر تھا آسمان تو حیرت میں تھی زمیں
کھلتا نہیں کہ سارا تماشا تھا کس لیے
کل شب حرم کے سامنے آیا جو یہ خیال
مت بھول تُو زمین پہ ہے آئینہ مرا
سب یہ تکلّفات تھے انسان کے لیے
گھر کو سجایا جاتا ہے مہمان کے لیے

جوسوالات شاعر نے خوبصورت سے مصرعوں میں اٹھائے ہیں ان کے جوابات کوئی اس لیے نہیں دے سکا کہ وجود باری اپنی کنہ کی حیثیت سے کسی پر منکشف نہیں ہوتا۔ عقل اور احساسات اس کا ادراک نہیں کر سکتے:

سچ ہے ع: معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

ع: العجز عن درک الا دراک ادراک

ع: چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ع: کہ ادراک است عجز از درک ادراک

یعنی خاک کو عالمِ پاک (نورِ مطلق، ذاتِ اقدس) سے کیا نسبت۔ کیونکہ انسان کی عقل کی حدِ ادراک محدود اور عاجزانہ ہے۔

حمدوں میں اسمائے حُسنٰی کی روشنی اللہ کے صفات کی جلوہ گری کرتی ہے۔ امجدؔ نے اسمائے حسنہ کہیں ناموں میں اور کہیں ان کے معانی اور مطالب کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ اللہ کا ہر فعل اور ہر صفت کمال ہے کیونکہ وہی ایک ذاتِ جلال بھی ہے

جمال بھی ہے نورالسمٰوات بھی ہے، وہی موجود بھی ہے اور اس کی ذاتِ پاک انسان کی سوچ سے باہر ہے۔ وہ دکھائی نہیں دیتا لیکن اس کے نشان اور شعار اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ذیل کے تین شعر دیکھیے۔

زباں پہ مہر لگادے جلال ایسا ہے
نظر کی تاب سے باہر، جمال ایسا ہے
کہیں دکھائی نہ دے اور ہر طرف موجود
گماں یقیں میں بدل دے کمال ایسا ہے
وہ نور جس کی سمائی نہیں کسی دل میں
بشر کی سوچ سے باہر خیال ایسا ہے

یہاں شاعر کا کمال یہ بھی ہے کہ ادق اور فلسفیانہ مسائل جو علم تصوف اور خدا شناسی کے ذیل آتے ہیں بہت سہل اور عام فہم بنا کر ایسا نظم کیا گیا ہے کہ عامی اور عالم دونوں کے لیے لطف اندوز اور قابل قبول ہے۔ اسی کو کہتے ہیں اچھی شاعری جہاں ابلاغ اور ترسیل آسان رہے۔ شاعر ایک اور حمد کے محدود الفاظ میں لامحدود صفات اور اس کے درخشاں نشانات جو کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں بڑی خوبصورتی سے مصرعوں میں جوڑ دیتا ہے، بعض مصرعوں میں قوافی کی نغمگی اور مضمون کی تازگی دلوں میں روشنی بکھیر دیتی ہے۔ ذیل کے چند مصرعوں اور فقروں میں خوبصورت قافیے جو آخری حرف دال کے ساتھ پورے ادا ہوئے ہیں۔ اردو اشعار میں جو حروف پوری طرح سے بعض اوقات ادا نہیں ہوتے وہ ''ذ'' اور ''ع'' ہیں۔ یہ امجد کی مہارت اور عروضی نکات پر گرفت ہے کہ اشعار سقم سے پاک ہیں۔

وہ جو معبود ہے
ہر جگہ جلوہ گر اور موجود ہے
سجدہ گہہ ہے جہاں وہ ہی مسجود ہے
سب کا مقصود ہے
حسن ہے بے کراں، آنکھ محدود ہے

یہ سچ ہے کہ حمد نگاری کے مطالب اور موضوعات لامتناہی ہیں کیونکہ ہم جب اپنی زمین کے رموز سے پوری طرح سے واقف نہیں تو کیسے ممکن ہے محدود الفاظ میں رب عالمین کی لامحدود عظمتوں، کمالاتوں، نعمتوں اور رحمتوں کا احاطہ کرسکیں جس کے لیے خود قرآن نے گواہی دی ہے کہ اگر سمندر روشنائی، اشجار قلم اور جن وانس کاتب بن جائیں تو شمہ برابر بھی اللہ کی حمد کا حق ادا نہ ہوسکے۔ چنانچہ اگر دریا کا شیریں پانی پورا سینچا نہ جاسکے تو کم از کم اتنا تو اپنے ساغر میں کھینچا جائے کہ پیاس کسی حد تک بجھ سکے اسی لیے حمد نگاروں نے اپنی اپنی فکر اور ہمت کے مطابق گلزارِ حمد میں پھول کھلائے ہیں جن کو ہم تجلیلی اور تنقیدی زاویوں پر چند اہم نکات کے تحت بیان کرسکتے ہیں۔

(الف) شہادت اور اثباتِ وجود اللہ تعالیٰ
(ب) شہادت اور اثباتِ وحدت اللہ تعالیٰ

(ج) شہادت قدرت کاملہ اللہ جل شانہ

(د) توصیفِ ذاتِ اقدس اسمائے صفات کے حوالے سے

(ھ) توصیف اور تشکر حسبِ استطاعت فکر وفنِ شاعر

(و) تصوفی نقطۂ نظر سے وجوب اور وجود پر استدلال

(ز) نعتیہ، مناجاتی، دعائیہ، قرآنی اور علمی مطالب وغیرہ

امجدؔ اسلام کی حمدوں کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے دس بارہ چھوٹی بڑی حمدوں میں توصیف اور تجلیل کے ساتھ کچھ سوالات بھی اٹھائے ہیں جن میں ''کن فیکون''، مسئلہ جبر وقدر، مسائل ازل وابد، داستانِ آدم وابلیس، یقین وگمان، کائنات وکہکشاں، مسئلہ جزا وسزا وغیرہ درجنوں مطالب پر روشنی ڈالی اور حضورِ اقدس سے روشنی مانگی بھی ہے۔ قرآن کریم میں متعدد جگہ کہا گیا ہے کہ ''اکثرھم لایعقلون'' اکثر لوگ غور وخوض، یا تعقل نہیں کرتے، صحیح غور وفکر اللہ کے وجود وحدت پر یقین کے ساتھ عبادت ہے۔

امجد اسلام امجدؔ کی حمدوں میں مختلف سوال جو فکری ذہن میں وقتاً فوقتاً اٹھتے ہیں سلیقے سے بیان کیے گئے ہیں جس کا مبدا اسلامی فلسفے کی موشگافیاں ہے۔ لیکن اس میں علامہ اقبال کے لہجہ کا رنگ بھی شامل ہے۔ امجدؔ کا کمال یہ بھی ہے کہ مطالب کو آسان فہم بنانے کے لیے حتی الامکان ادق الفاظ تلمیحات اور اصطلاحات سے دُوری برتتے ہیں اور صرف ضروری الفاظ جن سے گریز ممکن نہیں استعمال کرتے ہیں تاکہ عام قاری بھی بات کو سمجھ سکے۔ ایک حمد میں کہتے ہیں:

سوال ۱ے
نہیں بساط بشر کی کہ وہ احاطہ کرے
یہ جلوہ زارِ طلسماتِ ''کن فکاں'' کیا ہے

سوال ۲ے
کہاں سے کس طرح ابلیس کو ملی جرأت
ترا تھا حکم تو سجدہ نہیں کیا کیسے؟
تو پھر وہ واقعہ ''انکار'' کا ہوا کیسے

سوال ۳ے
اور اس کے بعد سے اب تک یہ کیا تماشا ہے
کہ اس طرف تو ہے شیطان کو کھلی چھٹی
اور اس طرف ہیں مشیت کے فیصلے تیرے
ہزار طرح کی مجبوریوں کے گھیرے ہیں
تو ہی بتا کہ وہ ان بندھنوں کے ہوتے ہوئے
سمے کی آگ کے دریا کو کیسے پار کرے

شاعر نے اس حمد میں ''تجاہلِ عارفانہ'' سے کام لیا ہے پوری حمد مقصدِ تخلیق کائنات تعارف سرورِ کائنات، فضیلتِ انسان فلسفہ جبر وقدر اور مسئلہ سزا اور جزا پر تعمیر کی گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ انسانی ذہن ابھی اس قوت کا حامل نہیں جو خدا کے وجود

کا پوری طرح درک کر سکے۔ حدیثِ قدسی کی رُو سے خدا جو ازل سے پوشیدہ خزانہ تھا قصد کیا کہ پہچانا جائے کائنات اور مخلوقات خلق ہوئیں اور احسن التقویم انسان جو اللہ کا نائب اور خلیفہ زمین پر بنایا گیا مجبور اور مختار کے درمیان جزا اور سزا کا مستحق قرار دیا گیا۔

اچھی اور فکری شاعری میں تہہ داری ہوتی ہے اس سے تعقل مہمیز ہوتا ہے۔ ذہن ذکرِ الٰہی میں مگن ہو جاتا ہے اور ذہن کے پرتوں پر پڑے ہوئے پردے ہٹنے لگتے ہیں اور اس طرح معرفتِ الٰہی کے دروازے فکر و نظر پر کھل جاتے ہیں، جس کا نام ایمان ہے۔ ہر ذی شعور اپنے احساس اور فکر میں ''کن فکاں'' کو سمجھ سکتا ہے اور اس کی آج بھی دمادم آواز تحت الشعور میں سُن بھی سکتا ہے۔ قرآنی آیات اور اسلامی تشریحات واقعہ انکار کی طرف یعنی اللہ سے نافرمانی کرنے کے نتائج سے واقف ہے اور کھلی چھٹی عدالتِ عادلِ کائنات کا وقفہ ہے صرف ابلیس ہی کو نہیں بلکہ نفس امارہ سے لبریز اشخاص کو بھی۔ اللہ کی مشیت اور شریعت فطرت انسانی پر رکھی گئی ہے۔ دنیا مجبوریوں کا جال ہے لیکن رحمت کے سہارے سے کی آگ کے دریا کو پار کیا جا سکتا ہے۔ اس حمد کے آخر میں شاعر نے جواب نما سوالوں کے بعد یہ اقرار کیا کہ خدایا یہ تیری مشیّت کے فیصلے حق ہیں، یہ نامیرے سوال ہیں نہ تنقید اور شکوے ہیں بلکہ عجز و انکساری سے بھری ہوئی عرضِ حال ہے جو لاوے کی طرح میرے دل کی گہرائیوں سے ابلتی رہتی ہے۔

خدایا تیری مشیّت کے فیصلے برحق
میں ان پہ کرسکوں تنقید یہ مجال نہیں
یہ میری عرض ہے مولا کوئی سوال نہیں

اس حمد میں شاعر کی زبان کے مطالب گہرے ہونے کے باوجود سطحی اور صاف ہیں۔ محاورہ ''کھلی چھٹی'' تلمیحاتِ ابلیس، واقعہ انکار وغیرہ کے ساتھ شاعر نے عمدہ پیکر سازی بھی کی ہے۔ تمام حمد ابلاغ کی کامیاب مثال ہے۔ مابعد جدیدیت کی شاعری کا اکیسویں صدی کے اذہان سے جوڑنا ضروری ہے۔ امجدؔ کا اسلوب امیر خسروؔ کی حمدیہ شاعری کی طرح جواب سے سوال، منفی سے مثبت اور گمان سے یقین کی طرف رواں دواں ہے۔

حمدیہ غزل کا مطلع اور لہجہ دیکھیے۔ کیا یہاں تعقل اور معرفت کا دروازہ شاعر کھول نہیں رہا ہے:

بنتے ہیں ہر سوال کے پیکر نئے نئے
کھلتے ہیں پھول ذہن میں اکثر نئے نئے

اس پوری حمد میں صفات ثبوتیا ہیں جو حمد کے اصلی ارکان میں شامل ہیں۔

کس نے سیاہ رات کو تارے عطا کیے
پھر ان میں رکھ دیئے کئی چکر نئے نئے

سیاہ رات میں تارے چمک کر رات کے منظر کو خوبصورت کرتے ہیں۔ یہ تاروں کی روشنی ہے جو رات کی ظلمت کو ختم کر رہی ہے۔ مصرعہ ثانی میں چکر گردش کا اور گولائی کا پیکر ہے۔ انسان اشرف المخلوقات اور احسن التقویم صرف شعور اور نطق کی بنیاد پر ہے۔ یہ نامرئی پیکر امجدؔ کی شاعری میں نئے نئے رنگ اور نئے نئے ڈھنگ سے مستعملہ ہیں۔ ذہنِ انسانی جس کو غالبؔ

مرحوم نے ''محشرِ خیال'' سے تعبیر کیا ہے شعور کے طبقات کا منبع ہے۔ اسی کی طرف امجدؔ نے اپنی غزل میں اشارہ کیا ہے۔

بس اس سے ہوگا فیصلہ افراد ہوں کہ قوم
رزقِ شعور، علم کی دولت ہے کس کے پاس

اسی لیے کہتے ہیں ع: فکر ہر کس بہ قدرِ ہمت اوست، اور یہ نظر کی وسعت قادرِ مطلق کی دین ہے۔ شاعر نے سوالیہ انداز میں اقراری جواب پیش کیا ہے۔ ذہن کی پرواز کو شہپر سے جوڑنا عمدگی کی دلیل ہے۔

آنکھوں سے دور اجنبی پرواز کے لیے
دیتا ہے کون ذہن کو شہپر نئے نئے

شاعر گواہی دیتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز بتا رہی ہے کہ یہ سب چیزیں کارخانۂ ہستی کی کسی کی قدرت سے باقی اور رواں دواں ہیں۔

ہر چیز کہہ رہی ہے کوئی اور ہے یہاں
جس کی رضا کے فضل ہیں ہم پر نئے نئے

علامہ اقبال نے دعا کی تھی خدایا مجھے وہ نظر عطا کر جو شراب میں نشہ کو دیکھ سکے۔ ع: دربادہ نشہ رانگرم او نظر بدہ
امجدؔ ایک حمد میں دعا کرتے ہیں:

اُسے کھول میرے شعور پر وہ جو راز ہے پسِ کُن فکاں
تری اک نگہ کا ہوں منتظر بڑی دیر سے
میں ہوں اپنے آپ سے بے خبر، بڑی دیر سے

معتبر حدیث ہے ''جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا'' شاعر معرفت کے دروازے کھلنے کی دعا کر رہا ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ جنت سے مجھے کیوں نکال کر یہاں بھیجا۔

ع: کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

امجدؔ انتظار کی بات نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے:

یہ جو ایک تل سی زمین ہے تری کہکشاؤں کے درمیاں
اسے کیوں چنا مرے واسطے اسے کیوں کیا مرا آشیاں

مصرعوں سے زیادہ بین السطور عبد و معبود کے رشتوں کی رنگ برنگی ہے۔ امجد کی نظموں میں غنایت ہم قافیہ الفاظ سے بڑھ جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ متضاد الفاظ سے حُسن بیان اور حُسن معنی درخشاں تر ہو جاتا ہے۔ یہ تمام صنائع شاعر کی مہارت کی سند ہیں جیسا کہ اسی حمد کے مطلع کے دو مصرعوں سے عیاں ہے۔۔

صنعت تضاد = ازل۔ ابد، قربتیں۔ دوریاں، ظلمتیں۔ روشنی
ہم قافیہ الفاظ مصرعوں میں = رواں دواں، تکرار۔ وہی۔ وہی۔ کہیں، کہیں

ہیں ازل سے تا بہ ابد یہاں، وہی قربتیں وہی دُوریاں
کہیں ظلمتیں کہیں روشنی، مرے چار سُو ہیں رواں دواں

سورہ فاتحہ جو مومن ہر روز نماز میں پڑھتا ہے دعا کرتا ہے کہ پروردگار مجھے اس سیدھے راستے پر چلا جس پر تو نے نعمتیں نازل کی ہیں۔ امجد کی ایک چھوٹی مگر بلیغ حمد تین مصرعوں کی نظم ہے اس کو ثلاثی بھی کہہ سکتے ہیں۔

ترا راستہ مجھے مل گیا یہ کمال مجھ پہ کرم ہوا
گھنی تیرگی میں چراغ سا، تیری یاد کا کوئی باغ سا
کبھی جل اٹھا کبھی کھِل گیا، یہ کمال مجھ پہ کرم ہوا

شاعر کہہ رہا ہے کہ جس کی دعا میں نے مانگی وہی صراطِ مستقیم وہی راستہ جو ظلمتوں میں روشن چراغ ہے۔ وہی راستہ جو ذکر سے رنگین اور خوشبودار ہے مجھے تیری بخشش اور کرم کی وجہ سے نصیب ہوا جس نے مجھے کامل بنا دیا۔ تو نے مجھے چودھویں کے چاند کی طرح کمال عطا کر دیا۔

اس حمد میں سلیس الفاظ کے صنعت اور صنعت لف ونشر مرتب یعنی چراغ، جل، باغ، کھل بھی شامل ہے۔ مصرعہ میں ہم قافیہ الفاظ چراغ، باغ، اٹھا، گیا، تکرار سا وغیرہ نے نغمگی کے ساتھ تاثیر میں رنگ بھر دیے ہیں۔

امجد کی ایک اور حمد چار مصرعوں کی نظم ہے۔ اس حمد کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس حمد میں نہ اسمائے حسنہ کا ذکر ہے اور نہ توصیفِ صفات ہے لیکن حمد یہ مطالب مصرعوں کے میناروں سے اذان دے رہے ہیں۔ بڑی شاعری کی شناخت یہ بھی ہے کہ موصوف یا اس کے صفات کہہ کر بھی سارا مطلب ابلاغ اور ترسیل کر دیا جائے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے ''اللہ ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے'' اور صرف ''اللہ ہی کا ذکر دلوں کو سکون عطا کر سکتا ہے۔'' قرآن ''بے شک ان لوگوں کے لیے ہدایت کی کتاب ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔'' ''اللہ کے نزدک دین اسلام ہے۔'' یہ سچ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا قافلہ اسی پیغامِ روشنی اور سحر کو پہنچانے کے لیے آیا ہے۔ اب اس تناظر میں حمد کے چار مصرعے پڑھیے۔ کیا یہ حمد نورانی حمد نہیں۔ کیا یہ شاعری پیامبری نہیں؟

یہ جو سلسلہ سا مہک کا ہے مرے پاس ہے وہ یہیں کہیں
یہ جو قافلہ سا دھنک کا ہے مرے پاس ہے وہ یہیں کہیں
وہ یقیں میں وہ گمان میں، وہی گونجتا ہے اذان میں
یہ پیام رنگِ شفق کا ہے مرے پاس ہے وہ یہیں کہیں

حمدوں میں ''کُن فیکون'' کا تجسس اور تلقین

قرآنی اصطلاحات، آیات کے فقرات اور الفاظ میں ''کُن فیکون'' کو اردو شعر و ادب میں علامہ اقبال کے کلام سے خاصی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ ایسا نہیں کہ اردو شعر و ادب میں ''کن فیکون''، ''کن فکون'' یا ''کن فکان'' یا اس کا مخفف ''کن'' کا پہلے استفادہ نہیں تھا بلکہ علامہ اقبالؔ کے کلام سے اردو شاعری میں اس موضوع کو مختلف جہتوں سے برتا اور پیش کیا گیا ہے۔ قرآنی آیت کے مطابق تخلیق کائنات میں رب العزت نے کہا ''ہوجا'' اور اُسی وقت وجود کائنات کا عمل ہوگیا۔ فارسی شعرا اور خصوصیت سے تصوفی شعرا نے ''کن فیکون'' کو اپنے شعری مجموعوں میں خاص توجہ دی ہے۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے علامہ اقبال کے بعد اگر کسی شاعر نے سب سے زیادہ اس مسئلہ پر لکھا ہے تو وہ میرے مطالعے میں امجد اسلام امجد ہیں۔ امجدؔ نے ''کن فکان'' کا سوال ہر اُس مقام پر اٹھایا ہے جہاں حیرت، عظمت، وحدت، خلقت کے مسائل ربوبیت کی معرفت سے متعلق ہیں۔ قرآن میں تعقل کی تاکید، بصیرت کی تلقین، اللہ کے صفات سے معرفت کی تحصیل تعلیم تشریح اور تفسیر کی روشنی ملتی ہے۔ علمائے اسلام بخصوص صوفی اولیا نے اللہ کی ذات میں فکر کرنے کی ممانعت اس لیے بھی کی ہے کہ انسانی ذہن اللہ کی ذات کا احاطہ نہیں کرسکتا بلکہ وہ اللہ کے صفات، نشانات اور افعال کا مطالعہ اور مشاہدہ کرسکتا ہے۔ شیخ سبستری متوفی 1320ء کہتے ہیں۔ اللہ کے اسمائے صفات، افعال اور کمالات میں غور و فکر کرنا اطاعت (عبادت) ہے لیکن ذاتِ حق میں فکر کرنا گناہ ہے۔ کیونکہ عقل کوتاہ بین اور عاجز ہے گمراہی کا غلط نتیجہ نہ نکال لے۔

در آلا فکر کردن شرط راہست
ولی در ذات حق محض گناہست

امجدؔ نے اللہ کے فضل و کمال پر جو سوالات اٹھائے ہیں اور ان کا جواب اور جواز بھی پیش کیا ہے عین معرفت ہے جس سے گمان یقین میں بدل جاتا ہے۔ عبادت تجارت بن جاتی ہے، اگر اس میں معرفت کا یقین نہ ہو۔ معبود نے بندہ ہی کو یہ توفیق دی ہے۔ ساری کائنات میں انسان ہی نائب اللہ فی الارض اور احسن التقویم شعور کی وجہ سے بنایا گیا ہے اسی لیے وہ رب العزت کا جتنا شکر ادا کرے اس کی جتنی حمد و ثنا کرے کم ہے۔ یہاں شاعر نے صنعت تجاہل عارفانہ میں ایک نظم ''مجھے ہی کیوں'' کے ذیل میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ خود دوسرے زاویۂ نظر سے ان کے جواب ہیں گویا مصرعے سوال کے ساتھ اس کے مخفی جواب بھی ہیں۔

مرے ہی واسطے کیوں ہے یہ آگہی کا رُوپ
مجھے ہی کیوں یہ بصیرت ملی کہ میں جانوں
مرے وجود کو کھاتی رہے گی کب تک یہ
یہ آگ جس کو ضرورت نہیں ہے ایندھن کی
یہ آگ جس کا کہیں پر سرا نہیں ملتا
مجھے ہی کیوں یہ اشارہ ہوا جدائی کا
عطا ہوئے یہ یقین و گماں مجھے ہی کیوں
مرے حبیب، مرے مہرباں مجھے ہی کیوں
حفیظ و خالقِ ہر دوجہاں، مجھے ہی کیوں

فلسفۂ وجود باری تعالیٰ پر صفات اور کمالات کی روشنی میں علما اور صوفیا نے کئی بحثیں کی ہیں۔ یہاں امجدؔ نے اپنے نظموں کے مجموعہ میں سوال کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ ایک ترتیب شدہ واقعہ ہے جس میں ہر چیز قاعدہ اور پلان کے تحت بنی ہے کیونکہ ان کا بنانے والا موجود ہے۔

ہمارے اندر کی اور باہر کی کائناتیں
ہر ایک ذرّہ ہے جن کا اپنی جگہ مکمل
اک ایسی دنیا جو ضابطے سے بنی ہوئی ہے
نظام جس کا ہر ایک ساعت یہ کہہ رہا ہے
اسے کسی نے بڑی توجہ سے اور اپنی گماں سے بالا
عظیم قدرت سے وا کیا ہے۔

اب ہم مزید اس روشنی میں حمد یہ موضوع اور مطالب کو امجدؔ کے کلام میں دیکھتے ہیں جو مابعد جدیدیت کے بعد کی جدید حمد کا معرفتی زینہ ہے۔ امجدؔ نے اپنے ایک شاہکار شعر میں بلند آواز کہا ہے۔

اُس حرفِ کُن کی ایک امانت ہے میرے پاس
لیکن یہ کائنات مجھے بولنے تو دے

سچ تو یہ ہے کہ آنکھیں وہ چیز نہیں دیکھ سکتیں جو دماغ نہیں جانتا۔ خون کا ایک قطرہ مائیکروسکوپ کے نیچے ایک عام پڑھے لکھے آدمی کے لیے کچھ رنگی خلیوں سے زیادہ نہیں مگر خون کے ماہر ڈاکٹر کے لیے ایک دفتر ہے اور ہر خلیہ اپنی بے زبانی سے اسے بیماری یا صحت کی نشانی دیتا ہے۔ امجدؔ کہتے ہیں:

آنکھیں تو سب کے پاس ہیں پر دیکھنا ہے یہ
ان منظروں میں ڈولتی حیرت ہے کس کے پاس

اقبالؔ نے سچ کہا ہے کہ ع: ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں'' قرآن کہتا ہے۔ ہر ایک فنا پذیر ہے اور یقیناً وہی

ایک ذات لافانی اور باقی ہے۔ اقبالؔ نے جو حیرت سے سوال کیا تھا۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز مشیتِ الٰہی کے پروگرام کے تحت ہے جس کے لیے قرآن کہتا ہے۔ ''اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں۔'' ہمارے شعور کی گہرائی اب ان تہوں کے پرت اٹھا رہی ہے اور ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ امجدؔ نے محسوس کیا ہے۔

شمس وقمر کے جادو گھر میں، بحر و بر کی حیرت میں
یوں لگتا ہے جیسے اب تک کُن کا کلمہ جاری ہے

کبھی وہ یوں بھی سوچتا ہے:

دمادم نت نئی کہکشائیں بنتی جاتی ہیں
وہ اک لمحہ نہ جانے کس قدر قرنوں میں پھیلے گا

امجدؔ جانتے ہیں عبادت کی معراج معرفت کی اسرار میں مخفی ہے جہاں عشق اور الہام سے کام چلتا ہے سائنس اور عقل جہاں نادان ہیں۔ شاید اسی لیے کہا ہے:

دوست کی بزم ہی وہ بزم ہے امجدؔ کہ جہاں
عقل کو ساتھ میں رکھنا بڑی نادانی ہے

شاعر جانتا ہے حضورِ الٰہی تک رسائی مومن کی رُستگاری ہے۔ اسی لیے کہتا ہے:

کہکشاں سے پرے، آسماں سے پرے، رہگزارِ زمان و مکاں سے پرے
مجھ کو ہر حال میں ڈھونڈنا تھا اُسے، یہ زمیں کا سفر تو بہانہ ہوا

امجدؔ فیض الٰہی اور لطف کردگار سے اُن تمام اسرار و رموز سے واقف ہونا چاہتا ہے جس سے وہ ذرّوں کے سینوں کو چیر کر تجلّی کا نظارہ کر سکے۔ اسی لیے دعا کرتا ہے:

کُن فکاں کے بھید سے مولا مجھے آگاہ کر
''کون ہوں میں'' گر یہاں پر دوسرا کوئی نہیں

کبھی کہتا ہے:

فقط اک لفظ سے امجدؔ یہ کیسے ہوگیا سب کچھ
کہانی ''کُن'' کی اس کے رازداں سے کس طرح پوچھیں

شاعر جانتا ہے ان تمام سوالوں کا تشفی بخش جواب نظروں کے سامنے ہے۔ یہاں ذرہ ذرہ اس کا عکس نما ہے جو اشارہ کر رہا ہے لیکن شرط اخلاص اور بندگی ہے۔ جس طرح انسان کا ظاہری برتاؤ اس کے اخلاق ہیں اس کا باطنی برتاؤ اخلاص ہے اور اسی لیے سورہ قل ھواللہ احد کو سورۂ اخلاص کہتے ہیں جس سے دل مخلص اور خالص ہوجاتا ہے امجدؔ کہتا ہے پہلے بندگی میں غرق

ہوجائیں تو بصیرت کی نظر اور معرفت کی فکر ان مسائل کو سمجھا سکتی ہے:

وہی سمجھا تری خدائی کو
جو تری بندگی میں ڈوب گیا

گور چشموں کے لیے آئینہ خانہ معلوم
ورنہ ہر ذرّہ ترا عکس نما ہے کب سے

یہ کائنات پہیلی سہی مگر امجدؔ
سمجھ سکو تو ہر اک حرف اک اشارہ ہے

ان تمام مسائل اور وسائل کے باوجود رحمتِ باری کو پوری طرح سمجھنا محال ہے:

اس کی تشریح کس طرح سے ہو
جس کی امجدؔ کوئی مثال نہیں

کون جانے کہ اس جہاں کا نقش
چشم پروردگار میں کیا تھا؟

ہم کائنات کی نغمگی میں اس کی آواز سُن سکتے ہیں اس کی روشنی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی خوشبو سونگھ سکتے ہیں کیونکہ کائنات میں صرف اللہ ھو ہی ہے۔ امجدؔ کے چند اشعار سُنیے اور سر دُھنیے:

حرف بھی اُسی سے ہے، صَوت بھی اُسی سے ہے
وہ صدائے ''کن'' ہی تو کردگارِ نغمہ ہے

ہے خلا میں بھی گر خدا موجود
کیسے کہیے! کہ ہے خلا موجود

ہے زماں مکاں میں جو گونج سی ترے اسمِ معجزہ ساز کی
یہی وِرد جاری رہے سدا اللہ ھو اللہ ھو
وہ جو ''کُن'' کے حرف کا راز ہے کھلے کیسے مولا کہ اُس گھڑی
نہ زمان تھا نہ مکان تھا نہ کوئی نمو اللہ ھو
کوئی اجنبی سی مہک سی ہے کوئی آشنا سی کسک سی ہے
مری روح جس کی تلاش میں پھرے کو بہ کو اللہ ھو

آخر میں ہم شاعر کے دو شعروں پر یہ مضمون ختم کرتے ہیں:

یہ کائنات سراپا جواب ہے جس کا
وہ اک سوال ہے پھر بھی سوال کے باہر

کیونکہ:

جس کو موجود ہم سمجھتے ہیں
ہے حقیقت میں وہ بھی ناموجود

بقول اولیاء اللہ: لا موجود الا اللہ

حمدوں میں مناجاتی اور دُعائیہ تجلّیات

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حمد میں مناجاتی اور دعائیہ اشعار ہمیشہ کم و زیادہ موجود رہتے ہیں اسی لیے حمد، دعا اور مناجات کو جدا جدا خانوں میں پوری طرح رکھا نہیں جا سکتا۔ دعا اور مناجات میں بندہ معبود سے بخشش، گناہوں کی معافی، مصیبتوں اور مشکلوں سے نجات، طولِ حیات، بیماریوں سے شفا، عزت، آبرو، دولت، نیک توفیقات، صالح اولاد، رزق کی فراوانی، عبادت کی قبولیت، جنّتی لوگوں میں شمولیت وغیرہ مانگتا ہے چنانچہ یہ تمام دینی اور دنیاوی، جسمانی اور روحانی ضروریات کو مانگنا بتا رہا ہے کہ اللہ قادر المطلق ہے اور یہ سب مسائل اسی کے فیض اور حکم سے حل ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حُسنہ میں ان تمام صفات کا ذکر ہے جس کے لیے بندہ اپنی حاجت طلب کر رہا ہے۔ اللہ شافع، توّاب، غفور، کریم رحیم، رزاق، بصیر، خبیر، قادر، حفیظ، سمیع اور علیم بھی ہے چنانچہ ان صفات کا تذکرہ اور ذاتِ اقدس سے مانگنا خود حمد ہے۔ قرآن مجید اور احادیثِ نبوی ﷺ میں دعا مانگنے کی تاکید اور اس کی تہذیب کی تربیت بھی شامل ہے۔

امجد اسلام کی کوئی بھی حمد ایسی نہیں جس میں کم از کم ایک شعر اس موضوع پر موجود نہ ہو، لیکن تقریباً ایک درجن حمدیں ایسی ہیں جن میں مناجاتی اور دعائیہ مضامین کی کثرت ہے اور اسی لیے شاعر نے بعض حمدوں کو مناجات، دعا یا حمدیہ مناجات کا عنوان بھی دیا ہے۔

موضوع اور مطالب کی ہم آہنگی اور مضمون کی طوالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم ان تمام حمدوں اور مناجاتوں اور دعاؤں کو چند عناوین کے تحت بیان کر کے ایک ہی گلدان میں کئی رنگ و بو کے پھولوں کو سجانے کی کوشش کریں گے۔

(ا) فن بڑی حد تک شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ جو لوگ امجد سے واقف ہیں وہ جانتے اور مانتے ہیں کہ ان میں عجز و انکساری اور خاکساری دوسرے شاعروں متشاعروں اور ماہروں کی نسبت بہت زیادہ ہے جو دینی اور دنیاوی لحاظ سے ایک بڑی فضیلت ہے۔ یہ سچ کہ آپ اپنی تعریف کرنا ہر لحاظ سے ناپسندیدہ مکروہ عمل ہے لیکن صرف شریعت شاعری میں یہ نہ صرف مکروہ عمل بلکہ مستحب ہے اور بعض شاعروں نے تو اس کو واجب اور فرض جان کر ہر موقع پر اسے ادا کیا ہے۔ اللہ کی ہی ذات کو یہ زیبا ہے کہ وہ اپنی آپ تعریف کرے اور جتنی بھی کرے کم ہے جیسا کہ خود قرآن، احادیث اور آسمانی صحیفوں سے ظاہر ہے۔ امجد نے اپنی ایک نظم ''سمندر کو دیکھو'' میں لکھا ہے:

تکبّر ہے زیبا فقط اُس خدا کو
جو سارے جہاں کا زمیں آسماں کا

زمان و مکاں اور یقین و گماں کا
ازل سے ہے مالک ابد تک رہے گا

اور اس کی مشیت کے آگے سمندر بھی قطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

تکبّر میں ڈوبا ہوا ہر سمندر
جو دیکھو تو چھوٹی سی اک آبجو ہے

شاید اس صفت کو شاعروں نے اس لیے اپنایا ہے کہ انہیں ''تلمیذ الرحمٰن'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ اسی لیے وہ اس رشتے سے فائدہ اٹھا کر کہتے ہیں یہ شعر میری تخلیق ہے اور ع: مستند ہے مرا فرمایا ہوا

امجد نے اپنے کلام میں بہت کم اس دولت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ حمدوں میں تو عجز و انکساری کی بڑائی قدم قدم پر ان کے کردار کے روشن مینار دکھاتی ہے اور اس کی انتہا مناجات، دعا وغیرہ میں فلک بوس ہے۔ انیسؔ نے صحیح کہا:

انہوں نے ٹھوکریں کھائیں جو سر اٹھا کے چلے
انہی کو اوج ملا جو کہ سر جھکا کے چلے

قرآنی آیات اور احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ خدا بندگی اور عجز کو پسند کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے اس نے دستِ دعا تو بلند کیا ہے لیکن وہ الفاظ کہاں سے لائے جو رب اقدس کے لائق ہوں۔ بس دل میں جو بھی ہے وہی زبان پر جاری ہے۔ امجدؔ کہتے ہیں:

اظہار پر نہ جایئے نیت کو دیکھیے
ہم کو نہیں شعور کہ کیسے دعا کریں

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

تری شان کیسے بیاں کروں
کہ لغت میں جتنے بھی لفظ ہیں تری گرد کو نہیں پا سکے

(ب) امجد کی حمدیہ مناجاتوں اور دعاؤں میں عالی مقاصد پنہاں ہیں۔ وہ اپنے شخصی مسائل میں بھی یا تو مغفرت اور بخشش کی گفتگو کرتے ہیں یا اپنے پیغام کو پہنچانے کے لیے فن کی بالیدگی اور تاثیر کی دعا مانگتے ہیں۔

امجدؔ، کبھی کعبے کے سامنے، کبھی گنبد خضرا میں، کبھی حضورِ اکرم ﷺ کے وسیلے سے اپنی حاجت کو پیش کرتے ہیں:

ہم کتنے خوش نصیب ہیں اس در پہ آئے ہیں
پوری جہاں پہ ہوتی ہے بن مانگے ہر مراد
دیکھو وہ سامنے ہے خزانہ بھرا ہوا
مانگو کہ خود ہے سامنے مالک کھڑا ہوا

ایک مناجات کے آغاز میں کہتے ہیں:

مرے خدا مرے آقائے محترم کے خدا
کرم کہ اب مری سختی معاف ہوجائے

شاعر نے ''مرے آقائے محترم کے خدا'' لکھ کر جس قلبی تعلق اور وابستگی کا والہانہ اظہار کیا ہے وہی رحمتِ حق کو جوش میں لانے کے لیے کافی ہے۔ حدیثِ دل کا اظہار یہاں کسی بناوٹ کے تحت نہیں بلکہ دل کی آواز الفاظ میں بھر دی گئی ہے جو تاثیر کی حامل ہے۔

بنامِ رُوحِ محمد ﷺ اب آسرا دے دے
ہمارے نقشہ اعمال کی طرف مت دیکھ
بس اس بھنور سے نکلنے کا راستہ دے دے

حضورِ ختمی مرتبت ﷺ سے وسیلہ برصغیر کی مناجات کی تہذیب، ترتیب اور تطہیر سمجھی جاتی ہے جو قبولیت کی ضامن ہے ورنہ بقول امجدؔ:

ہر اک دعا کے مقدر میں کب حضوری ہے
تمام غنچے تو امجدؔ کھلا نہیں کرتے

امجدؔ نے بھی نظم کے آخری حصے میں ''بنامِ رُوحِ محمد ﷺ'' کہہ کر دفترِ اعمال پر نظر نہ کرنے کی دعا مانگی ہے اور نیک راستے کی توفیقات چاہی ہیں۔ یہاں ہمیں علامہ اقبالؔ کے دعائیہ اشعار کی یاد آ رہی ہے۔ اقبالؔ نے کہا تھا مرے مالک اگر تو مرے اعمال دیکھے بھی تو۔

ع: از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر (اقبالؔ)

ہر بڑے شاعر نے اپنے کلام کی مقبولیت اور دوام کے ساتھ ساتھ شاعری کے نزول یعنی آمد کی دعا مانگی ہے۔ انیسؔ فرماتے ہیں۔

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر
اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن مرے قلمرو سے نہ جائے

علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں:

یارب دورنِ سینہ دل باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آن نظر بدہ
سیل ام مرا بجوی تنگ مایۂ مپیچ
جولانگہی بوادی و کوہ و کمر بدہ

یارب مجھے باخبر دل عطا کر تا کہ میں شراب میں پوشیدہ نشے کو دیکھ سکوں، میرے خیالات کے طوفان کو چھوٹی نہروں میں مت بہا۔ بلکہ اس کو دشت، کوہسار اور وادیوں میں بکھیر دے۔

امجدؔ نے بھی اپنے فن و ہنر کے لیے دعائیہ اشعار ''تم سچے برحق سائیں'' میں مانگے ہیں۔ فکر و خیال، راز و رموز، اسرا اور افکار کی طلب ''سچے برحق سائیں'' قلبی رُوداد ہے ہم کچھ مصرعے یہاں جوڑتے ہیں۔

اس بہتی ریت کے دریا پار
کیا جانے ہیں کیا کیا اسرار
تم آقا چاروں طرفوں کے
اور میرے چار طرف دیوار
کچھ بھید ازل سے پہلے کا
کچھ راز ابد کی آنکھوں کے
بس ایک نظر سے جڑ جائے
آئینہ میری ہستی کا
میں ایک بھکاری لفظوں کا
یہ کاغذ ہیں کشکول مرے
ہیں ملبہ زخمی خوابوں کا
یہ رستہ بھٹکے بول مرے
یہ ارض و سما کی پہنائی
یہ میری ادھوری بینائی
مانگوں ایک جھلک سائیں
تم سچے برحق سائیں

شاعر کے فن میں اس کی شخصیت اور حیات کے دلکش اور دردناک حالات ہر لمحہ رقم ہوتے رہتے ہیں۔ ''میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی'' میں بچے کی ہنسی کی کیفیت راحت اور روح کی تسکین بتا کر شاعر کہتا ہے۔

اے مالک اے ارض و سما کو چٹکی میں بھر لینے والے
میرا سب کچھ مجھ سے لے لے
لیکن جب تک
اس آکاش پہ تارے جلتے بجھتے ہیں
میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی
اے دنیا کے رب

بچے کی معصوم ہنسی سے زیادہ پیاری شئے
کیا کوئی ہے؟

امجدؔ اپنی غزلوں اور بعض نظموں میں دعائیہ اشعار ایسے سجا دیتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ وہ سب سے پہلے اپنی ذات کے اسرار سے واقف ہونا چاہتے ہیں تا کہ علم و آگہی کی روشنی اپنے کلام میں بکھیر سکیں۔

کھلے اسرار سب ارض و سما کے
بس اپنی ذات باقی رہ گئی ہے

مجھے آگہی کا چراغ دے مجھے روشنی کا سراغ دے
مرے ہاتھ سے کہیں کھوگئی ترے شہرِ علم کی کنجیاں
درِ کائنات جو وا کرے اُسی آگہی کی تلاش ہے
مجھے روشنی کی تلاش تھی مجھے روشنی کی تلاش ہے

شاعری فکر و دید کا کرشمہ ہے اور یہ سعادت بازو کے زور اور آنکھوں کی بصارت سے نہیں بلکہ الہامی توفیقات اور دلوں کی بصیرت سے حاصل ہوتی ہے اسی لیے امجدؔ نے فن کی معجز بیانی کے لیے دعا کی ہے۔

جو سوچتا ہوں اس پہ مجھے اختیار دے
جو دیکھتا ہوں اُس پہ مجھے اعتبار دے
مولا ترے کرم سے رہے ان میں روشنی
آنکھوں کو چین اور دلوں کو قرار دے
امجدؔ ہے اب بھی وقت یہ پس ماندہ زندگی
یادِ خدا میں عشقِ نبی ﷺ میں گزار دے

میں امجدؔ سے کہوں گا کہ تم اردو شاعری کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہو جنھوں نے حمد اور نعت کے گلشن سے اپنے ریاضِ سخن کو رنگین اور عطر آگیں کیا ہے۔ حمد اور نعت کی آمیزش اس ماہیے میں دیکھیے۔

دو گونہ عطا مانگی
کعبے کی طرف دیکھا
روضے پہ دعا مانگی

ایک اور دعا میں شاعر نے حرم میں نماز کا لطف اور مسجد نبوی ﷺ میں عبادت کا سکون قسمت والوں کی خوش بختی بتایا ہے۔ بڑی شاعری کا مقصد داخلی تجربات کو لفظوں میں ڈھال کر سننے اور پڑھنے والے کے دل میں وہی کیفیت کا پیدا کرنا ہے۔

یوں تو وہی نماز ہے دنیا میں ہر جگہ
لیکن حرم میں پڑھیے تو کچھ اور بات ہے

یوں تو تمام لفظ وہی ہیں اذان کے
لیکن حرم میں سنیے تو کچھ اور بات ہے
ایسا کہیں جہان میں پایا نہیں سکوں
ملتا ہے وہ جو مسجدِ نبوی ﷺ میں بیٹھ کر

امجدؔ اللہ کے کرم اور رحم کے علاوہ اس کے فضل کا بھی شکر گزار ہے۔ انسان مہد سے لحد تک ہر قدم پر معبود کے کرم، رحم، فضل کا محتاج ہے۔ اگر انسان اپنا خود محاسبہ کرے تو معلوم ہوگا کہ یہ مُشتِ خاک کی ترقی اور کامیابی سب کچھ اُسی کا دین ہے۔ شکر درحقیقت اللہ کے الطاف کا اقرار ہے جس سے اُس کے لطف میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ ہم سب بخوبی واقف ہیں کہ امجد اسلام امجد کو قدرت نے ہر طرح سے نوازا اور عزت و احترام سے مالا مال کیا ہے جس کے لیے وہ با آواز بلند کہہ سکتے ہیں کہ ''ھذا من فضل ربی'' اسی قرآنی آیت کی ذیل میں اشعار میں ''تو نے کیا'' کی ردیف سے ترجمانی کی ہے۔ اشعار کی خوبصورتی یہ بھی ہے کہ سوائے ایک آدھ شعر تمام اشعار ہر وہ شخص جو قلبِ سلیم رکھتا ہے اپنے آپ پر منطبق کر سکتا ہے۔

ع: جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

یعنی اللہ نے خزاں کو بہار، ڈولتے کو استوار، سینے کو رازدار، ریگ کو کوہسار، صحرا کو مرغزار اور امجد کو شاعر ذی وقار کر دیا۔ قافیوں کا استفادہ بہت عمدہ ہے جو ردیف میں کھپ گئے ہیں اور معانی کے اثر کو چند برابر کر رہے ہیں۔ کئی مقامات پر صنعت تضاد کے ساتھ ساتھ مراعات النظیر کا بھی خیال رکھا گیا ہے جو امجدؔ کی زبان اور بیان پر مہارت کا ثبوت ہے۔ چند مصرعوں کو جوڑ کر یہاں نفسِ مضمون نکھارا جا رہا ہے۔

خزاں کی شام کو صبحِ بہار تُو نے کیا (تضاد=خزاں۔ بہار، شام۔ صبح)
میں یونہی خاک کی پستی میں ڈولتا رہتا (تضاد= ڈولتا۔ استوار)
ترا کرم کہ مجھے استوار تُو نے کیا
مرے لہو میں رکھے اپنی خلوتوں کے راز
پھر اس کے بعد مجھے بے قرار تُو نے کیا
میں ایک ذرۂ ریگ رواں تھا صحرا میں
مجھے ثبات دیا، کہسار تُو نے کیا (تضاد= ذرہ=کوہسار)
(مراعات النظیر = ریگ، صحرا، کہسار، ذرّہ)
خطا کے بعد خطا پے بہ پے ہوئی مجھ سے
معاف مجھ کو مگر بار بار تُو نے کیا (تضاد= خطا، معاف کرنا)
(تکرار= خطا، پے، بار)
چلا جو میں ترے رستے پہ میرے صحرا کو (تضاد=صحرا، مرغزار)
امنڈتے اَبر دیئے، مرغزار تُو نے کیا

یہاں شاعر قرآنی آیت کے مضمون سے بھی فائدہ اٹھا رہا ہے کہ جو دعا ہر نمازی کرتا ہے اس راستے پر چلا جس پر تو نے نعمتیں نازل کی ہیں، شاعر کہہ رہا ہے صراطِ مستقیم پر میں چلا تو صحرا گلشن میں تبدیل ہوا، تیرے لطف و کرم سے۔ اس کے مقطع میں شاعر یقین سے اقرار کر رہا ہے:

مرے قلم پہ ہوئی جس گھڑی نظر تیری
مرے سخن کو، مجھے ذی وقار تو نے کیا

(ج) اردو کی کلاسیک اور روایتی حمد میں اللہ کے اوصاف اور اس کی عظمت و بخشش کا اقرار تھا۔ باقاعدہ طور پر حالیؔ اور پھر اقبالؔ نے مناجاتی اور دعائیہ مضامین عوام اور قوم کی نسبت سے لکھنا شروع کیے اور اقبال نے انہیں نیا رخ بھی دیا۔ امجدؔ نے بھی اللہ تعالیٰ کی نسبت سے جو رزاق ہے ہماری دنیا اور معاشرے کے بھوکوں کی حمایت اور وکالت کرتے ہوئے اُس خدائے برتر سے جو ایسا رزاق ہے بقول صفیؔ ع: ''صفی پتھر کے کیڑے کو غذا ملتی ہے پتھر سے'' سوال کیا ہے کہ ان بھوکوں کا کیا قصور ہے؟

تو ایسا رازِق ہے
جس کے دستِ عطا سے پتھر میں بند کیڑے کی زندگی ہے
تری توجہ کے خواب قریے میں جی رہے ہیں
جہاں کروڑوں سیاہ پیلے نحیف بچے
شکم کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں
اور اپنی سہمی اُداس ماؤں
کے خشک سینوں سے بھوک پیتے ہیں
خدائے برتر
مجھے بتا ان گرسنہ نسلوں کا جرم کیا ہے؟

اللہ کا شکر ادا کرنا بڑی عبادت ہے۔ بندگی کی معراج بندہ پرور کا شکر ہے۔ اسی لیے ہر موقع پر ''الحمد للہ'' کا ورد کرنے کی تاکید اور تلقین ہے۔ انسان کا اس دنیا میں پیدا ہونا دنیا کی سب سے بڑی قرعہ اندازی یعنی لاٹری ہے اور ہر سانس کا شکریہ لازمی ہے۔ تمام دنیا کی نعمتیں انسان کے اختیار میں اس شکر کو مزید تقویت دیتی ہیں۔ مولانا رومؔ نے کہا تھا کہ اگر نعمت کا شکر کریں نعمت میں اضافہ ہوتا ہے اور اگر شکر نہ کریں تو نعمت ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔

شکر نعمت ، نعمت ات افزوں کند
کفر نعمت نعمت ات بیروں کند

ہم نہ صرف شکر نہیں کرتے بلکہ شکوہ کرتے ہیں۔ بقول انیسؔ:

نعمت خدا نے دی تو کیا تو نے شکر کب
ایذا بھی چار دن ہو تو شکوہ نہ چاہیے

امجدؔ کہتے ہیں اللہ نے ہمیں اتنا عطا کیا، اتنا کرم و بخشش کی کہ شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم پر ایک دورازہ بند ہوا تو اس نے سو دروازے کھولے۔ اس حمدیہ مناجات میں عطا کرم بخشش اور شکر کے شاعرانہ رنگ اور ڈھنگ کو دیکھیے۔ امجدؔ نے کس عمدگی، سادگی اور صداقت سے روزمرہ اور محاوروں سے جذبوں کو نظم کیا جو ملٹن کے قول کے مطابق فطری شاعری ہے۔

مولا ترے کرم کے طریقے ہیں بے شمار
تری عطا کا اپنا ہی کچھ رنگ ڈھنگ ہے
بخشش پہ جب تو آئے تو دیتا ہے بے حساب
اور ایسے بھیجتا ہے دعاؤں کا تو جواب
تری عطا کا شکر کرے کس طرح ادا
گرہیں سی پڑنے لگتی ہیں اس کی زبان میں
ناشکرے پن کی آخری حد سے گزر گئے
وہ زندہ ہم ہیں جو کہیں اندر سے مر گئے

(و) امجدؔ کی مناجاتوں اور دعاؤں میں اپنی خاک اور اپنے قومی درد کی ترجیح تو ہے لیکن تفریق نہیں۔ وہ تمام قوموں کے محرومین اور مظلومین افراد کی بات کرتے ہیں اور ہر شخص کو اپنا وطن اور اپنا دین عزیز ہے جو ایک طبعی کیفیت ہے۔ اسی لیے امجدؔ کے کلام میں دوسری قوموں کے شعرا کی نظموں کے تراجم بھی شامل ہیں جو رنگ و نسل کی بنا پر دوسروں سے علاحدہ کر دیے گئے تھے۔

حدیثِ پیغمبرِ اکرم ﷺ ہے ''تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ اس میں سب سے زیادہ محبوب وہی ہے جو اس کی مخلوق کے لیے نفع بخش و فیض رساں ہو۔ اسی لیے تو سعدیؔ نے کہا تھا:

بنی آدم اعضائے یک دیگرند
کہ در آفرینش زیک جوہرند

اسی لیے تو حضرت معین الدین چشتیؒ فرماتے ہیں کہ ''وہ شخص اللہ کا دوست ہے جس میں دریا کی سخاوت، سورج کی شفقت اور زمین کی تواضع ہو۔ یعنی وہ حضور ﷺ کی حدیث کو دوسرے الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ ''لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔

اس کی کتاب سے بھی جو اُس کے وجود سے بھی جو
ان سے بھی نہیں ٹوٹتا خدا کا سلسلہ

اس روشنی میں جہاں میں کوئی بیگانہ نہیں امجدؔ کے اشعار سنیے!

چاروں طرف رواں دواں اُس کی عطا کا سلسلہ
دنیا کے ہر بشر سے ہے جاری خدا کا سلسلہ
کوئی بھی نسل و رنگ ہو کوئی زبان و قوم ہو
قائم ہے سب سے ایک سا جُود و سخا کا سلسلہ

(ھ) امجدؔ کی مناجاتوں اور دعاؤں کا ایک جذباتی اور احساسی پہلو ان کی وطن دوستی، وطن پرستی اور وطن کے ستم رسیدہ غریب اور محروم لوگوں سے ہے۔ جیسا کہ میرؔ نے کہا تھا:

شعر مرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

امجدؔ کہتے ہیں:

عوام سے ہے ہمیں گفتگو، خواص سے بھی
ہماری بات ہے سب سے بھی اور سب سے نہیں

امجدؔ کے کلام کو ہر طبقے کے افراد پسند کرتے ہیں لیکن امجدؔ دراصل عوامی شاعر ہیں۔ امجدؔ کے ڈراموں میں ملک کی جاگیردارانہ ذہنیت پر کھل کر اظہار ہو چکا ہے۔ اسی لیے وہ بہت مقبول ہوئے۔ جہاں امجدؔ نے ملک کے غیر منصفانہ مسائل کے خلاف احتجاج کیا ہے اپنی قلبی وارداتوں میں خدائے برتر سے اس مہم میں لوگوں کی مدد کی دعا بھی کی ہے۔ ذیل کے اشعار کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ امجدؔ کے دل میں ملک اور اس کے محروم اور بے کس افراد کا کتنا درد ہے۔

مولا مرے وطن پہ بھی رحمت کی ہو نظر
مٹی وطن کی بیچنے والے ہیں ہر طرف
مسجد ہے ایسی جس میں کہ جالے ہیں ہر طرف
چاروں طرف ہے رات سی کچھ سُوجھتا نہیں
وہ بے کسی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں
دستِ دعا کے کاسے میں کچھ بھیک ڈال دے
اس شب کو اپنے فضل و کرم سے اُجال دے

امجدؔ دعا میں اپنے پیکرِ خواب اور آنکھوں کو کائناتی مسائل سے جوڑ کر حضورِ الٰہی میں استغاثہ پیش کرتے ہیں۔

مولا، اس بستی کی آنکھیں کب تک سپنے دیکھیں
ایسا بھی اک سورج جس میں چہرے اپنے دیکھیں
ہر موسم میں پچھلی رت کے زخم چلے ہیں ساتھ
ان زخموں کی خوشبو میں ہیں جینے کے ارمان
آٹھ کروڑ انسان

اللہ کے در اور اس کی عطا اور جود و سخا کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں، اسی لیے مقطع میں بندگی سے سرشار شعر رکھ دیا گیا ہے۔

ترے عرشوں سے اب ہم پر بُہن برسے یا کال
مولا ہم بے نام پرندے کیسے چھوڑیں ڈال

ایک اور جگہ وطن کے بارے میں کہتے ہیں:

غربت کے مبتلا بہت، دولت کے ہیں مریض کچھ
دونوں کے واسطے کوئی اب ہو شفا کا سلسلہ
مولا مرے وطن پہ کیوں شامِ فرات رک گئی
ختم بھی ہو کہیں یہ اب کرب و بلا کا سلسلہ

یہاں شامِ فرات تلمیح ہے۔ یہ شامِ غریباں جو خانوادۂ نبی اکرم ﷺ پر درد و رنج، ظلم و جور اور غم و زخم سے بھری شام تھی۔ شاعر ایک مناجات میں کہتا ہے جس میں اس نے نبی کریم ﷺ کے وسیلے سے دعائیں کی ہیں یہاں دعا کا محور وطن اور اہلِ وطن ہیں اور اس کے وہ پُرآشوب حالات جس سے شاعر کا جینا دوسرے افراد کی طرح مشکل ہو چکا ہے۔ ہم اس مناجات کے چند مصرعے یہاں جوڑ کر مطلب کو پورا کرتے ہیں۔

وہ جس میں درج ہے احوال عہدِ رفتہ کا
اب اُس کتاب کے صفحے بکھرتے جاتے ہیں
مرے وطن کے بغیچے اجڑتے جاتے ہیں
قدم قدم پہ زمانہ ہنسی اڑاتا ہے
خود اپنے عکس سے اب مجھ کو خوف آتا ہے
اب اختلاف کی برداشت ہی نہیں باقی
مکالمے کی روایت نہیں کہیں باقی
مرے خدا مرے آقائے محترم ﷺ کے خدا
رہیں گے ہم اسی پستی میں بے نشاں کب تک

اسی وطن کے حالات کو مضمون بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

بے چارگی کا رزق ہوئی آبروے دل
ہم کو ہمارا کھویا ہوا افتخار دے
یہ ناتواں سفینہ کہیں ڈوب ہی نہ جائے
اس پر نگاہ کر سرِ ساحل اتار دے
دنیا میں آئینہ ہے یہ تیرے جمال کا
میرے وطن کی زلفِ پریشاں سنوار دے
اے خدا، اے مرے ہنر کے خدا
اور کچھ میری احتیاج نہیں

بستیوں کو نہ پستیوں میں رکھ
التجا ہے یہ احتجاج نہیں

بڑی شاعری کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دور کی ترجمانی کرتی ہے۔ امجدؔ ملک میں نام نہاد جہادیوں کی دہشت گری سے نالاں ہیں اور اس کو طنزیہ طور پر پوچھتے ہیں یہ کون سا جہاد ہے جو صدر اسلام سے آج تک اس طرح کی ناحق خوں ریزی کا باعث بنا جس میں بے شمار معصوم لوگ شہید ہوئے اور ہزاروں گھر بے چراغ ہو گئے۔ امجدؔ نے اس نظم کا عنوان مناجات رکھا ہے۔ ایسی نظمیں اردو شاعری میں خال خال ہیں اس کے لیے جرأتِ رندانہ کردار اور قوتِ ایمان درکار ہے۔ ہم کچھ مربوط مصرعوں کو جوڑ کر مطلب کو یہاں پیش کرتے ہیں۔

کرتے ہیں خود کشی کا یہ پہلے تو فیصلہ
اور اپنے ساتھ کرتے ہیں معصوم و بے گناہ
کھیلیں ہیں یہ جو ہولیاں لوگوں کے خون سے
کتنے گھروں کے دیپ بجھے اس جنون سے
بچے ذرا ذرا سے گلے کاٹتے ہیں یوں
جیسے کوئی مذاق ہو انسانیت کا خوں
کرتے ہیں ترے نام پہ سارا یہ کاروبار
اسلام کو بنادیا دہشت کا اشتہار
یہ کون سا جہاد ہے، اے رب کردگار

پھر دعا کرتے ہیں:

آنکھوں پہ ان کی جتنے ہیں پردے وہ سب اتار
کر ان پہ تو جہاد کے مطلب کو آشکار

امجدؔ مذہب نما متعصبوں اور ریاکاروں کے لیے بھی طنزیہ اشعار لکھتے ہیں جو ایک حقیقی فطری شاعر کی شناخت ہے بقول مولانا:

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(طریقت سوائے بندوں کی خدمت کچھ اور نہیں یہ تسبیح، مصلیٰ اور گدڑی سے نہیں)

امجد کہتے ہیں:

دن میں جلے چراغ تو کیا اس کی روشنی
لالچ ہو جس نماز میں اس کا ثواب کیا
نیت کو دیکھتا ہے وہ تسبیح کو نہیں
کرتے ہو اٹھتے بیٹھتے تم یہ حساب کیا

(و) امجدؔ اپنی ایک نظم ''جہاں ہم ہیں'' میں مذہبی اقدار کی بے ارزش اور مختلف فرقوں کے لوگوں کے ایجنڈوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

جہاں ہم ہیں
وہاں پر مسجدوں میں دین کی تعلیم پیچھے
اور اس مسجد کا مسلک آگے رہتا ہے
نبی ﷺ کے پاک منبر سے
دعا اور التجا کی اک مسلسل گڑگڑاہٹ کے سوا کچھ بھی
سنائی اب نہیں دیتا
کہ سارے مسلکوں کو غیر ملکوں سے ملے چندے
اور ان کی بے ثمر کج بحثیوں نے گھیر رکھا ہے
عمل اور علم دونوں کو یہ شاید دین سے باہر سمجھتے ہیں

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ امجدؔ اپنی نظموں اور غزلوں میں دعائیہ اشعار اشاروں میں بڑے عمدہ طریقے سے نظم کرتے ہیں۔ ذیل کی نظم ''بارِ الٰہا'' میں حالاتِ حاضرہ کو ایک دردناک طویل ڈرامہ بنا کر پوچھتے ہیں۔ آنکھیں ان تکراری مناظر کو دیکھتے ہوئے تھک گئی ہیں، کردار بات نہیں کرتے، کہانی رک گئی ہے۔ آخر کب تک مرے مولا یہ تماشا ختم ہوگا۔

اب تو دونوں تھک سے گئے ہیں
آنکھیں بھی اور منظر بھی
ایک جگہ پر آ کر سب سے
کرداروں کو چپ سی لگی ہے
اپنے اپنے جملے سب کو بھول چکے ہیں
اور کہانی رُک سی گئی ہے
پردہ آخر کیوں نہیں گرتا
کس دم ہوگا
بارِ الٰہا
ختم تماشا

امجدؔ نے ارضِ وطن کی محبت میں گیت بھی لکھے:

ارضِ وطن کی دید سا مرہم نہیں کوئی
اس قایدِ بہار سا پرچم نہیں کوئی
اُس ربِ دوجہان کی زندہ عطا ہے یہ
یعنی رسول پاک ﷺ کی روشن دعا ہے یہ

(ز) امجدؔ کی دُعائیہ نظم کا انوکھا درپن یہ بھی ہے کہ پوری نظم میں ایک مقام پر اللہ اس کے صفات، اسمائے حسنہ، آیات قرآن یا احادیث نبوی ﷺ کو لکھے بغیر مسلسل دعا کو مناجات کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ یہ عمل قادر الکلام شاعر کی بڑی شاعری کی دلیل ہے۔ امجدؔ کی نظم ''یہ جو وقت ہے مرے شہر پر'' کے آغاز میں شاعر کہتا ہے:

یہ جو وقت ہے مرے شہر پر کئی موسموں سے رکا ہوا
اسے اذن دے کہ سفر کرے
اسے حکم دے کہ یہ چل پڑے مرے آسمان سے دور ہو
یہ جو ''ہست'' ہے مرے چار سو، کوئی معجزہ کہ یہ ''بود'' ہو

پھر شاعر کہتا ہے خواب دھواں ہو گئے، کتاب کی روشنی ختم ہو گئی، آگ جو سینے کو گرم رکھتی تھی بجھ گئی، یقین گماں میں بدل گئے، نگاہیں منجمد ہو گئیں اس لیے!

مرے دشتِ ریگ ملال کو کسی خوش خبر کا غزال دے
وہ جو صبحِ نو کا نقیب ہو مری سمت اس کو اُچھال دے

(ح) امجدؔ نے اپنی ایک طولانی حمد یہ نظم میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ اللہ سمیع اور علیم ہے۔ وہ دلوں کے بھید جانتا ہے۔ دعائیں ہونٹوں پر آنے سے پہلے وہ ان سے واقف ہے تو پھر دعاؤں کی تاکید اور وہ بھی عجز و انکساری اور گریہ وزاری کے ساتھ کیوں ہو۔ یہ سچ ہے کہ بعض دعائیں مانگنے سے پہلے مستجاب ہو جاتی ہیں۔ دعا دراصل سوال اور طلب ہے حضوری باری تعالیٰ میں۔ میر انیسؔ نے انہی نکتوں پر یہ اشعار رقم کیے ہیں:

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں پہ نہیں حاجتِ سوال مجھے
کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں
مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

شاعر یہاں کہتا ہے کہ یہ مسئلہ میرے لیے تب حل ہوا جب:

میں پہلی مرتبہ داخل ہوا تھا صحنِ کعبہ میں
کسی نادیدہ دستِ مہرباں نے میرے شانے کو
بڑی شفقت سے تھپکا ہو
اور اک رحمت بھری آواز نے کانوں میں رس گھولا
مرے بندے
دعا وہ راستہ ہے جو تجھے مجھ سے ملاتا ہے
دعا میں سب کی سُنتا ہوں کہ سب مخلوق ہے میری
مگر تیری دعاؤں کو میسّر یہ فضیلت ہے

کہ ان کو اُس مرے محبوب کے ہونٹوں سے نسبت ہے
دعا میرے محمد ﷺ کی بہت مرغوب سنّت ہے
دعا میری نہیں بندے دعا تیری ضرورت ہے

یقیناً دعا ایسی ہو جو حضور ﷺ کی دعاؤں سے خوشبو لے کر گلزار احدیت میں پہنچے۔ علامہ اقبال نے اسی لیے کہا تھا:

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

دعا ہر مقام پر اور ہر قوم کا غیبی سہارا ہے۔ امجدؔ نے دنیا بھر کے دانش پاروں پر مبنی مختصر نظموں میں ایک مختصر نظم میں وہی مطلب ادا کیا ہے جو اقبال نے اپنے شاہکار شعر میں پیش کیا ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

امجدؔ لکھتے ہیں:

اپنے رب سے نہیں آج مانگے گا جو
جان لو تم کہ کل
سب سے مانگے گا وہ

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

خدا سے جو نہیں مانگے وہ سب سے مانگتا ہے
یہ راز ہم پہ کھلا آگہی کے رستے سے

(ط) امجدؔ نے حضرت عیسیٰؑ کی ایک دعا(O God forgive them for they know not) کو چھوٹی سی نظم میں دعائیہ انداز میں ترجمہ کیا ہے:

اے خدا اے خدا!
اے رحیم و کریم و سخی اے خدا
ان کو ہر اک خطا کی معافی ملے
کہ درست اور غلط میں کہاں فرق ہے
اور کیا فرق ہے!
یہ نہیں جانتے۔ یہ نہیں جانتے

ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ امجدؔ دعائیہ لہجہ اور اس کی تاثیری وسعت کو نظم کے عنوان سے جوڑ دیتے ہیں۔ امجدؔ کی ایک احساساتی نظم ''ماں'' ان کی والدہ کے انتقال پر ہے۔ اس طویل نظم میں دعا کے کچھ پہلو سوز و گداز کے ساتھ روشنی بکھیر رہے ہیں۔ کچھ مصرعوں کو جوڑ کر دستِ دعا بناتے ہیں:

وہ جو اک دعا کا چراغ سا مرے راستوں میں جلا رہا
وہ بکھر گیا
وہ جو ایک دعائے سکون تھی مرے رخت میں
وہی کھو گئی
اے خدائے واحد و لم یزل
تری دین ہے، ترا مال ہے
مجھے ہے تو اتنا ملال ہے
کہ جب اُس کی ساعت آخری سرِ راہ تھی
میں وہاں نہ تھا
مری التجا ہے تو بس یہی
مری زندگی کا جو وقت ہے کٹے اس کی اُجلی دعاؤں میں
تری بخششوں کے دیار میں
مری ماں کی روح جمیل کو
سدا رکھنا اپنے جوار میں

(ی) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ (سورہ انعام: ۵۲)

آپ ﷺ ان لوگوں کو مت دھتکاریے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں اور اس کی رضامندی کے خواہاں ہیں۔

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی (سورہ الکہف: ۲۸)

آپ ﷺ ان لوگوں کے ساتھ صبر اختیار کیجیے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں۔

دعا کیا ہے۔ اللہ کو پکارنا ہے۔ امجدؔ نے ایک نظم ''پھر پکاریں اسے'' لکھی کہ آج کے دور کے میڈیا اور موجودہ نسل کے مسائل اور وسائل سے اُس خدائے برتر کو آواز دیں۔

زخم کھاتے ہوئے مسکراتے ہوئے
زیرِ لب حمدیہ گیت گاتے ہوئے
وہ جو کہتا ہے میں ہر جگہ ہوں، چلو آج دیکھیں اسے
اس قدر زور سے اس کو آواز دیں
اس کو اخبار کے ہر ورق پر جلی سرخیوں سے لکھیں
ریڈیو اور ٹی وی پہ اس سے کہیں
تم جہاں پر بھی ہو لوٹ آؤ، اگر تم نہ آئے

تو سجدوں کی بیمار بوڑھی روایت بکھر جائے گی
تمہارے بنا روشنی اپنے سائے سے ڈر جائے گی

(ک) یہ سچ ہے نعمتوں کا شکر، نعمت زیادہ کرتا ہے امجدؔ نے ایک نجی نظم میں اپنے والدین اور اپنے اہل وعیال کی پُررونق زندگی کا شکر ادا کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کا فضل ہے۔ ہم کچھ مصرعوں کو جوڑ کر یہاں شکردان بناتے ہیں۔

شکر اس رحمتِ ربّ کا ہو جتنا کم ہے
مستقل لطف و عنایات و کرم کی بارش
مرے ماں باپ پہ مجھ پر مری اولاد پہ ہے
بے کراں سی کوئی رحمت ہے مرے چاروں طرف
مشکلیں لاکھ ہوں رکتا نہیں رستہ میرا
جیسے اک ہاتھ مسلسل مری امداد پہ ہے

(ل) امجدؔ نظم میں موضوع اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ امجدؔ کی شاعری میں رزق کا پیکر درجنوں طریقوں سے مصرف ہوا ہے۔ ایک نظم ''سبق'' میں بتاتے ہیں کہ بہت سی قومیں اس دنیا میں ایسی تباہ و تاراج ہوئیں کہ مشکل سے ان کا نام و نشاں کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ وہ قومیں تھیں جن کے فیصلے دوسرے لوگ کرتے تھے۔ اس نظم کے آخر میں دعا کرتے ہیں:

سروں کو اپنے جھکاتے ہیں اس دعا کے ساتھ
خدا کرے یہ عبادت قبول ہو جائے
فنا کا رزق بنی ہیں جو بے نشاں قومیں
ہماری راہ بھی ان کی ہی رہگزر تو نہیں
وہ جس میں رہتی ہے منزل سراب کی صورت
ہمارے سامنے پھر سے وہی سفر تو نہیں

عمدہ شاعری کا پہلا زینہ مفہوم و مطالب کا ابلاغ ہے جو یہاں روزمرہ کی شکل میں ایسے موجود ہے جیسے کوئی بات کر رہا ہے۔ اگر نظم کے مصرعوں کو تنقیدی میزان پر تولیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں رزق کی نادر پیکر تراشی، منزل سراب کی صورت کی خوب فہم تشبیہ کے علاوہ مراعات النظیر یا ایک ہی مضمون سے رشتے رکھنے والے الفاظ کا اژدھام ہے۔ جیسے سروں، جھکا، عبادت خدا، قبول کے ساتھ راہ رہگزار منزل سفر کے علاوہ فنا، بے نشاں وغیرہ ہیں۔

(م) امجدؔ نے گیتوں میں بھی بعض گیت اور بعض اشعار مناجاتی اور دعائیہ کہے ہیں۔ ان گیتوں میں رحمت کو جلال میں لانے کے لیے اللہ کے صفات سے فائدہ اٹھا کر سوالات کا استغاثہ کیا ہے۔

مولا تُو تو سب کا رب ہے

جو بھی کچھ ہے اس دنیا میں
تیرے حکم سے باہر کب ہے
پھر یہ کیا اندھیر ہے مولا
اتنی لمبی دیر ہے مولا
پانی سے سستا ہے خون
اندھا بہرا ہے قانون
زر یا زور نہیں جس پلّے
وہ بے چارا کس در جائے

ایک اور گیت میں علم کی اہمیت، عظمت اور اس کے حصول کی دعا کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ تمام گیت خدا، علم، زندگی اور روشنی کے پیکروں سے بنایا گیا ہے تکرار نے مفہوم کو بہت گہرا رنگ اور نغمگی کو غنایت دے کر گیت کو غنی کر دیا ہے۔ کچھ مصرعوں اور فقروں کو ہم یہاں جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔

اے خدا اے خدا
روشنی ہو عطا
جس سے پیدا ہوئی
ہر کوئی روشنی
علم ہے راہبر علم ہے راہنما
میرے رب نے کہا علم کے واسطے
اس زمیں پر جہاں تک بھی جانا پڑے
تم نہ ہرگز رکو
علم ہے زندگی علم ہے آگہی
روشنی روشنی روشنی روشنی

(ن) امجدؔ پنجابی قدیم شعرا سے مانوس اور متاثر ہیں۔ ایک نظم ''علموں بس کریں او یار'' بابا بلھے شاہ کی کافی سے لیا گیا ہے۔ یہاں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ علم بغیر عمل کے الم ہے۔ (مصرعوں کو جوڑ کر نظم کا کچھ مفہوم پیش کرتے ہیں)

اے خدا
میرے چشموں سے ریگِ رواں کے یہ خیمے ہٹا
ان کو پانی سے بھر
میرے پیڑوں کو سایہ کی توفیق دے
میرے اونٹوں کے لب پیاس سے خشک ہیں

میری ایڑی کو بھی کوئی چشمہ جگانے کا اعجاز دے
میرے بے صوت لفظوں کو آواز دے
مجھے علم کے اس جہنم سے آزاد کر

(س) امجدؔ کے چند تعلّی نما اشعار جن میں مناجاتی اور شکروی رنگ وخوشبو شامل ہے اور جو ان کے کلام میں کہیں کہیں ملتے ہیں ہم یہاں ان پھولوں سے گلدستہ بناتے ہیں۔

مرے فن سے پھیلے جو روشنی
اسے پھر کبھی نہ زوال دے

حرف یوں شعر میں دمکیں امجدؔ
رشک سے اہل زباں تک دیکھیں
شہرِ سخن میں ایسا کچھ کر عزّت بن جائے
سب کچھ مٹی ہوجاتا ہے عزّت رہتی ہے

علامہ اقبالؔ نے کعبے اور عبد معبود کے ذیل میں کہا تھا کہ ہمارے (عبد) اور معبود کے گھر کے درمیان جو رموز کا راستہ اور تعلق ہے اس سے جبریل امین بھی بے خبر ہیں:

میان ما و بیت اللہ رمز است
کہ جبریل امیں ہم را خبر نیست

امجدؔ نے اسی تعلق اور عبد و معبود کے رشتے کو یوں بیان کیا ہے:

اور جو کچھ ہے واہمہ ہے بس
ایک میں اک مرا خدا ہے بس
میرے اور اس کے درمیاں امجدؔ
ایک لمحے کا فاصلہ ہے بس

قرآن کہتا ہے۔ اللہ شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

وہ جو کائنات کا نور تھا نہیں دور تھا
مگر اپنے قرب و جوار میں اُسے دیکھتے

امجدؔ نے انسانوں کی عظمت بتائی ہے۔ امجدؔ، سخن کی ارزش اور اس کی بالیدگی کے قائل ہیں۔ وہ پاسبانِ حرمتِ حرمِ سخن ہیں۔ کیونکہ جانتے ہیں یہی شاعر کو ابدی زندگی دیتا ہے۔ جیسا کہ ذوقؔ نے کہا تھا:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے رہے یہی دو پشت چار پشت

امجدؔ کہتے ہیں:

روشن اُسی طرح سے ہے اہلِ ہنر کی خاک
ساغر کے ساتھ ساتھ کئی جم چلے گئے

انیسؔ نے کہا تھا:

مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کردیا

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

امجدؔ کہتے ہیں:

میں حرف حرف لوحِ زمانہ پہ درج ہوں
میں کیا ہوں میرے ہونے کا مطلب سِکھا مجھے

ہر تخلیق کار کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی مدح اور تعریف قابل پڑھے لکھے اور سخن شناس کریں۔ اسی لیے تو صائب تبریزی نے کہا تھا کہ صائب دو چیزیں شعر کی قدر کو تباہ کردیتی ہیں۔ ایک ناشناس کی تحسین اور دوسرے سخن شناس کا سکوت۔

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس سکوتِ سخن شناس

اسی لیے فیضؔ نے کہا تھا:

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازارِ سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گہر جائیں گے

امجدؔ نے بھی آرزومندانہ لہجہ میں کہا ہے:

مزا کلام کا بزمِ سخن وراں میں ہے
کہ چاند اجڑے گھروں کی چھتوں پہ کیا نکلے

حمدوں میں کعبے کی قبلہ نمائی

امجد اسلام امجدؔ کی حمدوں، مناجاتوں، دعاؤں اور اُن سے متعلقہ نظموں کی تعداد پچاس کے قریب ہے جو ان کے مجموعۂ حمد، نعت اور سلام ''اسباب'' میں شامل ہیں۔ اس مجموعے کے علاوہ امجدؔ کے پورے کلام میں حمدیہ اشعار بکھرے پڑے ہیں۔ امجدؔ کی حمدوں کا جائزہ لینے کے لیے ہم ان نگارشات کو بطور اکائی اور حسبِ ضرورت اور مطالب بطور اجتماعی بھی پیش کریں گے تاکہ قارئین زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔

مجموعۂ کلام ''اسباب'' کی پہلی حمد جو غزل کی ہیئت میں سات اشعار کی مردّف متوسط بحر کی تخلیق ہے خود صحنِ کعبہ میں لکھی گئی ہے۔

دل میں ہے ربِّ کعبہ تو کعبہ ہے سامنے
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں پہ لگتا ہے خواب ہے

اس حمد کے اشعار کعبے سے جوڑے گئے ہیں۔ یہاں شعروں میں الفاظ کعبہ، گھر، باب وغیرہ استفادہ کیے گئے ہیں۔ یہاں ہر شعر میں فقرہ یا فقرے جو قافیہ کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ بذاتِ خود ایک مکمل حمدیہ عنوان اور قلبی واردات ہے۔

رحمت ہے بے شمار کرم بے حساب ہے
مانگیں یہاں پہ جو بھی دعا مستجاب ہے
آٹھوں پہر کھلا ہوا توبہ کا باب ہے
کعبہ کو دیکھنا بھی تو امجدؔ ثواب ہے

اس حمد میں امجدؔ کے معروف علامتی پیکر خواب اور آنکھ کا ذکر خوبصورت انداز میں ملتا ہے:

ع: آنکھیں کھلی ہوئی ہیں پہ لگتا ہے خواب ہے۔

یہاں شاعر نے بنیادِ کعبہ کا اشارہ کیا ہے۔

گھر کے لیے خدا نے چُنا یہ مقام خود
بنیاد اس کی حضرتِ آدم نے خود رکھی
یہ گھر ہماری گمشدہ جنت کا خواب ہے

اسی لیے یہ مقام دعاؤں کے استجاب کا محور ہے اور اس کا سفر ثواب دارین ہے۔ تمام حمد روزمرہ میں سلیس اور سادے الفاظ سے سجی ہے۔ سچی اور تاثیری شاعری وہی ہے جس میں سچے جذبات اور بیانات میں صداقت ہو۔ اس حمد میں کعبہ کی تاریخ اس کی عظمت اور اس کی تجلیات کی روشنی بھی ہے۔

یہاں عبد و معبود کے رشتے کو بے شمار رحمت، بے حساب کرم، کھلے توبہ کے باب، ثواب اور جنت کے خواب سے باندھا گیا ہے جو کعبے کی نسبت سے سونے پر سہاگہ کا کام کر رہا ہے۔ جب حاجی احرام میں اللھم لبیک کہہ کر کعبے کے سامنے آتا ہے تو اس کے معبود سے ایک خاص تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی قلبی جذبے کی نگارش یہ حمد ہے۔ اسی لیے تو علامہ اقبالؔ نے کہا تھا جو راز حاجی اور کعبے کے درمیان ہے یعنی عبد اور رب کے درمیان ہے اُس سے رئیسِ ملک جبرئیل بھی بے خبر ہیں۔

میان ما و بیت اللہ رمز است
کہ جبریلِ امیں ہم را خبر نیست

حمد میں اللہ کے صفات اور کمالات کی روشنی ہے۔ یہ سلیس سادے الفاظ میں عامی اور عالم کو متاثر کرتی ہے۔

امجدؔ کی حمد یہ شاعری کا ایک منفرد حُسن یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف کعبہ کی عظمت احترام تاریخ اور تجلیات کے بارے میں مختصر اور مفصل طور پر لکھتے ہیں بلکہ طواف، مناسک حج کے علاوہ علاحدہ علاحدہ نظمیں چاہِ زم زم، منیٰ وغیرہ پر لکھ کر آبدار تاثیری اشعار پیش کرتے ہیں۔

امجدؔ کی ایک نظم ''کعبۃ اللہ پر پہلی نظر ہے'' امجد نے اس معروف اور مستجاب روایت کو نظم کرتے ہوئے کہا ہے۔

کعبے کو دیکھتی ہوئی پہلی نظر کے ساتھ
کہتے ہیں جو بھی مانگیے ملتا ہے وہ ضرور

شاعر مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ کعبہ پر جب پہلی نظر پڑتی ہے تو ہوش و حواس شدّتِ جذبات اور روحانی آب و تاب سے گم سم ہو جاتے ہیں، آنکھیں موند اور ذہن کند اور زبان بند ہونے لگتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی ہم کیا اور کس طرح دعا کریں بہر حال اللہ تعالیٰ جو دلوں کے حال اور فکر و خیال کو سنتا ہے دعا قبول کرتا ہے۔ کیونکہ:

لاریب اس کی ذات سمیع و بصیر ہے
ہے ایک بس وہی جو علیم و خبیر ہے

شاعر نے یہاں اسمائے حُسنیٰ سے مقطع کو فلک بوس کیا ہے۔ عبدالرحیم خانِ خاناں نے کہا تھا کہ ایک کامیاب ذہن جہاں بھی جاتا ہے اپنے لیے ایک کامیاب بارگاہ بنا لیتا ہے۔ چنانچہ امجدؔ نے کعبہ پر پہلی نظر کو نہ صرف شعری رنگ میں رنگا بلکہ اس میں دقیق ندرت بیانی سے مضمون کے کئی گوشوں کو روشن بھی کیا۔ ان نظموں سے اکیسویں صدی کی حمدوں کی دقیق نگاری اور جزئیات بیانی بھی جو امجدؔ کی شاعری کی پہچان ہے ظاہر ہوتی ہے۔

اس نظم کے چند مصرعوں کو جوڑ کر ہم گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں:

پہلی نظر جو پڑتی ہے اس گھر پہ تو وہیں
گڈمڈ سے ہونے لگتے ہیں سارے دعا کے لفظ

ہالہ سا کوئی پھیلنے لگتا ہے ہر طرف
لگتا ہے ایسے جیسے کہ کعبہ ہے ہر طرف
ہوتی ہے اس نواح میں منظور ہر دعا
اب تک نہیں کھلا کہ کریں کس طرح دعا
وہ سن رہا ہے جو بھی ہمارے دلوں میں ہے
اور وہ بھی جو شعور کی مبہم تہوں میں ہے

فوق الذکر مصرعوں میں ''گنڈمڈ'' اور ''ہالہ'' لفظوں نے فکر ونظر کو سہ بُعدی کیفیت دی ہے اور آخری مصرعہ میں ''شعور کی مبہم تہوں'' کا ذکر کمالِ سخن کی دلیل ہے۔ یہی اچھی اور بڑی شاعری کی شناخت اور نشانی بھی ہے۔

حج کی سعادت اور مناسکِ حج کے دوران مکّے کا قیام بھی شاعر کے لیے کلام کا پیام لایا اور شاعر نے انہیں بھی لفظوں میں قید کرلیا تا کہ یہ عطرِ ذہن کے شیشے سے نکل کر دفتر کے کاغذوں کو معطر کردے۔ اس تین شعر کی حمد میں امجدؔ نے حج کے بیکراں سفر کی روداد کو نہ صرف کوزے میں بند کیا بلکہ ان میں جذبات کا تلاطم بھی پیدا کیا۔ مصرعے خود بول رہے ہیں۔ سن لیجیے۔

آئے ہیں زندگی میں یہ کیسے عجیب دن
کیا خوش جمال راتیں ہیں کیا خوش نصیب دن
جچتی نہیں ہے آنکھ میں دنیا کی کوئی بات
یوں اُڑ گئے ہیں بن کے دھواں سب توہّمات
سمٹی ہے ایک نقطے میں جیسے یہ کائنات

امجدؔ کی ایک نظم ''کعبہ کہیں جسے'' ہے۔ اس پانچ شعر کی نظم کی خوبصورتی یہ ہے کہ سیدھے سادے رواں دواں الفاظ میں جذبات محسوسات جو شعور کی نامرئی صورت حال ہے الفاظ کی صورت پر خال بنا کر پیش کیے گئے ہیں۔ یہ شاعر کی ایسی داخلیت ہے جس میں ہر خارجی پیکر شامل ہوجاتا ہے۔ بقول آل احمد سرور ع: ''جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے''

کعبہ جو پہلا مبارک ہدایت کا گھر ہے اللہ کا گھر، خانۂ خدا، بیت اللہ اور حرم کے ناموں سے معروف اور مشہور ہے جب کہ اللہ لامکان ہے وہ شہ رگ سے قریب اور ہر جگہ اور ہر شئے میں موجود ہے۔ اس کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے بصارت نہیں بلکہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ شاعر نے نظم کے مطلع میں سوالیہ شعر رکھ کر یہ بتایا ہے کہ ''کعبہ'' یعنی اس چھوٹے سے مکان کی معجزنمائی بہت عظیم اور شدید ہے۔

کہتے ہیں لوگ کعبہ فقط استعارا ہے
ورنہ خدا کا گھر تو یہ سنسار سارا ہے

اس کو دیکھنے سے آنکھوں کی روشنی بڑھتی ہے اس کو چھونے سے بدن کے پور پور میں پھول کھلنے لگتے ہیں اس کے طواف سے تھکن کے بجائے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے دل چاہتا ہے اسے صبح شام دیکھتے رہیں۔ حج کے دوران صحنِ حرم میں حاجی کعبہ کو دیکھتا ہے، حجرِ اسود کو بوسہ دیتا اور چھوتا ہے اور طواف کرتا ہے۔ جبکہ خدا کا نام اس کے لب پر ہوتا ہے ان چاروں

عملیات کا اثر شاعر نے اس چھوٹی سی نظم میں دکھایا ہے۔

امجدؔ نے خود لکھا ہے کہ حج کے سفر میں کئی درجن حمدیں اور نعتیں مسلسل بارانِ رحمت کی طرح ذہن پر برستی رہیں۔ کئی نظمیں کعبے کے سامنے بیٹھ کر بھی لکھی گئیں۔ چنانچہ ان میں خارجی مشاہدہ اور داخلی جذبہ کی ملی جلی تاثیر ہے جو حاجی یا ہر تصور ذہنی کو اسی طرح متاثر اور محظوظ کرتی ہے جس طرح کہ خود شاعر کو، یہی عمل کامیاب اور مقبول شاعری کی سند بھی ہے۔ اس چھے شعر کی حمد میں جو غزل کی ہیئت میں ہے کعبے کی تقدیس، احترام اور جمالیاتی منظر نگاری کے ساتھ جذبات اور محاکات کی کیفیت ہر مصرعے سے چھلک رہی ہے۔ ایک ہی لباس یعنی احرام پہنے ہوئے سب لوگ پیر و جوان، شاہ و گدا کعبے کے سامنے ایسے احترام سے موجود ہیں جیسے کسی ذی وقار کی محفل میں حضوری کے طلب گار ہوں۔

بیٹھے ہیں لوگ اس طرح اُس گھر کے سامنے
جیسے ابھی وہ دیکھیں گے آکر کے سامنے
بے نام و بے نشاں ہوا ہر کوئی وہاں
قطرے کی کیا بساط ہے ساگر کے سامنے

زمین کی چھے سمتیں ہیں۔ کعبہ کی بھی چھے جہتیں ہیں۔ زمین کا مرکز اور جوہر کعبہ ہے جو صحن کعبہ کے بیچ میں آئینہ کی طرح ہے جس کی روشنی سے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں پھر بھی منظر صاف رہتا ہے یعنی بصیرت کی آنکھ ہمیشہ کھلی رہتی ہے۔

یہ بزمِ شش جہت بھی ہے گُم سُم ہمارے ساتھ
کس طرح عرض کیجیے جوہر کے سامنے
اس طرح آکے بیچ میں ٹھہرا ہے آئینہ
ششدر ہیں عکس اپنے ہی پیکر کے سامنے
آنکھیں ہوں بند پھر بھی نظر آئے صاف صاف

امجدؔ قادر الکلام شاعر ہے۔ مصرعوں میں قدرتی طور پر ایسے ہم وزن قافیہ اور ہم تلفظ الفاظ جمع ہو جاتے ہیں جو نغمگی کے علاوہ صنائع معنوی اور لفظی میں اضافہ کرتے ہیں۔ جیسے ''گم سم''، ''شش'' اور ''ششدر'' وغیرہ۔

ششدر صفت ابہام اور ایہام میں بھی ہے۔ تمام حمد میں صنعتِ سیاق الاعداد یعنی ایک شش اور آٹھ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ صنعت مراعات النظیر میں آنکھیں، نظر، روشنی، صنعت تکرار میں بے نام بے نشاں، صنعت تضاد میں قطرہ، دریا وغیرہ بھی نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے داورِ محشر سے دعا کی تھی کہ اگر اعمال نامہ سیاہ ہو تو شافع محشر (حضور اکرم ﷺ) کو نہ دکھانا، یہاں امجدؔ نے آخری شعر میں مضمون کو خود داورِ محشر سے منسلک کیا ہے۔ یعنی پروردگار مجھے بخش دے میرے عصیاں کو مٹا دے تاکہ میں شرمندہ نہ ہوں۔

امجدؔ ہے اب تو آٹھوں پہر ایک ہی دعا
شرمندہ ہوں نہ داورِ محشر کے سامنے

ایک ایسی ہی حمد امجدؔ نے ''صحنِ حرم میں ایک حمد'' کے عنوان کے ساتھ لکھی ہے۔ پوری ''حمد'' ایک خاص کیفیت سے

بھری ہے۔ لکھتے ہیں:

کیسے کوئی کرے، رُوح تک آدمی کو بھگوتی ہوئی کیفیت کا بیاں
یہ قلم کے ہے بس میں نہ اس پہ ہے کچھ اختیارِ زباں

پھر حمد کا رخ روشنی، بے خودی، آگہی، عاجزی، سرخوشی اور زندگی کے الفاظ کی تکرار اور نغمگی پر موڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ بین السطور الفاظ سے زیادہ اُس لفظ کی تاثیر تنویر اور تفسیر بکھر جاتی ہے۔ ان ذیل کے مصرعوں میں ہم قافیہ، ہم وزن الفاظ نے اس کو حمدی ترانہ بنا دیا ہے۔

روشنی، روشنی، روشنی ہر طرف
بے خودی، بے خودی، بے خودی ہر طرف
آگہی، آگہی، آگہی ہر طرف
عاجزی، عاجزی، عاجزی ہر طرف
سرخوشی، سرخوشی، سرخوشی ہر طرف
زندگی، زندگی، زندگی ہر طرف

کیونکہ نماز صحن حرم میں ہر طرف پڑھی جاسکتی ہے۔ یہاں دعائیں، التجائیں ہر رخ پر کی جاسکتی ہیں۔ یہاں اکثریت میں وحدت ہے اور یہی حج کا مقصد بھی ہے۔ یکجہتی، یک رنگی کعبہ میں حاضر ہونے کا مقصد ہے۔ یہ اتحاد اجتماعی ہے یہ عبادت ملی ہے یہاں ذائقے مختلف ہیں لیکن خوانِ نعمت ایک ہے۔ یہاں دائروں میں راستے مختلف ہیں لیکن منزل ایک اور اس کا جرس اللھم لبیک ایک ہے۔ یہاں رنگ مٹ چکے ہیں۔ یہاں رنگ برنگے جواہر اور پتھروں کا فرق ختم ہو چکا ہے یہاں محمود و ایاز ایک صف میں ہیں۔

صنعتِ تکرار نے اس نظم کو غنایت سے غنی کر دیا ہے۔ اس حمد کے آخری حصے میں پیغمبرِ اکرم ﷺ کا واسطہ دے کر شاعر ربِ ارض و سما سے اس کے اسمائے حُسنیٰ کی برکت سے اپنے وطن کی مشکلات کا حل مانگتا ہے۔

اے خدائے زماں، ربِ ارض و سما
تجھ کو تیرے محمد ﷺ کا ہے واسطہ
سخت مشکل میں ہے آج میرا وطن
یا رحیم و کریم و صَمد اے خدا
المدد المدد المدد اے خدا

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے حمد کو مناجات اور دعا سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ حمد میں مضامین اور مطالب کی پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ کعبے کا طواف حاجیوں کا ہجوم اس کثرت میں وحدت اور مرکزیت کو امجدؔ نے خوبصورت طریقے سے سجایا ہے۔ اس موقع پر علامہ اقبالؔ کے اسی موضوع پر چند شعر سنیے:

قوم را ربط و نظام از مرکزی
(ملت کے اتحاد اور ارتباط کا مرکز کعبہ ہے)

روزگارش را دوام از مرکزی
(ملت کی زندگی کے تسلسل کا محور بھی کعبہ ہے)
راز دار و راز ما بیت الحرام
(ملت کا راز رکھنے والا اور اسرار بھی کعبہ ہے)
سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام
(ملت کا درد اور ہمدرد بھی کعبہ ہے)
تو ز پیوند حریمی زندہ ای
(تو کعبے سے جڑا ہونے کے باعث زندہ ہے)
تا طواف او کنی پایندہ ای
(جب تک تو طواف کرتا رہے گا تو امر رہے گا)

اردو اور فارسی ادب میں طواف پر خوبصورت اور آبدار اشعار نظر آتے ہیں۔ امجد اسلام کی ایک سات شعر کی ''حمد'' کی ردیف ''طواف میں'' ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا کہ کعبہ صرف دل اور نظر کا قبلہ نہیں اس کا طواف، اس کی چھت اور دروازے کا طواف نہیں:

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست
طواف او طوافِ بام و در نیست

امجد کہتا ہے کعبہ دراصل ایک شمع کی طرح صحنِ حرم میں روشن ہے اور یہاں جان کا شعلہ یعنی نفس اور وجود کا سوز و گداز پروانے کی طرح اس کا طواف کرتا ہے یعنی یہ بدن کا نہیں بلکہ روح کا طواف ہے۔

ہے درمیان شمع کی صورت خدا کا گھر
پروانہ وار شعلۂ جاں ہے طواف میں

طواف کرنے والا کہتا ہے میرے مالک میں حاضر ہوں۔ اللھم لبیک۔ مالک کونین اس کی حمد و دعا سنتا ہے جس کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ اس لیے تو اقبال نے کہا تھا بندے اور بیت اللہ کے درمیان جو راز و نیاز ہے اس سے جبریل امین بھی بے خبر ہیں۔

میان ما و بیت اللہ رمز است
کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست

امجد کہتے ہیں:

وہ سب کی عرض سنتا ہے اور جانتا بھی ہے
جس وقت جو بھی اور جہاں ہے طواف میں

طواف کے عالم میں سپردگی، بے خودی، حضورِ حق میں کھوئی ہوئی حالت رہتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری

کائنات ساتھ چل رہی ہے جن میں جن و ملائک بھی شریک ہیں۔ کیفیات اور جذبات کو الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے الفاظ پر حکمرانی ضرور ہوتی ہے جو بڑی ریاضت اور مجاہدت سے اقلیم سخن میں حاصل ہوتی ہے۔

اک بے خودی کی لہر لیے جاتی ہے کہیں
کس کو خبر کہ کون، کہاں ہے طواف میں
جنت کے باغ کا سا سماں ہے طواف میں

امجدؔ کی ایک آزاد حمدیہ نظم ''حطیم'' ہے۔ ہم نے اس کو حمدیہ اس لیے بھی کہا کہ اس کا تعلق بیت اللہ اور ذکر اللہ سے ہے۔ امجدؔ کی بعض نظمیں جن میں کعبہ کا ذکر شامل ہے پڑھنے اور سننے والے کو نہ صرف کعبہ کی عظمت بلکہ کعبہ کی تاریخ اور ساخت و تعمیر سے بھی آگاہ کرتی ہیں۔ حطیم دیوار کعبہ کی قدیم دیوار کا حصہ ہے جو ہزاروں برس قدیم ہے جس میں وہ تاثیر ہے جس کو شاعر نے اپنی قلبی آواز سے جوڑا ہے۔ کچھ حصے حمدیہ نظم کے یہاں پیش کرتے ہیں۔

حطیم

کعبے کی ہیں ویسے تو
تین اور بھی دیواریں، تینوں ہی مقدس ہیں
اس چوتھی طرف میں ہے کیا جانے کشش کیسی
ہٹنے کو یہاں سے دل تیار نہیں ہوتا
دل ایسے دھڑکتا ہے
آنکھ اتنی برستی ہے
معلوم ہوا مجھ کو دیوار کا یہ ٹکڑا
اک وقت میں حصہ تھا کعبے کی عمارت کا

قرآنی آیت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے سب سے پہلا مبارک گھر (کعبہ) بنایا جو سارے جہاں کے لیے ہدایت کا محور ہوا۔ چنانچہ اسی مبارک عظیم گھر کے حصے حطیم میں جو دنیا کی سب سے پہلی ربانی عمارت کعبہ کا جزو ہے وہی اثر اور تاثیر ہونی چاہیے جس طرح سے شاعر نے محسوس کی اور قرطاس پر نقش کی۔

امجدؔ نے حمد نگاری میں نئے تجربے کیے ہیں۔ طواف کرتے وقت اللھم لبیک کا ورد بھی حمد کی ردیف میں تکرار کے ساتھ ''میں حاضر ہوں''، ''میں حاضر ہوں'' کہہ کر لایا گیا ہے۔ حمد میں عجز و انکساری کے ساتھ رب العالمین کی ذات، صفات، کمالات اور عظمت پر سپردگی اور حیرت کا اظہار بھی شامل ہے۔ شعار اللہ کے بیان کے ساتھ امجدؔ کا شعوری اور غیر شعوری پیکر آنکھیں اور خواب کا بھی بیان دلکش اور دلفریب ہے۔ ہم یہاں مزید تشریح اور تجزیہ کے بغیر چند مصرعوں کو چُن کر محراب عشق میں سجاتے ہیں۔

اے رب ملائک و جن و بشر میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں
خدمت میں تری شرمندہ نظر، میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں

جو تیری ثنا کے لائق ہو اک لفظ بھی ایسا پاس نہیں
میں جانتا ہوں یہ بات مگر میں حاضر ہوں
یہ ارض و سما کی پہنائی یہ میری ادھوری بینائی
ہے شوقِ سفر ہی زادِ سفر میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں
اے نورِ ازل اے حسنِ ابد سبحان اللہ سبحان اللہ
مری آنکھیں اپنے خواب سے بھر میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں

الفاظ کی تکرار، ردیف کی دھن، ہم قافیہ الفاظ نے اس طولانی بحر کی حمد کو بھی نغمگی سے سرشار کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تضادِ الفاظ، ارض، سما، ازل، ابد کے ساتھ پوری حمد میں معتبر اور متبرک تراکیب کا ہجوم ہے جو حمد کو نورانی بنا دیا ہے۔

امجدؔ کی ایک دلنواز حمد تلمیح سے شروع ہو کر کعبہ کی تقدیس پر اشارہ کرتی ہوئی یوں بڑھتی ہے۔

ایک ایڑی کی بے قراری سے
چاہِ زمزم جہاں سے پھوٹا تھا

یہاں شاعر قرآنی واقعہ جہاں حضرت اسماعیلؑ نے ایڑیاں رگڑی تھیں بیان کر رہا ہے۔ پھر دوسری تلمیح سے دوسرا شعر حضرت ابراہیمؑ کی جدت کے ذریعے لکھتا ہے۔

رب کعبہ کے اک اشارے پر
میرے آقا ﷺ کے جدِ امجد نے
پہلا پتھر وہاں پہ رکھا تھا
تب سے اب تک زمیں پہ ایسا گھر
بن سکا ہے نہ بن ہی سکتا ہے
اور کیسا عجیب گھر ہے یہ
نظر آتا نہیں مکیں کوئی
پھر بھی اس کا طواف کرنے کو
لوگ دیوانہ وار آتے ہیں

پھر شاعر اپنی توفیق اور سعادت کی وجہ سے کہتا ہے:

زہے قسمت کہ آج اپنا بھی
ان دوانوں میں نام آ ہی گیا
جذبِ بے قرارِ شوق اپنا
للہ الحمد کام آ ہی گیا

مکمل حمد ہے۔ آخری شعر یعنی مقطع بہت خوبصورت اور دل کی گہرائیوں سے آمدی بھی ہے اور سرمدی بھی ہے اور یہ

مشترکہ حروف میم، (یعنی مدٰ امجدؔ کے نام کے جزو بھی ہیں۔

امجدؔ کی حمدیں سفر کی روداد بھی ہیں اور ثواب دارین کی حق دار بھی ہیں۔ امجدؔ نے حمدیہ نظم ''یہ بستی منیٰ کی ہے'' لکھی۔ میرے محدود مطالعہ میں ایسی کیفیت سے لبریز منیٰ پر نظم اردو یا فارسی میں نہیں گزری۔ شاعر کہتا ہے۔ منیٰ صرف خیموں کا محلہ نہیں بلکہ یہ حق کا راستہ ہے جو نفی سے اثبات یعنی لا سے الا کی طرف ہے۔ یہاں ہر شخص دل شاد ہے مستی عشق خدا سے سرشار ہے۔ یہاں کی خاک دوا اور یہاں کی فضا شفا ہے۔ اس نظم کے بھی چند شعر سنیے اور سر دُھنیے:

بستی منیٰ کی ہے
ہر اہل دل کی آنکھ میں مستی بلا کی ہے
خیموں کا اک جہان ہے آباد ہر طرف
جاتے ہیں سارے راستے جمرات کی طرف
ہر اک نفی نکلتی ہے اثبات کی طرف
ہستی کے ہر مرض کی دوا اس جگہ پہ ہے
بادِ صبا میں تیرتی خوشبو شفا کی ہے
بستی منیٰ کی ہے

شاعر نے حج کے دوران جزوئیات کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ بخصوص جہاں مسئلہ واردات قلبی کا ہے۔ حاجی کے لیے وہ لحظہ جب کعبے سے وداع ہوتا ہے بہت سخت ہوتا ہے اسی لیے وہ اشکبار اور مغموم رہتا ہے۔ امجدؔ نے ان رخصتی کے لمحات کو مثبت رنگ دے کر مصرعوں میں درد و گداز کے ساتھ امید اور دعاؤں کی تاثیر پیدا کی ہے۔

امجدؔ ''طوافِ وداع'' کو خوبصورت نو (۹) مصرعوں میں بیان کرتے ہیں کہ یہ خوشبو بھرا سفر جس میں گمان کے اندھیرے یقین کے اُجالوں سے ختم ہو جاتے ہیں، جہاں قدم قدم پر رحمتوں کی بارشیں ہوتی ہیں دل تو چاہتا ہے کہ تمام عمر اللہ تعالیٰ کی ثنا میں ڈوب کر مصروف طواف رہیں۔ لیکن مقطع میں کہتے ہیں:

جاتے تو ہیں یہاں سے مگر اس دعا کے ساتھ
پھر حاضری نصیب ہو اور بار بار ہو

امجدؔ کے نعتیہ کلام کی معجز بیانی

امجد اسلام امجدؔ کے کلام میں تینتیس (۳۳) نعتیں، دو نظمیں معراج کے عنوان کے تحت اور دو نظمیں حضور ﷺ کے شہر مدینہ اور اس کے راستے کے عناوین کے ذیل میں ہیں۔ امجدؔ کی نعتوں میں چوبیس نعتیں غزل کی ہیئت (Form) میں ہیں۔ باقی نظم کی شکل میں موجود ہیں۔ تقریباً ہر نعت جو غزل کی ہیئت میں ہے اُسے صرف نعت کا عنوان دیا گیا ہے۔ چنانچہ تقریباً دس سے زیادہ نعتیں حضور اکرم ﷺ کے شہر، گنبد خضرا، مرقد مطہر، حرم، مدینہ کے راستے، قبرستان کے مرئی اور غیر مرئی مضامین سے سجی ہوئی ہیں۔

شہر نبی مدینہ ﷺ، دیارِ حبیب جو عاشق رسول ﷺ کے سینے میں محبت کا خزینہ ہے۔ اردو نعت کا معروف اور جذباتی مضمون ہے۔ اردو کی قدیم ترین نعتوں میں شہیدیؔ کی نعت شامل ہے جس کا شعر آج بھی نعت کا شاہکار شعر تصور کیا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے جب میرا قفس ہستی ٹوٹے تو آرزو یہ ہے کہ میرا طائر روح حضور ﷺ کے حرم کے درخت پر بیٹھے اور نغمہ سرائی کرے:

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو اگرچہ مکہ مدینہ میں پیدا نہیں ہوئے لیکن اپنی اپنی کوششیں اور حضور ﷺ کے عشق کی کشش سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے حضور ﷺ کے شہر مدینہ کی فضا سے اپنی روح افزا اور حضور ﷺ کی مرقد کی زیارت سے اپنی بصارت اور بصیرت کو منور کرتے ہیں۔ امجد اسلام امجدؔ بھی انہی خوش نصیبوں میں شامل ہی نہیں بلکہ اس لحاظ سے ممتاز اور مبارک بھی ہیں کہ اپنے خدا داد ہنر سے جو کیفیات ان کے دل و دماغ پر طاری ہوتی تھیں، انھیں لفظوں کے رنگوں سے نقاشی کر کے ایسی جاویدانہ تصاویر میں پیش کیں کہ ہر شخص کو بھی وہی احساس ہوتا ہے جو خود نعت نگار شاعر کو ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ کامیاب مژدہ نعت کے گلزار میں مقبول شاعر ہی کو عطا ہوتا ہے۔

روضۂ نبی ﷺ کے زائر کو مدینہ اس لیے قلب و جان سے عزیز ہے کہ وہاں عاشقِ رسول ﷺ کے معشوق حضور اکرم ﷺ مدفن ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہی زمین اور اسی فضا میں حضور اکرم ﷺ نے اپنی عمر بسر کی ہے۔ مدینہ اور مکہ کا ذرّہ ذرّہ محبوب الٰہی ﷺ کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ نعتیہ شاعروں نے مدینہ کی محبت اور مکّے کی عظمت کو حضور ﷺ سے ضرور جوڑی ہے۔ لیکن یہ امجد کی امیجری ہے کہ وہ تصور میں اُن لمحات کو نقش کر کے احساس بالیدگی اور خوش قسمتی کرتے ہیں کہ اسی خاک مکہ و مدینہ پر حضور ﷺ کے قدم مبارک نقش بناتے تھے۔ انہی گلیوں اور کوچوں کے مٹّی کے گھروں میں حضور اکرم ﷺ رہتے اور گزرتے تھے یہی حجر اسود کو حضور نے مسلسل بوسہ دیا ہے یا بالفاظ دیگر اسی حجر اسود نے حضور ﷺ کے بوسے لیے ہیں۔ اس امیجری کو شاعر پھر اپنے آپ پر منطبق کرتا ہے کہ وہ اُسی خاک پر قدم رکھ کر رہا ہے، حجر اسود کو چوم رہا ہے، اگرچہ اب مکہ اور مدینہ وہ مٹی اور خاک کے در و دیوار، گھر اور راستے نہیں جن میں نورانی بندے بستے تھے لیکن پھر بھی بستی وہی بستی ہے، زمین وہی زمین ہے اور فضا وہی فضا ہے۔ چنانچہ شاعر کے تخلیات میں ظاہری طور پر مدینہ میں تبدیلی ہے لیکن باطنی طور پر کچھ نہیں بدلا۔ امجدؔ اپنی ایک نعتیہ نظم میں اس منظر نامہ اور قلبی تاثر کو پیش کرتے ہیں۔ ہم یہاں چند مصرعوں کو گلچین کرتے ہیں۔

یہ بستی اب جہاں پر ہے زمانے بھر کی ہر راحت
یہ بستی اب جہاں پر سنگ و آہن سے بنی بلڈنگوں کا جال پھیلا ہے
یہ بستی اب جہاں خلقت کی ہر دم بھیڑ رہتی ہے
یہاں گلیاں ہوا کرتی تھیں جن میں گھر تھے مٹی کے
یہاں پر لوگ کم کم تھے
بظاہر تو نہیں لگتا ہمارے آقا و مولا ﷺ
اسی بستی میں رہتے تھے
مگر ایک شام کعبے میں جو چوما سنگ اسود کو
تصور میں چلا آیا وہ لمحہ جب اسے ان کے
مبارک ہاتھ نے اس جا اٹھا کر آپ رکھا تھا
تو اب محسوس ہوتا ہے
یہاں کچھ بھی نہیں بدلا ہمارے آقا و مولا ﷺ
اسی بستی میں رہتے تھے اسی بستی میں رہتے تھے

یہ پوری نظم تصور پر کھڑی کی گئی ہے۔ شاعر کا تجربہ فکر و خیال کے گلزار میں رنگ و بو لے کر مصرعوں میں نمودار ہوتا ہے جس میں سادگی سلاست، جذبات اور سب سے اہم حقیقت نگاری ہے۔ شاعر نے اس نظم میں مکہ اور مدینہ دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔ شاعر نے یہاں طنزیہ مصرعہ لکھا ہے کہ یہ جو بلڈنگوں کا جال پھیلا ہے:

بلندی جن میں کچھ کی تو خدا کے گھر سے اونچی ہے!

یہ سچ ہے کہ فلک بوس عمارتیں کعبے اور گنبد خضرا کے اطراف احاطہ کی ہوئی ہیں۔ شاعر کا طنز اس لیے بھی قبول ہے کہ اس کی

تہذیب میں ان چیزوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جب علامہ اقبال کو مسجد شاہی لاہور میں دفن کرنے کی اجازت بڑی مشکلات کے بعد حاصل ہوئی تو شرط یہی رکھی گئی تھی جس پر عمل بھی ہوا کہ مقبرہ کی بلندی شاہی مسجد کی کسی دیوار کے برابر یا اس سے اونچی نہ ہوگی۔

ایک اور نعت میں امجد کہتے ہیں وہ خوش بخت راستے تھے جن پر آپ ﷺ نے قدم رکھا، وہ خوش نصیب لوگ تھے جن کی آنکھیں آپ کے چہرے کی زیارت سے پُرنور ہوئیں۔ اسی لیے تو مدینہ منورہ ہے اور حضور ﷺ کے اصحاب کا درجہ بہت ارفع اور عالی ہے۔

خوشا راہیں کہ جن پر آپ نے اپنے قدم رکھے
خوشا آنکھیں کہ جن کے بخت میں تھا آپ کا چہرہ

اس مضمون کو شاعر اپنے تخیل میں قلبی واردات اور عقیدتی جذبات کی آمیزش کے ساتھ پیش کرتے ہوئے اپنی خوش بختی پر نازاں ہے کیوں کہ یہ لحظات اور لمحات اُس کی زندگی کی معراج ہیں۔ یہاں شاعر کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ جذبات کی کیفیات جو صرف محسوس کی جاسکتی ہے آسان لفظوں میں بیان کرکے آپ بیتی کو جگ بیتی میں بدل دیتا ہے۔ ذیل کے چند مصرعے جو اسی نعت کے ہیں ہمارے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مسجد نبوی ﷺ کی عظمت اور شاعر کی عقیدت دیکھیے:

وہ مسجد جس کی دیواریں تری خوشبو سے روشن ہیں
خوشا قسمت کے میں نے اُس کی مٹّی پر کیا سجدہ

اس شعر کی خوبصورتی یہ بھی ہے کہ آج بھی حضور ﷺ کی خوشبو اُسی طرح سے مسجد نبوی ﷺ میں پھیلی ہوئی ہے۔ جس طرح چودہ سو سال پہلے تھی یعنی حضور ﷺ زندۂ جاوید ہیں اسی لیے شاعر نے لکھا ہے کہ ''تری خوشبو سے روشن ہیں۔''

مدینہ میں سانس لینا اور گنبد خضرا کا دیدار کرنا شرعی آرزوؤں کا پورا ہونا لطف اور کرم خاص رحمت للعالمین ہے۔ چند مصرعے اسی مطلب کی روشنی بکھیر رہے ہیں۔

ترے شہر مکرم کی ہوا میں سانس لیتے ہی
مرے سینے کا سارا بوجھ جیسے ہوگیا ہلکا

(یہاں سانس اور سینے کا بوجھ عمدہ شعریت کا نمونہ ہے۔ محاورہ بوجھ ہلکا ہونا کا مضمون بلیغ ہے)

ذیل کے شعر میں گنبد پر نظر ٹھہرنا اور دشت تمنا کا کنارہ ندرت بیان ہے۔ یقیناً یہی گنبد خضرا ہماری طوفانی زندگی کا ساحل اور کنارہ ہے۔ دیکھنے میں یہ نعت کے اشعار سیدھے سادے ہیں لیکن تغزل کی چاشنی اور عقیدت کی روشنی سے لبریز ہیں اور اسی کا نام فطری شاعری ہے۔

ترے روضے کی گنبد پر نظر جس وقت ٹھہری تھی
وہی لمحہ کنارا تھا مرے دشت تمنا کا

قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے کہ ہم نے آپ (محمد ﷺ) کو بھیجا عالمین کی رحمت بنا کر، اسلامی علما نے رحمت کے درجنوں معانی بتائے ہیں۔ شاعر نے اسی آیت کی روشنی میں خوبصورت شعر کہا ہے۔

ترے الطاف بے حد سے نہیں رہتی کوئی مشکل
ترے دریائے رحمت سے نہیں پھرتا کوئی پیاسا

دریائے رحمت اور پیاسا کی وابستگی کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے

ازل سے تا ابد امجدؔ درود اس پر سلام اُس پر
کہ جس نے آدمی کو آدمی کا مرتبہ بخشا

یہ سچا اور صداقت سے لبریز شعر ہے۔ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے۔ ''اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔''

دوسری آیت میں ارشاد ہے ''تمھارے ذکر کو ہم نے رفعت دی ہے۔''

پس جب اللہ حضور اکرم ﷺ پر درود اور سلام بھیجے تو وہ ''ازل سے ابد تک'' کی ضمانت ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ حضور ﷺ بھی ہماری طرح بشر ہیں لیکن ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے عبد اور عبدہ کے ذیل میں گفتگو کر کے بتایا ہے کہ حضور ﷺ اگرچہ نوری ہیں لیکن خاکی لبادے میں اس لیے آئے کہ ہم انسانوں کے لیے قابل تقلید ہو سکیں۔ حضور ﷺ کے طفیل اور صدقے میں آدمی اشرف المخلوقات قرار دیا گیا اسی کی وجہ سے نائب اللہ خلیفہ فی الارض بنایا گیا۔ نجم آفندی نے خوب کہا ہے:

صورت گرِ ازل نے ترے اعتبار پر
اک مشتِ خاک تھی جسے انسان بنا دیا

پنڈت ہری چند اخترؔ کہتے ہیں:

آدمی کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

امجدؔ نے خلقت انسان جو اللہ کا خلیفہ زمین پر ہے اُس کے ثبوت میں نعت کا آخری مصرعہ دفتر نعت کے خلاصے کے طور پر لکھ دیا۔

کہ جس نے آدمی کو آدمی کا مرتبہ بخشا

قرآن کریم میں واضح طور پر پیغمبر اکرم ﷺ کی تعظیم اور توقیر کرنے کے بارے میں حکم دیا گیا ہے۔ سورہ الحجرات کی آیت ۲ میں ارشاد ہے۔ (ترجمہ) اے ایمان والو تم اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز سے بلند مت کرو اور تم ان کی موجودگی میں چلا کر بات نہ کرو جیسے آپس میں کرتے ہو، کیونکہ ایسا نہ ہو تمھاری گستاخی اور بے ادبی سے اعمال غارت ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ پھر اسی سورہ کی آیت ۳ میں ارشاد ہے ''جو لوگ حضور کے پاس دبی (آہستہ) آواز میں گفتگو کرتے ہیں، اللہ نے انہی لوگوں کے دلوں کو پرہیزگاری کے لیے پرکھ لیا ہے ان کے لیے مغفرت اور بڑا ثواب ہے۔ سورہ الفتح میں ارشاد رب العزت ہے۔ ''اے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ اور رسول کی تعظیم و توقیر کرو۔ (آیات ۹) سورہ الحجرات کی (۴۹) آیت میں ارشاد ہو رہا ہے۔ ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے کسی بھی عمل میں پیش قدمی نہ کرو۔ سورہ انفال کی آیت (۲۴) میں تاکید ہے۔ ''اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بلانے پر حاضر ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کو حضور اکرم ﷺ کا کتنا پاس تھا کہ سورہ بقرہ کی آیت (۱۰۴) میں فرماتے ہیں۔ ''اے ایمان والو! رسول ﷺ سے کسی مسئلے میں یہ ہرگز نہ کہو کہ ہمارا خیال کریں بلکہ یہ کہو کہ ہم پر نظر کرم فرمائیں، پہلے ہی سے بغور سنو، کافروں کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔'' کبھی

اللہ سورہ الاحزاب کی آیت (۵۷) میں تاکید وتنبیہ کے لہجے میں فرماتا ہے۔ ''یقینا جولوگ اللہ اور رسول ﷺ کو (عمل وفعل) سے تکلیف اور اذیت دیتے ہیں ان کے لیے دونوں جہاں میں اللہ کی لعنت ہے۔ اللہ نے ان کے لیے ذلت وخواری کا عذاب تیار رکھا ہے۔'' دوسری طرف ارشاد ہوتا ہے۔ ''جن لوگوں نے اپنے اوپر ظلم (عذاب) کیا اور آپ کے پاس آکر اللہ سے معافی مانگتے ہیں اور رسول ﷺ ان کی سفارش کرتے ہیں تو اللہ توبہ قبول کرتا اور رحم فرماتا ہے (سورہ النساء۔ آیت ۶۴)

اللہ نے نبی ﷺ کے ذکر کو بلند و بالا کرنے کی ضمانت دی ہے۔ کبھی سورہ والضحیٰ آیت (۵) میں فرمایا ''قریب میں آپ کا رب العزت آپ کو اتنا کچھ عطا کرے گا کہ آپ خوش ہوجائیں گے۔'' اسی لیے شاعر رسالت حسان بن ثابتؓ نے فرمایا تھا کہ اللہ آپ کو اتنا چاہتا ہے کہ پانچ وقت کی اذانوں میں اپنے نام کے ساتھ آپ کے نام کو جوڑ دیا۔ چنانچہ وہ عرش پر محمود ہے اور آپ یہاں محمد ﷺ ہیں دونوں کا مادہ ''حمد'' یعنی تعریف وثنا ہے۔

یہ سچ ہے کہ علمائے اسلام نے احترام رسول ﷺ کو بڑی عبادت کا درجہ دیا ہے۔ اللہ کریم نے اپنے حبیب ﷺ کے خلاف جس نے بھی گستاخانہ رویہ رکھا اس کی زبان نسل اور ہاتھ قطع کردیے۔ اسی لیے تو کہا گیا کہ با محمد ﷺ ہوشیار۔ عزتؔ بخاری کہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس آسمان کے نیچے وہ مقدس ہستی ہے جو عرش سے بھی زیادہ نازک ہے اسی لیے حضرت جنید اور بایزید جیسی ہستیاں بھی اکھڑتی سانس کے ساتھ آتی ہیں۔ اقبال نے کہا ہے:

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

اب اس تقدسی پس منظر میں امجد کی ایک نعت جو مردّف ہے دیکھیے۔ امجدؔ نے کئی قرآنی آیات کے مضمون اور مطالب کو بہت ہی سلیقے اور سلاست سے پیش کیا ہے۔ امجد کی احتیاط دیکھیے کہ حضور ﷺ مدینہ میں آرام فرما رہے ہیں۔

شہر نبی ﷺ ہے سامنے آہستہ بولیے
دھیرے سے بات کیجئے آہستہ بولیے
اُن سے کبھی نہ کیجئے اپنی صدا بلند
پیش نبی ﷺ جو آیئے آہستہ بولیے

صرف حضور ﷺ کے سامنے بلند آواز میں بات نہ کی جائے بلکہ یہاں کی خاک، یہاں کی راہیں، یہاں کی فضائیں سب کا احترام لازم ہے۔ شاعر نعت میں آداب مدینہ اور اس کی تہذیب وترتیب پیش کررہا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ حضور ﷺ آج بھی موجود ہیں اس لیے ادب اور تعظیم لازمی ہے۔

ہشیار! یہ ہے بادشہ دوجہاں ﷺ کا در
سر کو جھکا کے آیئے آہستہ بولیے
آداب یہ ہی بزم شہ دوجہاں ﷺ کے ہیں
دو زانو ہو کے بیٹھئے آہستہ بولیے

یہاں ''ہشیار'' لفظ تاکید اور ہماری درباری تہذیب کا عکاس ہے۔ سر کو جھکانا، دوزانو بیٹھنا، آہستہ بولنا سب احترام اور

تعظیم کی تربیت ہے۔

شاعر کا کمال یہ بھی ہے کہ اُس نے ادب اور آداب کو سہ بُعدی(Three dimentional) تصویر اور تصور میں سجایا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ مدینہ کی گلیاں مدینہ کے راستے سب محترم ہیں۔ یہ شہر معرفت کے ساتھ ساتھ شہر شرافت اور شہر عبادت بھی ہے۔ کچھ مصرعے سنیے:

ان کی گلی میں دیکھ کے رکھئے ذرا قدم
ہر اک سے کیجئے گا یہاں مسکرا کے بات
شہر نبی ﷺ ہے شہر ادب کان دھر کے دیکھ
کہتے ہیں اس کے راستے آہستہ بولیے

حضور ﷺ کے توسل اور توسط اور وسیلے سے دعا قبول ہوتی ہے۔ شاعر نے مقطع کے پہلے مصرع میں حضور ﷺ کے وسیلے سے دعا مانگنے کے خوبصورت انداز کو بیان کر کے زیر لب مناجات کی تاکید بھی کی ہے۔

امجدؔ وہ جان لیتے ہیں سائل کے دل کی بات
پھر بھی جو دل مچل اُٹھے، آہستہ بولیے

یہاں دل مچل اُٹھے جس کی سفارش بھی ہے کہ دعا حضور ﷺ رب العزت میں گریہ وزاری اور اضطراری کیفیت میں رستگار ہوتی ہے۔ امجد کو یقین ہے کہ حضور ﷺ کے وسیلے سے ان کی حاجتیں پوری ہوں گی۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کا مصرعہ ہے: ''نہیں تو سن نہیں سکتا ہے تیرا مانگنے والا۔'' امجد کی پوری ایک نعت ''مانگتا ہوں میں'' کی ردیف میں ہے۔ اس مانگنے میں جتنی حاجتیں، مرادیں، آرزوئیں شامل ہیں ان میں کسی کا بھی تعلق شاعر کی جسمانی، مادّی، اقتصادی یا دنیاوی ضرورتوں سے نہیں بلکہ حضور پُرنور ﷺ کا لطف وکرم، ان کی پیروی، ان کی توجہ، ان کا سایۂ سعادت، ان کا راستہ اور اسلام کی روح وغیرہ کی گدائی ہے۔ وہ بھی صرف اپنے لیے نہیں بلکہ ع: رحمت عام مانگتا ہوں میں۔'' اس نعت کا مطلع خود سہل ممتنع میں ہے۔ یقیناً حضور اکرم ﷺ کا نام نامی وگرامی خود مکمل روح اسلام ہے۔

آپ ﷺ کا نام مانگتا ہوں میں
روح اسلام مانگتا ہوں میں

امجدؔ نے اس چھوٹی بحر کی نعت کے اشعار میں بڑی فنی مہارت دکھائی ہے۔ پیروی کا الزام کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ شعر صنائع معنوی کی صنعت تاکید المدح بما شبہ الذم میں ہے۔

آپ ﷺ کی پیروی سے ہو منسوب
ایسا الزام مانگتا ہوں میں

صنعت ابداع جس میں الفاظ کے استعمال سے معنی آفرینی پیدا ہوتی ہے ذیل کے شعر میں موجود ہے۔

آپ ﷺ کے سایۂ سعادت میں
آخری شام مانگتا ہوں میں

سایۂ سعادت کی ترکیب نہ صرف جدید ہے بلکہ معنی خیز ہے۔ اچھی شاعری میں چھوٹی بحر میں معنی کے دفتر کھولنے کے لیے ایسے کلیدی تراکیب کرشمہ سازی کرتے ہیں۔

عشق کا درمان درد ہے۔ معشوق کی یاد سے لبالب درد کا جام حیات ابدی کا ضامن ہے جو شاعر الطاف و اکرام کی بھیک کے ساتھ مانگ رہا ہے۔

آپ ﷺ کی یاد سے لبالب ایک
درد کا جام مانگتا ہوں میں

یہی نہیں بلکہ ایک دوسری نعتیہ نظم میں حضور ﷺ کو حضور ﷺ سے مانگ لینا عشق کی گہرائی اور منگتے کی فنایت فی رسول ﷺ ہے۔

تو پلٹ کے پوچھے جو مدعا
تو میں بے دھڑک تجھے مانگ لوں

شاعر نے اپنے معشوق سے بڑی خوبصورت دل کی تہہ سے نکلے لفظوں میں یہ دعا مانگی ہے کہ رازوں کے دروازے اس پر کھول دے اور اس کو توفیق دے کہ اس کا ہر قدم ترے نقش پا پر رہے اور تو اس کے ہاتھ کو تھامے رہے۔

مرے خوش نظر، مرے چارہ گر، مرے راز داں، مرے مہرباں
یہ جو چار سو ہے خلا مرے، یہ جو وقت بہتا ہے درمیاں
اسے کھول میرے شعور پر
ترا نقش پا مرے ساتھ ہو
مجھے یوں لگے کہ قدم قدم
ترے ہاتھ میں مرا ہاتھ ہو!

امجدؔ کی چھوٹی بحر میں ایک ارفع نعت جو غزل کی ہیئت اور ردیف ''کی جائے'' میں ہے جس میں شاعر نے سیرت محمدی ﷺ کے حوالے سے مولاؐ کے متوالوں کو بھی شامل کیا ہے۔ شاعر کی سپردگی کا عمل دیکھئے:

آپ ﷺ سے آگہی کی شرط ہے یہ
پہلے تنسیخ ذات کی جائے

تذکرہ میخانہ اور فضل الفوائد میں لکھا ہے کہ جب امیر خسروؔ نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں پہنچے تو اولیاء نے کہا امیر اور خسروؔ کا ہماری خانقاہ میں کیا کام، پھر انا کو توڑنے کے لیے فرمایا رات کشکول لے کر فقیروں کے لیے غذا جمع کرو اور صبح کہا ہم نے تمھارا لقب ''محمد کاسہ لیس'' یعنی محمد کا کٹورا چاٹنے والا رکھا ہے۔

جب ذات کی تنسیخ ہو جائے تو پھر دل میں حضور ﷺ کی رحمت کی روشنی بھر جاتی ہے اور پھر زبان سے حضور ﷺ کی ہی ذات اور صفات کی بات حاصل زندگی اور کائنات بن جاتی ہے۔

کر کے دھڑکن کا آئینہ روشن
کملی والے ﷺ کی بات کی جائے

منہ میں جب تک زبان باقی ہے
آپ ﷺ ہی کی صفات کی جائے
ذکر احمد ﷺ کی ایک اک ساعت
حاصل کائنات کی جائے

تب جا کر حضور ﷺ کے طفیل میں زندگی کی رات سحر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

آپ ﷺ کے سایۂ عطا میں بسر
زندگی کی یہ رات کی جائے
سائے جس سمت بھی بڑھیں امجدؔ
روشنی ساتھ ساتھ کی جائے

یہ جدید صنعت کا عارفانہ انداز ہے۔ اس نعت میں تغزل اور جذبات ہیں۔ حضور ﷺ کے دامن سے وابستگی نجات کی ضامن ہے اور آپ کے نام کی حرکت و برکت سے زندگی کی سعی کو اثبات کیا جا سکتا ہے۔ حاصل زندگی کائنات حضور کا ذکر ہے۔ دل کی دھڑکنوں کو بیدار کر کے حضور ﷺ کی سیرت کا چراغ جلائیں تب جا کر سائبان عطا کے فضل سے زندگی کی سحر نمودار ہوگی۔

امجدؔ نے ایک جدید انداز میں نعتیہ نظم کہی ہے کہ تمام جمادات نباتات حیوانات کو حضور ﷺ کی وجہ سے مفہوم ملا اور حضور ﷺ ہی کے صدقات اور برکات سے نوع انسان کو بھی مفہوم حیات ملا، یہ کہہ کر شاعر کہتا ہے۔

مجھ پہ بھی ایک نظر
مجھ کو بھی دیجے کبھی
میرے ہونے کا پتہ
یا نبی ﷺ صلِ علیٰ

امجدؔ نے ایک نعت کے مطلع میں جو کہ غزل کی ہیئت میں ہے مطالب کے دفاتر سمو دیئے ہیں۔ یہ شعر سہل ممتنع میں ہے۔

سخن کے نور سے کردار کے اجالے سے
یہ کائناب نبی ﷺ ہے ترے حوالے سے

یہاں سخن کے نور سے مراد حضور ﷺ کی زبان مبارک پر نور مبین قرآن کا نزول ہے۔ حضور ﷺ کے کردار جس کی شہادت خود قرآن میں ہے جو آپ کی پاک سیرت ہے۔ چنانچہ قرآن اور سیرت خود ذات اقدس محمدی ﷺ ہے جس کے طفیل میں یہ کائنات بنی ہے۔ یہ شعر آسان، سلیس الفاظ میں روز مرہ میں ہے جس میں اضافت بھی نہیں، کہیں بھی قرآن یا سیرت کے الفاظ بھی شاعر نے استعمال نہیں کیے لیکن مطالب خود روز روشن کی طرح منور ہیں۔ یہاں ایک مدح سے دوسری مدح نکل رہی ہے جو صنعت استتباع ہے۔ ایسے اشعار جو لفظی اور معنوی حیثیت سے بہترین شعریت کے نمونے ہوں صنعت ابداع میں شامل کیے جاتے ہیں۔ ایسے ہی اشعار سے مقام شاعر کا تعین ہوتا ہے۔

اسی نعت میں حضور ﷺ کی فقیری زندگی کو شاہوں کی عشرت پر ترجیح بھی دی گئی ہے۔

ہر ایک تخت سے بالا ہے بوریا جس کا
ہمیں ہے کام اُسی دوجہان والے سے

حضور ﷺ کے بوریے کو دنیا بھر کے شہنشاؤں کے تختوں سے عالی اور عظیم بتا کر سرکار دوعالم سے اپنی نسبت قائم کرنا عمدہ نعتیہ مضمون ہے جو ہمارے عقیدے میں حضور ﷺ کی شاعر پر فیضِ کرم اور نظرِ عطا کی دین ہے۔اسی نعت میں ایک نادر جدید مضمون ''لقمۂ حلال'' بڑے انوکھے اور پُرتاثیر انداز میں باندھا گیا ہے۔درجنوں نعتیں دیکھ لیجیے ایسا مضمون شاذ و نادر ہی کہیں ملے۔یہ ہے اکیسویں صدی کی نعت جہاں کرپشن جو ہر دور سے زیادہ بعض افراد کی رگوں میں ناجائز لہو کی طرح دوڑ رہا ہے ساری دنیا کا گمبھیر مسئلہ ہے۔

وہ جس کا ذائقہ روحیں اجاڑ دیتا ہے
ترا کرم کہ رکھا دور اس نوالے سے

اس شعر کا پہلا مصرعہ ''ذائقہ روحیں اجاڑ'' کی نسبت سے فلک بوس ہوگیا۔ یہاں قطرے میں شاعر نے دجلہ دکھایا ہے۔علامہ اقبال نے مولانا روم سے سوال کیا تھا:

علم و حکمت کا ملے کیوں کر سراغ
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ

جواب ملتا ہے کہ علم و حکمت، عشق اور دلسوزی لقمہ حلال سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

علم و حکمت زائد از لقمہ حلال
عشق و رقت آید از لقمہ حلال

اقبالؔ جاوید نامہ میں فرماتے ہیں:

سِرِّ دیں صدق مقال، آکلِ حلال

اسی لقمۂ حلال سے خودی بلند اور سرفرازی ملتی ہے اور پرواز بلند تر ہوتی ہے۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ نان جس سے جاتی رہے اس کی تاب
وہی نان ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

کبھی علامہ فرماتے ہیں:

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی

امجدؔ لقمۂ حلال کو حضور ﷺ کے کرم سے جوڑ کر اسے سیرت محمدی ﷺ کے راستے پر چلنے کا فیض شمار کرتے ہیں۔

ہم یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ امجدؔ کی نعتوں میں سپردگی کے ساتھ ساتھ اعتماد نفس، خودداری، عزت نفس، حرص اور دنیاوی خواہشات سے بیزاری کے مضامین بکھرے پڑے ہیں۔ ان نعتوں کا کمال یہ ہے کہ امجدؔ نے ان میں واعظانہ لہجہ یا درسی تمہید نہیں برتی بلکہ مسائل کو اپنی ذات پر منتخب کر کے دوسروں کو دکھایا ہے۔ چنانچہ یہ اُسلوب اسی لیے بیشتر قابل تاکید اور تقلید قرار پایا۔ حضور ﷺ سے نسبت ہوتے ہی جو حال ہوا اس کو نعت کے چند مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔

در در کی اب وہ خواریاں، پھیرے نہیں رہے
دل میں وہ خواہشات کے ڈیرے نہیں رہے
چاروں طرف جو غم کے تھے گھیرے نہیں رہے
کس سے ملی نظر کہ ہر اک شے بدل گئی
راتیں نہیں رہیں وہ سویرے نہیں رہے

پس معلوم ہوا کہ اگر حضور ﷺ کی تعلیمات اور سیرت کو اپنایا جائے تو دل و جان میں انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔ ایک اور نعت میں شاعر اقرار کرتا ہے کہ:

سیکھا ہے تجھ سے نفس نے کرنا گناہ سے گریز
تجھ سے مری گرفت میں آیا جہان ممکنات
امجدؔ رسول پاک ﷺ کی سنت ہے ایسا راستہ
جس کے محیط میں عیاں راز و جواز کائنات

ایک اور عمدہ مردّف آٹھ اشعار کی نعت جس کے مطلع کا پہلا مصرعہ ہے۔ اس نعت کے

تمھارے شہر میں دیوانہ وار آئے ہیں

کئی اشعار سے تغزل چھلک رہا ہے۔ بعض اشعار میں پیکر تراشی، معنی آفرینی کے دفتر کھول دیتی ہے۔ نادر تشبیہات استعاروں کی تازگی، رعنائی خیال مصرعوں میں جمالیات بکھیر دیتی ہے جیسے اس شعر میں جہاں تمام گفتگو علامتی پیکر سازی اور اشارات میں ہوئی ہے۔ اب یہ پڑھنے اور سننے والے کی ہمت فکر پر منحصر ہے کہ وہ کس قدر گہرا غوطہ لگا سکتا ہے۔

بس اک سخن وہی شبنم کے آئینے جیسا
کہ جس سے آپ یہ گلشن نکھار آئے ہیں

یعنی یہ دین حق جس کا آئین قرآن جو خدا کا سخن ہے جس پر عمل کر کے یہ دنیاوی صحرا گلشن بن جائے گا۔ یہاں شبنم کے آئینے ندرت بیانی اور حسن کاری ہے۔ صنعت مراعات میں شبنم، گلشن اور نکھار شامل ہیں۔

امجدؔ کی نعت میں نہ صرف ذات مقدس حضور ﷺ کا ذکر ہے بلکہ دین محمدی ﷺ کا بھی پرتوی فضا میں پھیلا ہوا ہے۔

ابد تلک نہیں بدلے گا جس کا اب موسم
چمن میں لے کے وہ ایسی بہار آئے ہیں

پھر شاعر نے یہاں گلستانی پیکر سازی سے مضمون کو رنگین کر دیا۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ دونوں شعروں میں کہیں بھی

دین اور اس کے لوازمات کا ذکر نہ ہوتے ہوئے بھی پوری گفتگو اسی چمن کی زینت ہے۔ نعت کے اس شعر میں شاعر نے یقین کے ساتھ بتایا ہے کہ دین محمد ﷺ قیامت تک تر و تازہ برقرار رہے گا۔ بڑی شاعری کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ شاعر لفظ سے اس کے معنی کے علاوہ دوسرے مطالب حاصل کرتا ہے جو حسن بیان میں ہوتے ہوئے زود فہم بھی ہوتے ہیں۔ اس نعت کا مقطع شاعر کی یقین کی منزل ہے جو اسے حضور ﷺ اکرم کے فیض سے حاصل ہوئی ہے۔

عجب یقیں کا سمندر ہے موجزن امجدؔ
عجب گمان کے دریا کے پار آئے ہیں

اردو نعتوں میں اس طرح کی نفسیاتی کیفیتیں جو ایمان کی لو سے روشن اور نشاط روح سے لبریز ہیں خال خال ہیں۔ حضرت ﷺ کا عشق گمان کو یقین میں بدل دیتا ہے۔ اس شعر کی پُرکاری یہ بھی ہے کہ یہ سچا شعر ہے جو کسی بناوٹ یا لفظی صنعت گری کا حامل نہیں۔ یہ خیال و فکر کی پاکیزگی وجدانی تجربات کی دین ہے۔ اس شعر میں عجب کی تکرار، یقین و گمان کا تضاد اور سمندر، دریا، موجزن، پار کی مناسبت لفظی بھی موجود ہے۔ مدینہ کی گلیوں، وہاں کی فضا اور ماحول کا ذکر کئی نعتوں میں بکھرا ہوا ہے۔ یہاں مضمون کی طوالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختصار سے ایک نمونہ کا شعر پیش کرتے ہیں:

مٹ جاتا ہے یہاں پہ ہر اک بغض ہر عناد
عاشق کو اس گلی میں گوارا رقیب ہے

امجدؔ نے ''شہر نبی ﷺ'' نظم میں مدینہ کو داخلی جذبے کے ذوق و شوق کے تحت چشم بصیرت سے دیکھا اور اسے احساسات کے پیمانے پر تولا، چنانچہ اسے ہر سمت مدینہ کی روح افزا فضاؤں میں حضور ﷺ کی یاد کی خوشبو اسے ایسی بے خودی اور سرخوشی عطا کرتی ہے کہ احساس تھکن اور محن کا نہیں ہوتا بلکہ وجدانی جذب و کشش سے مسافرین جو دور و دراز سے آتے ہیں۔ مدینہ سب کے لیے تسکین اور اطمینان کا سفینہ بن جاتا ہے۔ یہ سب حضور ﷺ کی مرقد کی برکت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک اور نعت جو غیر مردّف ہے مدینہ کی قوافی پر غزل کی ہیئت میں فنکاری کی مہارت دکھاتی ہے۔ یہاں مشکل قافیے نگینہ، مدینہ، پسینہ، سینہ، قرینہ، مہینہ کے علاوہ کینہ اور کہیں نہ سے مصرعوں کو جڑ دیا گیا ہے۔ بالکل نیا مضمون ہے۔

صانع نے بصد شوق تراشا یہ نگینہ

کیونکہ اللہ کے حبیب ﷺ کا کوچہ مدینہ تھا اس لیے بصد شوق بنایا گیا۔ حضور بندوں اور معبود کے محبوب بھی ہیں اس لیے بھی۔

وابستہ ہے یوں اُن سے محبت کا قرینہ

معراج کے مضمون کو پیکر تراشی سے رونق دی ہے۔ یہاں خلا دنگ ہے۔ تاروں کو تارے نظر آنے لگے۔

ہے دنگ خلا گزری ہے یہ کس کی سواری
دیکھا ہے کسے آیا جو تاروں کو پسینہ

یہاں حضور ﷺ کو کامل اکمل دانا و بینا کہہ کر شاعر نے خوبصورت مناجات کی ہے۔ جو بہت عمدہ اور پُراثر ہے۔ شاعر کی کشتی منجدھار میں پھنسی ہے۔

کالی ہے بہت رات ہوا بھی ہے بہت تیز
سوچیں ہیں الم خیز تو رنجور ہے سینہ
کشتی ہے پرانی مرے پتوار شکستہ
رحمت کی نظر کیجئے یا شاہ مدینہ

پھر دل کو اطمینان دیتے ہیں:

مت بھول اگر ان کی دعا ساتھ ہے امجدؔ
اترے گا یقینا ترا اس پار سفینہ

مدینہ منور یعنی دیارِ رسول ﷺ کا شہر مقدس برصغیر کے شاعروں کے لیے بڑا جذباتی موضوع رہا ہے۔ ہر زائر نبی ﷺ نے کچھ کچھ اس دفتر میں ثبت کیا ہے۔ امجدؔ کی ایک نو (۹) اشعار کی نعت جس کی ردیف ''مدینہ میں'' ہے شاعر نے گل کاری کی ہے۔ انسان کی سب سے بڑی سعادت خود شناسی ہے کیونکہ اسی دروازے سے جہاں شناسی اور پھر خدا شناسی کی منزل ملتی ہے۔ اسی لیے حدیث ہے جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ شاعر کہتا ہے۔

گیا تھا جب تو کوئی اور آدمی تھا میں
میں اپنے آپ سے واقف ہوا مدینہ میں

اس نعت میں شاعر نے دعا کو مدینے میں مستجاب بتایا ہے۔ ادھر دعا منہ سے نکلی اُدھر قبول ہوئی کیونکہ وسیلہ حضور ﷺ کا ہے۔

عجب یہ رتبہ دعا کو ملا مدینے میں
کہ لفظ کوئی نہ خالی گیا مدینے میں

شاعر کہتا ہے یہاں کسی پردیسی کو غربت کا احساس نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ کے مرقد مبارک کی جالیوں کو دیکھنے سے انسان دل و جان سے حضور ﷺ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کیونکہ دلوں کے احوال سے واقف ہیں اس لیے یہاں سوال کرنے سے پہلے جواب مل جاتا ہے۔

وہ بات ان کو پہنچتی ہے جو دلوں میں ہو
بیاں سے پہلے ملے مدعا مدینے میں

نعت کا ایک فرعی مضمون دیارِ نبی ﷺ سے الفت اور سپردگی ہے جس کا تعلق وجدان اور داخلیت سے ہے۔ حضور ﷺ کے وسیلے سے شاعر بتا رہا ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے ہم وہی فیض آج بھی حاصل کر سکتے ہیں جو آپ کے اصحاب باوقار حاصل کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ عشق کے بول کو کسی بھی لَے میں پرو سکتے ہیں۔ حضور ﷺ کے مدینے کا ذکر گنبد خضرا کا تذکرہ مسجد نبوی کی دلربائی یا حضور کے حجرے کی جالیوں کا دیدار سب بصارت اور بصیرت کو منور کر دیتا ہے۔ امجدؔ نے کئی ماہیے اسی موضوع پر کہی ہیں ہم کسی تشریح یا تبصرے کے بغیر پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ آنکھوں سے دلوں میں اتر جاتے ہیں۔

ماہیے

۱
خوش رنگ نگینہ ہے
اُس جیسا نہیں کوئی
کیا شہر مدینہ ہے

۲
بھرپور خزانے ہیں
طیبہ کی فضاؤں میں
مبہوت زمانے ہیں

۳
ہر چیز تھی مستی میں
جس وقت ہوئے داخل
سرکار کی بستی میں

۴
نوری وہ منارے ہیں
کیا گنبد خضرا کے
دلدار نظارے ہیں

۵
دو گونہ عطا مانگی
کعبے کی طرف دیکھا
روضے پہ دعا مانگی

۶
جنت کی بشارت ہے
سرکار کی مسجد میں
جتنی بھی عبادت ہے

۷ جالی سی لگی آنکھیں
کیا خوب تصور تھا
کیا خوب سجی آنکھیں

۸ رحمت کا نشاں کہیے
اس آپ ﷺ کے حجرے کو
جنت کا مکاں کہیے

نعت نگاروں نے نعتوں میں معراج کے شعروں سے مضمون کو عروج اور بالیدگی دی ہے۔ اردو شعر و ادب میں درجنوں معراج نامے نظر آتے ہیں۔ امجدؔ نے بھی کئی نعتوں میں معراج کے مضامین کے علاوہ معراج، شب معراج وغیرہ پر خوبصورت اشعار تزئین کیے ہیں۔ معراج کا ذکر قرآن میں ہے۔ قرآن ان لوگوں کے لیے ہدایت کا معتبر صحیفہ ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ امجدؔ حضور ﷺ کی بدنی معراج کے قائل ہیں وہ یہ تمام مراحل کس طرح حل ہوئے اُسے ایک خاص نظر سے دیکھتے ہیں جہاں وقت اور کائنات تھم گئے تھے اور اس کی صحت اور معراج کے واقعہ کا یقین اس لیے ہے کہ یہ قرآن میں درج اور رسول صادق کی زبان مبارک سے بھی جاری ہوا ہے۔ یہ واقعہ حضور کائنات کی عظمت پر دلیل ہے کہ تمام کائنات ٹھہر چکی تھی اور حضور ﷺ سفر کر رہے تھے۔ ہم یہاں ''شبِ معراج'' کی نظم کے چند مصرعوں کو جوڑ کر موضوع کو روشن کرتے ہیں:

ہے یوں تو ایک گردش پیہم میں کائنات
روز ازل سے ان کے لیے حکم ہے یہی
سب اپنے دائروں میں گھومتے رہیں
لیکن وہ ایک رات کہ جس رات میں کہیں
ٹھہرا تھا وقت صاحب معراج کے لیے
اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ٹھہری تھی کائنات

امجدؔ کے مجموعہ شعری ''میرے بھی ہیں کچھ خواب'' میں بھی ایک آزاد نظم میں شب معراج کے دوسرے مضامین کو یوں پیش کرتے ہیں جسے ہم جوڑ توڑ کے چند مصرعوں میں یہاں لکھتے ہیں۔

وہ شہسوار کہ براق جس کا توسن تھا
کہاں کہاں سے گزر گیا نہیں معلوم
کہ جس کا پہلا پڑاؤ تھا بیت اقدس میں
کہاں پہ جا کے ہوا دوسرا نہیں معلوم

تمام اگلے زمانوں کے واسطے یہ سفر
ہے ایک زندہ حقیقت بھی استعارہ بھی

اس نظم کا آخری حصہ معراج سے ابھرنے والے کئی سوالوں کا جواب بھی ہے۔ تمام مصرعے اور فقرے استعارات اشارات اور علامات کے ساتھ مری اور نامری پیکر سازی کا عمدہ نمونہ ہیں۔

طلسم وقت کی تمثال ہے شب معراج
کہ ماورائے مہ و سال ہے شب معراج
گمان و عقل کے ہر وار کے مقابل میں
خدا کی بخشی ہوئی ڈھال ہے شب معراج

ایک اور نعت میں یہ شعر بھی دیکھئے:

گزرے جدھر جدھر سے وہ معراج کے لیے
کیسے بیان کیجئے ان نقش پا کی شان

اگر اردو نعتوں کا سرسری جائزہ لیں تو ہمیں کئی مقامات پر عرفی شیرازی کے شعر کو نقل کر کے یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ راستہ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز راستہ ہے جس پر تھوڑی سی غفلت سے ثواب عذاب میں بدل سکتا ہے۔ اسی لیے بعض مقامات پر تاکید کی گئی ہے۔ ع: باخدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ صوفی شعرا نے نعتیہ مضامین کے ذیل کچھ ایسے نکات نظم کیے جسے عامی اور سلوک و عرفانی نہ رکھنے والے پوری طرح سمجھ نہیں پائے۔ احد اور احمد میں میم سے جو باریک مضامین تراشے گئے اس کو بہت افراد نے پسند نہیں کیا۔ امجد کی نعتوں میں اس طرح کے مضامین کا گزر نہیں وہ نعت نگاری کو سیدھے سادے الفاظ میں جو دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں خوبصورت مصرعوں میں پیش کر دیتے ہیں۔ نعت امجد اسلام امجد کی حدیث دل ہے۔ وہ نعت نگاری کو نبی ﷺ کا صدقہ مانتے ہیں۔ ان کی شخصیت جو ان کے فن سے جدا نہیں کی جاسکتی وہ ان دونوں کا مبدا سرکار کی محبت اور عنایت سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ نعت کے اشعار میں اپنے احساس کے دریا میں روانی، اپنے الفاظ میں جادو بیانی، اپنی فصل خزاں میں گل فشانی وغیرہ سب کچھ حضور ﷺ کی بدولت سمجھتے ہیں:

مرے تھی بس میں کہاں مدح مصطفیٰ ﷺ امجد
یہ نعت ان کا کرم ہے مرا کمال نہیں

شاہ نامہ میں فردوسی نے کہا تھا:

منم ساختم رستم داستاں
وگرنہ یلی بودے در سیستاں

میں نے اپنے قلم اور فنکاری سے داستان کے رستم کو بنایا ہے ورنہ وہ تو ایک وحشی تھا جو سیستاں کے جنگلوں میں پھرتا رہتا تھا لیکن امجد کو اس عظیم مقدس برگزیدہ پیغمبر ﷺ کی شان اور مدح میں لکھنا تھا جہاں الفاظ محدود اور عاجز ہیں اور سیرت، شخصیت اور ذکر لامحدود۔ ایک نعت کے مطلع میں اقرار کرتے ہیں۔

کوئی بھی مدح مگر اس کے حسب حال نہیں
وہ ایک شخص کہ جس کی کوئی مثال نہیں
ترے خیال سے بہتر کوئی خیال نہیں
زباں کو تاب نہیں آنکھ کو مجال نہیں

کس طرح سے اس کے حسن کو بیان کیا جائے؟

کہ جس کے دیکھے سے آنکھیں حسین ہوجائیں
جہاں میں ایسا کوئی اور خوش جمال نہیں

وہ جو ایک نگاہ لطف سے روحوں کو منور کردے، وہ جو بغیر مانگے مرادوں سے جھولیاں بھر دے، وہ جس کا نام نامی دشمن کے مقابل ڈھال اور جس کا پیغام تا ابد لازوال ہے۔

بہت ہی تیز سہی دشمنوں کی تلواریں
جہاں میں اسم محمد ﷺ سی کوئی ڈھال نہیں

اس نعت کے اشعار میں روانی، سلاست اور شگفتگی ہے۔

ہر اک کمال سے آگے کمال ہے تیرا
تیرے خیال سے بہتر کوئی خیال نہیں

اس شعر میں کمال سے آگے کمال۔ خیال سے بہتر خیال صنعت استتباع میں ہے، یعنی ایک حسن وخوبی سے دوسری حسن وخوبی اعلیٰ تر ہے۔ یہاں کمال اور خیال کی تکرار نے مصرعوں کو نغمگی سے بھر دیا اور صنعت تکرار بنا دیا۔ صنعت ایہام میں خیال شامل ہے جس کے معنی قریب یا بعید لیے جاسکتے ہیں اور دونوں معنی صحیح ہیں۔ صنعت تجنیس میں خیال اور کمال شامل ہیں۔

امجد اسلام کی یہ قادرالکلامی اور حسن بیانی ہے کہ قلم سے محاسن شعر ٹپک جاتے ہیں۔ اور یہ عمل خود رو پھولوں کی طرح ہوتا ہے جیسا کہ صنعت مراعات النظیر میں دست، عنایت، فقیر، سوال، کاسہ وغیرہ سب ایک دوسرے سے نسبت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پورا شعر صنعت ابداع یعنی عمدہ شعریت کا حامل ہے جیسا کہ ذیل کے شعر میں ہے۔

جو تیرا دست عنایت نہ کرسکے پورا
کسی فقیر کے کاسے میں وہ سوال نہیں

امجد کی ایک مردّف نعت ''اک ترے نام سے'' میں ہر طرف روشنی اور خوشبو بکھری پڑی ہے۔ امجد نے مطلع میں چراغ اور پھول سجا کر اس پانچ شعر کی نعت میں روشنی اور خوشبو کا التزام کیا ہے۔ مرزا دبیرؔ نے محمد ﷺ کے دو میم سے شاہکار شعر لکھا۔ عربی سہ حرفی لفظ کا درمیانی حرف دل یا قلب کہا جاتا ہے۔ یعنی شمس اور قمر کا دل ''میم'' ہے۔

دو میم محمد ﷺ سے جہاں روشن ہے
مضموں یہ دل شمس و قمر سے پایا

جل اٹھے ہیں نگاہوں میں کتنے دیے اک ترے نام سے
کھل اٹھے راستوں میں عجب پھول سے اک ترے نام سے

حضور ﷺ کے نام کی برکت سے زندگی میں روشنی اور خوشبو کا سفر شروع ہوا۔

چین سا آ گیا خواب روشن ہوئے اک ترے نام سے
جتنے جالے تنے تھے مری روح پر سب دھواں ہو گئے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسم گرامی محمد ﷺ سنتے ہی امجدؔ کی روح جھومنے لگتی ہے۔

گنگنانے لگی ہے مری روح بھی تیری یاد آ گئی
جگمگانے لگے میرے سب آئینے اک ترے نام سے

امجدؔ کے ہنر میں الفاظ کے انتخاب اور اس کی نشست کی اہمیت ہے۔ وہ ہم قافیہ الفاظ مصرعوں میں پرو کر ردیف میں ایسے گتھ دیتے ہیں کہ بحر نغمگی سے سرشار ہو جاتی ہے۔

ملک الشعرا ذوقؔ نے صحیح کہا ہے:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے رہے یہی دو پشت چار پشت

اور پھر سخن اس کی مدح میں ہو جس کے سفر کے لیے زمان اور مکان ٹھہر جائے اور جس کے طفیل میں کائنات سجائی جائے اسی لیے تو نعت نگار شاعر امجد اسلام امجدؔ نے ایک نعت میں یہ دعا کی ہے۔

صدیوں کے بعد بھی رہے زندہ مرا کلام
اس ایک پل کے فیض سے روز حساب تک

نجم آفندی مرحوم کہتے ہیں:

شاعر ہوں ان کا نجمؔ جو ہیں وجہ کائنات
ممکن ہے تا ابد مرا نام و نشاں رہے

شاعر اپنی زندگی میں اپنے کلام کی داد اور مرنے کے بعد اپنے کلام کی یاد برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اس والہانہ نعت میں امجدؔ نے یہ دونوں تمناؤں کو بڑے معصومانہ انداز میں مانگا ہے۔ پہلے تو خدا متعال سے دعا کرتے ہیں جس میں ترے نبی ﷺ لکھ کر حبیب خدا ﷺ کی قربت بھی بتاتے ہیں۔

توفیق دے مجھے مرے مولا کہ لکھ سکوں
میں اس طرح سے ترے نبی مصطفیٰ ﷺ کی نعت
جیسے وہ آپ ﷺ رکھتے ہوں تشریف سامنے
شفقت سے مسکرا کے وہ دیکھیں مری طرف
محسوس ہو کہ سن کے بہت خوش ہوئے ہیں وہ

پھر عجز و انکساری سے کہتے ہیں:

میں جو کہ ایک شاعرِ کج مج زبان ہوں
نعت مجھے نصیب ہو دنیا جہان کی

ایک اور نعت میں اسی پر خوش نصیبی کا احساس کرتے ہیں۔ اس شعر کی خوبصورتی یہ ہے کہ یہ صنعت ایہام میں ہے جہاں معنی قریب اور معنی بعید دونوں لیے جاسکتے ہیں۔ خیال سے مطلب حضور کی مدح کی اوج، اور نعت کے موضوعات بھی ہوسکتے ہیں۔ سنوار کے معنی فنی عمدگی اور محاسنِ شعری اور معجز بیانی بھی ہوسکتی ہے۔

یہ جو تیرے ہونٹوں پہ نعت ہے یہ بڑے نصیب کی بات ہے
اسے عرض کرنا خیال سے اسے پیش کرنا سنوار کر

امجد کی نعتیہ کلام کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ مختصر نعتوں میں خصوصی مقامات کا ذکر کر کے ان سے جدید مضمون تراشتے ہیں۔ یہاں ہم صرف غارِ حرا کا اجمالی تذکرہ کریں گے۔ غارِ حرا کی منظر کشی حضور ﷺ سے وابستگی اور پھر ارتباطی مضامین دیکھئے:

اونچے سے اک پہاڑ پہ چھوٹا سا ایک غار
جس میں ہے ایک فرد کی مشکل سمائی بھی
رہتے تھے روز و شب وہ یہاں آ کے معتکف
بس وہ تھے اور پیشِ نظر تھی خدا کی ذات

ہم اس نعتیہ نظم کے مصرعوں کو جوڑ کر غارِ حرا کی تاریخ اور تنویر لکھ رہے ہیں اور جو حضور ﷺ پر آخری صحیفہ یعنی قرآن جبرئیل کے ذریعے نازل ہوا، اس کی بھی روداد انہی چند مصرعوں میں ہے کہ وہ تمام قدیم صحیفوں کا نچوڑ، ہر سوال کے جواب سے معمور، تاقیامت مستند ہے جو اس ختم رسل پر نازل ہوا جو اُمّی تھا۔ یہ مختصر اور جامع قرآن کا تعارف بھی ہے۔

کیا ذکر کرتے رہتے تھے کیا سوچتے تھے وہ
آئے جو جبرائیل تو سب راز کھل گئے
اُمّی پہ منکشف ہوئی وہ آخری کتاب
روداد جس میں سارے صحیفوں کی درج تھی
جس میں ازل سے تا بہ ابد جو بھی اٹھ سکے
ہر شک کا ہر سوال کا موجود تھا جواب

ایک اور نعت کے مطلع میں حضور، قرآن اور حرا کو پیش کیا ہے۔

حرا کی خلوتوں میں جو شہ لولک پر اترا
رہے گا حشر تک اب تو اسی پیغام کا چرچا

ایک دوسری نعت میں غارِ حرا یعنی جہاں سے قرآن کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس کی طرف عارفانہ اشارہ کرتے ہیں۔

یہ جو عاشقی کا ہے سلسلہ یہ جو جا رہا ہے سوے حرا
یہی راستہ ہے حیات کا اسے دیکھ بھال کر پار کر

یہاں پہاڑ کے راستے پر سنبھل کر چلنے کی بات حضور ﷺ کے وسیلے سے دین حق کا بیان ہے جیسا کہ خود اس شعر میں کہتے ہیں اور اسی لیے درود وسلام میں شریک ہوجاتے ہیں۔

بہتر نہیں ہے اس سے کوئی اور واسطہ
ہم کو دکھا گئے ہیں محمد ﷺ جو راستہ
لاکھوں درود اُن پہ کروڑوں سلام ہوں

امجدؔ جہاں کہیں بھی مضمون کی نوعیت سے موقع ملتا ہے مستند حوالوں کو نعت کا جزو بنادیتے ہیں اس طرح ان کی نعت عقیدتی شاعری ہوتے ہوئے سیرت کا روشن ورق بھی بن جاتی ہے۔ حق کا راستہ ہمیشہ تنگ اور آزمائشی ہوتا ہے۔ پل صراط اسی لیے بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز تلقین کیا گیا ہے۔

وہ جو اک تنگ سا رستہ ہے حرا کی جانب
اس کے پھیلاؤ میں کونین سمٹ جاتے ہیں
یہی جادہ ہے جو جاتا ہے خدا کی جانب

پہلے دو مصرعوں میں شاعرانہ مہارت تنگ اور پھیلاؤ کے ساتھ کونین کے سما جانے کا ذکر معنی آفرینی سے بڑھ کر معجز بیانی ہے۔ دونوں مصرعے روزمرہ کی سلیس، سادہ بات چیت میں ہیں کہیں بھی ادق الفاظ یا اضافات نہیں۔

تیسرے مصرعے میں ''جیم'' کی تکرار جادہ، جو، جاتا، جانب سے پیدا ہوئی ہے۔ ترنم خیز ہے۔ یہ عمل وہی کہنہ مشق، پختہ بڑا شاعر کرسکتا ہے جس کے پاس الفاظ کا خزانہ سینے میں دفن ہو۔

کبھی نعت کے مطلع میں تکرار کر کے غارِ حرا کی شان کو دوبالا کردیتے ہیں۔

ہر شے میں آشکار ہے صلِ علیٰ کی شان
غارِ حرا کی شان ہے غارِ حرا کی شان

ہم نے امجدؔ کی حمدوں، مناجاتوں میں بھی بتایا ہے کہ وہ نعتوں کی طرح صرف اپنے لیے دعا نہیں کرتے بلکہ اس میں دوسروں کو اور خصوصی طور پر اپنے وطن کے لوگوں کو شامل رکھتے ہیں۔

صرف اپنے لیے نہیں امجدؔ
رحمت عام مانگتا ہوں میں

کبھی کہتے ہیں:

بس ہے یہی دعا مرے مولا ﷺ کہ حشر میں
ہم سب کے ان کے چاہنے والوں میں نام ہوں

اُن پر جلی حروف سے لکھے ہوں جتنے نام
ان میں کہیں ضرور ہو میرا کلام بھی

امجدؔ حالیؔ کی طرح قوم میں تفرقوں اور پستی سے نالاں ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے بھی اس پستی، بیکسی، محتاجی، بے ہنری اور بے دینی کو حضور ﷺ سے دوری کی وجہ بتایا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ مسلمان کیوں خوار اور ذلیل ہیں اس لیے کہ : دلی دارند ومحبوبی ندارند۔ کبھی کہتے ہیں کہ خدا اس کے ساتھ ہے جو حضور ﷺ کے ساتھ ہے اور ایسے شخص کے لیے وعدہ ہے ع: یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں۔ وہ دنیا کی ظلمات کو حضور ﷺ کے پیغام اور نام سے نور میں تبدیل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ع: دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کردے۔ امجدؔ کی ایک نعت کی ردیف ''یا نبی یا نبی ﷺ'' ہے۔ اس یا نبی ﷺ کی ردیفی تکرار نے استغاثہ کو فلک رساں کردیا ہے۔ یہاں خود شاعر اجتماع کا جزو ہے وہ اس زمان ومکان میں سرکار کی عنایات، توجہات، ہدایات اور معجزات کا طلب گار ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ امت کے مسائل صرف قرآن اور سیرت پر عمل پیرا ہوکر ہی حل کیے جاسکتے ہیں۔ شاعر یہ دکھڑے حضور ﷺ کی خدمت میں اس لیے رو رہا ہے کہ وہ اس در کے سوا کسی اور در کو نہیں جانتا اور در بدری نہیں چاہتا، چنانچہ اسی در پر زندگی بسر کردینا چاہتا ہے۔ وہ روح کا سکون اور زندگی کا خلوص سوز وگداز چاہتا ہے۔

ختم ہو روح سے یہ فشار زماں یا نبی یا نبی ﷺ
زندگی ہوگئی ایک بارِ گراں یا نبی یا نبی ﷺ
آپ ﷺ کے لطف کو جو نہ آواز دوں اور کیا میں کروں
آپ ﷺ کے در بنا اور جاؤں کہاں یا نبی یا نبی ﷺ
ایک رحمت بھری مسکراہٹ ملے دن کی آہٹ ملے
میرے چاروں طرف رات سی ہے رواں یا نبی یا نبی ﷺ

موجودہ دور کی فرقہ بندی، خودغرضی، گمراہی، بے اعتنائی سے امجدؔ نالاں ہیں اور حضور ﷺ سے مدد مانگ رہے ہیں۔

فرقہ بندی کی تلوار سے کٹ گئے راہ سے ہٹ گئے
بھائی سے بھائی ہے سرگراں بدگماں یا نبی یا نبی ﷺ

ایک اور نعت میں کہتے ہیں۔ یہاں ہم چند مصرعوں کو جوڑ کر مضمون بڑھاتے ہیں۔

تم نے کہا تھا مل کے ہی رہنے میں خیر ہے
وابستہ تم سے شاہ امم ہم نہیں رہے
آپس کے تفرقوں نے کیا بے نشاں ہمیں
گنتی میں تو کسی سے بھی کم ہم نہیں رہے
چشمہ ہدایتوں کا تو ہے اب بھی رواں دواں
جوئندہ صراط کرم ہم نہیں رہے

لیکن وہ اطمینان قلب سے جانتے ہیں کہ رحمت کا دروازہ کھلا ہے۔ یہ تمام کوتاہیاں صرف ہماری ہیں کیونکہ

ہر دل میں ہیں سجے ہوئے غرضوں کے بت کدے
مایوس اپنے رب سے کسی حال میں کبھی
امجدؔ ہمیں خدا کی قسم ہم نہیں رہے

ایک اور جگہ امجدؔ کہتے ہیں:

جیسے بھی ہیں پر آپ ﷺ کے ہم اُمتی تو ہیں
ہم کو خبر ہے خوب کہ روزِ حساب ہم
پکڑے گئے تو اپنی ضمانت بھرے گا کون
اور آپ ﷺ کے سوا
محشر میں بھی ہماری شفاعت کرے گا کون

سلاموں کی اہمیت اور افادیت

اردو تنقید میں امجد اسلام امجدؔ کی سلام نگاری پر گفتگو نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب کہ امجدؔ کے چھ (۶) مطبوعہ سلام جدید سلاموں کے ارتقائی سفر میں قابلِ قدر اور تقلید کے عمدہ نمونے ہیں۔ امجدؔ کے پانچ سلام اردو اور ایک مختصر سلام پنجابی زبان میں ہے۔ ہم ان چند سلاموں کا تجزیہ کرنے سے پہلے چند جملے اردو سلام کی تاریخ اور اس کی تدریجی ترقی پر اس لیے رقم کر رہے ہیں کہ اس روشنی میں امجدؔ کے سلاموں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اگرچہ راقم نے سلام کے ان موضوعات پر صدہا صفحات رقم کیے ہیں جو انیسؔ کے سلام، دبیرؔ کے سلام، تعشقؔ لکھنوی کے سلام، نجمؔ آفندی کے سلام، سعیدؔ شہیدی وغیرہ کے سلام کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن یہاں ہم مطالب کے دریا کو ساغر میں پیش کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس صنفِ شاعری پر کام کم ہوتے ہوئے بھی اتنا سارا تحقیقی اور تنقیدی مواد فراہم کیا جا چکا ہے کہ اردو شعر و ادب میں سلام کا مقام تعین ہو سکے۔ سلام ایک مستقل صنفِ سخن ہے جسے مرثیے کی توسیع میں شامل کر سکتے ہیں۔ عربی اور فارسی ادب میں سلام کا صنفی اور تخلیقی وجود نہیں، یہ مکمل برصغیر کی پیداوار ہے۔ چنانچہ فارسی سلام بھی برصغیر ہی کے شاعروں نے یہاں کی عزاداری کی عام فضا سے متاثر ہو کر کہے ہیں۔ تاریخی حوالوں سے ثابت ہے کہ سلام کی ابتدا دکن سے ہوئی اور پھر اس کے ارتقائی مدارج شمالی ہند میں طے ہوئے لیکن سلام کا سنہری دور وہی زمانہ تھا جس میں رثائی ادب کے فلک پر انیسؔ اور دبیرؔ آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک ہر بڑے اور ممتاز شاعر نے اردو یا فارسی میں سلام کہے۔ سلام اگرچہ گزشتہ دو صدیوں سے غزل کی ہیئت میں کہا جا رہا ہے لیکن ابتدا سے اسے ہر ہیئت میں برتا گیا۔ اسی لیے قدیم سلام، مربع، مخمس، مسدس، مثنوی، ترجیع و ترکیب بند کے علاوہ قطعات وغیرہ میں بھی نظم کیے گئے۔ سلام کے مطلع میں پہلے سلام علیک، فاتحہ، سلام، سلامی، مجرا، مجرائی وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے جو آہستہ آہستہ جدید سلام نگاروں نے متروک کر دیے۔ ابتدا میں سلام کا مقصد صرف حضور اکرم ﷺ اور بزرگانِ دین کی روحوں پر درود و سلام بھیجنا تھا چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ دوسری مذہبی اور انسانی قدریں بھی اس میں شامل ہوتی گئیں۔ اگرچہ سلام ہیئت میں مقصدی غزل معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں غزل کی طرح رومانیت اور سوقیانہ الفاظ کی کھپت نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ یہاں بھی شاعر تعلّی اور فخر و مباہات کی گفتگو کرتا ہے لیکن اس کا لہجہ عجز و انکساری سے لبریز رہتا ہے۔ شاعری کے تمام محاسن سلام میں بھی قدر سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہاں تہذیبی، ثقافتی، علمی، اخلاقی اور انسانی قدروں کا ذکر نظر آتا ہے۔

سلام میں ماحول اور اپنے دور کے مسائل کی چھاپ سنائی دیتی ہے۔ موجودہ دور میں سلام نظم معریٰ اور آزاد نظم میں بھی لکھا جارہا ہے۔ آج کل سلام سے ثواب عقبیٰ کے علاوہ اخلاق سازی کا کام لیا جارہا ہے۔ کتاب اخلاق کا شاید ہی کوئی درس ہو جو سلام میں موجود نہ ہو، لیکن ان تمام قدروں کو دیکھتے ہوئے اردو سلام میں واقعہ کربلا اور شہدائے کربلا کا ذکر ضروری ہے۔ کربلائی سلام کا محور امام حسینؑ کی ذات اور ان کی شہادت ہے جو ایک تحریک کی شکل میں اشعار میں پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ یہاں شخصیت امام حسینؑ ایک مینارۂ روشنی ہے جو انسانوں کی طوفانی زندگی میں ظلم و استبداد سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ برصغیر کی تہذیب اردو شعر و ادب کی تربیت و تزئین اور اسلامی قدروں کی تعلیم نے سلام کو ایک ایسا خوش رنگ معطّر گلشن بنا دیا ہے جس میں ہر رنگ و بو اور ہر شکل و قامت کے پھول موجود ہیں۔ سلام بھی اُن چند برگزیدہ الفاظ میں شامل ہے جس کے معنی و مطالب آئینہ در آئینہ کی طرح روشن ہوتے جاتے ہیں جنھیں بیان سے زیادہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دیکھنے میں یہ صرف چار حرفی لفظ ہے لیکن یہ فکر احساس اور جذبے کی چھے سمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ امجد کے سلام کے آخری مصرعے یا فقرے سطروں سے زیادہ بین السطور میری بات کی تائید کریں گے۔ ایک سلام میں شامِ غریباں کی منظر کشی کے بعد لکھتے ہیں:

آج تک گزری نہیں
چشمِ خورشید کی تقویم میں اس رنگ کی شام
خون سے لکھتا تھا اک شخص وفا کا پیغام
ابن آدمؑ کی ہر اک نسل کے نام
اے حسینؑ ابنِ علیؑ تجھ پہ سلام
اے حسینؑ ابنِ علیؑ تجھ پہ سلام

سلام کے لفظ کی معراج یہ ہے کہ وہ زبان کے ورود کے ساتھ روح میں اس طرح ملے جیسے پھول کے رنگ میں خوشبو۔ ایک اور سلام کے مقطعے میں لکھتے ہیں:

حاضر تھے واں سلام کو تارے بھی اشک بھی
مقتل حسینؑ ابنِ علیؑ کا تھا سامنے

سلام کی غیر مرئی وسعت، قوت، کیفیت اور ندرت کی پیکر سازی دیکھیے۔ حسین ابن علیؑ کو خراج عقیدت دینے کے لیے مخلوقات اور ان سے منسوب لوازمات یعنی تارے اور آنسو دونوں الفاظ پیکر تراشی کی علامات اور مجازِ مرسل کے دفاتر ہیں، آنسو جمادات کے نہیں ہوتے، تارے زمین پر نہیں آتے لیکن صنعتِ ابہام اور ایہام نے یہ انتظام کردیا کہ ہر شعر پڑھنے والا امجدؔ کے الفاظ کے اہتمام کا دل سے احترام کرنے لگا یہی بڑی شاعری ہے۔

ہم یہاں سلام کے لفظ کی گیرائی، گہرائی، گُل کاری، حُسن کاری، خیال افروزی اور رعنائی کے ساتھ شاعر کی اعجاز بیانی، نازک خیالی اور معنی آفرینی دکھا رہے ہیں جس کی وجہ سے جذبات برانگیخت ہوجاتے ہیں۔

امجدؔ کے ایک اور جدید طرز کے سلام میں جہاں حسینؑ کی عزاداری سے منسوب الفاظ نوحہ، سیہ لباسی، کارواں، لاشوں وغیرہ کو نئے معنی دیے ہیں جس کا ذکر آیندہ ہوگا، سلام کے آخری حصے میں کہتے ہیں:

نئے یزیدوں کو فاش کرنا ہے کام میرا
ترے سفر کی جراحتوں سے
ملا ہے مجھ کو مقام میرا
حسینؑ تجھ کو سلام میرا

دیکھیے سلام کے لفظ کی وسعت ،عظمت، حُرمت، قیمت، طاقت اور قدرت عیاں اور نہاں ہے۔ امجدؔ اسلام کے مجموعہ ''نزدیک'' میں ایک سلام جو آزاد نظم ہے جس کی رنگینی شہید کے لہو سے ہے۔ اس کے آخری بند پر سلام سلام کی تکرار سنیے کہ دل کی پکار بھی ساتھ ساتھ ہوگی۔

ہے ان کی شان شہادت میں ایسا رنگ دوام
ہر آنے والے زمانے کی روشنی ہیں امامؑ
جہاں جہاں پہ گرا تھا حسینیوں کا لہو
وہاں وہاں سے صدا آتی ہے سلام سلام

حسینیوںؑ کے لہو سے اس طرح سے سلام کو جوڑنا ندرت بیان، مضمون آفرینی اور بلند خیالی ہے جس سے اظہار کو موثر بنایا گیا ہے۔ یہ لطافتِ خیالی اُس وقت الفاظ سے ٹپکتی ہے جب شاعر قادر الکلام اور شائستہ کلام ہو۔ علمائے اسلام نے عاشور کے دن امام حسینؑ ان کے فرزند امام سجاد، ان کی اولاد اور ان کے اصحاب پر مسلسل سلام بھیجنے کی سفارش بھی کی ہے۔

السلام علیٰ الحسینؑ
وعلیٰ ابن الحسینؑ
وعلیٰ اولاد الحسینؑ
وعلیٰ اصحاب الحسینؑ

چودہ سو برس سے شہدائے کربلا کو مہذب انسان سلام بھیج رہے ہیں۔ امجدؔ نہ صرف اپنے آخری دو مصرعوں میں حسینیوں کے تحت ان شہدا کو جمع کر رہے ہیں بلکہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ انسان ہی نہیں بلکہ زمین جو مخلوقِ خدا ہے وہ بھی اپنی بے زبانی میں سلام کر رہی ہے جو حسینیتؑ کی فتح کی علامت ہے۔

صنفِ سلام اپنی پیدائش سے آج تک جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے مختلف ہیئتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس میں مختلف اسلوب اور موضوعات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ایک بڑی تعداد مسکی سلاموں کی سلاموں کی فہرست میں آتی ہے جہاں درد و غم اور بین کے مضامین رقم ہوتے ہیں، اس کے علاوہ سلاموں میں شاعر کی داخلیت بھی بہت متاثر کرتی ہے جیسا کہ نظام دکن محبوب علی پاشا کے سلام سے ظاہر ہے۔

فدا ہوں اُس پہ سلامی ہے جس کا نام حسینؑ
مرا معیں مرا آقا مرا امام حسینؑ
صبا کو بھیج کے روضے پہ کر رہا ہوں دعا
کریں قبول الٰہی مرا سلام حسینؑ

میں اپنے دل کو بہت پاک و صاف رکھتا ہوں
کہ شاید اس میں کسی دن کریں قیام حسینؑ
سنا نہ ہائے کسی سنگ دل نے لاکھ کہا
رسول ﷺ کا ہوں نواسہ ہے میرا نام حسینؑ

انیسؔ دبیرؔ اور دوسرے عظیم سلام گویوں کے پاس یہ دونوں صنعتیں ہوتے ہوئے اخلاقی قدروں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے چنانچہ اگر ان کو بعض اشعار سے جدا کر دیں تو وہ اخلاقی غزلیں معلوم ہوتی ہیں۔ میر انیسؔ کہتے ہیں:

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں پہ نہیں حاجتِ سوال مجھے
کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیسؔ
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
انیسؔ عمر بسر کردو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلامِ ابو ترابؑ نہ تھا

امجدؔ کے پاس خالص مسلکی سلام نہیں لیکن امام کی عظمت اور جانثاری کی دل آویز شاعری سے جو دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیتی ہے اور خود بخود آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ ایک سلام کا مطلع دیکھیے:

جلتے تھے ہونٹ پیاس سے، دریا تھا سامنے
لیکن وقارِ تشنگی، ٹھہرا تھا سامنے

حسینؑ کون؟ رسول ﷺ کا نواسہ جس کے طفیل میں کائنات بنی، وہ دریا کے سامنے شدت سے پیاسا ہو جو اپنے ایک اشارے سے فرات کو اٹھا لے لیکن یہ اس کا امتحان اور وقار تھا جو پیاسا کھڑا تھا۔ کیا یہ شعر دل کے تاروں پر مضراب کا کام نہیں کرتا۔ نجمؔ آفندی نے اس عشق کے رشتے کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا:

پانی کی بندشوں پہ حقارت کی اک نظر
حیرت سے کائنات اُسے دیکھتی رہی

اگرچہ امجدؔ کے پاس بعض مصائب کے شعر بھی ملتے ہیں جیسا کہ ذیل کے شعر میں آلِ عبا کو برہنہ سر بتایا ہے اور عزیزوں کے لاشے دکھائے ہیں۔

پیچھے تھی چیختی ہوئی زینبؑ برہنہ سر
عباسؑ کا کٹا ہوا لاشہ تھا سامنے

کیا خوبصورت تشبیہ ہے۔ قرآن چراغِ مبین ہے، رسول ﷺ چراغِ دین، چراغِ آلِ نبی ﷺ حسینؑ آندھیوں کی زد میں ہے۔ جس کے دشمن ہجوم کر چکے ہیں۔

تنہا ہو جیسے کوئی دیا آندھیوں کے بیچ
ایسے وہ اُس ہجوم کے آیا تھا سامنے

علامہ اقبال اپنی نظم ''حادثۂ کربلا'' میں کہتے ہیں۔ امام حسینؑ کے دشمن ریگستان کی ریت کی طرح لاتعداد تھے جب کہ آپ کے جاں باز دوست صرف یزداں کے ہم عدد یعنی بہتر (۷۲) تھے۔ امام حسینؑ اپنی امت میں ایسی اہمیت رکھتے تھے جس طرح قرآن مجید میں قل ھواللہ احد۔

دشمناں چوں ریگِ صحرا لا تعد
دوستاں او بہ یزداں ہم عدد
درمیانِ اُمت آں کیواں جناب
ہم چوں حرف قل ھو اللہ در کتاب

امجدؔ اسی سلام میں خواجہ چشتی اجمیریؒ کی شاہکار رباعی کے مصرعے کے مطلب کو یوں لکھتے ہیں:

دستِ یزید میں نہ دیا ہاتھ ایک بار
ورنہ ہر ایک غم کا مداوا تھا سامنے

خواجہ اجمیریؒ نے کہا تھا:

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقّا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

علامہ اقبالؒ نے اسی مضمون کی تشریح کی تھی۔

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

حق کی پاسداری کے لیے حسینؑ نے اپنے کو خاک وخون میں غلطاں کیا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ لا الٰہ کی بنیاد مستحکم کی ہے۔ پھر امجد اسلام امجد اس مطلب کو ایک عمدہ شعر میں سجاتے ہیں۔

لکھتا تھا ریت پر وہ لہو سے پیامِ حق
دل کی ہر ایک بات وہ کرتا تھا سامنے

یہاں پھر مجھے اقبال کا شعر یاد آرہا ہے کہ حسینؑ نے کربلا کی خاک پر کلمہ لکھا اور یہی کلمہ ہماری نجات کا سامان بنا۔

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوانِ نجات ما نوشت

اردو شاعری میں نہ صرف کربلا کا لفظ استعارہ ہے بلکہ واقعۂ کربلا کا ہر نظارہ علامت اشارہ اور پیکر بن چکا ہے۔ مشہور ہے کہ امام حسینؑ نے عاشور کی شب چراغ بجھا دیا تھا کہ جو لوگ جانا چاہیں وہ بغیر شرمندگی کے خیمے سے نکل جائیں لیکن کوئی رفیق اور رشتہ دار نہیں گیا۔ امجدؔ نے ذیل کے شعر میں چراغ کو عجب کے لفظ سے جوڑ کر معانی کے دفاتر کھولے ہیں۔

اس شعر کی عمدہ بیانی یہ بھی ہے کہ کہیں بھی شب عاشور کا ذکر نہیں لیکن الفاظ خود آواز اور روشنی دے رہے ہیں۔ یہی فطری اور عمدہ شاعری ہے۔

اک پل میں روشنی کے معانی بدل گئے
اس نے عجب چراغ سا رکھا تھا سامنے

اس مطلب کو دوسرے شعر سے جوڑیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حق اور باطل کے درمیان صرف ایک ہی خط کھینچا جا سکتا ہے جو صراطِ مستقیم کی طرح حق کو باطل سے جدا کرتا ہے۔ ذیل کے شعر میں لاکھوں اور ایک کی فنکاری بھی دیکھیے:

لاکھوں کی تھیں حسینؑ پہ نظریں لگی ہوئیں
لیکن وہاں تو ایک ہی رستہ تھا سامنے

اور فیض احمد فیضؔ نے اپنے بہتر (۷۲) مصرعوں کے مرثیے کے آخری شعر میں اس راستے کے دروازے کی نشاندہی کی ہے۔

مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا
اُس خاک تلے جنتِ فردوس کا در تھا

امجدؔ نے اپنی ایک غزل کے قطعہ بند اشعار میں عمدہ مضمون نگاری کی ہے۔ اگرچہ اس غزل کی ردیف ''ہجوم تھا'' تنگ ہے لیکن کہنہ مشق پُرگو عمدہ بیان کے لیے یہ تنگنائے غزل بھی مضمون کے ہجوم کا باعث ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالبؔ کے سوا ہر شاعر کے لیے غزل کا دامن تنگ نہیں۔ کسی نے کہا ہے:

غزل اور تنگ دامانی کا شکوہ
سلیقہ ہو تو گنجائش بہت ہے

عاشور کی رات دعا اور مناجات کی رات تھی۔ ہر خیمے میں امام حسینؑ کے اصحاب اقربا دعاؤں میں مصروف تھے کیوں کہ یہ برگزیدہ اشخاص جانتے تھے کہ یہ آخری عبادت کی رات ہے وہ بھی رسول ﷺ کے نواسے کے ساتھ۔ یعنی اس رات میں سپردگی، جانثاری، سرخ روئی کے ساتھ بے کسی اور بے بسی بھی مستورات اور ماؤں کے چہروں پر امنڈ رہی تھی۔ اس ماحول میں امجدؔ کے شعر دیکھیے۔

کیا شب تھی وہ فرات کی موجوں سے پوچھیے
جس کے ہر ایک پل میں دعا کا ہجوم تھا
غارت گری سے قبل سمندر ہو جس طرح
موسم کی خامشی میں صدا کا ہجوم تھا
امجدؔ خدا دکھائے نہ منظر وہ پھر کبھی
کس بے کسی میں خلقِ خدا کا ہجوم تھا

یہ تینوں شعر ہمارے اس بیان کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ واقعہ کربلا سے جڑا ہوا ہر پیکر علامت بن چکا ہے۔ جب کوئی پیکر عوامی اور مشہور و معروف ہو جاتا ہے تو علامت بن جاتا ہے جیسے اقبال کا شاہین۔ ان تینوں شعروں میں صرف ایک لفظ شاعر نے فرات رکھا ہے باقی سب اشعار خود بخود ارسال اور ابلاغ کے نقیب بن گئے ہیں۔

اسی سلام کا ایک مکمل شعر عاشور کے دن ڈھل جانے پر جو آلِ نبی ﷺ پر قیامت کی شام آئی جس کو تاریخ شامِ غریباں

کے نام سے یاد کرتی ہے۔ جب منظر نگاری الفاظ کو سہ بُعدی (Three dimentional) جسم عطا کرتی ہے تو وہ محاکات مرقع نگاری بن جاتے ہیں۔ اس شعر کے بعد مزید الفاظ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ اس کو پڑھنے کے بعد تخیل اور تفکر میں سانحہ در سانحہ واقعہ در واقعہ کھلتا جاتا ہے۔

خیموں میں آگ، ریت پہ لاشے پڑے ہوئے
ڈھلتی تھی دھوپ، شام تھی، صحرا تھا سامنے

سلام کے اس شعر سے ہم امجد اسلام کے دوسرے سلام جس کا عنوان ''آخری شام'' ہے کو جوڑتے ہیں۔ امجدؔ کے سلاموں کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ رقّت کے ساتھ مضمون اور صاحبِ مضمون کی عظمت، قدرت اور جرأت کو بھی پیش کرتا ہے جو فلسفۂ شہادت کا بہت اہم جزو ہے۔ چنانچہ اسی لیے واقعۂ کربلا صرف رونے رُلانے والا واقعہ نہیں بلکہ عزتِ نفسی، خودداری، عزم و استقلال، آزادی و حُریّت اور باطل کو کچل دینے کا عملی جرأت مندانہ اقدام ہے۔ اسی سے مختلف عقائد سے تعلق رکھنے والوں نے عظمتِ حسینؑ کے سامنے سرخم کیا ہے اور واقعۂ کربلا انسان کی بیداری کی علامت ہے۔

انسان کو بیدار تو ہولینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

آج دنیا ظلم کی آگ میں جل رہی ہے اور دنیادار خاموش تماشائی ہیں اسی لیے شاید فیضؔ نے ہشدار دیا تھا:

جو ظلم پہ لعنت نہ کرے آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکرِ دیں ہے

اس تمہید کے ساتھ امجدؔ کے سلام کے آزاد مصرعے جس کے ہر لفظ سے صداقت، شجاعت، عظمت، حریت، آفاقیت اور حقیقت بکھر رہی ہے سنیے:

وہ عجب شام تھی لیکن جس کے
رینگتے سایوں کے پہلو میں زمانے گم تھے
خون میں ڈوبی ہوئی ریت پہ بے گور و کفن
ان شہیدوں کے بدن تھے کہ جنھیں
آسماں سینکڑوں صدیوں میں جنم دیتا ہے
ان کے جلتے ہوئے خیمے تھے جنھیں
اپنے دامن کی پنہ باب حرم دیتا ہے

یہ سچ ہے کہ جیسا کہ شاعر نے ظاہر کیا ہے ازل سے آج تک لاکھوں شامیں آتی جاتی ہیں لیکن یہ شامِ غریباں پھر روئے زمین پر نہیں ہوگی۔ اسی لیے اُس ایک شام کی یاد زماں اور مکاں کی بندیشوں کو توڑ کر چھا گئی ہے۔ کیونکہ اس کا ہر لمحہ تاریخ کے صفحہ پر بولتے خون سے لکھا گیا ہے۔

وہ عجب شام تھی لیکن جس کا
ایک اک لمحہ زمانوں پہ جہاں گیر ہوا

لوحِ تاریخ پہ جس کا ہر لفظ
بولتے خون سے تحریر ہوا
اہلِ ایمان کی تقدیر ہوا

امجدؔ کی آزاد نظم میں ایک جدید طرز کا سلام ہے۔ ہم اس سلام کو مابعد جدیدیت کے سلاموں میں شمار کرتے ہیں۔ اس سلام کا کمال یہ بھی ہے کہ اس میں جو تلمیحات اور اصطلاحات استعمال ہوئے ہیں اس کا بواسطہ یا بلا واسطہ تعلق واقعہ کربلا سے ہے۔ اس میں نہ صرف امام حسینؑ، یزید، کربلا، نوحہ، سیہ لباس، کارواں، لہو لاشوں وغیرہ الفاظ شامل ہیں بلکہ جذبات، اداس چیخوں، دہشت، بدحواسی، جراحتوں اور بے خبروں کو بھی دخل ہے۔ اس سلام میں امجدؔ فلسفۂ شہادت کی عظمت، قدر و قیمت سے آج کے دور کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سلام شروع کرتے ہیں اس فقرے سے کہ ''میں نوحہ گر ہوں''

امجدؔ نے نوحہ کو صنعتِ ایہام میں استعمال کیا ہے جس کے ایک قریبی معنی یعنی عزادار رونے اور غم کرنے والا اور دوسرے دور یا بعید معنی افسوس اور اُن حالات پر غمگسار ہوں ان پر اظہارِ تاسف کرنے کے ہیں۔ یہاں نوحہ گر صنعتِ ایہام میں بھی لیا جاسکتا ہے۔ محمد علی جوہرؔ نے کہا تھا۔

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ایک عربی شاہکار شعر ہے:

کل یومٍ عاشورا
کل ارضٍ کربو بلا

یعنی ہر دن عاشور کا دن اور ہر حصہ زمین کا کربلا ہے یعنی ہر روز اور ہر مقام پر حق اور باطل کا مقابلہ ہے۔ حسینؑ کی شہادتِ عظمیٰ کا مقصد صرف سیاہ پوشی یا گریہ زاری نہیں بلکہ آپ کے پیغام سے حُریت انسانیت، مساوات، صداقت اور اسلامی اقدار کی پاسداری بھی ہے۔ یعنی ہمیں عزم استقلال اور حق شناسی امام حسینؑ سے سیکھنا ہے اور یہی حسینؑ شہادت کی اہم سمت بھی ہے۔ اسی سے دین اور قرآن پر روشنی پڑتی ہے۔ امجدؔ کہتے ہیں:

میں نوحہ گر ہوں مسافروں کا جو اپنے رستے سے بے خبر ہیں
میں ہوش والوں کی بدحواسی کا نوحہ گر ہوں
حسینؑ! میں اپنے ساتھیوں کی سیہ لباسی کا نوحہ گر ہوں
ہمارے آگے بھی کربلا ہے، ہمارے پیچھے بھی کربلا ہے
حسینؑ میں اپنے کارواں کی جہت شناسی کا نوحہ گر ہوں

علامہ اقبال کہتے ہیں اگرچہ واقعۂ کربلا کی عظمت وہی ہے لیکن مسلمان عمل پیرا نہیں۔ ایک بھی حسینؑ کو پوری طرح سے اپنی زندگی میں روشن نہیں کر رہا ہے۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؑ
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

فرماتے ہیں:

از آن کشتِ خرابی حاصل نیست
کہ آب از خونِ شبیریؑ ندارد

یعنی اسلامی زمین جو بنجر اور ویران ہو چکی ہے اُس سے کوئی بھی چیز اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اُسے خونِ شبیرؑ سے سیراب نہ کیا جائے۔

امجدؔ اسی سلام میں دنیا میں ہونے والے مظالم کی روک تھام اسوۂ حسینی پر عمل کرنے سے بتاتے ہیں۔ یہاں آلِ نبی کی عورتوں کی اداسی، بچوں کی چیخیں، شہیدوں کے لاشوں کو جو اسلام کے نام پر دہشت گروں کے توسط سے ہوئے آج کے دور کے بھی حالات یہی ہیں جس سے دنیا جل رہی اور دہشت گردی پھیل رہی ہے بتا کر اس سلام کے آخر میں کہتے ہیں:

نئے یزیدوں کو فاش کرنا ہے کام میرا
ترے سفر کی جراحتوں سے
ملا ہے مجھ کو مقام میرا
حسینؑ تجھ کو سلام میرا

شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار
اے زندگی جلالِ شہِ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسینؑ دے

امجدؔ کا سلام عزمِ حسینؑ کا پرچار کر رہا ہے۔ ہم یہاں امجدؔ کی غزلوں کے دو تین اشعار جو اسی مضمون پر ہیں پیش کرتے ہیں۔

رسم یہ حق پہ جان دینے کی
ہم نے سیکھی ہے کربلا سے ہی
جینے کے لیے موت سے لیتے ہیں گواہی
دیکھو تو حقیقت میں ہیں انسان یہی لوگ
کٹنے سے اور بڑھتی ہے اٹھتے ہوئے سروں کی فصل
اپنے لہو سے اہلِ دل بیج یہ کیسے بو گئے

امجدؔ کا ایک اور سلام جو آزاد نظم ہے جدید مضمون سے لبریز ہے۔ اس سلام کا نکتہ اساسی تلاشِ حق ہے۔ زمانے کو حسینؑ کی ضرورت ہے جو اس کو سدھار سکے۔ اس پُرآشوب ماحول میں رہبری، تلاشِ رزقِ حلال، ہنروری کا جمال ختم ہو چکے ہیں۔ آج کربلا درکار ہے کربلا کا راستہ درکار ہے۔ اب ظلمات میں روشنی درکار ہے۔ امجدؔ کا سلام یوں شروع ہوتا ہے۔

بھٹک رہی ہے زمیں پہ خلق خدا ہراساں
کہ رہبری کا کمال دنیا سے اٹھ گیا ہے
ہنروری کا جمال دنیا سے اٹھ گیا ہے
تلاشِ رزق حلال کس کو ہو اور کیوں ہو

یعنی ہم ان مصرعوں، فقروں کو امجدؔ ہی کے سلام کے ایک شعر سے جوڑتے ہیں کہ

پیاس پھر بستیوں میں اتری ہے
گفتگوئے فرات کی جائے

لیکن خود امجدؔ کہتے ہیں اگرچہ حسینؑ کی راہ پر چلنے کے مدعی بہت ہیں لیکن

سروں کو ہاتھوں پہ لے کے چلنے کے مدعی ہیں ہزار لیکن
کسی کے رستے میں کربلا کا سفر نہیں ہے
کہاں گئے اے زمیں وہ راہِ وفا کے جویا
کہ لاکھ اہلِ نظر ہیں لیکن نظر نہیں ہے

علامہ اقبال نے کہا تھا کہ مسلک شبیریؑ پر ہر نام نہاد شخص نہیں چل سکتا کیوں کہ یہاں تیر، خنجر، شمشیر اور نیزوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تیر و سناں و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

آخر میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ امجدؔ کے سلام آج کے بے وفا زمانے میں مشعلِ وفا ہیں۔ امجدؔ کی غزل کا شعر ہے جو ان کے سلاموں پر منطبق ہوتا ہے۔

سرخی بنے تو خونِ شہیداں کا رنگ تھے
روشن ہوئے تو مشعلِ راہ وفا رہے

علامت نگاری میں خوابوں کی کرشمہ سازی

ہم امجد اسلام امجدؔ کی شاعری میں علامت نگاری کی کرشمہ سازی کا طلسم کھولنے سے پہلے چند جملے علامت کی بابت عرض کریں گے تا کہ اُن افراد کے لیے بھی مضمون سہل ہوجائے جنھیں گونا گوں وجوہات سے گلشن علامت کی سیر اور اس کی گل چینی کا وقت میسر نہ ہوا ہو۔ یہ سچ ہے کہ گزشتہ تین چار دہائیوں سے بازارِ نقدِ سخن میں علامتوں کی دکانیں بھی سجائی جارہی ہیں جس سے اس بازار کی رونق بڑھ رہی ہے۔ تخلیق اور تنقید میں اب وہ دَور گیا جہاں بات محاسن زبان میں تشبیہات، استعارات، کنایات اور صنائع و بدائع کے ساتھ فصاحت، بلاغت رمزیت، ایمائیت اور اشارات تک محدود تھی۔ اب وہ دور ہے جہاں گفتگو ان محاسن کی علامتوں کو پیکر تراشی میں ڈھلنے اور ان سے نئے نئے معنی اور مفہوم کی تلاش پر مبنی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ لکھتا ہے کہ علامت جو خود ایک قائم بالذات شے ہے اور جو شاعر اور قاری کے درمیان دونوں سے جڑی رہتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کا رابطہ شاعر کے ساتھ ویسا ہی ہو جیسا قاری کے ساتھ۔ اسی نکتے کو ولیم ٹنڈل نے آسان طریقے سے پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایک باذوق قاری علامت کے اُس مفہوم کو جو شاعر نے اس علامت میں رکھی ہے حاصل کرتے ہوئے اپنی فکر اور صلاحیت کی توانائی اور گہرائی سے نئے معنی بھی پیدا کرلیتا ہے۔ اسی لیے پرانے عرب علما نے شعر فہمی کو شعر گوئی سے مشکل بتایا ہے۔ ہر انسان کے ذہن میں علامات کا ذخیرہ ہوتا ہے لیکن تخلیق کار کے فکر و ذہن میں یہ ذخیرہ بہت زیادہ مقدار میں خام مواد کی شکل میں بھی موجود ہوتا ہے جسے وہ مختلف صورتوں اور طریقوں سے استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ علامت ایک صنعتِ معنوی ہے اس میں تشبیہ، استعارہ اور تمثیل وغیرہ کے اظہار کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جس سے اس میں معنی آفرینی اور وسعتِ خیالی کا دروازہ کھلتا ہے پس معلوم ہوا کہ علامات، تعلق یا تلازمے وغیرہ کسی خیال یا کسی غیر مرئی شے کا مرئی نشان ہوتے ہیں۔ اگرچہ امجد اسلام امجدؔ کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو درجن سے زیادہ الفاظ علامات میں ڈھل چکے ہیں جنھیں امجدؔ نے جگہ جگہ اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ ہم اجمالی طور پر چند الفاظ پر اپنی گفتگو کو مرکوز کریں گے۔ سب سے پہلے ہم خواب کی تعبیر ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ فارسی اور اردو شاعری میں خواب بصورت مضمون محاورہ اور استعارہ ہر زمان و مکان میں نظر آتا ہے۔ ہر بڑے اور چھوٹے شاعر نے خوابوں کی دنیا سجا کر اپنی اپنی قوت متخیلہ سے نت نئے مضمون تراشے ہیں۔ خواب ایک ایسی حقیقت ہے کہ اسے کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ خواب دیکھنا ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔

امجدؔ کی شاعری میں خواہ وہ نظم ہو یا غزل یا گیت خواب بطور استعارہ پیکر، علامت اور اشارہ عمدہ طریقے سے سجایا گیا

ہے جس کی تعبیریں ہر شخص اپنی اپنی استطاعت اور مشاہدے سے کرسکتا ہے۔ غزل کے ایک شعر میں امجدؔ کہتے ہیں:

اُس شب کے تصوّر سے لرز جاتی ہیں آنکھیں
جب اِن کو کسی خواب کی حاجت نہ رہتی

یہ عمدہ شعر ہے جو استغاثہ اور درد بن کے ایک دردمند شاعر کے سینے سے اُبل رہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا:

خدا نہ کردہ کسی قوم پر یہ وقت آئے
کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینے میں

امجدؔ کے شعر میں خواب علامت ہے امید کا کوشش اور تلاش کا۔ فرد کی قنوط، افسردگی، مایوسی اور ناامیدی قوم کا وبال بن جاتی ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد انسان سعی اور کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ تقریباً ہر مذہب اور دھرم میں ناامیدی گناہ تصور کی جاتی ہے۔ انسان مشکلات اور چیلنجوں کا دریا مثبت فکر اور کوشش کی ناؤ میں بیٹھ کر پار کرتا ہے اسی لیے شاعر نے اس شعر میں کہ آنکھوں کو خواب کی حاجت نہیں رہتی لکھ کر سماج کے اُس المیہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے وہ دوچار ہے۔ امجدؔ کی شعریت میں خواب اور آنکھوں کا گہرا اور خوبصورت سنگم جگہ جگہ لہریں مارتا نظر آتا ہے جسے ہم آئندہ بیان کریں گے۔ اس شعر میں صنعتِ مراعات النظیر میں شب، آنکھیں، خواب کے علاوہ محاورہ لرزتی آنکھیں بھی موجود ہے۔ خواب پر فانیؔ بدایونی کے ایک لافانی شعر کا مصرعہ ہے:

ع: زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

دیوانہ خواب تو دیکھتا ہے لیکن اس کی تعبیر نہیں کرسکتا، اُس کو سمجھ نہیں سکتا بلکہ شاید خواب کی غیر ممکن باتوں کو وہ صحیح سمجھنے لگے چنانچہ اس تلازمے میں تہہ داری اور کئی جہتوں میں معنی کی وسعت ہے۔ امجدؔ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں:

ہستی امجدؔ دیوانے کا خواب سہی
اب تو یہ بھی خواب گزرنے والا ہے

خواب کا لفظ یہاں رختِ عمر کی علامت ہے۔ زندگی کی تعبیر اُسی طرح سے ناممکن ہے جس طرح دیوانے کے خواب کی ہر حکایت، روایت، قصص اور کائناتی فلسفے، وجود، عدم، وقت، زمان مکان سب کچھ پر تحقیق کرنے پر معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد۔ شاعر کہتا ہے عمرِ رفتہ خود ایک سفر عدم سے عدم تک یعنی نامعلوم سے نامعلوم سفر ہے تو سہی بہرحال یہ سفر گزر ہی جائے گا۔ امجدؔ کے پاس قرار اور یقین ہے جو فانیؔ کے شعر میں اضطراب اور گمان کی منزل ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک دوسرے شعر میں امجدؔ نے خواب کے معنی حقیقت کے برعکس لیے ہیں اور اس بارے میں ذہنِ انسانی کی محدودیت کا اقرار بھی کیا ہے۔

یہ خواب ہے کہ حقیقت خبر نہیں امجدؔ
مگر ہے جینا یہیں پر یہیں پہ مرنا ہے

اگرچہ یہ شعر فلسفہ کے رنگ سے رنگین ہے اور یہاں زندگی، عدم و وجود اور کائنات کی حقیقت زیرِ بحث ہے۔ مگر شاعر کا یقین ہے کہ اسی دنیا میں زندگی جو جنم سے شروع ہوکر موت پر ختم ہوگی وہ یہیں ہوگی اس لیے وہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کی سائنسی اور فلسفے کی لن ترانیوں سے مطمئن نہیں۔ اس شعر میں صنعتِ تضاد جینا، مرنا، خواب حقیقت کے علاوہ صنعت عکس جینا یہیں پر اور یہیں پر مرنا شامل ہے۔ خواب یہاں یقین اور حقیقت کے برخلاف لفظی پیکر میں ظاہر ہوا۔ اس کے علاوہ دنیا کی زندگی ایک دلفریب اور دلدوز خواب کے مانند بھی ہوسکتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ علامت اگرچہ شاعر کے مفہوم کو قاری تک پیش کر دیتی ہے لیکن وہ ذکی الحس قاری کے ذہن کے دریچوں کو بھی کھول دیتی ہے اس لیے اس کا کام کئی جہات میں جاری رہتا ہے۔ ذیل کی نظم میں خواب کے معنی کی نیرنگی، بوقلمونی، تہہ داری اور معنی آفرینی دیکھیے جو امجد کی بڑی شاعری کی سند ہے۔

امجد کی نظم ''تیرے میرے خواب'' آج کی دنیا کا المیہ بھی ہے اور سماج کے درد کا اظہار بھی ہے جو تعبیر کو ترستے رہتے ہیں۔ ہم چند مصرعے اور فقرے یہاں بطور نمونہ نقل کرتے ہیں۔

یہ جو فرش خاک پہ بکھرا ریزہ ریزہ آئینہ ہے
اس میں جتنے عکس ہیں، سارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں!
دیر رہیں جو آنکھوں میں تو خواب پرندے بن جاتے ہیں
لاکھ انہیں آزاد کرو یہ پھر کر واپس آجاتے ہیں
یہ جو قفس کے دروازے میں پر پھیلائے بیٹھے ہیں
یہ درماندہ اوگن ہارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں

ہمارے اس مشینی دور میں جہاں اخلاق کی قدریں رو بہ زوال ہیں جہاں دوستی اور رفاقت باہمی خلوص اور محبت کے بجائے غرض اور ضرورت کی بنا پر بنائی گئی ہے۔ امجد نے جہاں اپنی شاعری میں جوش اور خلوص کے کردار کا پرچار کیا ہے وہیں خواب کے استعارہ کو سچی دوستی کی قدر و قیمت بتانے اور اس کو نبھانے کے لیے استعمال بھی کیا ہے۔ شاعر کہیں خواب کو ٹکڑے ٹکڑے آئینہ کی طرح جن میں کئی تصاویر جلوہ نمائی کرتی ہیں تعبیر کرتا ہے اور اس سے مضمون کے معنی کو طلسم بنا دیتا ہے اور کہیں پالتو پرندے بنا کر آنکھوں کے قفس میں لوٹا دیتا ہے۔ مصرع میں خواب کو درماندہ اوگن اور ہارے جیسے پستی کے الفاظ سے مخاطب کرنے میں یہ درد بھی شامل ہے کہ ہر سوچ و فکر بالیدہ اور بلند نہیں اگر حرکت نہ ہو تو برکت اور ترقی ممکن نہیں۔ شاعر نے محاورے پاؤں پھیلائے سے خوابوں کے پرندوں کو پر پھیلائے ستائے بتایا ہے۔ صنعت مراعات اور لفظی مناسبت شاعر کی الفاظ پر قدرت کی نشاندہی کرتی ہے جیسے پرندے، پر، قفس اور عکس آئینہ وغیرہ۔

شاید ہی اردو کے کسی شاعر نے ''خواب'' کے موضوع کو اتنے مضامین اور رنگوں میں باندھا ہو۔ خواب چونکہ ہر شخص جداگانہ دیکھتا ہے اس لیے وہ ہر ایک کی فکری پسند اور ناپسند کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ یہاں ذیل کی نظم میں خواب کسی کی آرزوؤں کا میلہ ہے تو کسی کے راستے کی منزل تو کسی کے لیے مہتابوں اور گلابوں کا تحفہ ہے۔ ہم یہ بتا رہے ہیں کہ اس نظم میں خواب کی علامت نے قدروں کی پامالی اور بے قدری کے لیے فکر و سوچ کا موقع فراہم کیا ہے۔

امجد کی یہ خاص نظم ''چُن لو اپنے اپنے خواب'' کا ڈکشن بالکل جدید اور منفرد ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں خواب کا تعارف اور دوسرے حصے میں اس کی قدر و قیمت کو ایمان، احسان، عزت اور شہرت کے برابر نئے پیرائے میں دکھایا ہے جو آج کے سماج اور زمانے کا انداز ہے۔

چُن لو اپنے اپنے خواب
اب ڈھیر لگا ہے خوابوں کا
مہتابوں اور گلابوں کا
ہر آنکھ طلب ہے بوجھل ہے
ہر خواب کسی کی منزل ہے
ہر خواب تمناؤں کا باب
چن لو اپنے اپنے خواب
یہ شام سمے کا دھندا ہے
یہ شام سمے کا دھندا ہے
اس وقت یہاں پر مندا ہے
ایمان کی قیمت دو آنے
احسان کی قیمت دو آنے
توقیر ملے گی دو آنے
تشہیر ملے گی دو آنے
ہر خُوب کی قیمت دو آنے
ہر خواب کی قیمت دو آنے
دو آنے بھئی دو آنے

آج کے سائنسی ماڈرن دور میں نیند اور اس سے مربوط کیفیات، لوازمات شعوری اور تحت الشعوری حالات پر ریسرچ ہورہی ہے۔ جہاں تک خواب کا موضوع ہے یہ بہت پرانا موضوع ہے جو عامی اور عالم دونوں کا بحث اور اعتقاد کا مسئلہ بھی رہا ہے اسی لیے ہمارے پاس قدیم ادب میں بھی خواب کی تعبیر کی کتابیں اور خواب سے منسوب کئی حکایتیں اور داستانیں نظر آتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انسان جاگے یا سوئے اس کا دماغ بدن کے دوسرے اعضا کی طرح ایک لمحہ کے لیے بھی معطل نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسرے ضروری کام کرتا رہتا ہے جسے اُسے زندگی برقرار رکھنے کے لیے کرنا لازمی ہوتا ہے۔

سائنس نے نیند کو کئی درجوں میں تقسیم کیا ہے ہم قارئین کی سہولت کی خاطر صرف گہری نیند، ہلکی نیند اور غنودگی کے الفاظ سے استفادہ کریں گے۔ جدید پیمائشی مشینیں بتاتی ہیں کہ انسان گہری اور ہلکی نیند میں مسلسل خواب دیکھتا ہے لیکن اسے صرف اور صرف وہ خواب یاد رہتے ہیں جب اس کی نیند ہلکی اور وہ جاگنے کے قریب ہو۔ تحقیقات یہ بتاتی ہیں کہ تمام حیوانات بھی خواب دیکھتے ہیں۔ بعض داستانوں اور اساطیری قصوں میں نباتات کو بھی رات میں سوتے دکھایا گیا ہے۔ جہاں تک خواب اور شعر و ادب کا تعلق ہے۔ اردو ادب میں بھی شعرا نے ہر دور میں خواب سے مضمون تراشا ہے۔ کئی محاوروں اور تمثیلوں میں خواب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ خواب سے مہکتے شعر ہر شاعر کے پاس موجود ہیں۔ غالبؔ اور فرازؔ کے دو زبان زدِ عام شعر جو

بالکل الگ الگ مضمون و معنی رکھتے ہیں پیش کر کے ہم امجدؔ کی شاعری میں خواب نگاری کی مثالوں سے آگے بڑھاتے ہیں۔
غالبؔ:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

احمد فرازؔ کہتے ہیں:

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

خواب امجدؔ کا ایک ایسا اہم اور متنوع موضوع ہے کہ اگر اس پر لکھے گئے اشعار ایک جگہ جمع کیے جائیں تو امجدؔ کی خواب نگاری کا مرقع بن سکتا ہے۔ نہ جانے کیوں اردو شعر و ادب میں راشدؔ کی معروف نظم کے بعد ترقی پسند اور اربابِ ذوق کے حامیوں نے خواب کے موضوع کو بھرپور طور پر اپنایا۔ قاسمیؔ نے بھی اسے ضروری سمجھا اور اس کی تلقین کی لیکن امجدؔ نے اِسے اُس منزل تک پہنچایا کہ خواب امجدؔ کی شاعری کی شناخت کا سنگِ میل بن گیا۔

امجدؔ کی نظم ''خواب ٹوٹ جاتے ہیں'' سے کچھ یہاں لکھتے ہیں:

بے رُخی کے گارے سے، بے دلی کی مٹی سے
فاصلے کی اینٹوں سے اینٹ جڑنے لگی ہے
خاک اڑنے لگتی ہے
واہموں کے سائے سے، عمر بھر کی محنت کو
پل میں لوٹ جاتے ہیں
اک ذرا سی جنبش سے
ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں
خواب ٹوٹ جاتے ہیں

اس نظم کے بند کا عروجی نکتہ آخری مصرعہ ہے۔ یہاں شاعر نے جھوٹی ریاکارانہ دوستی، مطلب پرستی اور بناوٹی محبت کے کھوکھلے پن کو ظاہر کیا ہے۔ سچی رفاقت کے لیے ضروری ہے کہ دونوں طرف صداقت، ایثار اور محبت کی آگ لگی ہو جو واہموں شک اور شبہات کو جلا دے ورنہ دوستی، محبت کا خواب ٹوٹ جائے گا اور تعبیر سے محروم رہے گا۔ یہاں خواب کی علامت مضمون کو جلا دے کر نکھار رہی ہے۔

امجدؔ کی نظم ''دوسرا رخ'' میں خواب کا دُوسرا رخ جس میں امید اور رجائیت ہے پیش کرتے ہیں۔ مستقبل کے ضامن، زندگی کی نقدی، ظلمتوں میں چراغ سب کچھ خواب ہیں۔ انسان صرف نیند کے عالم میں خواب نہیں دیکھتا بلکہ مضبوط، مستحکم، معتبر خواب بیداری میں دیکھتا ہے، جن پر زندگی کا قلعہ اور زندہ دلی کا تاج محل تعمیر ہوسکتا ہے۔ کچھ حصہ اسی نظم ''دوسرا رُخ'' سے۔

تیز ہوا کی سفاکی نے کیا کیا کچھ برباد کیا
آؤ جو کچھ بیت چکا ہے اس کو دفن کریں
گرتے پتوں کی ڈھیری سے اپنے اپنے خواب چنیں

آیندہ کے خواب ہی تو وہ سکّے ہیں جو
ارض وسما کی ہر بستی بازار میں چلنے والے ہیں
یہی دِیے ہیں جو آندھی کی راہ میں جلنے والے ہیں
خوابوں کی اس بھیڑ سے آؤ
ہم تم اپنے خواب چنیں

زندگی، مشکلات سے نبرد آزما ہونے اور حوادث سے ٹکرانے کا نام ہے۔ یہاں شاعر نے پوری نظم میں خواب کے پیکر میں ہر جگہ ایک نیا رنگ، ایک نئی طاقت اور کیفیت بھر دی ہے۔ جو اُسے عزم ارادہ، استقلال اور ہمت دے رہے ہیں۔ کہیں خواب کو ارض وسما کا رائج الوقت سکّہ کہا ہے تو کہیں آندھیوں میں جلنے والے چراغ دکھایا ہے۔ یہاں خواب کی علامتوں کا اثر استعاروں اور پیکروں سے بلند اور دیرپا ہے، اسی لیے نظم تاثیر سے لبریز ہے۔ تیز ہوا۔ گرتے پتوں کی ڈھیری۔ خواب چنیں۔ منظر کشی سے معنی آفرینی اور متحرک مصوری ہے۔ ارض وسما کے تضاد میں بازار اور سکّہ کی مناسبت تازہ خیالی ہے اس طرح کی شعریت سے جان دار مخصوص فضا نظم میں قائم ہوجاتی ہے جو بڑی شاعری کی علامت ہے۔ کبھی امجدؔ کے خواب دعائیہ لہجہ بن جاتے ہیں۔

اے خدا میرے پیڑوں کو سائے کی توفیق دے
گرد بادوں کی دہلیز پر سوچکے خواب کو اس کی تعبیر دے

یہاں خواب سینے سے اُبل کر دل و زبان کے راستے سے پڑھنے والوں کی آنکھوں میں بکھر چکے ہیں۔ اس شعر میں گرد بادوں کی دہلیز علامتی پیکر تراشی کا کمال ہے یعنی زندگی کے تلاطمی لمحات کے آغاز میں عزم و امید و کوشش نے ہتھیار ڈال دیے اس کو تازہ کاری اور جدوجہد کی توفیق کی دعا ہے تاکہ اس عمل سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے، جس طرح پیڑ کے سائے سے پہنچتا ہے۔ خدا سے توفیق اور خواب سے تعبیر طلب کرنا رجائی شاعری کی لطافت بیانی بھی ہے۔ یہی اخلاقی، انسانی اور عبادتی شاعری کی رہگزر بھی ہے۔

امجدؔ نے خواب کو امید، آرزو اور مثبت سوچ کے معانی میں بڑی خوبصورتی سے ثبت کیا ہے۔ ان کی ایک نظم ''چلیں ہم فرض کرتے ہیں۔'' کے آخری حصے میں یہ کہتے ہیں کہ نیچر اور مشیّت جن ناکام افراد کی خالی زندگی میں افسردگی، ناامیدی، رنج و بے تابی بھری ہوتی ہے یہ تلقین کرتی ہے کہ اچھے مواقع، اچھے دن تمہاری سرنوشت میں لکھے ہوئے تھے جس سے تم نے پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔

تو پھر اک دن
کسی بے نام سے احساس کی آہٹ
ہمارے ہست کی خالی گلی میں گونجتی ہے
اور ہمیں بیدار کرتی ہے بتاتی ہے
کہ ہم جس گھر میں رہتے ہیں
وہاں کچھ خوبصورت خواب بھی آباد ہوتے تھے

یہ سچ ہے کہ مشیت کی فطرت بار بار نصیب کے دروازے نہیں کھولتی۔ چنانچہ شاعر اپنی شیوہ بیانی اور مصرعوں کی نادرہ

کاری میں یہ آدرش دیتا ہے کہ نیچر اور قدرت پر الزام دھرنے سے پہلے اپنی فکر کے گریبان میں جھانک کر دیکھ لو کہ تم نے وہ مواقع ضائع کر دیے۔ انسان اپنی زندگی ہی میں اس زیاں کے احساس اور اپنی کوتاہی سے واقف ہوسکتا یا ہوجاتا ہے۔ یہاں شاعر نے خواب کے لفظ کو تہہ داری اور پہلو داری سے تزئین کیا ہے۔ اسی لیے معانی کی ترسیل مشکل نہیں۔ احساس کی آہٹ اور ہست کی خالی گلی عمدہ بیانی اور دلکش شاعری ہے۔

کیا انسان کسی اور کے خواب دیکھ سکتا ہے اور اگر دیکھ سکتا ہے تو خود اس کے خواب کا سپنا کیا ہوگا؟ ذیل کی نظم ''کاش کبھی تو ایسے ہو'' امجدؔ نے سوال کیا ہے۔ شاید اس کا جواب آسان نہیں۔

آنکھیں دیکھیں خواب
آنکھیں دیکھیں اور کسی کے خواب
اپنی آنکھیں ہی جب دیکھیں اور کسی کے خواب
کون بُنے پھر خواب ہمارے، شکوے کون سُنے
کانٹے کون چُنے
دل کو ہے بس ایک ہی الجھن
من چاہی تعبیر سے روشن سپنا کیسے ہو
آنکھوں میں جو خواب بسا ہے اپنا کیسے ہو

میرے محدود مطالعے میں ایسا نیا مضمون نظروں سے کبھی نہیں گزرا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بات بھی نئی اور انداز بھی انوکھا۔ نظم کا یہ حصہ جس میں آنکھوں اور خواب کے رشتے کی تکرار کے ساتھ اپنی اور کسی کی بات ہورہی ہے جو نغمگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ یہ کیسا المیہ اور اندھیر ہے ہم کسی کا خواب دیکھیں؟ یہاں خواب کے معنی دوسرے کے ہاتھ کٹھ پتلی ہونا ہے۔ دنیا اسی مرض میں مبتلا ہے۔ کمزور قومیں آج من چاہا خواب نہیں دیکھتی اس لیے ان کے خواب کبھی تعبیر تک نہیں پہنچتے۔ صنعتِ تکرار میں آنکھیں، خواب، کسی، دیکھیں، صنعتِ مراعات النظیر میں آنکھیں خواب، صنعت ترجمہ میں خواب اور سپنا ہے۔

ریت کے گھر بنانا بچوں کا کھیل ہے جو وہ ایک پل میں توڑ دیتے ہیں۔ شاعر اس منظر سے مضمون اٹھاتا ہے۔

وہ جو ریت گھر سے بکھر گئے
وہ جو ایک پل میں اُجڑ گئے
مرے خواب تھے
ترے خواب تھے

یہاں مضمون جو ایک عام مشاہدے اور تجربے سے جو بچوں کے بنائے ریت کے گھر سے ملا، اسے شاعر نے الفاظ کی تکرار وہ، جو، گئے، خواب، تھے، سے جوڑ کر مرے اور ترے کے تضاد کے ساتھ کامیاب فنکارانہ تخلیق بنا دیا۔

اب ہم یہاں مختلف نظموں سے ''خواب'' اور ''آنکھیں'' چُن کر مضمون کی بوقلمونی، خواب اور آنکھ کی مناسبت سے دونوں کی جمالیات، علامت نگاری اور ان کی اثر پذیری بتانا چاہتے ہیں۔ امجدؔ کے پاس کائنات کے ہر شور میں سکون کی تلاش

ہے۔ایک مختصر نظم ''بارش کی آواز'' میں کہتے ہیں:

جاگتی آنکھیں
سپنوں کی دہلیز سے اپنے ریزہ ریزہ خواب اٹھانے
اور انہیں ترتیب میں لانے لگتی ہیں
مٹتی بنتی تصویریں پھر دھیان میں آنے لگتی ہیں
بارش کی آواز کو سن کر

جاگتی آنکھوں کے خواب سپنوں سے جدا ہوتے ہیں اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ جدا نہیں بھی ہوتے۔ یہاں شاعر نے بارش کی آواز میں حسن سماعت، حسن بصارت اور لمس کی لطافت کی جمالیات کو ذہن میں موجود یادوں کو جوڑا ہے اور اس طرح جاگتی آنکھوں میں وہ تصاویر لاتے ہیں جو خوابوں میں بکھر چکی تھیں۔ اسی لیے کہا گیا۔ ع: '' چھین لے مجھ سے حافظہ میرا'' یہاں خواب یاد بود اور سپنے یادوں کے جمالی رخ کے نقیب ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو خواب امجد کی امیجری میں تحت الشعور کی وہ اُپج ہے جو شعور سے رزق لیتی ہے۔ انسان خواہشوں کا پُتلا ہے۔ تمنا کے لیے کائنات کی وسعت ہیچ ہے۔ تمنا سے ہی انسان انسان رہتا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

امجدؔ تمنا کو خواب سے تعبیر کرتے ہیں اور ''اتنے خواب کہاں رکھوں گا'' میں لکھتے ہیں:

ہر اک خواب کے سرنامے پر
اپنے جگ مگ ہاتھ سے تو نے
میرے نام کے حرف لکھے ہیں
اور مری آنکھوں کا قریہ
ان کی منزل درج کیا ہے
لیکن پیارے
اب کے پھر تو تعبیروں کا خانہ بھرنا
بھول گیا ہے

ان اشعار میں شاعر بتا رہا ہے کہ جس طرح کام اپنے انجام کے بغیر بے نام ہے اسی طرح خواب تعبیر بغیر بے احساس ادھوری داستان ہے۔ خواب کو تعبیر معتبر کرتی ہے۔ اگر چہ تعبیر کا وجود خواب کی وجہ سے ہے۔ یہ اشعار خواب اور آنکھ کے ہمراہ معشوق کے ہاتھ کی جلوہ گری بھی سرنامے سخن کی نوعیت سے کر رہے ہیں۔ ان اشعار کی حیرت یہ ہے کہ یہ کس کے خواب ہیں جس کی منزل عاشق کی آنکھیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ صرف سپنوں کو آنکھوں میں بسانے کا نام محبت نہیں، بلکہ اس کی تعبیر کو نبھانے کا

نام محبت اور سچا عشق ہے جو وفا سے حاصل ہوتا ہے اور یہاں اس کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ امجدؔ کی شاعری میں لفظی مناسبت جگہ جگہ نظر آتی ہے جیسے سرنامے۔ منزل۔ لکھے۔ نام کے ساتھ خواب تعبیر۔ آنکھ وغیرہ۔

رومانیت صرف حسن و عشق کی داستان نہیں، یہ جمالیات کا چمنستان بھی ہے جس میں خالق اور مخلوق سے محبت کے علاوہ وطن سے محبت، درماندہ مظلوم کمزور لوگوں کی مدد ہمدردی اور ان کے درد میں شریک ہونا اور ان کے دردو مشکلات کو دامے، درمے، سخنے حل کرنا اور دوا کے ساتھ دعا کرنا جس کا عکس ہم امجدؔ کی ذیل کی نظم ''یہ جو وقت ہے مرے شہر پر'' میں دیکھ رہے ہیں۔ یہاں خواب اور آنکھوں کا ملاپ طاہرانہ ہے لیکن اس نظم کا انداز اور طرز دعائیہ ہے۔

کہ نواحِ چشم خیال میں وہ جو خواب تھے وہ دھواں ہوئے
وہ جو آگ تھی وہ نہیں رہی جو یقین تھے وہ گماں ہوئے
مری آنکھ میں یہ جو رات ہے مری عمر سی اسے ٹال دے
مرے دشتِ ریگِ ملال کو کسی خوش خبر کا غزال دے
یہ فلک پہ جتنے نجوم ہیں ترے حکم کے ہیں یہ منتظر
وہ جو صبحِ نو کا نقیب ہو مری سَمت اُس کو اُچھال دے

یہاں نواحِ چشم خیال، جدید علامتی ترکیب ہے۔ خواب کا دھواں ہونا ندرت بیانی ہے۔ پہلے ڈھائی مصرعوں میں صورتِ حال ہے اور آخری مصرعوں میں آرزو التجا اور دعا ہے۔ پوری گفتگو اشارات اور پیکروں میں ہے۔ وہ سوز و گداز نہ رہا، چنانچہ یقین گمان ہوگیا۔ یہاں خیال کی بوقلمونی ہے جو آنکھوں میں نہیں ہے اسی لیے آنکھ جو روشنی کا مصدر ہے رات کی طرح تاریک ہے۔ ریگِ ملال کی ترکیب بیانیہ حُسن کاری ہے جو خوش خبر غزال سے بدل سکتی ہے۔

بڑی شاعری یہ بھی ہے کہ علامتوں کو جس طرح چاہے برتے کبھی فلک پر تاریک رات میں تاروں کو روشن جگنو بنا کر تعریف کرے اور کبھی انہیں بے سود اجسام بتا کر صبح کے نور سے فنا کردے۔ یہاں شاعر کا فقرہ صبحِ نو کا نقیب ایک تازہ انقلاب کا سورج ہے۔ امجدؔ کی شاعری میں مصرعوں کی روانی اور اس کی سبک بیانی، دریا کا بہتا پانی یا کسی دوشیزہ کی چڑھتی جوانی کی طرح تیز اور دلکش ہوتی ہے جو الفاظ میں موجود داخلی لہروں کو دوسرے الفاظ کی لَے سے ملانے سے پیدا ہوتی ہے۔

اگر خواب کو اس کی الہامی قوت سے گوندھ دیا جائے تو وہ کیفِ مجہول کا مرقع بن جاتا ہے۔ امجدؔ نے ذیل کے شعر میں عمدہ ترکیب ''خواب نگر'' کے ساتھ سہلِ ممتنع میں شعر کہا ہے:

خوا ب نگر ہے، آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہوں
اُس کو اپنی جانب آتے دیکھ رہا ہوں

یہاں مضمون مجازی اور حقیقی سرحدوں پر ایک گھنے پیڑ کے سائے کی طرح دونوں دائروں پر سایا فگن ہے۔ اگر اس شعر کو عشقِ مجازی میں لیا جائے تو یہ مشاہدہ ایک خواب کی طرح ہے کہ معشوق عاشق کی آنکھوں کے سامنے اس کی جانب آرہا ہے اسے یہ لمحہ خواب جیسا لگ رہا ہے جو مشکل سے باور کیا جاسکتا ہے۔

یہاں خواب علامتی پیکر میں نئے معانی کا حامل ہے۔ اس شعر میں رعنائی خیال ہے۔ طرزِ ادا کی خوبصورتی نے شعر کو

سہلِ ممتنع بنا دیا ہے۔ مصرعہ ثانی روزمرہ میں ہے یعنی بات کرنے کے انداز میں ہے۔ اس شعر میں رومانیت کے ساتھ روحانیت کی جمالیات بھی شامل ہے۔ امجدؔ کے شعروں کی ایک عمدگی ردیف میں قافیہ کی کھپت بھی ہے جیسے آتے دیکھ رہا ہوں۔

اب کے بھی ہے جمی ہوئی آنکھوں کے سامنے
خوابوں کی ایک دھند جو پچھلے برس میں تھی

یہاں شاعر نے محبوب کی دھندلی یاد کو دھند کا پیکر بنا کر مومی پیکر سازی کی ہے اور اس کو خوابوں کی رومان پرور فضا سے جوڑا ہے۔ آنکھوں کے سامنے دھند ہو تو صاف دکھائی نہیں دیتا، راستہ معلوم نہیں ہوتا، ایک خاص ہیجانی کیفیت رہتی ہے۔ شاعر کی یادوں کا ایک دھندلا عکس زندگی کے مسائل میں حائل رہا ہے۔

امجدؔ کی ایک طولانی نظم "چلو اک خواب دیکھیں ہم" ہے۔ اس نظم میں گنگا جمنی تہذیب، محبت، سماجی، ثقافتی رواداری اور انسانی قدروں کی تربیت اور تشہیر ہے جو ایک سماج کے فرد کو اچھا انسان بناتی ہے۔ نظم کا آخری بند خواب دیکھنے کے علامتی معنوں کو ظلمات میں چاندنی، روشنی، اُجالے، بارانِ رحمت کے نظارے، تحمل صبر، بُردباری اور درگزر کرنے سے جوڑتا ہے۔ یہاں ترسیلِ معنی میں کوئی دشواری نہیں۔ کچھ مصرعوں کو چُن کر پیش کرتے ہیں۔

تو پھر آؤ
اسی بادل کے پیچھے اک نیا مہتاب دیکھیں ہم
جو کھلتا ہے ہماری مشترک خوشیوں کے آنگن میں
تحمل، صبر، حکمت، بردباری، درگزر کرنا
کریں کوشش کہ ان الفاظ کے سب گم شدہ معنی پلٹ آئیں
اور ان کی سبز خوشبو میں مہکتے ابرِ رحمت سے
دلوں کی سرزمینوں کو سدا سیراب دیکھیں ہم
چلو اک خواب دیکھیں ہم

یہاں شاعر نے نیا مہتاب صنعتِ ایہام اور ابہام میں کہا ہے یعنی روز نکلنے والا چاند نہیں بلکہ تازہ انقلابی چاند جس کی خوشیوں کی روشنی سب کے آنگنوں میں پہنچے۔ تمام اوصافِ حمیدہ کو ایک ہی مصرعے میں جواہرات کی طرح پرو کر انہیں سجایا اور قیمتی بنایا ہے۔ ابر کو رحمت سے، خوشبو کو سبزے سے، زمین کو دلوں سے جوڑ کر فصل اُگائی ہے جو سیرابی کی بدولت ہے۔ شاعر کو الفاظ کا ذخیرہ حاصل ہے۔ اس لیے مراعاتِ النظیر، لفظی مناسبت، مجاز اور کنایوں کی نمایش بھی ہے جیسے ابر، سبز، سیراب، زمینوں یا تحمل صبر بردباری، درگزر کرنا وغیرہ خوبصورت اور جدید الفاظ جوڑے گئے ہیں جیسے سبز خوشبو، خوشیوں کے آنگن، یہ جدت آمیز پیکر آرائی ہے۔

امجدؔ کی شاعری میں کھوئے ہوئے انسان کی تلاش ہے۔ چاند پر جانے والا آدمی آج اخلاقی، روحانی اور انسانی لحاظ سے اتنا گر چکا ہے کہ سمندروں کی تہوں میں اس کا مسکن ہے۔ امجد کی غزلوں میں اس مضمون پر چونکانے، غیرت اور عبرت دلانے والے اشعار کی کمی نہیں۔ پھر بھی کہتے ہیں۔

کس قدر خواب ہیں نگاہوں میں
جن کو لفظوں میں لا نہیں سکتا

کبھی ہشدار دیتے ہیں:

آنکھوں میں یہ پلنے والے خواب نہ بجھنے پائیں
دل کے چاند چراغ کی دیکھو لو نہ ہو مدھم

دنیا عمدہ لوگوں سے کبھی خالی نہیں رہی۔ جہاں ایک شخص نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اب وہ سب کی آنکھوں میں روشن ہے۔ یہ شعر صنعتِ ایہام میں ہے جو ایک مصلح پر جوڑا جاسکتا ہے جبکہ اس کا منشا قائدِ ملت کی طرف ہے۔

گھور اندھیری شب میں جو اک شخص نے دیکھا تھا
دیکھو اب وہ خواب ہے روشن کتنی آنکھوں میں

شاعری ساحری ہوجاتی ہے جب اس سے فیض اٹھانے والا شخص پیغام کا جزو ہوجائے۔ یہ عمل اسی وقت ہوتا ہے جب پیام میں صداقت اور جذبات شامل ہوں۔ امجدؔ کے اشعار ذہن کو جھنجھوڑ دیتے ہیں اس کو سرسری طور پر پڑھ کر درگزر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ بڑی دُور اور بڑی دیر تک قاری کے احساس اور اس کی سوچ کا پیچھا کر کے اسے عمل کرنے پر مجبور اور مامور کردیتے ہیں یعنی اُسے اپنا بنالیتے ہیں۔ اسی لیے تو امجدؔ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں:

یہاں سے کیوں کوئی بیگانہ گزرے
یہ میرے خواب ہیں، رستہ نہیں ہے

شاعر مطمئن ہے کہ ایک دن اس کی تمنا کا خواب تمام شہر میں پھیل جائے گا۔

حقیقت کے نگر میں، جاگتے لمحوں میں پھیلے گا
مرا خوابِ تمنا شہر کے رستوں میں پھیلے گا

غزل کا شاہکار شعر ہے۔ کون کہتا ہے امجدؔ غزل کے صفِ اول کے شاعروں میں نہیں۔ خواب دراصل حقیقت کے برعکس ہوتا ہے جسے سوتے ہوئے دیکھا جاتا ہے۔ یہاں وہ حقیقت کے شہر میں جاگتے لمحوں میں نمو کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ شاعر کی تمناؤں کا دریا ہے جو تمام شہر کو اپنی گرفت میں لے لے گا۔

یہاں خواب تمناً عمدہ اور نادر ترکیب ہے اور یہی اس شعر کا کلیدی مطلب ہے۔ شاعر نے خواب کی علامت سے تمنا کو جوڑ کر تمنا کے ساغر میں جدید شراب بھر دی ہے۔ کبھی شاعر کہتا ہے:

جو میرا خواب تھا، سیلاب بن کر
ترے دل سے گزرنا چاہتا ہے

خواب آنکھوں اور سینوں میں دفن کرنے کا شاعر قائل نہیں بلکہ وہ اسے نکال دینا چاہتا ہے تاکہ یہ آنے والے کل پر ظاہر ہوجائے:

خوابِ فردا زمیں پہ ظاہر ہو
میری آنکھوں میں پل رہا ہے کیا

ہم یہاں خواب کی بوقلمونی، مضمون اور معنی آفرینی کے ساتھ خیال کی لطافت اور قلبی جذبات کی اثر پذیری دیکھ رہے ہیں۔ امجدؔ غزل ہو کہ نظم مضمون کے تقاضوں کو عمدگی سے نبھاتے ہیں جس سے فکر وشعور میں بلندی اور بالیدگیِ روح حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے پاس تحریر میں اتنی گنجایش نہیں کہ ہم ہر مصرعے میں الفاظ کے در و بست، ایمائیت اور شاعرانہ تجربات کی عکاسی کر سکیں۔ بہرحال شاعر کی قوتِ احساس Power of feeling کو ہر مصرعہ میں درک کیا جاسکتا ہے۔ یہی شعری مقصدی بلندی بھی ہے۔

شاعر یہاں روحانی خیالات سے سرشار ہے اسی لیے ایہام سے بھی شعر میں دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ جو چاہے وہی سودا خرید لے۔

بجھ گئے تھے دِیے بھی تارے بھی
اک مرا خواب تھا کہ جلتا رہا

خواب کا جلنا ندرتِ بیانی ہے۔ انتظار محبوب کا بھی ہوسکتا ہے اور عزم و استقلال اور پاسداری کا جذبہ بھی، لیکن شعر کی خوبصورتی خواب کو چراغ کہنا اور اسے تاروں اور دِیوں کی طرح روشن رکھنا ہے ہم اس تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ شاعر نے ایک لفظ خواب کے استفادہ میں کتنی پہلو داری، زاویہ نگاری، تخیل کی گونا گونی اور رنگارنگی سے محاکاتی تصویر کشی کی ہے۔

امجدؔ کی اصل شعری شناخت نظم نگاری ہے۔ اگر حالیؔ نے مدوجزر لکھا اور اقبال نے شکوہ اور دوسرے شاعروں نے بھی اس درد کے جام کو گردشِ دوراں میں رکھا تو امجد نے بھی جہاں کہیں موقع اور محل ملا جذبوں کو برملا کیا۔ ''کھو گئے ہیں کہاں'' میں صرف دو مصرعوں میں تین بار خواب کا لفظ مصرف ہوا لیکن تمام نظم خواب ہی کے محور پر گردش کر رہی ہے۔ اس نظم کے چند مصرعوں اور فقروں کو سن لیجیے۔

کھو گئے ہیں کہاں!
وہ چمکتے دمکتے طرب خیز دن
جو ازل گیر تھے جو ابد تاب تھے
اور کیوں رک گئی
آسماں پر مرے، چاندنی سے تہی یہ لہو ریز شب
جس کی دہلیز پر خواب ہی خواب تھے
پر کسی خواب کا کوئی چہرہ نہیں
اب کسی دن کے در پر لگی لوح پر
نام تیرا نہیں نقش میرا نہیں

اس نظم کو تشریح اور تبصرے کی ضرورت نہیں۔ بولتے مصرعے اور رولتے جذبات ذہن کو جھنجھوڑتے ہیں اور ہمیں اپنے ضمیر اور وجدان کو ٹٹولنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ آخر یہ سب کیوں ہوا۔ ازل گیر اور ابد تاب کی جوڑی اور ان کی تضاد کی صنعت عمدہ

ہے۔ مصرعوں میں نغمگی اور ترنم، ہم قافیہ الفاظ چمکتے، دمکتے، تیرا، میرا کے علاوہ الفاظ کی تکرار خواب، نہیں وغیرہ سے بڑھ گئی ہے۔ کبھی شاعر کی نظموں میں سلیس سادے عوامی الفاظ ہوتے اور کبھی اس نظم کی طرح فارسی عربی کے محتشم اور پُروقار الفاظ کے گچھے جو فلک سخن پر تاروں کی جھرمٹ کا منظر پیش کرتے ہیں۔ ''طرب خیز دن''، ''ازل گیر''، ''ابد تاب''، ''لہو ریز شب''، ''بحر زماں''، ''مضمحل لوح'' وغیرہ۔ یہ امجد کی زبان پر گرفت کا سکہ ہے۔

ایک نظم ''اے راندگانِ خاک'' میں اقبال کے رنگ میں کہتے ہیں:

اٹھو زمین سے اے راندگانِ خاک اٹھو
خدا نے سر جو دیے ہیں انہیں اٹھا کے چلو
تمام سجدے بشر پر حرام ہوتے ہیں
بس ایک سجدہ ہے جائز جو اس کو زیبا ہے

پھر خواب کی متحرک مصوری اور جذبی کیفیت دیکھیے۔ ایک ہی لفظ تمام نفسیاتی کیفیتوں کو حمل کر رہا ہے۔ یہ ہے تہہ داری اور طرح داری اور کامیاب فنکاری۔

جو خواب دیکھے ہیں صدیوں تمہارے آبا نے
جو تم بھی دیکھتے جاؤ گے رات دن یوں ہی
تمہیں بھی خواب ہی واپس ملیں گے اور وہ بھی
بڑی اذیت و ذلّت بہت پکار کے بعد

ہم یہ بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مضمون کی نوعیت سے ہم یہاں دوسرے الفاظ کی تلازمات، متعلقات، نشانات صرفِ نظر کر رہے ہیں اور صرف خواب ہی کو گل چین کر رہے ہیں جو امجد کی شاعری کے کلیدی شبدوں میں شامل ہے۔

''اس گرد کے منظر نامے میں'' بڑی اثر پذیر احساسی نظم ہے جس میں علامتی لفظ خواب کے علاوہ رزق کے تلازمے سے متن کو وسعت اور مضمون آفرینی دی گئی ہے۔

کیا خواب تھے ان کی آنکھوں میں
اور کیا ان کی تعبیریں تھیں
جو سیلِ زماں کا رزق ہوئیں
وہ کیا محکم تعمیریں تھیں

سیلِ زماں کا رزق سحر طرازی اور خیال افروزی ہے۔ یہ عمل شاعر کی ذکاوتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ سیلِ زماں میں پوری تاریخ سمٹی ہوئی ہے۔ رزق میں پوری تازہ خیالی سما دی گئی ہے۔

خواب اور رزق کے تلازمات سے ''سپنے کیسے بات کریں'' میں شاعر پوچھتا ہے۔

خدشوں کی زنجیر پڑی ہے نیند بھری سب آنکھوں میں
سپنے کیسے بات کریں

سپنے کس سے بات کریں
جن لوگوں کا رستہ تکتے عمریں رزقِ خاک ہوئیں
اب وہ لوگ اور ان کے سپنے دیکھنے والی
آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں
راکھ کے اس انبار میں ہوں گے کیسے کیسے زندہ خواب
خوابوں کی اس راکھ کو لیکن چھیڑے کون؟

عمروں کا رزقِ خاک ہونا اور آنکھوں کا بجھ کر راکھ ہونا، طرزِ ادا کی جدت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک بڑے فنکار کے ہاتھ میں الفاظ موم کے حروف ہیں جن کو توڑ کر موڑ کر شکلیں بدل بدل کر وہ جیسا چاہے ویسا استعمال کر سکتا ہے اور اس سے معنی نکال سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

خاک کے اندر بھی چنگاریاں دم توڑتی باقی رہتی ہیں۔ یہ چنگاریاں دراصل زندہ خواب ہیں لیکن اس خواب کے ڈھیر کو کون کریدے۔ شاید اسی لیے امجدؔ نے اپنی نظم ''خواب سراب'' میں لکھا۔

کس قدر خواب تھے جو خواب رہے
کس قدر نقش تھے جو نقشِ سرِ آب رہے
کس قدر لوگ تھے جو
دل کی دہلیز پہ دستک کی طرح رہتے تھے
اور نایاب رہے

زندگی ایک ایسا معمہ ہے جو ساری عمر گزارنے پر بھی حل نہیں ہوتا۔ اس میں جو شش جہتی بلندی، پستی اور سطحی حالاتی کیفیات ہیں ان کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن الفاظ میں پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے مناظر اسی طرح سے کھلتے رہتے ہیں جس طرح دو آئینوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھنے سے لامتناہی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ امجدؔ کی مختصر نظم ''تلازمہ'' میں اسی کیفیت کو خوبصورت علامتوں میں فلسفے کے رنگ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

خواب آئینہ صفت
آئینے سیماب صفت
اور سیماب اُبھرتے ہوئے مہتاب صفت
عکس در عکس بھی ہیں عکس سے محروم بھی ہیں
اور دیکھو تو یہی زیست کا مقسوم بھی ہیں

آئینہ میں سچائی، سیماب میں تغیر اور تحرک اور مہتاب میں روشنی کا سفر ہلال سے کمال تک ہے اور یہ تمام اوصاف

خواب کی صفت میں موجود ہیں کہیں تسلسل کے ساتھ تو کہیں تفریق کے ساتھ، اسی لیے یہ زندگی کے نصیب بن گئے ہیں کیوں کہ اس کے خمیر میں شامل ہیں۔

شاعر نے مطلب کو واضح کرنے کے لیے الفاظ کا جو انتخاب کیا ہے اس میں موضوع کے لحاظ سے لفظوں کو چنا ہے جو اپنے علامتی معنی میں ایجاز کا اعجاز دکھا سکیں۔ الفاظ کی تکرار نے خیال کو تسلسل اور مصرعوں کو ترنم بخشا ہے۔ خواب، آئینے، سیماب، مہتاب، زیست، اپنی ذاتی شناخت رکھتے ہوئے اپنے متعلقات اور تلازمے بھی رکھتے ہیں جو معنی کے اردگرد بکھرے رہتے ہیں۔ ایسی شاعری ادب عالیہ میں شامل ہے۔ کیوں کہ اس میں طرح داری کے ساتھ ساتھ تہہ داری اور بلند خیالی ہے جو اظہار کو موثر بناتی ہے۔

امجدؔ کی شاعری کے دفتر کا عنوان محبت ہے۔ وہ ان کی شاعری کی شناخت، رومانیت کی جمالیات ہے چنانچہ اس تیز اور تند روشنی نے ان کی دوسری شعری کیفیات اور غم دوران کی واردات کی اثر پذیری کو مدھم کر دیا ہے۔ جہاں تک خواب کے مضمون کا تعلق ہے اردو کی رومانی شاعری میں خواب وہی گھسے پٹے معاملاتِ عشقی میں استعمال ہوا، اگرچہ عمدہ شاعروں نے اس گلشن میں نئے نئے گل بوٹے کھلائے جو ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ امجد اسلام کے خواب کے اشعار پر مکمل تبصرہ اس لیے بھی ممکن نہیں کہ ان کی ہزار سے زیادہ غزلوں، نظموں اور گیتوں میں ہر جگہ کم و زیادہ تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے ہم کلیں کر کے تشریح اور تبصرے کے چند اشعار نقل کرتے ہیں۔

اتنے خواب کہاں رکھوں گا؟
آنکھوں کے بازار میں اب تو تل دھرنے کی جگہ نہیں، میں
اتنے خواب کہاں رکھوں گا
جیون ایک ترازو جس کے اک پلڑے میں
تیرے وصل کا خواب رکھیں تو
دنیا بھر کی ساری خوشیاں تل جاتی ہیں

یہ سچ ہے اگر امجدؔ کے عشقیہ رومانی اشعار ان کی شاعری کے ایک پلڑے میں رکھیں تو وہ ترازوے سخن کا بھاری پلڑا ہوجاتا ہے۔ تل دھرنے کا استعمال محاوراتی ہے۔ آنکھوں کے بازار جدید فقرہ ہے۔ ترازو، پلڑے، تل مراعات النظیر ہے، تل اور تل کی تجنیس کے ساتھ ہندی کا رسیلہ لفظ ''جیون'' عمدہ نظم نگاری ہے۔

محبت اور عشق کے مضامین کی داستان سمٹے تو دل عاشق اور پھیلے تو زمانہ ہے اور اسی فسانے میں کچھ خواب جاویدانہ بھی رہتے ہیں اور کچھ خواب پرانے ہوجاتے ہیں جیسا کہ خود شاعر نے اشارہ کیا ہے۔

ہر پل دھیان میں بسنے والے لوگ افسانے ہوجاتے ہیں
آنکھیں بوڑھی ہوجاتی ہیں خواب پرانے ہوجاتے ہیں

عشقیہ واردات میں بعض خواب نقشِ سراب کی طرح جلد فنا ہوجاتے ہیں۔ یہ سچا اور دقیق اشارہ ہے۔

کس قدر خواب تھے جو خواب رہے
کس قدر نقش تھے جو نقشِ سر آب رہے

امجد کی غزلوں میں خواب پر بکھرے شعر خاص رومانیت اور جمالیات لیے ہوئے ہیں۔

تری آنکھوں کے کنج خوشبو میں
ہم کو بھی ایک خواب بونا ہے

کنج خوشبو گلشن کے معنی میں آنکھ کے گوشے سے جوڑنا نازک خیالی ہے۔ خواب بونا نیا مضمون ہے۔ خواب یہاں شجرِ محبت کا بیج ہے۔

خواب کو مسافر بنا کر آنکھ کی منزل میں ٹھکانہ دینا محاکاتی تصویر کشی ہے۔ خواب کی کشتی میں بیٹھ کر کاجل سے بھری کالی جھیل سی آنکھوں میں سفر کرنا علامتی پیکر تراشی اور متحرک مصوری ہے جو ذیل کے اشعار سے پیدا ہے۔

بھٹک رہے ہیں کسی خواب کی طرح کب سے
اس آس پہ کہ تری آنکھ میں کریں آرام

جانا ہے ہم کو خواب کی کشتی میں بیٹھ کر
کاجل سے اک بھری ہوئی چشمِ سیاہ تک

اس کے بعد بھی یقین نہیں کہ پار اتریں گے جیسا کہ خود شاعر نے بیان بھی کیا ہے۔

کچھ ایسے اس کی جھیل سی آنکھیں تھیں ہر طرف
ہم کو سوائے ڈوبنے کے راستہ نہ تھا

امجد غزل کے اشعار میں خواب اور سراب کی مشترکہ خصوصیات اور گوناگوں صفات کو خیال کی تازگی اور حسنِ معنی کی شایستگی کے ساتھ یوں ظاہر کرتے ہیں۔

اب کے سفر ہی اور تھا اور ہی کچھ سراب تھے
دشتِ طلب میں جابجا سنگِ گرانِ خواب تھے

وہ جو خواب تھے مرے سامنے جو سراب تھے مرے سامنے
میں انہی میں ایسے الجھ گیا مری بات بیچ میں رہ گئی

کبھی شاعر کہتا ہے عشق میں عاشق اور معشوق الجھے بھی رہتے ہیں۔ خواب سے اس رشتے کو دیکھیے۔

ہمارے خواب ہیں مکڑی کے جالے
ہم اپنے آپ میں الجھے ہوئے ہیں

یہ بھی سچ ہے کہ خواب، خواب ہے اور جاگنا جاگنا۔ فارسی میں سونے کو خواب اور جاگنے کو بیداری کہتے ہیں۔ ایک چھوٹی نظم میں خواب کو گمان، اور شک کے نزدیک کر کے معلوم اور نامعلوم، موجود اور ناموجود، ہست اور نیست کے درمیانی رابطے کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس چھوٹی نظم میں جدید ترکیب ''خوابِ رفاقت'' بھی مطرح کی گئی ہے۔ یہاں خواب کے ساتھ وقت کی

روانی کو بھی بتایا گیا ہے۔

ہست اور نیست کے مابین اگر
خواب کا پُل نہ رہے
کچھ نہ رہے
وقت سے کون کہے
یار ذرا آہستہ

غالبؔ نے بھی ہستی کے فریب کا ذکر کیا تھا۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ

کبھی غالبؔ خط میں لکھتے ہیں۔ لا موجود الا اللّٰہ۔ یہ تصوفی اور وجودی گفتگو ہے جس کا اس مضمون سے خاص تعلق نہیں۔

''خوابوں کو باتیں کرنے دو'' میں شاعر خواب کی رومانی زبان اور پیار کے لہجے کی بات چھیڑتا ہے کہ دنیا میں سب فانی صرف محبت امر ہے۔ کیونکہ

کھا جاتا ہے ہر اک شعلہ وقت کا آتش دان
بس اک نقش ''محبت'' ہے جو باقی رہتا ہے

آنکھوں میں جو خواب ہیں ان کو باتیں کرنے دو
ہونٹوں سے وہ لفظ کہو جو کاجل کہتا ہے

نظم ''روبرو'' میں خواب کی امیجری اور رزق سے اس کی وابستگی ہے۔ یہاں نادر جدید تراکیب ڈیڑھ درجن سے زیادہ ہیں۔ جیسے رسمِ بخیہ گری، سلکِ ایمان، ہیزمِ خشک، شہرِ کم رزق، ژولیدہ مُو، حقیقت نما خواب، آرزو پا بہ گل، خوابوں کی دہلیز وغیرہ۔ کچھ مصرعے اور فقرے یہاں پیش کرتے ہیں۔

اپنے خوابوں کی دہلیز پر مضمحل
کب سے بیٹھے ہیں عُشاق
ژولیدہ مُو اور پژمُردہ دل
رسمِ بخیہ گری
شہرِ کم رزق میں اس طرح سے بڑھی
بھوک کے زخم بھی سلکِ ایمان سے لوگ سینے لگے
معجزوں کے لیے
اپنی آنکھوں کی جھولی پسارے ہوئے خواب اوڑھے ہوئے

ہیں رواں بے جہت
بے نوا اور خجل
اپنے ہونے کے آشوب سے منفعل

اس نظم کا متن، پیکر سازی، علامتوں، تلازموں اور اشاروں میں بیان ہوا ہے۔ اس نظم کا مرکزی خیال عوامی غفلت، ناامیدی، کاہلی، بے دلی اور افسردگی ہے جو صرف معجزوں کی طلب میں بغیر کسی شرمندگی اور کوشش وسعی کے مذہب پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔ علامہ اقبال نے چار مصرعوں میں کہا تھا:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تُو باقی نہیں ہے

امجد کی نظم میں اسی ''تُو'' کی تلاش ہے جس کے نہ ہونے کا منظر نامہ، منظر کشی سے بڑھ کر مرقع کشی میں تبدیل ہوگیا ہے۔ خواب کی دہلیز پر بیٹھے رہنا اور خواب نہ دیکھنا بدقسمتی ہے۔ مردہ دل، پریشان حلیہ کے ساتھ قحط، غربت اور آسیب زدہ شہر میں مذہب کے تار سے بھوک کے زخم سینا ایمان نہیں۔ سب سے اہم چیز خود شناسی اور خود بینی ہے جو سعی، کوشش، جدوجہد اور انسانی اور اخلاقی قدروں سے حاصل ہوتی ہے جس کا دین بھی پرچار کرتا ہے۔ یہاں خوابوں کی دہلیز، خواب اوڑھے ہوئے، شہر کم رزق، آنکھوں کی جھولی عمدہ تخیل کی نیرنگی اور گونا گونی ہے۔

امجد کہتے ہیں۔

قائم کسی بھی حال پہ دنیا نہیں رہی
تعبیر کھوگئی، کبھی سپنا بدل گیا

اقبال نے کہا تھا۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ یہ ایک قدیم موضوع اور بحث کا عنوان رہا ہے۔ لیکن اس شعر کی خوبصورتی اس کا خواب اور اس کی تعبیر سے جوڑنا ہے۔ دنیا خود ایک خواب کی مانند ہے جو ہر وقت حالات، کیفیات، رجحانات اور واقعات کے تحت بدلتی رہتی ہے اور یہی نہیں جس طرح ایک خواب کی کئی تعبیریں ہوتی ہیں اُسی طرح دنیاوی مسائل کی بھی مختلف توجیہات ہوتی ہیں۔ اسی لیے ایک اور غزل کے شعر میں شاعر کہتا ہے:

جو میری آنکھ میں ٹھہرے ہیں ایک سے منظر
حریمِ خواب میں شب بھر بدلتے رہتے ہیں

حریمِ خواب کی ترکیب خوبصورت اور نادر ہے۔ انسان کی زندگی ہر دن ہر رات بدلتی رہتی ہے۔ یہی گونا گونی اور متحرک زندگانی دنیا میں انسان کی کہانی ہے۔ یہاں بلا واسطہ خواب کا وقت سے تقابل کیا گیا ہے جو مسلسل دریا کے پانی کی طرح زندگی کے پُل کے نیچے سے گزر رہا ہے۔ صنعتِ مراعات النظیر میں خواب، آنکھ، شب، منظر وغیرہ شامل ہیں۔

امجد کا ایک اور شعر اسی تغیر اور تبدیلی اور جداگانہ ڈکشن کے ساتھ یہ بتا رہا ہے کہ جس طرح زمین اور فضا ایک ہے لیکن

اس میں ایک مقام پر ایک زمان میں رہنے والے مختلف فکر اور احساس کے مالک ہیں اسی طرح اگرچہ آنکھیں ایک سی معلوم ہوتی ہیں لیکن ان میں مختلف خواب نمو پاتے ہیں۔

ایک سی ساری آنکھیں تھیں
جدا جدا تھے خواب مگر

ہم مختلف مقامات پر امجد کی شاعری کی تشریح اور تجزیہ کرتے ہوئے دُہرا چکے ہیں کہ وہ محبت کے شاعر ہیں اس لیے ہر مضمون اور موضوع میں وہ محبت، عشق، غم جاناں کی خوشبو بکھیر دیتے ہیں۔ وہ فرصت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ذیل کے شعر میں جاناں کو دوراں سے ملا کر خوبصورت ذاتی تجربات کی عکاسی اور حسن کاری کے ساتھ آپ بیتی سے جگ بیتی کی گفتگو کی ہے۔

کسی کی دھن میں کسی کے گماں میں رہتے ہیں
ہم ایک خواب کی صورت جہاں میں رہتے ہیں

شاعر کسی میں کھویا ہوا ہے جس طرح انسان دنیا کی رنگارنگی میں کھو جاتا ہے۔ شاعر کو معشوق کا یقین گمان کی طرح ہے جس طرح دنیاوی مسائل بھی اعتبار کے قابل نہیں، خواب میں ہر نقش پانی پر بنایا جاتا ہے جو لحظاتی ہونے کے ساتھ دنیا کے کئی نقشوں اور رنگوں سے مماثلت بھی رکھتا ہے۔ اسی لیے ایک اور شعر میں کہتے ہیں:

جیسے کوئی دیکھتا ہو خواب سا
اس طرح سے ہم تمہیں دیکھا کریں

یہاں صنعتِ ایہام ہے۔ خواب میں گمان کو یقین کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ خواب کے تمام رنگ بے رنگ ہوتے ہوئے بھی رنگ برنگ نظر آتے ہیں یعنی شاعر معشوق کی بے وفائی جانتے ہوئے بھی اس کو یقین کی نگاہ سے نہیں دیکھتا جس طرح خواب کو عقل اور منطق سے دیکھنے والا اسے نہیں پرکھتا۔ شعر روزمرہ میں خوش سلیقگی سے ڈھالا گیا ہے۔ اسی مطالب کو امجدؔ نے بالکل نئے پیرائے میں دشت اور سراب کو حقیقت اور خواب سے جوڑ کر پیش کیا ہے۔

دشتِ دل میں سراب تازہ ہیں
بجھ چکی آنکھ، خواب تازہ ہیں

اجڑے دل میں معشوق کی یاد کے سراب کبھی فنا نہیں ہوتے بالکل اسی طرح سے کہ آنکھوں کے یقین دلانے پر بھی حقیقت سے تہی خواب بھی تازہ خیالی، تازہ کاری اور عشق کی تازہ طرفہ کاری میں مصروف رہتے ہیں۔ امجدؔ کی شاعری میں تازہ محاورے بجھ چکی آنکھ کے علاوہ کئی لفظوں کے پیکر سازی کے نمونے بھی شامل ہیں۔

خواب نہ صرف امجد کی نظموں کے متن میں پیوست ہے بلکہ کئی نظموں کا محور اور ان کا مرکزی خیال بھی خواب ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ کئی نظموں کا عنوان خواب سے بنایا گیا ہے۔ جن سے ان موضوعات یا ان زاویوں پر روشنی پڑتی ہے جسے اب تک اُس طرح برتا نہیں گیا تھا۔ ہم یہاں عنوانات کو پیش کرتے ہیں جو اردو شاعری میں کمیاب نہیں بلکہ نایاب ہیں جیسے ''چلو اک خواب دیکھیں ہم''، ''خواب ٹوٹ جاتے ہیں''، ''اتنے خواب کہاں رکھوں گا''، ''خوابوں کی باتیں کرنے دو''، ''کوئی کسی اور کے خواب میں کیسے زندہ رہ سکتا ہے''، ''سپنے کیسے بات کریں''، ''خواب اور خدشے''، ''ہر موسم کا سپنا''، ''ایک خواب کے ٹوٹنے پر''،

''چشمِ بے خواب کو سامان بہت''، ''آخری خواب'' اور ''دل اک خواب نگر ہے'' وغیرہ۔ ایک اور حسن کاری جو امجد کے کلام میں توجہ کو کھینچتی ہے وہ ان کی جدید نادر تراکیب کے علاوہ دو یا تین الفاظ کی جوڑی ہے جو حسنِ صوری کے ساتھ حسنِ معنی کی صناعی بھی ہے جس کا کوئی نام نہیں جنگلوں میں کھلنے والے کتنے پھولوں کے نام نہیں۔ ''ایک خواب کے ٹوٹنے پر'' میں فصیلِ لب، خوابِ حضوری، ڈولتے لمحے''، ''شہیدِ رہِ ملال'' روح کی ڈوری کے ساتھ وغیرہ۔ یہاں قائدِ اعظم کا ذکر بغیر ان کے نام اور صفات کے الفاظ کی جبینوں پر کندہ نظر آتا ہے۔

جو خواب اُس نے دکھایا ہے وہ تو سچا تھا
ہر ایک رُوح کی ڈوری ہے تیری مٹھی میں
اُسے گھٹا کہ بڑھا یہ تری مشیت ہے
پر اُس کے خواب کے رستوں میں روشنی رکھنا
کوئی چراغ بجھے یا جلے مگر مولا
مرے وطن کی فصیلوں میں روشنی رکھنا

یہ اشعار دُعائیہ ہیں جسے خواب سے جوڑا ہے اور روشنی بکھیری ہے۔

یہاں ہم امجد کی گیتوں میں بھی خواب نگاری کے جلوے پیش کریں گے۔ امجد کے تقریباً پونے تین سو گیت مطبوعہ ان کی کلیاتِ گیت ''سپنوں سے بھری آنکھیں'' میں ہیں۔

یہ روشنی تو محض ایک خواب ہے
نظر نظر میں اب بھی اضطراب ہے
ابھی وفا کا راستہ کٹا نہیں ہے ساتھیو، رُکو نہیں
غموں کا جال آنکھ سے ہٹا نہیں ہے ساتھیو، رُکو نہیں

فیض نے کہا تھا:

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

شاعری میں کوئی آدھا گلاس بھرا دیکھتا ہے اور کوئی صرف آدھا خالی دیکھتا ہے، بہت کم ہوتے ہیں جن کی نظر بھرے اور خالی دونوں حصوں پر برابر پڑتی ہے۔

شاعر اپنے گیت میں آنکھ، خواب، وقت اور زندگی کے رشتوں کو ایک دوسرے میں گوندھ رہا ہے اسی لیے ان مصرعوں میں رنگا رنگی اور گنگا جمنی زبان ہے۔

چاروں اَور سمے کا دھارا
ساگر ساگر دریا دریا
اس آبی دیوار کے دل سے

نکلے گا منزل کا رستہ
یہ پایاب نہیں ہے ساتھی، آنکھ کھلی رکھنا
جیون خواب نہیں ہے ساتھی آنکھ کھلی رکھنا

ان مصرعوں میں ہندی شبدوں، اور (سمت) سے (وقت) ساگر (دریا) جیون (زندگی) کے مانوس الفاظ ترنم کا رس بھرتے ہیں اور مصرعوں کی جڑوں کو مقامی زمین میں دور تک پیوست کر دیتے ہیں جس سے گیت کا درخت آسانی سے بادِ مخالف کے جھونکوں سے نہیں اکھڑتا۔ امجد اپنی شاعری میں تمام تخلیقی قوتوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ ڈرامے، مکالمے، کالم سب ایک ہی دماغ کی پیداوار ہیں جنھیں جدا نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ ان سے فائدہ اٹھا کر شاہکار تعمیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خوبصورت چہرے میں ناک ونقشہ، آنکھ وآبرو، لب ورخسار، رنگ وزلف سب حسین ہوں تب جا کر کوئی شاعر کہے گا:

ع: تجھ کو معبود نے فرصت میں بنایا ہوگا

اشعار کی تزئینی سے پتہ چلتا ہے کہ امجد نے ان شعروں کو سنوارنے میں کتنی راتوں میں اپنے سنہرے خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھے ہوں گے۔ شاعر کا سیروں لہو جلتا ہے تب جا کر ایک آبدار شعر بنتا ہے۔ اس گیت کے شعر میں رومانی فضا دیکھیے:

تُو چلے تو ستارے بھی چلنے لگیں آنسوؤں کی طرح
خواب بے خواب آنکھوں میں جلنے لگیں جگنوؤں کی طرح

کبھی کہتے ہیں:

کیسی فرقت کیسا ساتھ
خوابوں کے اِس رُوپ نگر میں
دل ہے کھلی ہوا کا پنچھی
اس زخمی پنچھی کے ہاتھ

امجدؔ کے گیتوں میں آنکھوں کی جمالیات بھری پڑی ہے۔ ہماری اس مختصر اور اجمالی تحریر کا مقصد قاری کو ان کی شاعری کے گلشن کی سیر کرانی ہے جو مطبوعہ طور پر موجود ہے۔ کسی گیت میں کہتے ہیں۔ آنکھیں کہتی ہیں اور دوسرے میں بتاتے ہیں۔ سپنے بات نہیں کرتے۔ دونوں کی جھلک دیکھیے۔

آنکھیں کہتی ہیں
جو باتیں ہم کہہ نہیں پاتے
آنکھیں کہتی ہیں
جو منظر ہم سہہ نہیں پاتے
آنکھیں سہتی ہیں

تمام گیت روزمرہ اور سادہ زبان میں ہے اور یہی گیت کی مقبولیت کا راز بھی ہے جس کا عالم سے زیادہ عامی عاشق ہے۔

سپنے بات نہیں کرتے
راتیں جاگتی رہ جاتی ہیں
لمحے بات نہیں کرتے
چہرے بات نہیں کرتے
سپنے بات نہیں کرتے

امجد کی شاعری میں معنی کی بوقلمونی اور تہہ داری کے لیے اصناف کی قید نہیں۔ غزل ہو کہ نظم، ماہیے ہوں کہ گیت، ہنر ہر جگہ چھلک رہا ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ، کہیں آسان، کہیں ادق، الفاظ میں رعنائی خیال کی مہک بکھرتی ہی رہتی ہے۔ گیتوں میں بھی خواب کی علامتوں کی شعبدہ بازی، جذبوں کی گھلاوٹ اور بول کی مٹھاس، کام و دہن کو شیریں بنا دیتی ہے۔ اگرچہ یہاں لب ولہجہ کا رکھ رکھاؤ لطیف اور رومانیت سے رنگا ہوتا ہے۔ سوالیہ طنز دیکھیے:

رنگ آنکھوں میں بھر گئے کیسے
دل کے دریا اتر گئے کیسے
خواب کیوں راستے بدلنے لگے؟

گھٹا، بادل، رُت، برسات رومانی تلازمے برصغیر کی سنسکرت شاعری کی دین ہیں جو ہم نے دکنی شاعری کے ذریعے حاصل کیے ہیں۔ کئی محلی بولیوں میں بھی یہ اشارے بولتے ہیں۔

کل میں نے اک سپنا دیکھا
بادل کی دہلیز پہ روشن
نام ترا اور اپنا دیکھا

ایک اور گیت میں شاعر خواب کو یادوں کی برات بناتا ہے جس میں لفظوں کے دیپ جلاتا، شبنم کو ہرکارہ بناتا ہے اور تاروں کو پیغام پہنچاتا ہے تاکہ اگر تو نہیں آتا تو تیری خبر تو آجائے۔

وہ خواب محبت کا
دل بھول نہیں پاتا
ہر رات جلائے ہیں لفظوں کے دیے میں نے
ملنے کے جتن پیارے کیا کیا نہ کیے میں نے
شبنم کو کیا قاصد تاروں کو دیے نامے
آیا ہی نہیں کوئی جو تیری خبر لاتا
وہ خواب محبت کا دل بھول نہیں پاتا

امجد نے گیتوں کی کرافٹ میں آنکھوں کے سپنوں کو رومانی رنگ میں جذبات اور احساسات کو ملاتے ہوئے پیش کیا ہے جس کی وجہ سے گیتوں کے مزاج میں بناوٹ کا چلن پیدا نہ ہوا اور گیت اپنی پُروقار صنف کا پرچم بلند رکھتا گیا۔ امجد جیسے قادر

الکلام شاعر کے لیے ہر صنفِ سخن کی صوری اور معنوی حیثیت کو نبھانا مشکل بات نہیں اگر قدرت شاعری کی فطری رنگینی طبیعت میں بھر دے تو ہر نقش کو اس کے اعتبار اور شکل وصورت سے رنگین کیا جاسکتا ہے اگرچہ مضمون کو سو رنگ سے باندھنا ہی کیوں نہ پڑے۔

اُن آنکھوں سے کیسے اپنے دل کا بھید چھپائیں
تاریکی میں دیکھ سکیں جو خاموشی میں گائیں
لکھے نہیں جو لفظ ابھی تک ان کو بھی دُہرائیں
دیکھیں بے چہرہ تصویریں
جانیں خوابوں کی تعبیریں
سپنا سپنا رنگ بھریں یہ
یاد آئیں اور تنگ کریں یہ
ہر منظر میں سنگ رہیں یہ

گیت کی جان پہچان آن بان شان نغمگی ہے۔آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ہر لفظ ترنم خیز ہے، چھپائیں، گائیں، دہرائیں، تصویریں، تعبیریں، بھریں، کریں، رہیں۔ رنگ، تنگ، سنگ کے علاوہ الفاظ کی تکرار جیسے سپنا، وغیرہ۔ یہ طلسمی اثر ذہن پر ہوتا ہے تو قاری کی روح بھی اس لیے اس میں گھل مل جاتی ہے اور اس طرح گیت رگ وپے کا جزو ہو جاتا ہے۔

کئی گیتوں کے مطلعوں یا ابتدائی بندوں کو خواب کے دریچوں سے کھولنے کا فن کوئی امجد کی گیت نگاری سے سیکھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے موجودہ نستعلیق نما شاعروں نے گیت کو اپنے شایانِ شان نہیں سمجھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ گیت کے شایانِ شان نہیں کیوں کہ گیت ہیں شاہ اور ان کی شان بہت کم نظر آتی ہے۔

دل کا بھید چھپے گا کیسے
آنکھیں تو بدنام کریں گی
جھوٹ کہے گا سپنا کیسے

کیسے اُتروں پار
بادل بادل تیری آنکھیں دریا دریا خواب
چاروں جانب پھیل رہی ہے کاجل کی آواز
کیسے اتروں پار

جس گیت میں گیتی کی لے نہ ہو، حسن کی ریت نہ ہو، میت کی بات چیت نہ ہو وہ ادھورا ہے۔ یہاں الفاظ کاغذ پر بکھرنے سے پہلے جذبوں کا لباس پہن لیتے ہیں جیسے

سُن ری پوَن سُن رات کہے کیا
آنکھوں میں جاگ اٹھے سپنے پیا
سپنے پیا تیرے سپنے پیا

کہیں عشق کے اثر سے خواب سہانے، غم بیگانے اور دن دیوانے ہوجاتے ہیں جس کو وہی محسوس کرسکتا ہے جو اس دریا میں اترا ہے۔

ہر اک چیز بدل جاتی ہے عشق کا موسم آتے ہی

امجد نے خواب کو پہیلی کی شکل میں بُوجھا ہے۔

تیری آنکھ میں گر جائیں تو سارے خواب سراب
قسمت ایک پہیلی جس کا تیرے نین جواب

ایک اور گیت کے بول سنیے اور سر دُھنیے!

جاناں میری بانہوں سے کہیں اور نہ جانا
چاہت کے حسیں خواب میں کھوجائیں گے دونوں
پھولوں کی ردا پہن کے سوجائیں گے دونوں

امجد کے کچھ غزل کے اشعار مزید گفتگو بغیر جو خواب اور آنکھ کے رابطے سے ربط رکھتے ہیں یہاں نقل کرتے ہیں۔ ہر شعر خود اپنی جگہ ایک خوبصورت اور کامیاب فنکارانہ تخلیق ہے۔

کھلی آنکھوں سے ساری عمر دیکھا
اک ایسا خواب جو اپنا نہیں تھا

کچھ خواب ہیں کہ جن کے لیے در بدر ہُوں میں
ورنہ ترے دیار میں رکھا ہے اور کیا

نہ جانے کیسے چلا آیا ایک خواب میں وہ
پھر اس کے بعد تو سونا مجھے حرام ہُوا

کوئے قاتل میں چلے جیسے شہیدوں کا جلوس
خواب یوں بھیگتی آنکھوں کو سجانے نکلے

تعبیر کے دیوں میں ہے خوابوں کی روشنی
رہتی ہے ایک یاد بھی ہجرت کے ساتھ ساتھ

وہ سپنا جس کی صُورت ہی نہیں ہے
مری آنکھوں میں پلنا چاہتا ہے

یہ جو اک خواب ہے آنکھوں میں نہفتہ مت پوچھ
کس طرح ہم نے زمانے سے بچا رکھا ہے

کہیں بے کنار سے ریتگے کہیں زر نگار سے خواب دے
ترا کیا اصول ہے زندگی مجھے کون اس کا جواب دے!

بہار آئی تو تتلیوں کے پَروں میں رنگوں کے خواب جاگے
اور ایک بھنورا کلی کلی کے لبوں کو رہ رہ کے چُومتا تھا

اک نام کی اڑتی خوشبو میں اک خواب سفر میں رہتا ہے
اک بستی آنکھیں ملتی ہے اک شہر نظر میں رہتا ہے

پاؤں سے خواب باندھ کے شامِ وصال کے
اک دشت انتظار کو جادہ کیے ہوئے

زندہ نظر نہ آئے گی تعبیر کیا کبھی
مرتے چلے ہی جائیں گے آنکھوں میں خواب کیا؟

نرم تھی لکڑی خوابوں کی
تیز سے کے آرے بھی

اگرچہ امجدؔ کے ہر شعر پر تبصرہ کرنے کو دل بڑھتا ہے لیکن مضمون کی طوالت ہمیں روکتی ہے۔ اعجاز حسین بٹالوی نے بہت ایمانداری سے کہا تھا۔ امجدؔ کی شعری ڈکشن میں خواب کا لفظ بہت حاضری دیتا ہے۔ کچھ رومانی اشعار پر بات ختم کرتے ہیں۔

147

اشک بہت تھے آنکھوں میں
ورنہ خواب بچھاتا میں

کیا کیا ہمارے خواب تھے جانے کہاں پہ کھو گئے
تم بھی کسی کے ساتھ ہو ہم بھی کسی کے ہو گئے

ان کے ہونے سے ہے وابستہ مری آنکھ کا رزق
اپنے خوابوں سے کہو دوست کہ آتے جائیں

مری آنکھوں میں جو اک خواب تھا جس میں تم تھے
کیوں وہ غلطیدۂ خوں ہے کبھی سوچا تم نے

برگزیدہ اور امجدی نظموں کا تجزیہ

امجدؔ شناسی شعریت کی بنیاد پر کم ہوئی ہے یعنی ان کی وہ نظمیں جو ذات اور کائنات فہمی سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے ہمیں کون و مکان کے رموز اور خالقِ کائنات کی معرفت حاصل ہوتی ہے اُس سے عوام تو کجا خواص بھی واقف نہیں۔ شاید آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کریں گی چونکہ امجدؔ چھپ چکا ہے اور سچ ہے۔ ع: چھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد۔ امجد کی نظم ''آبِ حیات'' ہمیں آبِ حیات پی کر جاوداں ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ قرآن مجید کی آیت اکثرھم لا یعقلون کے معنی یہ نہیں کہ اکثریت عقل نہیں رکھتی بلکہ اکثریت تعقل نہیں کرتی وہ گل بوٹے میں صناعِ خدا نہیں دیکھتے، وہ کائنات کے جمادات، نباتات، حیوانات اور اشرف المخلوقات کی الواح کے نقش کو پڑھ کر معرفت کی منازل اور زمین و زماں کو تسخیر نہیں کرتے جن کی طرف اقبال نے کئی مقامات پر اشارے کیے ہیں۔ انسان کچھ نہیں سوائے کوشش اور سعیِ پیہم کا جو قرآنی اشارہ ہے۔ وہ بھی ہمیں دیمک کا رزق بننے سے پہلے کام اور کوشش کا درس دیتا ہے۔ اسی لیے بہتر یہ ہے کہ جو کچھ بھی سینے میں تجربات اور مشاہدات سے حاصل ہوا ہے خاک ہونے سے پہلے خاک پر اُگل دیں تاکہ اس خاکدان کے چمنستان میں ہمارا نام بھی برگزیدہ ہستیوں کے ساتھ شامل ہوجائے۔ یہ مختصر سا امجد کی نظم کے ان حصوں کا تحلیلی اور تجزیاتی تبصرہ تھا جسے ہم یہاں کچھ بند چھوڑ کر پیش کر رہے ہیں۔

آتے جاتے موسموں کی لوح پر
لکھے ہواؤں نے
بہت سے لفظ ایسے
جن کے معنی اب کسی کو بھی نہیں آتے

نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ ماضی میں تو زندہ ہیں
مگر کچھ اس طرح جیسے
مشینوں کے توسط سے کوئی ''کومے'' میں زندہ ہو
مگر اک وقت آئے گا
کہ یہ مفہوم کی پوشاک پہنیں گے
بلند آواز میں بولیں گے اور باتیں کریں گے

ہمیں معلوم ہے اک دن
گزرتے وقت کی دیمک ہمیں بھی چاٹ جائے گی
کہ یہ اس کا وظیفہ ہے
یہ روشن دن جو نکلا ہے یہ آخر شام بھی ہوگا

تو اس دیمک کا رزقِ بے نشاں بننے سے پہلے
آخری حیلہ تو کر دیکھیں
جو کاغذ اپنے حصے کا ہے وہ کاغذ تو بھر دیکھیں
کہ وہ الفاظ جن کے آج تک معنی نہیں ظاہر
ہم ان کا بھید پا جائیں

ہم ان لفظوں کے پوشیدہ معانی جان پائیں تو
سمے کی لوح پر لکھے ہوئے کچھ خاص ناموں میں
ہمارا نام بھی ہوگا۔

اکیسویں صدی کی اردو شاعری کو جو کئی چیلنج درپیش ہیں ان میں سب سے اہم ترسیلی مسئلہ ہے یعنی ہم عوام کو اور جدید نسل کو آسان فہم جدید تشبیہوں اور استعاروں سے سمجھائیں، الفاظ سادے، سلیس اور مطلب صاف اور شفاف ہو تو ادق اور رموزی گتھیاں بھی بڑی حد تک سلجھتی جاتی ہیں جیسے اسی نظم میں ''کوئی کومے میں زندہ ہو' وقت کی دیمک چاٹ جائے گی،'' اپنے حصے کا کاغذ تو بھر دیکھیں'' سمے کی لوح پر'' وغیرہ وغیرہ۔

ٹی ایس ایلیٹ لکھتا ہے جس شعر و ادب میں ادبِ عالیہ ہوتا ہے وہ نہیں مرتا، ایسی نظمیں ادبِ عالیہ کی نشانیاں ہیں جو ہماری شاعری کی بقا کی ضامن ہے۔ ضروری نہیں کہ صرف مشاعروں کی غزلوں سے مست ہوں جہاں عموماً تحسینِ ناشناس کا غلغلہ ہے۔ ایسی نظمیں فکری سرمایہ ہے جو دماغ کو جلا اور جہالت کو جلا دیتی ہیں۔

امجد کی عمدہ نظموں میں ایک شاہکار نظم ''یہ لمحے اس کے نام کریں'' جو انسان کے درد، اخلاق کے درس کے علاوہ تاریخ، جغرافیائی فرق اور زمان و مکان کی کہانی سناتی ہے نسبتاً طولانی ہے اس کے موضوعات متنوع ہیں لیکن ایک دوسرے سے جڑے ہیں۔ نظم چھ (۶) حصوں میں منقسم ہے۔ اس نظم کا آہنگ بلند اور لہجہ دبنگ ہے۔ خیالات تو اپنی جگہ عالی قدروں سے سجے ہوئے ہیں لیکن جگہ جگہ پر حُسنِ بیان کی روشنی کہیں تشبیہہ، کہیں استعارہ، کبھی مجاز تو کبھی کنایات بن کر بکھری نظر آتی ہے۔ اس میں اردو کے علاوہ حسبِ ضرورت ہندی کے رسیلے الفاظ سے لے کر فارسی، عربی کے مجرد اور مرکب لفظوں کو برتا گیا ہے۔ جدید تراکیب کے بت تراشنے میں امجد کسی ادبی آذر سے کم نہیں۔ اس ایک نظم میں نئی تازہ ترکیبوں میں گلِ حرف، کنجِ لب، گماں آبادِ ہستی، ابرِ یقیں، چشمِ خوش وغیرہ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ نظم میں کئی ذہنی سوالات کے ساتھ ساتھ نکات بھی نمودار ہیں مثلاً

ازل کیا ہے
اگر وہ ہے تو اس سے قبل کی تقویم کیسی تھی!
ابد کے جس کنارے کی طرف اپنے تئیں
ہم سب روانہ ہیں
کہاں ہے وہ!

زمیں زادوں کی قسمت میں اگر مٹی ہی لکھی تھی
تو پھر یہ ہاؤ ہو کیا ہے
زمیں کی بات نکلی ہے تو یاد آیا
یہ جتنے فاصلے ہیں
آدمی اور آدمی کے درمیاں
ان کی مسافت میں لہو جتنا بھی بکھرا ہے
دلِ آدم سے نکلا ہے

شاعر وہی فرشتوں کی پیشین گوئی کا زندہ ثبوت پیش کر رہا ہے کہ انسان زمین پر فساد پھیلانے والا ہے۔ اس نظم کا سب سے اہم اور سچا حصہ تاریخ کے بارے میں ہے۔ ہم جانتے ہیں تاریخ حکمرانوں، طاقتوروں، جنگ جیتنے والوں نے لکھی یا لکھائی ہے یاں کچھ واقعات اور حقائق جو گوشہ نشینوں نے اپنے قلم سے اور کچھ جاں بازوں نے اپنے خون سے تختہ دار پر لکھے وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے اوراق کی سنہری اور سرخ تحریر بن کر ظاہر ہوئے۔ اس نظم کے حصے کو پڑھیے اور سر دُھنیے:

''ہوس کے اک مسلسل خواب کی تعبیر ہے دنیا
جسے تاریخ کہتے ہیں
یہ کچھ طاقتوروں کے ظلم کے قصوں کا ملبہ ہے
غلاموں اور کنیزوں کے کہیں بازار لگتے ہیں
سگے بیٹوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری جاتی ہیں
ہوس میں تختِ شاہی کی
برادر اور برادر زادگاں دشمن ٹھہرتے ہیں
خود اپنے ہاتھ سے گردن اڑا دیتے ہیں
اُس کی بھی
کہ جس کا خون ہوتے ہیں

ہر اک رشتے کا حلقہ ایک پل میں ٹوٹ جاتا ہے
مگر پھر بھی
مؤرخ امن سکھ اور چین لکھتا ہے
(کہ آخر اس مؤرخ کو بھی کچھ دن اور جینا ہے)

تاریخ نویسی کی اردو شعریات میں ایسی صاف شگفتہ، سچی اور جذباتی دستاویز نہیں جس کا ہر لفظ آئینہ ہے اور آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا بلکہ عکس دکھا دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا اس کا شاعرانہ اظہار نظم کے آخری مصرعے سے ملتا ہے کہ تاریخ جبر و استبداد کی تحریر ہے۔

امجدؔ محسوسات کا شاعر ہے۔ احساس کی کرشمہ سازی ان کی شاعری میں ہر جگہ بکھری پڑی ہے۔ احساس حواس سے بھی ہوسکتا ہے اور شعور کی فکر پیمائی۔ یعنی محبوب کی چاپ اور اس کے قدموں کی آہٹ عاشق کو متاثر اور منقلب کرتی ہے اور اسی طرح معشوق کا تصور میں حاضر ہونا بھی پُرکیف ماحول بنا دیتا ہے۔ امجد کی ایک مختصر آزاد نظم ''صدائے آشنا'' ہے جس میں آہٹ کو دونوں طرح سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ آہٹ تو صرف سننے سے تعلق رکھتی ہے جب کہ بقول فارسی مقولہ سنا کب دیکھنے کے برابر ہوسکتا۔ شنیدن کہ بود مانندِ دیدن۔

ہم یہاں امجد کی نظم پیش کرنے سے پہلے فیضؔ کے چار مصرعے لکھتے ہیں جن کا محور معشوق کی ''یاد'' ہے جو صرف تصوراتی اور فکری ہے اور جسم سے اس کا تعلق نہیں۔ یہاں ہم تقابل نہیں بلکہ اردو شاعری کے تنوع کو ظاہر کر رہے ہیں کہ یاد کیا کیا کرسکتی ہے۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

اب دیکھیے محبوب کی چاپ یا آہٹ انتظار کے لمحوں کو کیسا بدل دیتی ہے۔

تری آہٹ
سلگتی دوپہر کو ایک پل میں شام کرتی ہے
اُترتی ہے سوادِ ہجر میں کچھ اس طرح سے
صدائے آشنا کوئی
گھنے گہرے اندھیرے جنگلوں کی بے یقینی میں
رخِ منزل دکھاتی
روشنی کا کام کرتی ہے

سلگتی دوپہر کو سہانی شام بنانا، ہجر کی بے نوائی کو صدائے آشنا کرنا، جنگلوں میں منزل کا راستہ دکھانا اور ظلمتوں کو

روشنیوں میں تبدیل کرنا جس کے قدم کی آہٹ ہو، اس کی بات کی مٹھاس اس کے چہرے کی تب و تاب کیسی ہوگی۔

امجد کے پاس بھی فیضؔ کے قطعہ کی طرح ایک چار مصرعوں کی نظم ہے ''تیرے دھیان کی تیز ہوا۔''

پت جھڑ کی دہلیز پہ بکھرے
بے چہرہ پتوں کی صورت
ہم کو ساتھ لیے پھرتی ہے
تیرے دھیان کی تیز ہوا

اس نظم میں منظر کشی اور خیال تھا ایک دوسری چار مصرعوں کی نظم ''ہر موسم کا سپنا'' میں خواب اور وقت کا تعلق کسی یاد سے منسوب ہے۔ شاعری کے ایک آہنگ میں درجنوں ڈھنگ ہوتے ہیں۔

موسم موسم آنکھوں کو اک سپنا یاد رہا
صدیاں جس میں سمٹ گئیں وہ لمحہ یاد رہا
قوسِ قزح کے رنگ تھے ساتوں اس کے لہجہ میں
ساری محفل بھول گئی وہ چہرہ یاد رہا

امجدؔ کی ایک طولانی نظم ''اس گرد کے منظر نامے میں'' ہے۔ یہ شاہکار نظم ہے اس میں امجدؔ نے قوم کے ماضی سے ان کے جدید دور کو ملانے اور اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم کا لہجہ اقبال کے ڈکشن کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس نظم کی زبان اور الفاظ کا رچاؤ بھی امجد کی عام شاعری سے الگ ہے۔ اس نظم میں درس بھی ہے اور آدرش بھی ہے۔ ہم صرف کچھ حصہ چُن کر یہاں رکھتے ہیں۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

تاریخ کی اُلجھی گلیوں میں
کچھ ڈھیر پڑے ہیں ملبے کے
ملبہ جو ہمارے درد کا ہے
ہر منظر دھندلا دھندلا ہے
کچھ ایسا پردہ گرد کا ہے
وہ لوگ جو آگے گزر گئے

کیا خواب تھے ان کی آنکھوں میں
اور کیا ان کی تعبیریں تھیں
جو سیلِ زماں کا رزق ہوئیں
وہ کیا محکم تعمیریں تھیں

اور خلقِ خدا کی قسمت کے
جو مالک بن کر بیٹھ گئے
لاشوں پر مسند رکھی اور
پھر اُس پر تن کے بیٹھ گئے

اور وہ جو علم کے جُویا تھے
تاروں پہ کمندیں ڈالتے تھے
وجدان کے سکّے ڈھالتے تھے
اور وہ جو عشق کے رُسوا تھے
جو مرزا، رانجھن، ہیر ہوئے
باطن میں اتر کر حرفوں کے
جو غالبؔ خسروؔ میرؔ ہوئے
یہ سب اور ان سے اور کئی
اس سیلِ زماں کا رزق بنے

امجدؔ کی ایک مختصر سی مگر بلیغ نظم ہے۔ ''اسی ایک نقش کے عکس ہیں'' اس نظم میں شاعر نے مختلف مطالب اور فلسفوں کو الفاظ کے عناوین سے ظاہر کیا ہے جن میں یقین و گمان، زمین و زمان، نقش و عکس، آرزو و جستجو، دشت و باغ، ڈال اور پھول ہیں۔ ان الفاظ کو اگر کھولیں تو تہہ در تہہ معنی برآمد ہوتے ہیں۔ تمام نظم کا محور تصوفی قدر ہمہ اوست اور ہمہ از اوست۔ شاعر نے کتنے سادے اور خوبصورت الفاظ مصرعوں کے رشتے میں موتیوں کی لڑیوں کی طرح باندھ دیے ہیں۔ اس نظم کو پڑھنے میں پل دو پل کا وقت لگتا ہے مگر سمجھنے کے لیے ساری عمر بھی کافی نہیں۔ پوری نظم بغیر کسی کمی و کسر کے یہ ہے۔

اُسی ایک نقش کے عکس ہیں
یہ زمین بھی یہ زمان بھی
جواں آرزو کے صنم کدے
تھکی جستجو کے جہان بھی
وہی ایک موجِ نمود ہے کبھی دشت میں کبھی باغ میں
اُسی ایک ڈال کے پھول ہیں
یہ یقین بھی یہ گمان بھی۔

شاعری میں دقیق مشاہدہ کی امیجری بڑی شاعری میں شمار کی جاتی ہے۔ ادھ بھرے گلاس کو تو ہر چشم بینا دیکھ سکتی ہے لیکن آدھے خالی گلاس پر وہی آنکھیں جمی رہتی ہیں۔ جو دقیق بینی اور تخیل کے راستوں سے آشنا رہتی ہیں۔ امجد کی شاعری میں

قوتِ متخیلہ سے استفادہ کرشمہ نگاری کا ضامن نظر آتا ہے۔ ''خوابوں کو باتیں کرنے دو'' کی نظم سے دو چار مصرعے دیکھیے:

ے ہونٹوں سے وہ لفظ کہو جو کاجل کہتا ہے
ے بادل کی دہلیز پہ تارے کیوں کر بیٹھے ہیں
ے کھا جاتا ہے ہر اک شعلہ وقت کا آتش داں
ے آنکھوں میں جو خواب ہیں ان کو باتیں کرنے دو

امجدؔ کے پاس ایک چھوٹی سی نظم ''یاد'' کے نام سے موجود ہے۔ یاد، خیال، دھیان، وچار، فکر، سوچ وغیرہ شاعری کا ایک ایسا گھنا توانا پیڑ ہے جس کا سایہ مجاز اور حقیقی دائروں پر نظر آتا ہے۔ غزل کے شاعروں نے خصوصی طور پر اس موضوع کو نت نئے طریقوں سے برتا ہے۔ اردو ادب کے درجنوں اشعار صدیوں کے گزر جانے کے بعد اپنی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ مومنؔ کے سہل ممتنع کے معروف شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سے بشیر بدرؔ کے عوامی شعر تک:

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

اس مضمون میں تازگی اور دلربائی ملتی ہے کیونکہ یہ شاعر کی صرف آپ بیتی نہیں بلکہ جگ بیتی بن جاتی ہے۔

نظم کی ایک خوبصورتی یہ بھی ہے کہ مصرعوں کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے مضمون کو پھیلا کر اس میں رنگ برنگ کے موضوعات کو بکھیرا جاتا ہے جس سے ذہن میں سیرِ گلشن کا کیف حاصل ہوتا ہے اور یہ عمل قاری اور سامع کے فکری اقلیم کو فتح کر لیتا ہے جس طرح ذیل کی نظم ''یاد'' کے مصرعوں اور فقروں میں شاعر نے یاد کی خوشبو، یاد کے پیکر، یاد کے چہرے، یاد کے سائے، یاد کی سُن گن سے یاد کے موسم کا بہار نامہ لکھا ہے۔ ہم صرف چند مصرعے یہاں لکھ کر پوری نظم پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس موسم میں جتنے پھول کھلیں گے
ان میں تیری یاد کی خوشبو ہر سو روشن ہوگی
اِس موسم میں جتنے تارے آسمان پہ ظاہر ہوں گے
اُن میں تیری یاد کا پیکر، منظر منظر عریاں ہوگا
اس موسم میں
دل دنیا میں جو بھی آہٹ ہوگی
اُس میں تیری یاد کا سایہ گیت کی صورت ڈھل جائے گا

امجد کی شاعری میں روز مرہ کی زبان کی چاشنی ہے جس میں خارجی روزانہ استعمال ہونے لفظوں کی رنگینی ہے۔ یہ Adopted Children کی طرح اپنا علاحدہ شجرہ رکھتے ہوئے بھی اردو فیملی کے ساتھ خوش وخرم زندگی بسر کرتے ہیں۔ اردو ئے

معلّٰی اور اردوئے محلہ کا یہ فرق بڑی شاعری میں بھی دیکھنے میں ملتا ہے جہاں ہندی اور مقامی بولیوں کے نرم رسیلے اور شگفتہ لفظوں سے شاعری کو زمین سے جوڑا جاتا ہے۔ امجد کی شاعری میں یہ عمل زیادہ تر نظموں میں خوبصورت ڈھنگ سے پیش ہوا ہے۔ جہاں غربت اور غیر مانوسیت پیدا نہیں ہوتی بلکہ ابلاغ اور ترسیل میں آسانی ہوجاتی ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ امجد فلسفی نہیں لیکن فلسفہ جس کا دوسرا نام سوچ کا پیچیدہ طرزِ بیان ہے امجد کے کلام میں موجود ہے۔ ہر ذی شعور شخص جو سوچ وچار کرتا ہے کئی منطقی اساطیری فلسفی اور کمپلکس خیالات میں ملوث رہتا ہے۔ دنیا حیرت خانہ ہے یہاں کا ذرّہ ذرّہ اداکاری میں مصروف ہے۔ بہت سے ع: ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں۔'' امجد کی ایک نظم کا عنوان ''کیوں'' ہے۔ کیوں تعلیم کا دوسرا زینہ ہے۔ بچے کا پہلا سوال ''کیا ہے'' ہوتا ہے جب وہ اس منزل سے گزر جاتا ہے تو ''کیوں'' کے دائرے میں قدم رکھتا ہے جو اُسے لحد تک ساتھ رکھتا ہے۔ اس نظم کا حُسن یہ ہے کہ ہر مصرعے میں الفاظ کے درمیان نسبت موجود ہے۔

ہر موج کے دامن میں بیدار جو دریا ہے
اک ریت کے ذرّے میں آباد جو صحرا ہے
بے انت سوالوں کی زنجیر ہے یہ دنیا
اُس عکس کے سایوں کی تصویر ہے یہ دنیا
کیوں چاند نہیں بجھتا کیوں رات نہیں جلتی
کیوں خواب بھٹکتے ہیں کیوں آس بکھرتی ہے
اس ایک تسلسل سے کیوں وقت نہیں تھکتا
بس ایک تحیّر میں کیوں عمر گزرتی ہے

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب ''معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد'' ہے۔

امجد کی رومانی یا رومان پرور شاعری میں محبت کے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر اشعار ملتے ہیں لیکن ان کے شعروں کی معنویت اصلیت اور فنکارانہ توجہ محبت کے باطنی اقدار کے گرد طلایا گردی کر کے ان کی حفاظت اور ستایش کرتی رہتی ہے۔ اس وجہ سے اشعار میں بلندی اور پاکیزگی کی جھلک اور مہک سما جاتی ہے اور بعض اوقات عشق حقیقی اور مجازی کی پہچان مٹ جاتی ہے۔ امجد کی ایک نظم ''پھر پکاریں اُسے'' نظم کا انداز، لہجہ کا بہاؤ، مضمون کی بوقلمونی دیکھیں۔ اگر اس مصرعہ میں ایک دو مصرعے تخاطبی اور نام لیوانہ ہوتے تو بھی فکری گردش برقرار رہتی۔ ہم یہاں نظم کے صرف چند مصرعے لکھ رہے ہیں۔

پھر پکاریں اُسے
آخری مرتبہ پھر پکاریں اُسے
گرد بادوں کو منزل بناتے ہوئے
زخم کھاتے ہوئے مسکراتے ہوئے
آؤ مل کر ذرا آج ڈھونڈیں اسے
اس قدر زور سے اس کو آواز دیں

آسماں اور زمیں ٹین کی چادروں کی طرح بج اٹھیں
اس کو اخبار کے ہر ورق پر جلی سرخیوں سے لکھیں
تم جہاں پر بھی ہو، لوٹ آؤ اگر تم نہ آئے
تو سجدوں کی بیمار بوڑھی روایت بکھر جائے گی
ریڈیو اور ٹی وی پر اس سے کہیں
تم اگر ہو تو آؤ تمہارے لیے ہم گھروں میں دیے
اور دلوں میں عقیدت کی شمعیں جلائے ہوئے منتظر ہیں
تمہارے بِنا روشنی اپنے سایہ سے ڈر جائے گی

یہ سراسر محبت بھری نظم ہے جس میں استغاثہ درد اور ضرورت دل کی تہوں سے لبوں پر اُبل رہے ہیں۔ کہتے ہیں دل سے دل کو راستہ ہوتا ہے یہ اُسی راستے کی بانگِ جرس ہے یہاں دانستہ طور پر میں نے چند مصرعوں کو شامل نہیں کیا تاکہ حمد کی کرشمہ سازی اور رنگا رنگی جو امجد کی جدید اور جدت بھری شاعری کی دین ہے ظاہر ہو سکے۔

زیرِ لب حمد یہ گیت گاتے ہوئے
آؤ مل کر ذرا آج ڈھونڈیں اسے
وہ جو کہتا ہے میں ہر جگہ ہوں، چلو آج دیکھیں اسے

اکیسویں صدی کی نئی شاعری اپنے ماحول سے لپٹے ہوئے اخباروں، ریڈیو اور ٹی وی یعنی تبلیغ کے لیے تمام جدید ذرائع استعمال کر رہی ہے اور حمد نئے آہنگ میں معرفتِ الٰہی کا نغمہ گا رہی ہے۔ یہاں مطالب سطروں کے درمیان اور لفظوں کے اجسام میں دفن ہیں۔ جلوہ گاہِ الٰہی اور رحمتِ یزداں ان قوموں سے منہ پھیر لیتی ہے جو نورِ الٰہی پر دل کے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ یہ پکارنا کیا ہے۔ یہ گڑگڑانا، زخم کھا کر مسکرانا سب عاشق کے منازل ہیں معشوق تک پہنچنے کے لیے اُس کی رحمت کو دعوت دینے کے لیے۔ اصل روشنی نورِ الٰہی ہے۔ ورنہ ہر ظاہری روشنی تاریکی سے بدتر ہے۔ دلوں میں روشنی صرف تجلیٔ پروردگار سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ امجدؔ نے کہا ہے۔

تمہارے بِنا، روشنی اپنے سایہ سے ڈر جائے گی

امجدؔ اسلام کی ایک شاہکار اور مشہور نظم جو تقریباً ہر مشاعرے میں اصرار کر کے پڑھوائی جاتی ہے۔ ''تمہیں مجھ سے محبت ہے۔'' محبت کے بیکراں سمندر میں غوطہ زن ہو کر مختلف شاعروں نے لولو و مرجان ہی نہیں بلکہ انواع و اقسام کے آبدار مروارید اور درشہوار بھی نکالے ہیں۔ امجدؔ نے اپنی اس رواں دواں احساساتی جذباتی نظم میں محبت کی اُس بے قراری اور اضطراب کے ایک گوشے پر روشنی ڈالی ہے جس کو خود شاعر کے لفظوں میں تائیدِ تازہ، اظہار، تکرار اور اقرار کی ضرورت رہتی ہے۔

محبت کی طبیعت میں عجب تکرار کی خُو ہے
کہ یہ اقرار کے لفظوں کو سننے سے نہیں تھکتی
بچھڑنے کی گھڑی ہو یا کوئی ملنے کی ساعت ہو

اسے بس ایک ہی دُھن ہے
کہو۔ مجھ سے محبت ہے
کہو۔ مجھ سے محبت ہے
کچھ ایسی بے سکونی ہے وفا کی سرزمینوں میں
کہ جو اہلِ محبت کو سدا بے چین رکھتی ہے
کہ جیسے پھول میں خوشبو کہ جیسے ہاتھ میں پارا
کہ جیسے شام کا تارا
یقیں کی آخری حد تک دلوں میں لہلہاتی ہو
نگاہوں سے ٹپکتی ہو، لہو میں جگمگاتی ہو
ہزاروں طرح کے دلکش حسیں ہالے بناتی ہو
اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے
اِسے تائید تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے

شاعر نے اس نظم کے چہرہ میں محبت کی طبیعت میں بچپنا دکھا کر بچوں کی طرح بے صبری اور معصومیت کا عمل دکھایا ہے جو محبت کرنے والوں کا لاشعوری مزاج رہتا ہے جہاں عینِ وصل میں بھی ہجر کا خدشہ اور گماں رہتا ہے۔

اس نظم میں تازگی اور معنی آفرینی سے لبریز ایسے مصرعے موجود ہیں جو غزل کے مصرعوں کو شرمندہ کرتے ہیں:

زمیں سے آسماں تک جس قدر اچھے مناظر ہیں
محبت کے کنائے ہیں، وفا کے استعارے ہیں
ع: محبت جس طرف جائے زمانہ ساتھ چلتا ہے

نظم کا اقرار اور اضطراب خوبصورت متحرک تشبیہات کی وجہ سے احساس میں شدت اور جذبے میں کیفیت پیدا کرتا ہے جسے معنی آفرینی کی معجز بیانی کہہ سکتے ہیں۔

محبت کے اقرار کے پیمانے۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔
سمندر سے کہیں گہری، ستاروں سے سوا روشن
پہاڑوں کی طرح قائم، ہواؤں کی طرح دائم

اضطرابی کیفیت کی تمثال سازی۔

کہ جو اہلِ محبت کو سدا بے چین رکھتی ہے
کہ جیسے پھول میں خوشبو کہ جیسے ہاتھ میں پارا
کہ جیسے رات کا تارا

جدید تراکیب نئے انداز سے مجسم ہو کر مصرعوں اور فقروں کو نئی جہتیں دیتے ہیں۔ جیسے گماں کے شاخچوں، تھکن کی

کرچیاں، وفا کی اجرکیں، سمے کی رہگزر وغیرہ۔ سچ تو یہ ہے کہ امجد نے نظم کو موجودہ دور کی فکری رفتار سے ہم آہنگ کر دیا جو آگے چل کر اپنے دور کی ترجمانی بھی کرے گی۔

امجدؔ شاعرِ محبت تو ہے ہی مگر وہ ہر محبت کرنے والے سے بھی محبت کرتا ہے یعنی اس کی محبت دائرہ در دائرہ کی مانند ہے۔ وہ اپنے تجربات اور واردات کو محبت کرنے والوں کی حکایات بنا دیتا ہے۔ اسی لیے اس کی آپ بیتی محبت کی جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ ایک اچھا ناظم نظم کی سہولت سے استفادہ کرتا ہے، مسلسل غزل میں بھی ہیئت کی تبدیلی نہ ہونے سے مطالب جو یہاں بیان کیے گئے ہیں دامنِ غزل میں جمع نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ شاعری میں وسعت بیانی کے لیے نظم کی ضرورت ہے۔ امجد کی نظم ''لوگ محبت کرنے والے'' سے کچھ مصرعے یہ ہیں۔

آنکھوں آنکھوں چل پڑتے ہیں تاروں کی قندیل لیے
چاند کے ساتھ ہی ڈھل جاتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے
پانی پیچ بتاشہ صورت خود تو گھلتے رہتے ہیں
سم کو شہد بنا دیتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے
خواب خوشی کے بو جاتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے
تتلی تتلی لہراتے ہیں پھولوں کی امید لیے
ایک دن خوشبو ہو جاتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے
بن جاتے ہیں نقش وفا کا
لوگ محبت کرنے والے
جھونکا ہیں بے چین ہوا کا
لوگ محبت کرنے والے

یہی نہیں بلکہ خود محبت کے کئی روپ ہیں جو کہیں عیاں اور کہیں نہاں رہتی ہے۔ ہم ''محبت'' کی نظم کے چند مصرعے چُن کر کسی تشریح کے بغیر محبت کی تاثیر کو پیش کر رہے ہیں۔

محبت اوس کی صورت
پیاسی پنکھڑی کے ہونٹ کو سیراب کرتی ہے
محبت ابر کی صورت
دلوں کی سرزمین پر گھر کے آتی اور برستی ہے

محبت آگ کی صورت
بجھے سینوں میں جلتی ہے تو دل بیدار ہوتے ہیں

کائنات میں محبت سے طاقتور کوئی شے نہیں۔ یہ محبتِ الٰہی کی قدرت ہے جس سے ستارے اپنے اپنے مدار پر لاکھوں کروڑوں برسوں سے رواں دواں ہیں۔ امجد محبت کا شاعر ہے۔ محبت کے زور وشور، محبت کے اثر ورسوخ، محبت کی فتوحات اور کارناموں سے واقف ہے۔ نظم ''کوئی زنجیر ہو'' کا آخری حصہ دیکھیے:

محبت روک سکتی ہے سمے کے تیز دھارے کو
کسی جلتے شرارے کو، فنا کے استعارے کو
محبت روک سکتی ہے کسی گرتے ستارے کو
یہ چکنا چور آئینے کے ریزے جوڑ سکتی ہے
جدھر چاہے یہ باگیں موسموں کی موڑ سکتی ہے
کوئی زنجیر ہو اس کو محبت توڑ سکتی ہے

سائنسی تجربات کے تحت اوپر کہے ہوئے ہر مصرعہ کا جواب نفی میں ہے۔ ظاہراً محبت یہ کام نہیں کرسکتی لیکن معنوی طور و طریقہ پر یہ تمام عمل کرسکتی ہے۔

محبت خواب کی صورت
نگاہوں میں اترتی ہے کسی مہتاب کی صورت
محبت درد کی صورت
گزشتہ موسموں کا استعارہ بن کے رہتی ہے

اگر ہم ان چند منتخب مصرعوں ہی کو کھولیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی جذبہ، کوئی زندگی کا مزا، زندگانی کا شادی وغم کا سودا محبت کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

امجد کی شاعری محبت کی کینوس پر کچھ اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ کوئی دوسرا رنگ محبت کے رنگ پر حاوی نہیں ہوسکتا۔ اس کیفیت سے عالم اور عامی دونوں واقف ہیں کیوں کہ یہ دونوں قاری اور سامع بن کر امجد کے شعرستان سے جڑے ہوئے ہیں۔ امجد نے محبت کے جتنے رنگ وروپ اپنی شاعری کے نقشوں میں ابھارے ہیں، شاید ہی کسی عصری یا قریب جدید کے شاعر نے ابھارے ہوں۔ محبت کہیں کنارہ ہے تو کہیں استعارہ، کہیں ہجر کا لاوا ہے تو کہیں جینے کا سلیقہ، کہیں روپ کا داؤ ہے تو کہیں پیار اور الفت کا گھاؤ۔ بہرحال جو کچھ بھی اس کائنات اور انسان کی ذات میں پھیلا ہوا ہے وہ سب محبت کا پھیلاؤ ہے۔ ''ساتواں در'' کی نظم میں اسی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

تیرے میرے ابد کا کنارہ ہے یہ
استعارہ ہے یہ
روپ کا داؤ ہے

پیار کا گھاؤ ہے
جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

اگر امجدؔ کی رومانی شاعری کے بارے میں کہا جائے کہ ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' تو غلط نہ ہوگا۔ غزل ہو یا آزاد یا پابند نظم مضمون اور ہیئت کے ساتھ الفاظ کا بندوبست، ان کا لہجہ، ان کی نغمہ سرائی بدلتی رہتی ہے جو ان کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی کی وجہ سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امجدؔ ایک محنتی اور مشاق شاعر ہے۔ مصرعوں کو سنوارنا، کانٹوں بھرے جھنڈ سے گلاب کا پھول نکالنے کے مترادف ہے۔ یہاں ہماری تشریح سے زیادہ خود مصرعوں کی روانی اور نغمگی امجد کی گواہ ہیں۔

اے شعلۂ جاں دیکھ
کھلتے تھے جہاں چاند وہاں برف جمی ہے
تاروں سے تہی رات کی آنکھوں میں نمی ہے
کم کم ہیں دیے اور بہت تیز ہوا ہے

خوشبو کی زباں گنگ ہے رنگوں کی نوا گم
منزل تو بڑی بات ہے رستہ بھی ہوا گم

آشوب ہے ایسا کہ نہ دیکھا نہ سنا ہے
لیکن یہی آشوب تو میزانِ وفا ہے
اے دل یہ کڑا وقت ہی عرفانِ وفا ہے

چاند کو کھلانا، رات کی آنکھ میں نمی کرنا، خوشبو کو گنگ زباں کرنا اور رنگوں کی نوا گمانا شاعر کے ذہن میں ہل چل اور آشوب برپا کرنا ہے لیکن یہی عشق کی وفا کی میزان اور عرفان ہے اور عاشق کی تمام تر خواہش اور آرزو یہی ہے کہ

اے شمعِ نظر، ضو پہ تری حرف نہ آئے
اے شعلۂ جاں دیکھ تری لَو نہ لرز جائے

غزل میں خیال اور لفظ کے اِتّصال کا جمال وکمال

امجد اسلام امجدؔ اگرچہ نظم کے شاعر مشہور ہیں لیکن ان کی سوا تین سو غزلیں مطبوعہ شکل میں کلیاتِ غزل ''ہم اس کے ہیں'' میں موجود ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم کچھ منتخب چیدہ چیدہ غزل کے اشعار پر تنقیدی، تجزیاتی اور تشریحی تبصرہ کریں پہلے اردو شعر وادب میں غزل اور امجد کی غزل گوئی پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔ اگرچہ شاعری کو حتمی طور پر خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا، پھر بھی نظم نظم ہے اور غزل غزل ہے۔

جہاں تک امجدؔ کی غزل گوئی اور دورِ حاضر میں ان کی غزل کے مقام کے تعین کا مسئلہ ہے اُس پر ان کے نادان دوستوں اور دانا دشمنوں نے امجدؔ ہی کے بعض جملوں کو جوان کے مجموعے ''ہم اس کے ہیں'' کے دیباچے یا بعض انٹرویوز اور تحریروں میں نظر آتے ہیں سند بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو صحیح نہیں۔ یہ امجد کی اعلیٰ ظرفی اور عجز وانکساری ہے ورنہ جو تخلیق کار نظم کے پیکر میں اتنا تغزل سمو دے کہ نظم کے بعض حصے غزل معلوم ہونے لگیں یا غزلوں میں ایسے تخیل اور دلکشی سے بھرپور اشعار موجود ہوں جو دورِ جدید کی غزل کے سر پر تاج معلوم ہونے لگیں، وہ عمدہ غزل نگار بھی ہے۔

آیئے پہلے اُن جملوں پر نظر ڈالیں جنھیں سرنامۂ سخن بنایا گیا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ موجودہ دور میرؔ اور غالبؔ کا نہیں بلکہ مغلوب اور غریب کا دور ہے۔ امجد کہتے ہیں ''غزل گو شعرا کی صف میں داخل ہونے کے لیے جس غیر معمولی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھے اپنی غزل میں نظر نہیں آتی۔ میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ اردو غزل کے اکابرین کے ساتھ ساتھ اپنے سینئر ہم عصروں اور اپنے سے بعد لکھنا شروع کرنے والوں سے بھی اس شعبدہ ساز صنف کے نت نئے اسرار و رموز اور پیرایوں کو سیکھنے کی کوشش کروں۔ مجھے خوشی ہے کہ نظموں کے ساتھ ساتھ میری غزل کے قارئین کا بھی ایک خاصا بڑا حلقہ قائم ہوگیا ہے۔ میرے لیے اتنی پذیرائی بہت ہے کہ بڑے لوگوں کے گروپ فوٹو میں جگہ مل جانا بھی اپنی جگہ پر ایک عزت اور افتخار کی بات ہوتی ہے۔ (دیباچہ۔ ہم اس کے ہیں)''

ہمارے دور کے ممتاز اور معروف تنقید نگار خورشید رضوی نے ''شاعر امجد'' میں سچ کہا ہے کہ ''امجد نے جس بے ساختہ اور سچے انکسار سے کام لیا ہے اس سے اس کے اندر کی بڑائی منکشف ہوتی ہے۔ امجد کی غزلوں کے قارئین کا حلقہ واقعی ''خاصا بڑا'' ہے وہ ہمارے مقبول ترین ہم عصروں میں سے ہے اور ان کی غزل میں اُن بہت سے احباب سے بہت بہتر شعر نکل آتے ہیں جو اپنے مقام کے تعین میں خود میرؔ و غالبؔ کو بھی کہیں میلوں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔''

یہ سب جانتے ہیں امجدؔ احساسات اور جذبات کا سچا شاعر ہے چونکہ اس کے پاس جذبے کی شدت اور محبت کا خلوص ہے اس لیے اس کے اشعار سے دردسوز وگداز اُبلتا ہے جومصرعوں سے زیادہ بین المصرعہ ظاہر ہوتا ہے اور پڑھنے یا سننے والا اس سے مضطرب اور متاثر ہوجاتا ہے۔

یہ سوزِ عشق تو گونگے کا خواب ہے جیسے
مری زباں مری حالت بتا نہیں سکتی

کلاسیکل غزل عشق ومحبت کے خمیر سے بنی ہے اس لیے ہر زمان ومکان میں یہ عشق سے جڑی رہی۔ ایک سرے پر وہ جنسی محبت و پیار سے مجازی تعلق رکھتی ہے تو دوسری طرف عشق حقیقی کی بنا پر تصوّف کے عشق وشراب سے مست ہے۔ اسی لیے اس کے ہر طرح کے نام اور اشارے بھی ہیں۔ ذوق، شوق، سوز وگداز، آگ وشعلہ، گل وخوشبو، قوت عمل، ہوشیاری، دیوانگی، جنون دماغ کا خلل وغیرہ لمبی فہرست ہے۔ ولیؔ کہتے ہیں۔

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی کا کیا مجازی کا

غزل میں زندگی کے حالات اور جذبات بیان ہوسکتے ہیں۔ غزل کی اس ہمہ رنگی اور ہمہ جہتی نے اس کو پسندیدہ صنف کردیا ہے۔ جہاں تک اردو غزل کی ادبی، سماجی، تہذیبی اور تدریجی ترقی کا سوال ہے وہ ایک گلشن ہے جس کی بہار وخزاں کے موسموں کو بیان کرنے کے لیے دفاتر درکار ہیں۔ اس گلشنِ رنگ وبو میں ہر تخلیق کار نے اپنے مزاج کے رنگ اور ڈھنگ سے کیاریاں بنا کر گل بوٹوں کی نشوونما کی ہے۔ کہیں قطب شاہ کی پیاریوں کی پیاری پیاری باتوں سے گلشنِ غزل کی کیاریاں بھری ہوئی ہیں، کہیں ولیؔ دکنی کی محبوبہ غزل کی رنگینی سے گلوں میں رنگ بھرے تھال نظر آتے ہیں۔ اسی گلزارِ غزل کی سیر کے دوران غم، درد، عشق کا سوز وگداز، زبان و بیان کی رنگارنگی، خیالات کی جدت، تصوفی اقدار کی چاشنی سے آبدار مضامین اور غزل کے باغبانوں کے ہاتھوں سے اُگائے ہوئے برگ وگل و بار پر نظر پڑتی ہے کہ ہاں یہ سب محصولات میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ غزل میں عشقیہ مضامین کس حد تک عریاں ہیں اس میں گھسے پٹے مضامین کو کس طرح جدید طریقے پر سجایا جاسکتا ہے، غزل کو ادب میں کس طرح سنوارا جاسکتا ہے ان مطالب کی گل کاریاں جرأتؔ، میر حسنؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ کی غزلوں سے سجائی گئی ہیں۔ چونکہ خوبصورت سے خوبصورت تختۂ گل کو بھی کاٹ اور چھانٹ سے رشکِ باغِ خلد بنایا جاسکتا ہے اس لیے غزل کے عاشقوں میں ناسخؔ شاہ نصیرؔ اور ناسخؔ کے شاگردوں کی دستکاری سے اضافی خس وخاشاک کو اس گلشن کی خاک سے تہہ خاک کیا گیا جس پر غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور ظفرؔ نے کہیں فلسفیانہ، کہیں عاشقانہ، کہیں عالمانہ، کہیں صوفیانہ پھول ایسے کھلائے کہ ان رنگ برنگ پھولوں سے جن کی مہک نے صحن غزل کو مشکبار کردیا تھا اَن گنت بلبلوں، بھونروں، تتلیوں اور پروانوں کو اپنے اردگرد جمع کرلیا اور انہی عندلیبوں میں سے کوئی داغؔ کوئی امیرؔ، کوئی حالیؔ، کوئی مجروحؔ بن کر ابھرا۔ غزل کا گلشن کبھی باغبان سے تہی نہ رہا یہ اور بات ہے کہ وقتی اور موسمی جبر سے بہار خزاں میں تبدیل تو ہوئی لیکن گل کاری جاری رہی چنانچہ اقبالؔ، حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ، فراقؔ، سیمابؔ، یگانہؔ اور جگرؔ وغیرہ کی کشت حاصل خیز رہی۔ اسی لیے آج بھی چمنستان شاعری میں غزل کا چمن شاداب رنگین اور عنبر آگیں ہے جہاں ناصرؔ، فیضؔ، مجید امجدؔ، منیر نیازی، احمد فرازؔ، پروین شاکر، احمد مشتاق، سعیدؔ، افتخارؔ، امجد اسلام امجد

وغیرہ اپنے اپنے نغموں سے غزل کی فضا کو طرح طرح کے رنگوں سے منقش کر رہے ہیں۔ غزل کے ہر دور میں ایک ہمدرد اور غزل کے خلاف بات اور عمل کرنے والا گروہ بھی موجود تھا جس نے خود کسی حد تک غزل گوئی بھی کی لیکن اسی معشوقہ کو پھانسی دینے کا فتویٰ بھی دیا۔ اس گروہ کے مثبت اور منفی اثرات سے غزل کا رنگ اور نکھرا۔ اس گروہ میں وحید الدین سلیم، عظمت اللہ خان، کلیم الدین، جوش، حامد حسن قادری وغیرہ سرفہرست ہیں۔ حالی کا مسئلہ دوسری نوعیت کا ہے جو بعد میں بیان کیا جائے گا۔ اردو کے بعض ممتاز شعرا اور ادیبوں نے غزل کی ہیئت اور ساخت کے ساتھ اس کے موضوعات کو بھی اپنے مخالف خیالات کا نشانہ بنایا ہے۔ کوئی غزل کی تنگ دامنی، کوئی غزل کے اشعار کے مضمون کا عدم تسلسل و ربط، کوئی غزل کی ریزہ کاری تو کوئی غزل کی قافیہ پیمائی پر نالاں تھا۔ بعض نے بحر قافیہ اور ردیف کو بھی غزل کی کمزوری کے حصے میں رکھ دیا۔ کسی نے اسے بے وقت کی راگنی، کسی نے اسے نیم وحشیانہ شاعری کہا، کسی نے اس کی گردن زدنی کا فتویٰ دیا، تو کسی نے غزل گو شاعر کو قافیہ کا غلام ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اردو شاعری کی اکثریت غزل کی دلدادہ ہے۔ غزل کے مخالفین کے پرچار سے نظم کا ارتقا نہیں ہوا بلکہ مغربی تقلید گری ہوئی غزلوں کے گھن آور مضامین، قدیم گھسے پٹے مضامین کی تکرار، فنی اور عروضی باریکیوں اور مشکلوں سے گریز، نظم کے تبلیغی دبستان کی کوشش اور عوام کی اس تازہ شاعری کی پسندیدگی نے نظم کو جو پابند ہو یا آزاد شاعری کے طاق میں سجا دیا۔ اچھے شاعر نظم اور غزل دونوں میں کامیاب مشقِ سخن کرنے لگے۔ اسی طرح بعض شعرا صرف غزل کے ہو کر رہ گئے یا بالفاظ دیگر فنا فی الغزل ہو گئے یا بعض نظم کے تسلسل کی زنجیر میں ایک حلقہ کی شکل شامل ہو گئے لیکن بہر حال ان کی شاعری کے مقام کا تعین غزل ہی سے ہوتا رہا۔ اسی لیے اس میں تقریباً ہر بڑے شاعر کا نام شامل رہا۔ یوں تو غزل گو شاعروں کی تعداد سینکڑوں تک پھیلی ہوئی ہے لیکن ان میں ممتاز محمد قطب قلی، سراج، ولی، میر، سودا، انشا، مصحفی، آتش، ناسخ، غالب، مومن، مجروح، امیر، حالی، اقبال، حسرت، اصغر، شاقب عزیز، فانی، یگانہ، فراق، جگر، ناصر کاظمی، فیض وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ بہت سے شعرا فنا فی الغزل نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ ایسی آبدار غزلوں کے خالق ہیں کہ انہی کے چند شعروں سے شہرِ شعرستان میں ان کی شناخت ہے۔

اردو غزل کی عمر کم از کم چار سو برس ہے۔ اگرچہ فارسی غزل سلمان مسعود کے دور میں لاہور میں وارد ہوئی لیکن جلد ہی اردو غزل نے برِصغیر کے مختلف شہروں میں اپنا ڈیرہ ڈال دیا۔ چونکہ غزل ماحول اور تمدن و تہذیب کی عکاس بھی ہوتی ہے اس لیے ڈیڑھ سو، دو سو سال قبل تک دہلی اور لکھنؤ دبستانوں کی نمائندگی کرتی رہی۔ اسی لیے دبستانِ دہلی کی غزل میں سیاسی بے قراری، شکست و ریخت اور درد و غم کی شدت ہے جبکہ لکھنؤ جو کئی صدیوں تک ان شورشوں سے محفوظ رہا، سرور و طرب کی غزل سے سجا رہا۔ یہ بھی سچ ہے کہ دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد غزل رام پور، حیدر آباد، عظیم آباد، لاہور اور کئی دوسری آبادیوں میں آباد ہو گئی۔ مخزن کے ایڈیٹر عبدالقادر لکھتے ہیں:

''غالبؔ نے اقبالؔ کے رُوپ میں دوبارہ جنم لیا۔'' لوگوں نے اقبال کو غالبؔ کا معنوی شاگرد کہا۔ اقبالؔ اور غالبؔ کی شاعری بالکل علاحدہ اور الگ رنگ کی ہے۔ اقبالؔ ایک مخصوص پیغام کی ترجمانی اور ایک خاص فلسفۂ حیات کے شاعر تھے۔ اقبالؔ نے اپنی غزل کے لیے جو زبان بنائی وہ نہ داغؔ سے سیکھی اور نہ داغؔ سے لی بلکہ خود وضع کی جس کے لب ولہجہ اور موضوع سے غزل کے کاروان کے ہم عصر امیر بھی واقف نہ تھے۔ میر انیسؔ کے نواسے پیارے صاحب خورشید کا اقبال کی غزل سن کر یہ کہنا کہ ''ایسی اردو ہم نے آج تک نہ پڑھی ہے نہ سنی ہے۔ حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اردو ہے یا کوئی اور زبان ہے۔'' بے شک یہ مخصوص

کیفیت اور لہجہ کی حامل اردو فارسی مخلوط زبان اقبال کی غزل کی زبان ہے جس کے موضوعات میں وصال و فراق رشک و حسد، جمال و جسم کے بجائے آفاقی، حیاتی، انسانی، علمی، قدری باتوں کا ذکر ہے جو زیادہ تر رموز اور اشارات میں بیان کیا گیا ہے جس سے اردو غزل اقبال سے قبل واقف نہ تھی۔

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلّیات میں
تُو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں
گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
باغ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اردو غزل پر خشک مگر معلوماتی اور ضروری تحریر کے بعد ہم پھر اپنے مرکز پر واپس لوٹتے ہیں۔ اس کتاب میں امجدؔ کی شاعری مختلف مقامات اور مختلف موضوعات کے تحت تنقیدی رجحانات سے گزرے گی لیکن حتی الامکان مطالب کی تکرار نہیں ہوگی۔ نظم ہو کہ غزل، گیت ہو کہ قطعہ یا ماہیا سب کچھ شاعری کے ذیل میں آتے ہیں اور اس طرح ایک ہی شاعر کے ذہن کی پیداوار محسوب ہوتے ہیں لیکن ہیئتوں کی آزادی اور پابندی، ایجاز اور طوالت، موضوع اور جذبات کے تحت شاعری کے مختلف پہلو عیاں اور نہاں ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے مختلف عناوین کے ذیل میں ان کا جائزہ لیا ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے کہ امجدؔ عشق اور محبت کے فلسفہ کے خشک یا تصوفی شاعر نہیں۔ البتہ یہاں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ شعر و ادب اور تنقید میں کوئی رجحان یا موضوع صد در صد نہیں ہوتا یعنی انہیں پوری طرح مختلف خانوں میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دوسرے سے تھوڑی آمیزش، تھوڑا لگاؤ بلا واسطہ یا بالواسطہ برقرار رہتا ہے جس کی وجہ سے ان حالتوں کا کہیں کبھی اظہار ہوتا رہتا ہے جو ایک فطری شاعر کے ذہن کی فطرت میں شامل ہے۔ امجدؔ کی شاعری میں پیچیدہ پیکر تراشی اور امیجری بھی نہیں دکھائی دیتی۔ ان کے کلام میں جھنجھوڑ دینے والے تجربات کا سراغ نہیں بلکہ امجدؔ کی اقلیم شاعری کی بنیاد شگفتہ، سلیس بیانی کے ساتھ جذبوں اور احساساتوں سے چھلکتے آبگینوں پر رکھی گئی ہے۔ ان کے پیغام میں تحریک ترقی پسندی ہے مگر نعرہ بازی اور تنظیمی تشہیر نہیں۔

امجدؔ کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ بھی بہت اہم ہے۔ اگرچہ لغوی معنی میں علمِ نفس کو نفسیات کہتے ہیں لیکن عملی معنی میں ان نکات پر غور و فکر ہے جن کا تعلق تحت شعور اور لاشعور سے ہے۔ ہم جانتے ہیں اچھے شعر میں قافیہ پیمائی نہیں بلکہ قافیہ نگاری ہوتی ہے۔ الفاظ خود بہ خود مصرعوں میں جڑتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے نادر تراکیب کا ظہور اور معنی آفرینی کا نزول ہوتا ہے۔ امجدؔ کے پاس یہ عمل اگرچہ غزل کی نسبت نظم میں زیادہ ہے چنانچہ قاری اور سامع نظم کے دریا کے تیز پانی میں بہہ جاتے ہیں اور مصرعوں کی نغمگی اور غنائیت میں کھو جاتے ہیں۔ شاعر خود اس دریا کے عمق میں موجود لولو و مرجان سے بے بہرہ رہتا ہے۔ یہ

ناقدین کا نقدی فرض ہے کہ وہ غوطہ لگا کر ان موتیوں کی مالا شاعر کے کلام کے گلے میں پہنائیں۔

امجدؔ کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ایک یا دو شاعروں کو چھوڑ کر کسی بھی اچھے ممتاز اور بڑی شاعری کرنے والے شاعر کے کلام پر تشفی بخش کام نہیں ہوا؟ کئی عمدہ نادر اشعار نظموں، غزلوں اور گیتوں میں دبے ہوئے ہیں جن کی قیمت اور عظمت ان چند اشعار سے زیادہ ہے جنھیں ہم عمدہ انتخاب کہتے ہیں خود امجد اسلام امجدؔ نے اپنی تنقیدی اور تشریحی کتاب ''نئے پرانے'' (جس پر ایک بسیط مضمون ہم نے اس کتاب میں لکھا ہے) بتایا کہ وہ اشعار بھی جو انتخابات میں نہ آسکے منتخب شدہ شعروں سے بدرجہ بہتر ہیں۔ پس معلوم ہوا ''شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا انھیں۔'' کوہِ نور ہیرا تاج و تخت کی زینت اس لیے ہوا کہ وہ خاک کی تہوں سے برآمد کیا گیا نہ جانے کتنے ہیرے آج بھی کوہ نور سے قدر و قیمت میں بڑے خاک میں پوشیدہ ہیں اور کسی معدن کھودنے والے کے ہاتھ کے منتظر ہیں۔ چنانچہ اسی طرح سے امجدؔ کے مجموعوں میں ایسے اشعار کی شناخت اور دریافت اردو شعر و ادب کے لیے نیک شگون سمجھا جانے لگا۔

جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا کہ اُردو غزل صدیوں پر بکھری تہذیبی تاریخ کی وہ داستان ہے جس میں ہمیشہ امکانات کا سلسلہ موجود رہا۔ امجدؔ کی نظم اور غزل میں دورِ حاضر کی شاعری کا ایسا نقش موجود ہے جس میں روایتی اور جدید شاعری کو ایک خاص تناسب سے ملایا گیا ہے۔ امجدؔ کی غزلیں بتاتی ہیں کہ وہ رجائیت کا مینار ہے جو حرمتِ انسان بخصوص نسواں کا نگہبان ہے۔ اس کی شاعری میں غم جاناں اور غم دوراں کا ملاپ پُراثر اور دلکش ہے۔ امجدؔ کی شاعری جدیدیت اور رومانیت کا سنگم ہے جس کی جھلک غزل اور نظم میں یکساں ہے۔ امجدؔ کی غزلوں میں سلاست، شگفتگی، پُرکاری، جوشِ زندگی، جمالیاتی لہجہ اور تمکنت و خلوص ہے۔ یہاں قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی ہے اس کے ساتھ ساتھ غزل میں محاسن زبان و بیان کی گل کاری پڑھنے والے کو اپنے رنگ و بو سے گرویدہ کرلیتی ہے۔ امجدؔ فطری شاعر ہونے کی وجہ سے یہ محاسن اور معجز نمائی ان کے تخلیقی جوہر کی بدولت ہے۔

امجدؔ کی شاعری میں موجودہ دور کے رویوں اور محسوسات کا خوبصورت اظہار ہے۔ شاعر دراصل کائنات اور ذات میں بکھری ہوئی خوبصورتی اور رنگینی کو خوشبو کے ساتھ ایک جگہ جمع کر کے پیش کرنا ہے یعنی یہ ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں ہر پھول کو ہر شخص اپنی پسند سے انتخاب کر کے اپنے ذہن کے دریچے میں سجالے۔

امجد اسلام امجدؔ کی غزلوں پر گفتگو سے پہلے ان کی شعری لفظیات پر بھی روشنی ضروری ہے۔ شاعروں کے اسلوب، موضوعات، لہجوں اور اشارات میں بعض الفاظ خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی خارجی اور داخلی کیفیت کے علاوہ ان کی کیمسٹری بھی شاعر کے رگ و پے سے تعلق رکھتی ہے۔ دُور کیوں جائیں مرزا غالب کی شاعری میں آئینہ کا استعمال۔ امجد اسلام امجد کے پاس ایسے الفاظ کم از کم دو درجن ہیں اور یہ ہونا بھی چاہیے جس شاعر نے ایک ہزار کے قریب نظمیں، غزلیں اور گیت کہے ہوں وہ پُرگو شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ فیضؔ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا ''لفظ کو استعارہ بنانا میں نے غالبؔ سے سیکھا۔'' میں سمجھتا ہوں امجدؔ نے بھی لفظ کو استعارہ بنانا اساتذہ سے سیکھا ہے۔ امجدؔ بعض الفاظ کو مجرد طور پر اور بعض کو ترکیب کا جزو بنا کر مرکب طور پر استعمال کرتے ہیں مگر دونوں صورتوں میں معنی کا محور اور لہجہ و بیان کا اثر اسی کلیدی لفظ پر رہتا ہے۔ امجد کی لفظیات کا تعلق کائنات اور ذات کے انتخاب سے ہے۔ اس انتخاب سے اہم امجدؔ کے اشعار میں ان الفاظ کا

استعمال ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ الفاظ کے تمام خانوں کو دیکھ نہیں لیتے لفظ نہیں چنتے ۔ پھر ان لفظوں سے اپنی داخلی وارداتوں اور شعری تقاضوں کو محاسنِ زبان کے جواہروں سے آراستہ کر کے ایسا شعر میں جڑ دیتے ہیں کہ ایک بودا لفظ پہاڑ کی استقامت اور ایک برگِ سبز چمنستان کا نقشہ بن جاتا ہے۔ اور یہی نادر تشبیہ استعارہ، کنایہ اور صنائع لفظی و معنوی بن کر دمکنے لگتے ہیں۔ امجد کی لفظیات میں کائناتی اجزا اور بدنی اعضا اور حالات شامل ہیں۔ چند پسندیدہ الفاظ میں محبت، وقت، رزق، خواب، چاند، ستارے، سمندر، شام، سحر، موسم، سورج، عرش، زمین، وطن، روشنی، آنکھیں، خوشبو، بہار، خزاں وغیرہ شامل ہیں۔

امجدؔ کی ایک مردف غزل کے دو تین شعر دیکھیے۔

دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی سے لوگ نالاں ہیں۔ شاعر کہہ رہا ہے اس میں حیرت کیوں ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں میں نے دنیا کو تین طلاق دیے ہیں۔ امجدؔ نے دنیا کو ایک ایسی عورت سے تشبیہ دی ہے جو ہرجائی ہے۔

دنیا کی بے وفائی پہ حیرت ہے کس لیے
رہتی تمام عمر یہ عورت ہے کس کے پاس!

یہ مضمون جدید غزل کے اخلاقی اقدار میں شامل ہے۔ قوموں کی تاریخ گواہ ہے کہ جس قوم کے پاس علم حکمت اور شعور کی دولت نہیں وہ کمزور اور فنا پذیر ہے۔ ع: ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔'' آج اکیسویں صدی میں قوموں کو زندہ اور پائندہ رہنے کے لیے شعور اور علم سے سرفراز رہنا ضروری ہے۔

بس اس پہ ہوگا فیصلہ افراد ہوں کہ قوم
رزقِ شعور علم کی دولت ہے کس کے پاس

رزقِ شعور عمدہ اور نادر ترکیب ہے۔ امجدؔ اردو شاعری کا وہ ممتاز شاعر ہے جس نے رزق کو دو درجن سے زیادہ معنی اور مطالب میں باندھا ہے۔ امجدؔ کی شاعری میں رزق کی پیکر تراشی اسے علامت نگاری کی صف میں داخل کر دیتی ہے۔ یہ سچا شعر ہے جو سماجی اور ثقافتی زاویوں سے تراشا گیا ہے اور جو غزل برائے مقصد اور ہدف کی ضرورت ہے۔

اردو شاعری میں برصغیر کی تہذیب کا رس اسے امرت بنا دیتا ہے۔ سب سے پرانی برصغیر کی شاعری کی سند امیر خسرو کا وہ شاہکار مثنوی کا شعر ہے جو انہوں نے اپنی مثنوی مجنوں و لیلیٰ میں ماں کے انتقال پر لکھا:

ہر جای کہ زپای تو غبار است
ما را ز بہشت یادگار است

یہاں ماں کی ممتا محبت اور قدر و قیمت کو مذہبی اور قومی اثاثہ سے جوڑا گیا ہے۔ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو شاعری میں کبھی ماں پر معجز بیاں اشعار کی کمی نہیں رہی۔ انیسؔ ع:'' کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔'' خسروؔ کے شعر کی یادگار حدیث سے استوار ہے۔ امجدؔ نے ماں کی دعا کو دنیا میں جنت کا مثل قرار دیا ہے جو نیا مضمون ہے۔

کس کے سفر میں ماں کی دعائیں ہیں ساتھ ساتھ
روزِ جزا سے قبل یہ جنت ہے کس کے پاس

ایک اور شاہکار شعر امجدؔ نے نئے انداز اور نادر بیان سے ماں کی دعا پر لکھا ہے۔

ماں کی آنکھیں چراغ تھیں جس میں
میرے ہمراہ وہ دعا بھی تھی

دنیا میں سب کچھ ہے مگر انصاف نہیں ہے۔ کتنا ہی اچھا تیر انداز ہو پھر بھی کبھی کبھی تیر نشانے پر نہیں بیٹھتا۔ انسان کچھ نہیں اگر محنت، مشقت اور مسلسل کوشش نہ کرے اس کے باوجود بھی قسمت کا برتاؤ سب سے یکساں نہیں ہوتا۔ بعض افراد ہمیشہ گردشوں میں رہتے ہیں اور بعض بھنور کے بالکل بیچ حالتِ سکون میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

ڈولے پھرے ہواؤں میں امجدؔ تمام عمر
ہم ہیں وہ تیر جن کو نشانہ نہ مل سکا

اس شعر میں مناسبت لفظی سے تیر، ہوا، نشانہ شامل ہیں۔ تمام عمر گردشِ چرخ کے بعد بھی منزل نصیب نہ ہوئی۔ ڈولے پھرے ایہامی کیفیت یعنی ڈولتے یا بارِ سنگین کے ساتھ پھرتے رہے۔ نیا مضمون ہے لیکن لوازمات وہی قدیم ہیں۔ یعنی تیر اور نشانہ۔ یہاں شاعر نے پرانے ساغروں میں نئی شراب بھری ہے۔

امجدؔ کی غزلوں میں اخلاقی اور تربیتی قدریں اچھی تشبیہات اور استعارات کے ساتھ ملتی ہیں۔

چاند کے گرد جو ہالہ ہے اسے غور سے دیکھ
اچھی صحبت سے یوں ہی لوگ سنور جاتے ہیں

اخلاق کی کتابوں میں اچھی صحبت، اچھی محفل و مجلس کے لوگوں سے دوستی کی تاکید ہے۔ یہاں ''سنور'' کا لفظ پورے شعر کو سنوار رہا ہے۔

خاموشی زیادہ مقامات پر سخن گوئی سے اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ جب حق گفتاری کی بات آئے تو خاموشی جرم بن جاتی ہے۔ کبھی کہا گیا جواب جاہلاں خاموشی ست۔ کوئی کہتا ہے۔ Spech in Silver but silence is gold کسی نے شعر کہا۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یعنی مرد کو اسی وقت بات کرنا چاہیے جب وہ کسی خاص اور اہم مطلب کو صحیح طور پر پیش کر سکے جس سے اس کی عزت اور حرمت بڑھ سکتی ہے۔ یعنی ضرورت پر ہی انسان کو بولنا چاہیے۔

تاریخوں میں لکھا ہے نیک لوگ اور اولیائے کرام خاموش رہتے اور ان کے چہروں پر نور کے ساتھ مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس تمہید کے ساتھ امجدؔ کی غزلوں کے تین شعر دیکھیے:

کہہ رہی تھی حال امجدؔ، خامشی
تم بتاؤ بولتے ہم اور کیا

خامشی سی نہیں کوئی تلوار
مسکراہٹ سی کوئی ڈھال نہیں

یہاں خموش رہنا اس لیے ہے کہ جھوٹ بولا نہیں جا سکتا۔ اور پھر جب بات میں اثر ہی نہ ہو تو کیوں کی جائے جیسا کہ اقبال کے مصرعے سے ظاہر ہے۔ ع: دل سے نکلتی ہے جو بات اثر رکھتی ہے۔ امجد کہتے ہیں:

ہے احتجاج کی صورت خموش رہنا بھی
جو لفظ دل سے نہ نکلے کہا ہی کیوں جائے

دنیا کی تاریخیں ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں کہ شہر والوں نے نابغۂ روزگار کی وہ عزت اور قدر نہیں کی جس کا وہ انسان مستحق تھا۔ اردو محاورہ ہے۔ ''گھر کی مرغی دال برابر'' صنعت جمع میں کتنا سچا شعر امجدؔ نے تخلیق کیا۔ یہاں ''نہ'' کی تکرار نے بھی ترنم کو بڑھا دیا ہے۔ خلوص، الفت، دید اور لحاظ کی جمع آوری عمدہ ہے۔

جہاں خلوص نہ الفت، نہ دید ہے نہ لحاظ
تو ایسے شہر میں امجدؔ رہا ہی کیوں جائے

امجدؔ کا ذیل کا شعر سچا اور عمدہ ہے۔ شاعروں کو آمد کے لیے مزاج کی بحالی اور طبیعت کا اٹھاؤ موثر ہے۔

سُوجھتے ہیں نئے نئے مضموں
ہو طبیعت اگر اٹھاؤ میں

امجدؔ نے اپنی غزل میں رومانیت، سماجیت کے ساتھ اخلاقیات کی قدروں کا بھی ہر جگہ ذکر کیا ہے۔ ان کی غزلوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا اخلاقی قدروں کے اشعار کہنہ مشقی کے ساتھ بڑھتے گئے اور بعد کی شاید ہی کوئی غزل ہو جس میں اخلاقی شعر موجود نہ ہوں۔ چنانچہ اگر ایسے اشعار جمع کیے جائیں تو کتاب اخلاق کا عمدہ باب بن سکتے ہیں اور اس سے سماج کی تربیت بھی ہو سکتی ہے۔

خدا سے جو نہیں مانگے وہ سب سے مانگتا ہے
یہ راز ہم پہ کھلا آگہی کے رستے میں
نہ اپنی راہ کسی کو بھی روکنے دیجے
نہ آپ آیئے امجدؔ کسی کے رستے میں

انیسؔ کے شعر کا مصداق شعر دیکھیے۔ انیسؔ نے کہا تھا:

خیالِ خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

امجدؔ کہتے ہیں:

شیشے میں بال آیا تو سمجھو کہ وہ گیا
رکھیے خیال، دوست کبھی بدگماں نہ ہو

امجدؔ آگہی کا ذکر بڑی گہرائی اور تہہ داری سے کرتے ہیں:

کلام کرتی ہے اُس سے ازل کی حیرت بھی
نصیب جس کو ہوئی آگہی چراغوں کی

یہاں دل کی روشنی چراغوں سے لیا گیا مضمون ہے۔

ہم نے پہلے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ کہکشاں اب صرف چمکتے دمکتے سورج، چاند، ستارے نہیں بلکہ سائنسی دنیا نے ذہنوں کو اس طرف سوچنے پر مجبور کر دیا ہے جو اس صدی کی شاعری کی ضرورت بھی ہے۔ امجدؔ ان چند گنے چنے شاعروں میں ہے جو ان مضامین پر جہاں موقع ملتا ہے کھل کر لکھتا ہے۔

یہ کائنات پہیلی سہی مگر امجدؔ
سمجھ سکو تو ہر اک حرف اک اشارہ ہے

امجد اسلام امجدؔ نے عنیزہ صدیقی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا ''ابتدائی شاعری کے تراشے ۱۹۹۵ء کے سیلاب میں ضائع ہو گئے، امجدؔ نے گیارہ سال کی عمر سے پہلے شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ان کی شاعری کا آغاز غزل سے ہوا تھا یا نظم سے بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شش جہتی فنی شخصیت کی شاعری کو ڈرامہ نگاری، کالم نویسی، افسانہ نگاری، سفرنامے اور تنقید پر اوّلیت اور فوقیت حاصل ہے۔ اسی لیے امجد کی شاعری کا وجود دیگر تخلیقات سے پہلے ملتا ہے اور اسی بنا پر بھی شاعری ہی امجد کی سب سے معتبر شناخت بھی ہے۔ امجدؔ کے تخلیقی تجربوں میں محبت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ محبت غم جاناں سے غمِ دوراں تک کے ختم نہ ہونے والے راستے پر فنون کے وسیلوں سے پھیل رہی ہے۔ امجدؔ کی شاعری میں زندگی دوڑتی ہے جسے ہر ذی شعور قاری محسوس کر سکتا ہے۔ امجدؔ کی شاعری کی ایک زندہ متحرک روایت غزل ہے۔ بیدلؔ نے کہا تھا کہ ع: ''در یدِ بیضا ہمہ انگشت ہا یک دست نیست'' یعنی حضرت موسیٰ جیسے عظیم پیغمبر کے ہاتھ کی انگلیاں بھی یکساں نہیں یعنی اس دنیا میں ہر چیز چھوٹی بڑی، اچھی بُری، سستی، مہنگی، بلند و پست ہو سکتی ہے۔ بقول مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، خدائے سخن میر تقی میرؔ کے پاس بھی غزل کے اشعار بلند سے بلند اور پست سے پست ہیں یعنی ہر شعر شاہکار نہیں ہوتا لیکن ایک شاہکار شعر بھی شاعر کو جاویدانہ زندگی عطا کر دیتا ہے اسی لیے بعض کم نام اور غیر معروف شعرا بھی اپنے ایک دو شعروں سے زندہ ہیں۔ اس تمہید کا مقصد یہ بھی ہے کہ شاعروں کے کلیات کو کھنگالا جائے تا کہ اس میں موجود سونے کے ذرّات کو علاحدہ کر کے سنہری حرفوں سے سجایا جائے۔ امجدؔ کے پاس درجنوں آبدار اشعار غزل کے دامن کو روشن کر رہے ہیں جن پر مزید کام کی ضرورت ہے۔ امجدؔ کہتے ہیں:

ڈرتا ہوں آنکھ کھولوں تو منظر بدل نہ جائے
میں جاگ تو رہا ہوں مگر جاگتا نہیں

امجدؔ کا یہ شعر اردو شعر و ادب کے جاودانہ عظیم شاہکار شعروں کی صنف میں شامل ہے۔ امجدؔ کی شاعری میں ہم سب جانتے ہیں آنکھ، خواب، منظر وغیرہ کے پیکر، علامتوں، تلازموں، اشاروں کے ساتھ الفاظ کے نشان بھی بن کر جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں جو امجدؔ کی شعری ادراک، محاکاتی انداز اور تخیّل کی پرواز کا نتیجہ ہیں۔ یہاں شاعر ایک معمولی تجربے سے بڑا شعر تخلیق کر رہا ہے۔ آنکھ کے کھولتے ہی خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس نیم خوابی کیفیت میں شعور اور لاشعور کی آمیزش شامل ہوتی ہے جس سے شاعر فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یہاں آنکھ کھولنا صنعتِ ایہام میں ہے۔ اس کے ایک معنی سیدھے سادے آنکھ کا کھلنا یا جاگنا ہے اور دوسرے معنی محاورے کے مجازی معنی حقیقت سے آگاہ ہونے کے ہیں۔ شاعر آج کے سماج کے دردناک فکری زوال پر روشنی ڈال رہا ہے کہ قوم خود کو دھوکا دے رہی ہے یعنی وہ آنکھیں بند رکھے ہوئے ہے تا کہ حقیقت اور سچائی سے سامنے نہ کرنا پڑے اور

فریب زدہ ماحول سے رابطہ ختم نہ ہو جائے چنانچہ یہ خود فریبی جاری رہے۔ اس لیے وہ حقائق اور صداقت سے واقف اور آشنا ہوتے ہوئے بھی خود کو اس روشنی سے بے بہرہ رکھے ہوئے ہے اسی لیے آنکھیں کھولنے کا خوف طاری ہے۔ اگر رومانی تشریح کے ذیل میں یہ شعر آئے تو اس میں جمالیات اور رومانیت کی خوشبو ہے۔ ایک سہانا سپنا، یعنی معشوق کے ساتھ اگرچہ خواب ہی میں کیوں نہ ہو لذت بخش لمحہ اور دلربا منظر ہے اور شاعر کہہ رہا ہے اگرچہ وہ اس نیم شعوری حالت میں جاگنے اور سونے کی سرحد پر ہے لیکن سونے کو ترجیح دیتا ہے جب کہ وہ حقیقت میں جاگ رہا ہے۔ اس شعر میں دونوں مصرعے روز مرہ اور سلیس، شگفتہ زبان میں بغیر کسی ادق خارجی لفظ یا ترکیب کے ہیں۔ یہاں صنعت مراعات النظیر میں آنکھ، خواب، جاگنا شامل ہیں۔ دونوں مصرعے صنعت ایہام میں ہیں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی یہاں مصرعوں میں معنی قریبی یا رومانی نہیں بلکہ معنی بعید اور دور کے ہیں۔ یہاں صنعتِ اشتیاق میں جاگ اور جاگنا ہے۔ صنعتِ تضاد میں خواب اور جاگنا شامل ہیں۔ اس شعر کی اہمیت اور بلندی اس کی منفی ردیف سے بھی ہے جس کو برتتے ہوئے شاعر نے عمدہ شعر کہا ہے۔ علمائے شعر و ادب نے ایسے عمدہ اشعار کو صنعت ابداع میں شامل کیا ہے۔

جب یہاں منفی ردیف کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ہم کچھ ایسے اشعار کو یہاں پیش کرتے ہیں جہاں منفی ردیف میں مثبت تازہ کاری اور تخیل کی گونا گونی اور نیرنگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ذیل کے شعر میں دونوں مصرعے منفی لے ڈھونڈ رہے ہیں:

دلوں کی روشنی بجھنے نہ دینا
وجودِ تیرگی محکم نہیں ہے

حق، روشنی، عزم، سچائی حقیقت اور صداقت وغیرہ ایسی لازوال قوتیں ہیں جو ابد تک باقی رہیں گی جب کہ اس کے مخالف کی تمام ظلمتیں فانی اور ختم ہونے والی ہیں۔ شاعر کہہ رہا ہے یہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں اس لیے ہمت اور عزم برقرار رہے۔ پہلا مصرعہ روز مرہ میں ہے۔ وجودِ تیرگی نادر ترکیب ہے۔ صنعتِ تضاد میں روشنی اور تیرگی شامل ہیں:

زندگانی، جاودانی بھی نہیں
لیکن اس کا کوئی ثانی بھی نہیں

بڑا شعر ہے۔ فلسفے کا رنگ لیا ہوا ہے۔ مصرعوں میں روانی اور نغمگی ایسے الفاظ سے بڑھ گئی ہے جو ترنم خیز اور ہم قافیہ ہیں جیسے زندگانی، جاودانی، کوئی ثانی وغیرہ۔ بہت وسیع مرکزی موضوع زندگی کو ایجاز بیانی کے ساتھ پیش کرنا فن پر مہارت اور بڑی شاعری میں شامل ہے۔ یہاں الفاظ کی کرافٹ سے حسن صوری کے علاوہ حسن معنی اور معنی آفرینی پیدا کی گئی ہے۔ یہاں صنعتِ تجنیس کے علاوہ آفاقیت، عینیت اور ندرتِ بیان بھی موجود ہے۔

کبھی شاعر مصرع اول کی توجیہہ اور تفسیر کی صداقت مصرع دوم کی منفی ردیف سے حاصل کرتا ہے۔ یہاں ایک عام مشاہدے اور کائنات کے تجربے سے حاصل ہوئی سچ کی عکاسی کی خوش سلیقگی خیال کی برجستگی سے ظاہر ہے۔

ہر اک دعا کے مقدر میں کب حضوری ہے
تمام غنچے تو امجدؔ کھلا نہیں کرتے

دعا کے استعجاب کو غنچے کے چٹکنے سے تعبیر کرنا لطافتِ خیال ہے۔ مصرعۂ اول میں حضوری کا لفظ ندرت بیانی ہے۔ کبھی

اسی منفی ردیف میں میر تقی میرؔ کے معروف شعر کے مطلب سے بالکل جداگانہ معنی نکالتے ہوئے امجدؔ کہتے ہیں:

عوام سے ہے ہمیں گفتگو خواص سے بھی
ہماری بات ہے سب سے بھی اور سب سے نہیں

صنعتِ تضاد نے شعر کو بلندی پر جا گزیں کیا ہے جیسے عوام، خواص، ہے، نہیں اور صنعتِ عکس میں سب سے بھی، سب سے نہیں شامل ہیں۔

ردیف عربی اشعار میں نہیں، یہ اردو شاعری میں فارسی سے آئی ہے۔ ردیف سے نہ صرف بحر میں ترنم بڑھتا ہے بلکہ اگر ردیف کو قافیے سے خوبصورت طور پر جوڑا جائے تو موضوع کی موجوں میں تلاطم بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ امجدؔ کی تقریباً تمام غزلیں ردیف سے سجی ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ مثبت اور ردیف برائے ردیف کی مثالیں فراواں اردو شاعری میں موجود ہیں لیکن منفی ردیف میں خیالات کی بوقلمونی، مضمون آفرینی، پہلو داری، نازک خیالی سے امجدؔ نے عمدہ غزلوں کا گلدستہ شاعری کے محراب میں سجادیا ہے جس میں رومان سے انقلابِ فکر تک کے راستے سے چنے ہوئے پھولوں کی کمی بھی نہیں۔

نیا مضمون دیکھیے:

کاٹے ہیں اس طرح سے ترے بعد روز و شب
میں سانس لے رہا تھا پہ زندہ نہیں رہا

اُس کی گلیوں میں رہے گردِ سفر کی صورت
سنگِ منزل نہ بنے، راہ کا پتھر نہ ہوئے

دن کے بھولے کو اور کیا کہیے
جو سرِ شام بھی نہیں آیا

جس کے ہاتھوں پہ خون اپنا تھا
اُس پہ الزام بھی نہیں آیا

پلٹ کے آنے لگے شام کے پرندے بھی
ہمارا صبح کا بھولا مگر نہیں آیا

امجدؔ کی شاعری اور خصوصی طور پر غزل کے اشعار میں محاوروں کی چھاپ گہری ہے۔ غزل میں مقامِ محاورہ، صحتِ محاورہ کے ساتھ ساتھ موضوع کو محاورے سے جوڑنا بھی محاورے کی معنی آفرینی کو نکھار دیتا ہے۔ امجدؔ اپنے اشعار میں محاوروں کو ایسے جڑ دیتے ہیں کہ اس سے وہ پوری بات جو ایک غزل میں کہی جاسکتی ہے۔ وہ اس کو صرف ایک شعر یا مصرع میں باندھ کر ادا کردیتے

ہیں۔ اوپر کے مصرعوں میں روز و شب کاٹنا، سانس لینا، گرد سفر کی طرح، سنگ میل ہونا، راستے کا پتھر، دن کا بھولا شام کو پلٹنا، ہاتھوں پر خون وغیرہ کے مضمون کے ساتھ شعری متن کا لب ولہجہ لفظوں کے رنگوں سے تصویر بنا دیتا ہے۔ امجدؔ غزل کی صنف کے تقاضوں کو بدرجہ احسن تکمیل کرتے ہیں۔ امجدؔ محبت کے نقیب ہیں چنانچہ کئی غزل کے اشعار میں رومانی جمالیات کی رنگارنگی، جذبوں کی گھلاوٹ اور بول کی مٹھاس بھی شامل ہے۔

دل ہمارا ہے چاند کا وہ رُخ
جو ترے رخ کی روشنی میں نہیں

جدید مضمون ہے۔ یہاں معشوق کے حسن کے اقرار کے ساتھ عاشق کا شکوہ کہ اس کے دل کا کچھ اثر معشوق کے خدو خال پر اور اس کے برتاؤ میں نہیں۔ رُخ کی تکرار صُوری اور معنوی حسن طرازی ہے۔

تُو نہیں، تیرا غم ہے چاروں طرف
جس طرح چاند، چاندنی میں نہیں

معشوق کے فراق کا غم عاشق کو چاروں سمت گھیرا ہوا ہے۔ لیکن معشوق غم کی فضا میں نہیں جس کو تشبیہہ دے کر چاندنی اور چاند سے جوڑا گیا ہے۔

امجدؔ کی غزل مسلسل کے چند شعر ''نہیں سکتا'' کی ردیف میں دیکھیے:

لہر ایسی چلی ہے بستی میں
کوئی بھی سر اٹھا نہیں سکتا
ضبط سے یوں بھنچ رہے ہیں ہونٹ
آدمی مسکرا نہیں سکتا
اتنی گہری ہوئی ہے تاریکی
آدمی راہ پا نہیں سکتا

غمِ دوراں، سماج کا فشار، ناانصافی، ظلم اور استبداد کا رواج ہے کہ نہ کوئی سر اٹھائے، نہ بولے، نہ مسکرائے اور نہ راستہ پائے۔ ان تمام اثرات کو احساسات اور نازک خیالی کے محسوسات سے درک کیا جا سکتا ہے۔

اللہ کی حمد الفاظ کی محدودیت میں بیان نہیں ہو سکتی پھر بھی یہ انسان کی کوشش رہتی ہے کہ نہ کہنے سے کچھ کہنا بہتر اور ضروری ہے تا کہ کچھ حقِ بندگی کا ادراک ہو سکے۔ امجدؔ نے سہلِ ممتنع میں ایک حمدیہ، شعر پیش کیا ہے۔

خدا کی ہے یہی پہچان شاید
کہ کوئی اور اُس جیسا نہیں ہے

امجدؔ غزل میں بعض مقامات پر دو چار اشعار مسلسل یا قطعہ بند کر کے نظم کی ساحری کی بھی رونمائی کر دیتے ہیں۔ ذیل کے چار مصرعوں میں سماجی اور معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر کر کے ان کے علاج اور راہ حل بھی بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پتھروں سے خطاب کیا کیجے
آدمی ہوں تو بات کی جائے
پیاس پھر بستیوں میں اتری ہے
گفتگوئے فرات کی جائے

سنگ دل، شقی اور ظالم لوگوں سے جو مظلوموں، بیکسوں اور ضعیفوں پر ظلم کر رہے ہیں کیسے بات کریں؟ اور کیا بات کریں؟ صنعتِ ایہام میں ان سے بات نہیں بلکہ مقابلہ کرنے کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ یا دوسرے معنی میں ان سے بات کرنا بیکار ہے کیوں کہ آدمی بات سنتے ہیں، پتھر جمادات بات نہیں سن سکتے۔ غزل میں اصطلاحات اور تلمیحات کی اہمیت اور ان کی بے پناہ قدر و قیمت ہے۔ اردو شاعری میں اب نہ صرف کربلا کا لفظ استعارہ ہے بلکہ واقعہ کربلا سے منسوب ہر چیز خود علامت اشارہ اور نشان بن چکی ہے جیسے اس شعر میں پیاس سے مراد اہل بیت نبی اکرم ﷺ کی تشنہ دہانی اور بستیوں سے مراد آلِ نبی ہیں جس کو شاعر اپنے زمان و مکان سے جوڑ کر چودہ سو برس قبل کے واقعہ کو آج کے دور سے ملا رہا ہے۔ جیسا کہ عربی شعر میں ہے کہ ہر روز عاشور ہے اور ہر زمین کربلا ہے۔

کُلِّ یومٍ عاشورا
کُلّ ارضٍ کربو بلا

امجد کہہ رہے ہیں پھر عدل اور مساوات کو ختم کیا جا رہا ہے۔ انسانیت پامال ہو رہی ہے۔ پھر عزم حسینی اور درس گاہ کربلا کی بات کی جائے اور اس پر عمل بھی کیا جائے یعنی رسم شبیری ادا کی جائے۔ علامہ اقبال نے بھی یہی کہا تھا۔

ع: نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؑ

امجدؔ کے درجنوں اشعار ہم نے مختلف عنوانات کے تحت کم و بیش توضیح اور تشریح کے ساتھ بیان کیے ہیں جن کی تکرار ضروری نہیں۔ غزلوں کے اشعار جو حمدوں، مناجاتوں، نعتوں اور سلاموں کے علاوہ وقت، خواب، آنکھوں، رزق، محبت، موسم وغیرہ وغیرہ مضامین پر تھے انہیں تجزیاتی، تحلیلی اور تشریحی تحریروں سے پیش کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر ہم اُنہی غزل کے اشعار سے محفل سجا رہے ہیں جو اوپر بتائی ہوئی صفوں میں شامل نہ ہو سکے جن میں زیادہ تعداد عشق کی طرز کاری، عشوہ ہائے محبوب کی نیرنگی، لطیف تخیل، علامات، تلازمات اور متعلقات کے ساتھ پیغامی پیٹرن اور کہیں لطیف اور شیریں لہجے میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں چونکہ ہر شعر کی تشریح یا تجزیاتی تفسیر ممکن نہیں، اس لیے کہیں گفتگو میں گہرائی اور عمق اور کہیں سطحی مطالعاتی بات ہوگی۔ اشعار خود قاری کو اپنی حیثیت سے باخبر کر دیں گے کہ ان کا تخلیق کار ایک عمدہ، ممتاز شاعر ہے جس کا حسنِ بیان کہیں ماہرانہ اور کہیں ساحرانہ ہے۔ اس کی شعری ساخت کے لیے شاعری کی ہیئت یا تکنیک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

جہاں تک امجدؔ کی غزل کا تعلق ہے۔ وہ صنف غزل کے تقاضوں سے پوری طرح واقف ہیں یہی نہیں بلکہ ان کی غزلوں میں غزل کی جو اہم اور امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں وہ مصرعوں میں چمکنے اور دمکنے لگتی ہیں کیونکہ ان کے پاس قدرت کی عطا کی ہوئی وہ وہبی تخیل کی دقیق اور نازک خیالی موجود ہے جو خیال کو تصویر اور الفاظ کو جذبوں میں ڈھال دیتی ہے اسی لیے جو بھی محرکات اور گوناگوں عوامل جو مشاہدات اور تجربات سے حاصل ہوتے ہیں، وہ پیرائے اظہار میں شیوہ بیانی کے ساتھ امجدؔ کی

زبان دانی کو طلسماتی قوت سے سرفراز کر دیتے ہیں۔ تب ہی تو شاعر کہہ سکتا ہے۔

اُس حرفِ کُن کی ایک امانت ہے میرے پاس
لیکن یہ کائنات، مجھے بولنے تو دے

دل کو گواہ کر کے لکھا جو بھی کچھ لکھا
کاغذ کا پیٹ بھرنے کو لکھتا نہیں ہوں میں

صنعت اشتقاق میں شعر کی بلندی اور معنی کی وسعت دیکھیے جہاں روز مرہ میں نثر کی طرح کسی خارجی زبان کے لفظ سے استفادہ کیے بغیر، خوبصورت شعر تخلیق کرتے ہیں۔ یہی ہے غزل نگاری میں لفظ برتنے کا ڈھنگ۔

تخت سے تختہ بہت دُور نہیں ہوتا ہے
بس یہی بات ہمیں آپ کو بتلانی ہے

اردو ادب کے ہر ممتاز شاعر نے زندگی اور موت پر معروف اشعار لکھے ہیں، اسی لیے تو وہ مشہور بھی ہوئے۔ امجدؔ کے پاس بھی ان حکیمانہ موضوعات پر اشعار کی کمی نہیں۔ ہر پھل کا ذائقہ اور ہر پھول کی ساخت اور خوشبو جدا ہوتی ہے۔ اس کا احساس امجدؔ کے اشعار پڑھ کر ہونے لگتا ہے۔ ایسے اشعار صنعتِ ابداع یا سہلِ ممتنع کے دفاتر میں جمع ہوں گے۔ موت کو بھی پھول کہنا اور اُسے زندگی کی پناہ کہنا رعنائی خیال کے ساتھ جولانی فکر بھی ہے۔

ایک ٹہنی کے پھول ہیں دونوں
موت اور زندگی میں ناتا ہے

موت ہی زندگی کی دشمن ہے
موت ہی زندگی بچاتی ہے

موت اور زندگی صنعتِ تضاد کی خوبصورتی ہے جو دشمن اور بچانے کے مخالف الفاظ سے محکم ہوجاتی ہے۔ اس شعر میں موت، زندگی، ہی اور ہے کی تکرار بھی شعر کو سلاست، تازگی، روانی بخشتی ہے۔ الفاظ کی تکرار اور ان کی داخلی نغمگی (Organic rhythm) سے استفادہ غزل نگاری کا حسن بھی ہے جو ذیل کے اشعار میں بھی ظاہر ہے۔

عکس در عکس فقط حیرت تھی
عقل جب آئینہ خانہ میں گئی

بات کوئی سمجھ نہیں آئی
بات اتنی سمجھ میں آتی ہے

حرف بھی اُسی سے ہے صَوت بھی اُسی سے ہے
وہ صدائے کن ہی تو نغمۂ کردگار ہے

جدیدیت یا مابعدِ جدیدیت کی غزل اور کلاسیک دور کی غزل میں جو ایک اہم فرق ہے۔ اس میں فن برائے فن اور فن برائے مقصد کی بھی تفریق شامل ہے۔ ہم نے جو اشعار اب تک پیش کیے ان میں ہر قسم کے موضوعات کی جھلک تھی لیکن سماجی ثقافتی اور رومانوی رنگ امجدؔ کی غزلوں کا خاص حسن ہے۔ وہ معاشرے، کنبے، وطن، دورِ حاضر کے ظلم وستم پر کُھل کر لکھتے ہیں۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ امجدؔ کے پرستاروں کی دنیا کے ہر گوشے میں کمی نہیں۔

کہنے کو ایک صحن میں دیوار ہی اُٹھی
گھر کی فضا، مکان کا نقشہ بدل گیا

پہلا مصرعہ واقعہ کی منظر کشی ہے جس سے مکان کا نقشہ بدل گیا۔ یہ ایک طبعی چیز ہے۔ اصل اس شعر کا رمز گھر کی فضا میں بند ہے۔ مکان اور گھر میں زمین آسمان کا فرق ہے اگرچہ دونوں الفاظ مترادف ہیں لیکن معنوی لحاظ سے جس گھر میں محبت اخوت ایثار اور اُلفت نہیں رہتی وہ صرف مکان مکین کے رہنے کی وجہ سے بن جاتا ہے۔ فضا وہی ماحول ہے جو گھر کو مکان سے جدا کرتی ہے۔ اس شعر میں دیوار حقیقی معنی میں یا محاورتی معنی میں ایہامی کیفیت پیدا کر رہی ہے۔ دیوار کوئی بھی مسئلہ ہوسکتا ہے جو مکان کے لوگوں کو جدا کر رہا ہے، اور اختلاف باعث ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے اگر خاندان میں درگزشت اور ایک دوسرے کا لحاظ نہ ہو تو معمولی سی بات بھی بتنگڑ بن سکتی ہے جس سے پورا خاندان ہمیشہ کے لیے ٹوٹ سکتا ہے۔ یہ شعر اخلاقی قدروں کی پاسداری کی اہمیت واضح کر رہا ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر دو تین غزل کے اخلاقی اشعار بغیر تشریح اور تحلیل کے نقل کرتے ہیں۔

جڑیں جن کی ہوں مستحکم، وہی پودے پنپتے ہیں
دلوں میں جو اتر جائے اسی کا نام عزت ہے

امجدؔ نہ قدم روک کہ وہ دُور کی منزل
نکلے گی کسی روز اِسی گردِ سفر سے

میں ایسے لفظ لکھوں گا جو سب کے دل میں ہیں
فقط وہ بات کروں گا جو سب سمجھتے ہیں

ساری بات تعلق والی جذبوں کی سچائی تک ہے
مَیل دلوں میں آجائے تو گھر ویرانے ہو جاتے ہیں

آخر میں ہم امجد اسلام امجدؔ کی غزلوں سے چند عشقیہ اشعار جو جمالیات، رومانیت اور جذبوں کی کیفیت کی خوشبو بکھیر کر مخصوص محبت کی فضا سے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں پیش کرتے ہیں۔ ان اشعار میں سادگی کے ساتھ خلوص کی چاشنی، شکوے،

درد و گداز کی واردات سب کچھ شامل ہے۔ ہم نے ذیل کے اشعار سے چند کا تفصیلی تجزیہ دوسرے مقامات پر کیا ہے۔ اس لیے تکرار سے اجتناب کرتے ہیں۔

کسی کی دُھن میں کسی کے گماں میں رہتے ہیں
ہم ایک خواب کی صورت جہاں میں رہتے ہیں

تم نے نگاہ پھیر کے دیکھا بس ایک پل
اس ایک پل میں کتنے ہی موسم چلے گئے

پلکوں کی دہلیز پہ چمکا ایک ستارہ تھا
ساحل کی اُس بھیڑ میں جانے کون ہمارا تھا

حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

زمیں سے آسماں تک جس قدر اچھے مناظر ہیں
محبت کے کنائے ہیں، وفا کے استعارے ہیں

ہر مسافت کی دوری کا سمٹاؤ ہے
جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

خوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
اک نظم ترے واسطے لکھیں گے کسی دن

امجدؔ کتابِ جاں کو وہ پڑھتا بھی کس طرح
لکھنے تھے جتنے لفظ ابھی حافظے میں تھے

اُسے اندازہ ہی امجدؔ نہیں ہے
اُسے اک شخص کتنا چاہتا ہے

کلامِ امجدؔ میں وقت کی تصویر کشی

آج جب میں امجد اسلام امجدؔ کی شاعری میں وقت زمان و مکان کے مضمون کی آخری بار نوک و پلک سنوار رہا ہوں ٹیلی ویژن کے پردے پر دنیا کے عظیم فیزسٹ اسٹیفن ہاکنگ کی موت کی خبر پڑھ رہا ہوں جس نے پچاس سال سے زیادہ مہلک بیماری ALS کا مقابلہ کیا۔ چھہتر (۷۶) برس میں جو کچھ اُس نے دنیا کو دیا اس کا بیان ممکن نہیں۔ یہ شخص آئین سٹائین کے بعد عصری دنیا کا سب سے بڑا سائنس داں تھا جس نے بلیک ہول، ستاروں کی دنیا، وقت و زمان کے نکات وغیرہ پر بہت کچھ سمجھا اور اپنی تحریروں سے سمجھایا۔ کئی مغربی دنیا کے حکمراں لیڈر اس سے ملنے، اس کے دفتر پر جاتے اور خراجِ تحسین پیش کرتے جن میں کیتھولک مذہب کا سربراہ پوپ بھی شامل ہے۔ مگر میں نے نہیں سنا کہ کسی ہمارے دینی یا دنیوی اہم شخص نے ملاقات کی اور اس زمان و مکان کی آگہی اور تسخیر کرنے کے راستے بنانے والے کو اہمیت دی ہو، جبکہ حکیم الامت کی شاعری میں فضیلتِ انسان، کہکشاں کے رموز سے آگاہی اور ان کی تسخیر میں شامل ہے۔ یہاں ہم نے ان چند جملوں کو اس مضمون کا چہرہ اس لیے بھی بنایا کہ ہمارے کلچر میں لہو و لعب کو تو اہمیت دی جاتی ہے لیکن آگہی، معرفت، رموز اور افکار سے شناسائی پر توجہ نہیں دی جاتی۔ چنانچہ امجدؔ کی شاعری کے محدود ریویو میں امجدؔ کی انسان شناسی، ان کی کائنات سے آگہی کی روشنائی، زمان اور مکان کی آشنائی اور وقت کی زندگانی پر چند سطحی جملوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا جبکہ ان کے کلام سے اگر ان اشعار اور مصرعوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو ان نکات پر سیر حاصل فکری، منطقی اور وجدانی حیثیتوں سے بھرپور مواد جمع ہوسکتا ہے۔ اردو کا دوسرا شاعر جس نے اس طرف توجہ کی ہے وہ گلزارؔ ہے۔ ان کے علاوہ اِکا دُکا کبھی کبھار ان موضوعات پر نظمیں نظر آتی ہیں ورنہ اردو کا چمنستان ان تازہ پھولوں سے خالی ہے۔

وقت امجدؔ کی شعری اُپج کا ایک خاص سبجیکٹ ہے۔ امجدؔ نے اسے کسی خاص ضابطے کے تحت نہ کہا ہے اور نہ اس کو کسی خاص ترتیب کے ساتھ جمایا ہے بلکہ یہ افکار و خیالات ان کے شعری کوہ و دمن میں قدرتی پھولوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں جن کو چُن کر گلدستہ بنانا بھی اس لیے آسان نہیں کہ وقت کے موضوعات کی طرح ان کی شکلیں، رنگ اور جسامتوں میں فرق ہے لیکن سب اشعار فکری زاویوں کو متحرک اور خیالات کو منہمک کرتے ہیں اور آگاہی کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں۔ ہمارے مطالعے میں بعض فارسی اور اردو کے شاعروں جن میں اساتذہ بھی شامل ہیں انہوں نے تصوفی اور فلسفہ کی منطقی اور وجدانی سیر کی ہے وقت اور زمان و مکان پر شعر کہے ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر خود امجد نے اپنی تنقیدی کتاب ''نئے پرانے'' میں کیا ہے۔

یہاں اس موضوع پر گفتگو اور ان شعروں کا تجزیہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ موضوع اردو ادب میں خال خال ہے اور بعض جگہ قول اتنا مشکل ہے کہ اس کا سمجھنا بڑی حد تک محال ہے جبکہ امجد کی شاعری میں وقت کا جال پھیلا ہوا ہے اور اس کا سمجھنا ہر ایک کی فکر کا تال ہے جو آسان گوئی کا کمال ہے۔ ہر عامی اور عالم کے ذہن میں ان مسائل کے خاکے اور کچھ کچھ منتشر خیالات ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ ان داخلی تجربوں کو شعری رس میں گھول دیتا ہے تو وہ امرت بن کر ذہنوں میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ اس بات کا بھی خیال ضروری ہے کہ وقت لامحدود وسعتیں رکھتا ہے اور الفاظ محدود ہیں۔ اس لیے الفاظ کے تہہ در تہہ معانی بھی مطلب کو سمجھنے کے لیے لازم ہیں۔

امجد کے مجموعہ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں ایک نظم جس کا عنوان ''آج'' ہے۔ اس نظم میں وقت پر تبصرہ بھی ہے۔ وقت سے متعلقہ ادوار کی تشریح بھی ہے اور ان میں شامل شاعرانہ تجزیہ بھی ہے۔

یہ ''آج'' جو کل میں زندہ تھا
یہ ''کل'' جو آج میں زندہ ہے
وہ کل ''جو کل'' کے ساتھ گیا
وہ کل ''جو ابھی'' آئندہ ہے
گزر چکے اور آنے والے جتنے ''کل'' ہیں جتنے ''کل'' تھے
ان کا کوئی وجود نہ ہوتا
ہم اور تم بے اسم ہی رہتے
''آج'' اگر موجود نہ ہوتا

ہوسکتا ہے آنے والے ''کل'' میں ہمارا ''آج'' نہ ہو
اور اُس کی جگہ
اک ایسے وقت کا سایہ سا رقصندہ ہو جو
ماضی حال اور مستقبل کے
تین کناروں والے اس دریا سے یکسر باہر ہو

آج کے پُل پر رک کر آگے پیچھے دیکھ
روشنی اور تاریکی شاید ایک ہی ڈال کے پتے ہیں
لمحوں کا یہ فرق نظر کا دھوکہ ہے
وقت کی اس ''ناوقتی'' کے سیلاب میں۔ شاید
''آج'' ہی واحد لمحہ ہے

امجد نے وقت سے بنائے گئے تین مفروضوں کی حقیقت بتادی کہ یہ فرض کر لیے گئے ہیں کہ کل آج اور آئندہ کل یعنی

ماضی، حال اور مستقبل سب نظر کا دھوکہ ہے جس کے ذریعے ہم زمانے کی بات کرتے ہیں۔اسی سے دن رات ، مہ وسال اور عمرِرواں کا حساب ہوتا ہے۔ وقت ایسا دریا ہے جس کی ابتدا اور انتہا نہیں معلوم اور زمانے اس دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ مطالب امجدؔ اپنی دوغزلوں کے اشعار میں یوں پیش کرتے ہیں۔ دریا کے دو کنارے ہوتے ہیں مگر وقت کے تین کنارے ہیں۔

تین کنارے ہیں اس کے
وقت بھی کیسا دریا ہے

وقت کی کوئی حد نہیں شاید
ہر زمانہ اسی میں ڈوب گیا

ایک اور نظم ''ابھی کچھ دنوں میں'' اسی لمحہ (Moment) کو مرکزیت دے کر خیالات کی جمع تفریق کر کے رموز زماں کے شاعرانہ دائرے بناتے ہیں۔

وہ لمحے جو غم کی کمانوں سے چھوٹے تو سیدھے دلوں میں ترازو ہوئے
وہ لمحے جو زلفوں کی چھاؤں میں گزرے تو ہر آس کے دست و بازو ہوئے
وہ لمحے جنھیں بھول جانے کی خاطر میں اَن دیکھے رستوں پہ چلتا رہا
وہ لمحے جنھیں دیکھنے کے لیے میں چراغوں کے مانند جلتا رہا
جمع و تفریق کے اس مسلسل عمل میں
جو لمحہ بھی گزرے پلٹتا نہیں
وقت کے آئینہ میں کوئی عکس بھی
ایک پل سے زیادہ ٹھہرتا نہیں

خیامؔ نے کہا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے ہر لحظے سے لذت لینی چاہیے اور اس لحظے میں زندگی بتانا چاہیے کیوں کہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ امجدؔ کی غزل کے دو شعر اسی عمدہ مضمون پر دیکھیں جو حقیقت نگاری کے ساتھ بلیغ خیالات کی سادگی، شگفتگی اور دقیق تازہ خیالی بھی ہے۔ یہاں علامتی پیکر تراشی، معنی آفرینی کی ضامن ہے۔

اگلے پل کے آنے تک
بس یہ لمحہ اپنا ہے

روزمرہ میں پل اور لمحہ کا استعمال قادرالکلامی ہے۔

پھسلتا جاتا ہے مانندِ ریگ ہاتھوں سے
گزرتے وقت کو اک پل قرار ہو تو سہی

عمدہ متحرک تشبیہ ہے جو قدیم ریت کی گھڑی سے جڑ گئی ہے۔ یعنی وقت کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اگر ہم اس پل کو ایک اور مجموعہ ''فشار'' کی پہلی نظم ''ہم ایسے مرگ طلب بھی نہ تھے محبت میں'' کے آشوبی مصرعوں سے جوڑ دیں تو پل کا وہ رخ بھی ظاہر

ہوجائے گا۔

سو بات حرف وفا کی ہے اور نہ خوابوں کی
نہ ڈولتے ہوئے رنگوں سے پُر گلابوں کی
سمے کے چڑھتے اترتے ہوئے سمندر میں
سب ایک پل کی حقیقت
سب ایک پل کا سراب
دلوں میں ترکِ تمنا کا حوصلہ ہو اگر
تو کیسا حرفِ وفا
اور کہاں کے خواب و گلاب

مشہور ہے گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ جو پانی پل کے نیچے سے گزر جاتا ہے پھر نہیں پلٹتا۔ آدمی دریا کے اُسی پانی میں دوبار قدم نہیں ڈال سکتا۔ یہ سب باتیں یہ بتا رہی ہیں کہ وقت ایک مسلسل دھارا ہے جس کا اول و آخر معلوم نہیں۔ امجدؔ نے نظم ''اُس رات آسمان پر تارے تھے اس قدر'' میں لوحِ وقت پر لکھی تحریر سنائی ہے۔

یہ سچ ہے لوحِ وقت پہ تحریر موجِ رنگ
نقش و نگارِ آب کی صورت ہے برق پا
اک بار پل تلے سے جو پانی گزر گیا
سمجھو کہ مر گیا
ساحل کا جھاگ ہو کے مٹے یا کہ رزقِ ابر
آتا نہیں پلٹ کے کبھی جو گیا گیا

مصرعوں کی سلاست، روانیٔ الفاظ کی مصرعوں اور فقروں میں نشست نظم کو نرم اور شیریں بنا رہی ہے۔ امجدؔ ادق اور مشکل مسائل کو آسان اور سہل بنا دیتے ہیں۔ یہ ان کی ہنرمندی ہے جس کی وجہ سے ان کی نظم رواں دواں رہتی ہے اور بعض وقت غزل سے بھی زیادہ تیزی اختیار کر لیتی ہے۔

''رزق'' امجد نے جیسا اپنی شاعری میں برتا ہے کسی اردو شاعر نے نہیں کیا۔ ہم نے ایک دوسرے مقام پر اس کو مصرعوں سے ثابت کیا ہے۔

امجدؔ جہاں نظموں کے طویل مصرعوں، فقروں اور بندوں میں موضوع کو گوناگوں طریقوں سے زینت دیتے ہیں وہ غزلوں میں اختصار سے ایجاز بیانی بھی کرتے ہیں۔ غزل کے دو شعر نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

گزر جاتا ہے جو منظر وہ پھر واپس نہیں آتا
کہ کوئی جا چکا لمحہ دوبارا ہو نہیں سکتا

امجدؔ کے پاس بعض عمیق فکری شعر جو فلسفہ معلوم ہوتے ہیں موجود ہیں۔ زمان اور مکان، خودی بے خودی، ازل اور ابد

کو کس طرح سے پیش کیا ہے۔

پھر اس کے بعد ابد تک زمان ہے نہ مکاں
خودی ہے ایک قدم، بے خودی کے رستے میں

امجدؔ کے اشعار لفظی مناسبت سے معمور ہیں جیسے قدم، رستے، مکان یا اصطلاحات کی معنی خیزی میں جیسے زماں مکاں، خودی بے خودی وغیرہ۔ ایسے اشعار جدید ذہن کو سوچنے اور سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں اور شاید اکیسویں صدی کی شاعری کا تقاضہ پورا کر رہے ہیں۔ امجدؔ ایک گیت میں کہتے ہیں۔

یہ عمر ہوا کا جھونکا ہے
کب وقت کا دریا رُکتا ہے
سچا ہے بس آج کا لمحہ
باقی سب افسانہ ہے

جو گزر رہا ہے وہ سچا ہے جس سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے کیوں کہ وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ وقت کے بارے میں سب عالموں کی موشگافیاں افسانوں سے بڑھ کر نہیں۔ یہاں عمر کو ہوا کے جھونکے سے تعبیر کرنا سچی اور نادر استعاراتی صناعی ہے۔

وقت امجدؔ کا اہم موضوع ہے۔ وقت اور آنکھ کا سمبندھ یہاں عزم و استقلال کے ساتھ اکیسویں صدی کے لیے ایک نظم میں کیا گیا ہے۔ ہم نظم کا چہرہ اور آخری حصہ اور درمیانی دو بند پیش کر رہے ہیں۔

سمے کے رستے میں بیٹھنے سے
تو صرف چہروں پہ گرد جمتی ہے
اور آنکھوں میں خواب مرتے ہیں
جن کی لاشیں اٹھانے والا کوئی نہیں ہے
زباں پہ زنجیر سی پڑی ہے
اور آنکھوں میں شام زنداں کی بے بسی ہے
چراغ سارے بجھے پڑے ہیں جلانے والا کوئی نہیں ہے
مرے عزیزو چلو کہ آنکھوں کو مَل کے دیکھیں
کہاں سے سورج نکل رہا ہے
سمے کے رستے پہ چل کے دیکھیں

شاعری کا مقصد زندگی کو سنوارنا بھی ہے۔ اس لیے شاعر موضوعات کو چُن کر نکات روشن کرتا ہے کیوں کہ ایک شعر گاہی اوقات ایک کتاب کے چیپٹر سے مفید ثابت ہوتا ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے وقت کے دھارے کے ساتھ بہنا زندگانی اور کوشش و کامرانی ہے۔ یہاں بدلتے ہوئے حقائق اور حالات سے آگاہی ہوتی ہے اور یہی آگہی کامیابی کی کنجی ہے۔ امجدؔ کو جو کئی ہندی

کے رسیلے لفظ پسند ہیں ان سے سے، سپنا، جیون، سندر اور آدرش وغیرہ جگہ جگہ اپنی خوبصورتی اور جمالیاتی صوری اور معنوی چہروں سے غزل اور نظم کو دلکش اور عام فہم بنا دیتے ہیں۔ ان اشعار میں سے کی دلربائی دیکھیے:

سے کے ساتھ بدلتی ہے دل کی کیفیت
ہمیں یہ لگتا ہے منظر، بدلتے رہتے ہیں

وہ آدمی ہوں، ستارے ہوں یا تمنائیں
سے کی راہ میں ہر شے بدلتی رہتی ہے

سے کا چاک ہے اور خاک ہے حوادث کی
زمین زاد، سدا امتحاں میں رہتے ہیں

چاک اور خاک کی علامتوں پر بنایا گیا یہ شعر شاہکار ہے۔ یہاں شاعر نے ایک پورے مشاہدے اور تجربے کو زندگی کے فراز و نشیب سے جوڑ دیا ہے۔ زمین زاد کی خوبصورتی مجازِ مرسل اور کنایات کی یاد تازہ کرتی ہے۔ دنیا کے ہر لحہ، ہر لحظہ ہونے والے واقعات جو وقت کے چاک پر ظاہر ہو رہے ہیں شاعری کا کمال ہے کیوں کہ چاک وقت کی گردش میں رہتا ہے اور اسی گردش سے چیزوں کا وجود اور ان کی شکلوں کی نمود ہوتی ہے۔ ایک منظر کشی کر کے شاعر نے ''سدا امتحاں میں رہتے ہیں'' کا فقرہ جڑ دیا جو سچی شاعری ہے۔ اس شعر میں چاک اور خاک کی موجودگی نے مصرعے کو ترنم خیز بنا دیا ہے۔ امجد کے کئی مصرعوں میں دو یا دو سے زیادہ ہم وزن اور ہم قافیہ الفاظ نظر آتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں اردو شاعری کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے نئے نئے تجربات اور مشاہدات کو نئے طریقوں سے پیش کرنا ہوگا۔ شاعر نے ایک اور مقام پر وقت کو بچے اور کھلونے کی نسبت سے دیکھا ہے۔ ہم سب بچے اور کھلونے کے تعلق سے واقف ہیں۔ اس ذہنی مشاہدے میں ان اشعار کو کھولیے تو معلوم ہوگا زندگی اور تقدیر وقت سے کیا نسبت رکھتی ہے اور کیا اُسے دے سکتی ہے۔

زندگی اک دُکاں کھلونوں کی
وقت بگڑا ہوا سا بچہ ہے

بگڑے شریر بچے سارے کھلونوں کو بکھیر دیتے ہیں جس کی وجہ سے بعض کھلونے ٹوٹ بھی جاتے ہیں لیکن پھر بھی دکان اسے جماتی رہتی ہے۔ کیا زندگی کا نشیب و فراز، شادی و غم امیری اور غریبی، دوستی اور دشمنی، صحت اور بیماری، وصل و فراق یہ تغیرات برپا نہیں کرتے۔ تقدیر، جبر اور اختیار کی بے اختیاری قسمت بخت کا روشن ہونا اور بجھ جانا کیا وقت کی طرح کھلونے اور بچے کا سمبندھ نہیں۔

وقت اور بخت کے تعلق میں
ایک بچہ ہے، اک کھلونا ہے

پھر یہاں مصرعہ اولیٰ میں دو ہم وزن الفاظ کے ہونے سے نغمگی بڑھ گئی۔ یہاں وقت اور بخت جو دو نامرئی پیکر ہیں ان سے دو مرئی پیکر بچہ اور کھلونا، معنی آفرینی کے سبب ہیں۔ اسی وجہ سے بھی شعر بڑی شاعری کا نقیب بن گیا ہے۔

مشہور ہے کہ وقت کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا۔ میر انیس کہتے ہیں۔

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیسؔ
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

امجدؔ کہتے ہیں:

شہرت، عروج، حسن کی دولت کسی سے بھی
کرتا نہیں یہ وقت رعایت کسی سے بھی

بہت آباد رستوں سے گزرتا وقت کا دریا
سبھی نقشے مٹا دے گا، میں تم سے کچھ نہیں کہتا

وقت ایسا ہم سفر ہے جس کی منزل ہے الگ
وہ سرائے ہے کہ جس میں ٹھیرتا کوئی نہیں

یہ سچ ہے اس مفہوم کو کئی طریقوں سے باندھا گیا ہے جیسے دنیا کی بے وفائی، بے ثباتی اور بے رخی۔ وقت کی آفاقیت، اس کی پہلو داری، فکری وسعت، حسن آفرینی اور سحر طرازی بڑے شاعروں اور بخصوص فلسفہ سے رچے بسے مفکر شاعروں کے پاس کم وبیش موجود ہے۔ جہاں زمان ومکان، ازل وابد، جبر، اختیار، زندگی اور موت جیسے پیچیدہ مسائل پر گفتگو خال خال ہے۔ امجدؔ نے ان مسئلوں پر کئی نظموں میں اور چند غزل کے شعروں میں فکر اور سوچ کو مہمیز کیا ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند نظموں کے کچھ مصرعے اور فقرے پیش کریں گے جو ازل وابد، زمان ومکان اور وقت کے تعلق سے ہیں۔ امجدؔ کی وقت پر خوبصورت فکر انگیز نظم ہے جس کے چند مصرعوں کو جوڑ کر ہم قارئین کو پوری نظم پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ جو وقت ہے مرے چار سو
اسے ناپنا شب و روز میں، مہ و سال میں
اسے روکنا کسی حال میں
نہ تو ممکنات کے بس میں ہے
اسے دیکھنا، اسے سوچنا
کبھی سرخوشی کے جمال میں
کسی معرفت کے خیال میں
کسی فلسفے کے سوال میں

کہ نقوش ماضی و حال میں
فقط ایک کوشش خام ہے مرے شوق کی مرے فہم کی
جسے وقت کہتے ہیں آپ ہم
کوئی بے کنار سی موج ہے کسی سیل کی
اُسی سیل کی جو ازل کے دل سے رواں ہوا
وہ ازل کہ جس کی مثال بھی یہی وقت ہے
جسے تھامنا ہے ابد کے دشتِ گمان نے
وہ ابد کہ جس کی مثال بھی یہی وقت ہے

یعنی اس نظم کا مطلب شاعر یہ بتا رہا ہے کہ سب گمان کی باتیں ہیں ہمیں خرد نے اتنی وژن نہیں دی جس سے یہ رموز کو ہم فاش کر سکیں۔ پس معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد۔ ایک اور نظم ''وہ ایک چشم آشنا'' میں ازل اور ابد کے مسئلے پر کہتے ہیں:

ازل سے آج تک جہاں، وہی ہے رُت وہی سماں
بہت سے ایسے پانیوں کے سلسلے ہیں آج بھی
کہ جن سے آشنا نہیں ہیں کشتیوں کے بادباں
اور ان پہ ایک چھت کی مثل یہ کشیدہ آسماں
کہ جس کے بے کنار میں ہیں بے نشاں، زماں مکاں
افق افق غبار ہے نظر نظر دھواں دھواں

شاعر یہی کہہ رہا ہے کہ اس زمان و مکان کے سمندر میں جو کشتیاں، فلسفہ تحقیق اور منطق وغیرہ کی بہا رہے ہیں وہ راستوں سے واقف نہیں اور وہ اس آسمانی چھت سے واقف نہیں جو ان کے سر پر تنی ہوئی ہے کیوں کہ ہر طرف غبار اور آنکھوں میں دھواں بھر گیا ہے۔

ان مصرعوں میں ازل، ابد کے تضاد، افق نظر دھواں کی تکرار اور مراعات النظیر میں پانیوں، کشتیوں، بادباں کی وجہ سے خوبصورتی اور تاثیر بڑھ گئی ہے۔ جب کوئی لفظ تکرار ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے نہ صرف نغمگی بڑھ جاتی ہے بلکہ تکرار سے دھندلی تصویر گہری ہو جاتی ہے جس سے قاری متاثر ہو جاتا ہے۔

امجد ایک نظم ''کہا اس نے'' میں مکاں اور لامکاں کو وقت کے دھارے سے جوڑتے ہیں۔ اس نظم کے بیچ کے چند مصرعے۔

مکاں اور لامکاں کے درمیاں جو
وقت کا دریا سا بہتا ہے
کہیں اُس پر کوئی اک پُل ہے جس نے جوڑ رکھا ہے
نگاہوں کی پہنچ سے دور

یہ سب مفروضات ہیں کیوں کہ لامکاں کوئی مکاں ہی نہیں تو کیسے وہ پل کا دوسرا پایا ہوگا۔ یہی ان مسائل کی عقلی اور منطقی دشواریاں ہیں۔ ایک طولانی نظم ''عکس در عکس'' کے اشعار کو ملا کر دیکھیں تو اور بھی مسئلہ الجھتا معلوم ہوتا ہے۔

ازل میں اور ابد میں کون پہلے ہے؟ نہیں کھلتا
بس اتنا جانتے ہیں ہم
یہ دونوں خط، خطِ تقدیر کی سنگت میں رہتے تھے
بس اتنا فرق ہے شاید
خط تقدیر ان دونوں کے بیچوں بیچ چلتا ہے

یہ سب نام جیسے ازل کے معنی یقین سے وہی نہیں جو معروف ہیں۔ یہاں خطِ تقدیر عمدہ ترکیب ہے۔ اسی ازل اور ابد کی بحث کو امجدؔ ''حد'' میں یوں نظم کرتے ہیں۔

زمیں کی حد ہے
فلک کی کوئی بھی حد نہیں ہے
ہم آپ اتنا ہی جانتے ہیں
ابد کے پیچھے ازل نہیں تھا
ازل سے پہلے ابد نہیں ہے

ازل اور ابد کی تکرار نے مصرعوں کو حُسن صوت کے ساتھ حسنِ صوری بھی دیا ہے۔

پھر نظم ''سمندر کو دیکھو'' میں زمان و مکان اور ازل و ابد کو سمندر کے تکبّر سے ملا کر نیا مضمون معرفت کا چھیڑتے ہیں۔

تکبّر ہے زیبا فقط اس خدا کو
جو سارے جہاں کا زمیں آسماں کا
زمان و مکان اور یقین و گماں کا
ازل سے ہے مالک ابد تک رہے گا
اور اس کی مشیت کے آگے سمندر
جو دیکھو تو چھوٹی سی اک آبجو ہے

ان مصرعوں میں صنعت تضاد کی کرشمہ سازی ہے۔ ازل ابد، یقیں گماں، سمندر، آبجو مصرعوں میں معنوی رنگ کو گہرائی اور گیرائی دے رہے ہیں جو امجدؔ کی نظموں میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں جیسے اس نظم ''درد کے رشتے عجب ہیں'' میں ملتے ہیں۔

یہ زماں اور یہ مکاں
یہ قربتیں یہ دوریاں
دور تک بچھتی زمیں اور اس پہ پھیلا آسماں

امجدؔ کی شاعری میں یہ حکیمانہ موضوعات اور نظری مسائل صرف فلسفہ اور وجدان کی موشگافیوں کے طور پر نہیں آئے بلکہ

ان قدروں سے انہوں نے قدیم ادوار سے موجودہ دور کو جوڑ کر اہم سوالات اٹھائے ہیں اور آئندہ کے لیے خطِ فکر بھی کھینچا ہے جیسے وہ ''ہجوم اور کارواں'' میں پوچھتے ہیں۔

کہاں گئے وہ رنگ جو سمے کے سنگ سنگ تھے
کدھر گئی وہ روشنی جو حرف حرف تھی رواں

یہ روز و شب کا کارواں
ازل ہے جس کا بے نشاں
ابد ہے جس کا نا گہاں
ہم اس کے کس پڑاؤ پر رُکے ہوئے ہیں اور کیوں
یہ کس طرح کی دھندسی ہمارے آس پاس ہے
صدا جرس کی کیا ہوئی؟

یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص امجد کا پورا کلیات پڑھے۔ اسی لیے اگر کوئی اس نظم کو دیکھے تو ازل و ابد کے مطالب وہ بیان کر دیتے ہیں جو ان کے تعارف کے لیے کافی ہے۔ پھر اس سے دوسرے مطالب کو جوڑ کر نئے نئے نکات نکالتے ہیں۔ یہاں ہم قافیہ الفاظ، رنگ اور سنگ، تکراری الفاظ، سنگ، حرف جس 'کا' ہے تجنیسی الفاظ رنگ سنگ، آس پاس، تضاد کی جوڑیاں روز، شب، ازل، ابد کے علاوہ مصرعوں کا سوالیہ انداز طرزِ بیان کی مہارت کے نشان ہیں۔

کلام میں رِزق کی فراوانی

رزق عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی روزی، خوراک، غذا، کھانا اور وظیفہ بھی ہے۔ یہ اللہ کے صفاتی نام رزاق سے ہے۔ اردو شاعری میں گاہے گاہی اس لفظ کو برتا گیا ہے لیکن جس طرح سے امجد اسلام امجدؔ نے اس لفظ کو مختلف موضوعات اور مطالب و ترکیبات کے ساتھ استعمال کیا شاید ہی کوئی دوسرا شاعر اس کی ہمسری کر سکے۔ امجدؔ ایک فطری شاعر ہے۔ فطری شاعر فطرت کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اس کے کلام میں معنوی لطف اور حُسن ہو جو اُسے اقتضائے وقت کے مطابق کئی طرح سے حاصل کرنا پڑتا ہے، کبھی مثال اور مانند کے ذریعے، کبھی لفظ کے غیر لغتی معنی سے اور کبھی مطلب اشارے میں ظاہر کر کے۔

شاعر کلام میں اثر آفرینی پیدا کرنے کے لیے کئی ایسے طریقے اختیار کرتا ہے کہ احساسات کی شدت کی تصویر کھینچ سکے، ان مختلف طریقوں کے فن کو علمائے بلاغت نے علم بیان کہا ہے جس میں تشبیہ، استعارہ، مجاز، کنایہ، علامت، تلازمے، اشارات وغیرہ شامل ہیں جو پیکر تراشی کی دین ہے اور جس سے معنی آفرینی ہوتی ہے۔ امجدؔ کی غزل ہو کہ نظم یا گیت رزق ہر جگہ ملتا ہے۔ کہیں یہ رزقِ انتظار، کہیں رزقِ غبار، کہیں رزقِ غنچہ، رزقِ الم، رزقِ خاک، رزقِ پائے باد، رزقِ اجل، فنا کا رزق، کہیں غریب کا رزق، زمین کا رزق اور ریگِ رواں کا رزق ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔

امجدؔ معمولی سی بات کو اس لطف سے بیان کرتے ہیں کہ وہ جدید معلوم ہوتا ہے۔ امجدؔ کہیں کہیں مخفی مفہوم رکھ دیتے ہیں جس تک ہر شخص کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ امجدؔ نظم میں بیچ کی کچھ کڑیوں کو چھوڑ دیتے ہیں پھر بھی زنجیرِ فکر و خیال مجروح نہیں ہوتی۔ شاعری کے فن میں لفظ بڑی قدرت کا حامل ہے اور اس توانائی کو ظاہر کرنے کے لیے اس کے استعمال کے سلیقے سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے اور پھر اس توانائی کو اس کے اطراف کے الفاظ سے جوڑ کر توانائی کا مینار بنانا پڑتا ہے جو ایک شاہکار شعر ہے یعنی ایک لفظ کے action کو دوسرے الفاظ کے Reaction سے جوڑنا تاثیر کا عمل ہے۔ الفاظ کا عاشق ہونا اور چیز ہے الفاظ کا پارکھ ہونا اور ہے۔

خدا کا رزق تو ہرگز زمیں پر کم نہیں یارو
مگر یہ کاٹنے والے مگر یہ بانٹنے والے

کون نہیں جانتا کہ لاکھوں ٹن اناج سمندروں میں ڈبو دیا جاتا ہے کہ اضافی غلّے سے اس کی قیمت کم نہ ہو جائے۔ پہلے شعر کے مصرعے میں حقیقت نگاری ہے۔ دنیا کی بہت کم زمین اناج اُگانے میں استعمال ہوتی ہے۔ اس پر بھی اتنا اناج پیدا ہوتا

ہے کہ انباروں میں رکھنے کی جگہ نہیں رہتی۔ اگر چہ اس کی تقسیم ٹھیک نہیں ہوتی اور آج بھی غریب ملکوں میں لوگ روٹی کے ٹکڑے کے محتاج ہیں۔ مصرعہ دوم حسنِ صوری اور حسنِ معنوی کا شاہکار ہے۔ پورا مصرعہ الفاظ کی تکرار سے بنایا گیا ہے۔ یہاں صرف دو ہم وزن الفاظ کاٹنے اور بانٹنے کے علاوہ مگر، یہ، والے تکراری ہیں۔ شاعر سماج کے ظالمانہ رویہ سے نقاب کشی کر رہا ہے کہ رزق تو اللہ کی دین ہے مگر یہ زمین کے جاگیردار اور غریبوں، مزدوروں، بیکسوں کا حق ہڑپ کرنے والے حیوان صفت افراد سماج کا روگ ہیں۔ مشرقی معاشرے میں رزق دینے والا صرف اللہ سکھایا جاتا ہے۔ اسی لیے پرانے دسترخوانوں پر فارسی کا ایک شعر جگہ جگہ لکھا جاتا تھا:

شکرِ خدا کن کہ مہمان تو
رزق خودش می خورد در خانہ تو

یعنی اللہ کا شکر ادا کر کہ تیرے گھر پر تیرا مہمان اپنا رزق کھا رہا ہے یعنی اللہ کا معین کردہ رزق تیرے دسترخوان سے حاصل کر رہا ہے۔ اس شعر میں صنعتِ تکرار، صنعتِ تجنیس کے علاوہ روزمرہ کی جھلک بھی ہے۔ مغربی تہذیب میں عام طور پر کہتے ہیں ''میں آپ کا لنچ خریدوں گا''۔

امجدؔ ایک اور شعر میں اسی مطلب کو انسان کی حرص اور طمع سے روشن کر رہے ہیں۔ دنیا کی نعمتیں ایک روٹی کی شکل ہیں اگر اس کو عدالت اور انصاف کے ساتھ بانٹ کر کھائیں تو دنیا معنوی طریقے پر متمدن اور قابلِ رشک ہوجائے گی مگر یہ لالچی افراد حق دار تک اس کا حق پہنچنے نہیں دیتے۔

حرص کھا جاتی ہے غریب کا رزق
ورنہ کچھ کم تو یاں اناج نہیں

امجدؔ کی شاعری کا ابھرتا مضمون وقت اور اس سے جڑے ہوئے زمان ومکان کے ہمراہ ازل و ابد کا مسئلہ ہے۔ کئی مقامات پر ان موضوعات پر عمدہ شعر ملتے ہیں، چند شعروں کا ذکر ہم نے وقت کے بیان کے ساتھ کیا ہے۔

آتے دنوں کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ کھلے
سب کچھ فنا کا رزق ہے ماضی بھی حال بھی

یعنی مستقبل، حال، ماضی سب فنا پذیر ہیں۔

امجدؔ کو ان افکار سے دلچسپی ہے اور وہ اس حیرت کے دریا کے شناور ہیں۔ ایک نظم ''نئے لفظوں کی خوشبو'' میں اعتراف بھی کرتے ہیں۔

لکھوں وہ لفظ کسی نے لکھے نہ ہوں اب تک
کروں وہ بات نہ جس سے ہو آشنا کوئی
چنوں وہ رنگ جو پیدا نہیں ہوئے لیکن
یہ آگہی کے علم کس لیے بلند کروں

مگر سچ بات تو یہ ہے وہ ہر جگہ یہ جھنڈے گاڑتے جاتے ہیں، چنانچہ اسی نظم میں لکھتے ہیں:

جو میرے ذہن میں جلتا ہے اس چراغ کی لَو
وہ روشنی تو نہیں جس کی آرزو لے کر
ازل سے محوِ سفر ہیں یہ آدمی زادے
سیاہ بخت لیے رزقِ پائے باد بنے

کبھی سماجی ظلم و جور، بے دردی، حق کشی کا پرچم لہرا کر رزق ہی کا نام اس پر مختلف معنوں میں ثبت کرتے ہیں'' سے کی صدا'' میں رزق کی شاعرانہ تصویر کشی اور معنیاتی تازہ خیالی دیکھیے:

ظلم کی آگ کو روکنا ہے اگر
جان ہاتھوں پہ رکھ کر چلو دوستو
بے بسی رزق ہے ظلم کی آگ کا
رزق یہ اس کو ہرگز نہ دو دوستو

یہاں رزق کے لفظ کا اثر بہت گہرا ہے جس سے مضمون کو تقویت حاصل ہو رہی ہے یہی کامیاب فنکارانہ خوش سلیقگی ہے جو صرف ایک ماہر فطری شاعر کو قدرت کی جانب سے ودیعت کی جاتی ہے۔

یہاں بات علامتوں اور اس کے تلازمات میں نکھر رہی ہے۔ محاورے جان ہاتھوں پہ لینا کے علاوہ تازہ کاری کے فقرے، بے بسی کا رزق اور سے کی صدا اس شاعری کو موجودہ دور سے جوڑ رہی ہے۔

شاعری شیوہ بیانی بھی ہے، نادرہ کاری بھی ہے، نازک خیالی کے ساتھ تاثیراتی صناعی بھی ہے۔ ان تمام قدروں کو اس شعر میں دیکھیں جہاں رزق نے معنی کے پیٹ کو جمالیات سے سیر کیا ہے۔

ہر سمت آئینوں پہ ہیں رُسوائیوں کے داغ
فصلِ خزاں کا رزق ہوئے آرزو کے داغ

ہم جانتے ہیں شاعر کا دلچسپ اور دلربا مضمون خواب اور اس کے متعلقات ہیں۔ ایک غزل میں لکھتے ہیں:

عمر اسی تضاد میں، رزقِ غبار ہوگئی
جسم تھا اور عذاب تھے آنکھیں تھیں اور خواب تھے

''اس گرد کے منظر نامے'' میں دوسرے رنگ میں حقیقت ابھارتے ہیں۔

کیا خواب تھے ان کی آنکھوں میں
اور کیا ان کی تعبیریں تھیں
جو سیلِ زماں کا رزق ہوئیں
وہ کیا محکم تعمیریں تھیں

میرؔ نے کہا تھا:

پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردوں سے انسان نکلتے ہیں

اقبالؔ نے کہا تھا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

امجد کہتے ہیں:

خاک اور خُوں کا رزق کیے ہیں کتنے رنگ اور کتنے نقش
صفحۂ جاں پر تب جاکر یہ اک تصویر ابھاری ہے

دنیا میں فنا پذیری سے بقا کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ کئی گل رخ خاک میں پیوند ہوتے ہیں تو پھول کا جنم ہوتا ہے کیسے کیسے رنگ اور نقش فنا کا رزق ہوئے تب ایک تصویر خاک سے ابھرتی ہے۔ اس جہان میں کوئی عمل بے ارزش نہیں ہوتا اگر اس میں صداقت ، ہمت، شجاعت اور حقیقت کی نمایندگی ہو۔ ایک نظم ''ناگزیر'' میں شاعر کہہ رہا ہے۔ اگرچہ ایک جگنو کے چمکنے سے ظلمت ختم نہ ہوگی، بے زور بازو دہشت کی فصل کاٹ نہیں پائیں گے، شاعر کے جذبات کا شعلہ خاک میں مل جائے گا مگر:

میں روشنی کی لکیر بن کر کسی ستارے کی مثل بکھروں گا
میں جانتا ہوں کہ میرا شعلہ چمک کے رزقِ غبار ہوگا
مگر میں پھر بھی سیاہ شب کا غبار بن کر نہیں جیوں گا
کرن ہو کتنی نحیف لیکن کرن ہے پھر بھی
یہ ترجماں ہے کہ روشنی کا وجود زندہ
اور جب تک
یہ روشنی کا وجود زندہ ہے رات اپنے
سیاہ پنجوں کو جس قدر بھی دراز کرلے
کہیں سے سورج نکل پڑے گا

سچ تو یہ ہے کہ حق پرست کی معمولی سی آہ بھی افلاک میں شور مچا دیتی ہے اور اس کو کوئی بھی طاقت جبری روک نہیں سکتی بالکل اسی طرح جیسے شاعر کہتا ہے:

کیسے خوشبو کو بکھر جانے سے روکے کوئی
رزقِ غنچہ اسی گٹھری میں بندھا رکھا ہے

مصرعوں سے مضمون کی رنگا رنگ اثر پذیری ظاہر ہے۔ اس لیے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ امجدؔ کے دفترِ عشق میں وجدانی تجربات کی کمی نہیں ، وہ کسی لفظ کو کسی موضوع کے لیے مخصوص نہیں کرتے بلکہ اُسے ہر رنگ کے مضمون میں رنگ دیتے ہیں اور اس کی بدولت کلام گلدستۂ معنی بن جاتا ہے۔ یہاں کلام میں حسن کاری خیال افروزی سے روشنی لیتی ہے۔

وصل اور فراق سے دفترِ جمال اور اشعار معاملہ بندی بھرے پڑے ہیں۔ ان محاکاتی تصاویر میں نئے رنگ اور نقش کی کمی ہے۔ اس بیان میں تخیل کی بوقلمونی سے متعلقات حسن کے ذکر کو نیا اور تازہ تاثراتی پیٹرن دینا بھی جدید شاعری کے نصاب اور چند عمدہ شاعروں کے نصیب میں ہے۔ ہم ذیل میں چند رومانی اشعار کسی توضیح اور تشریح کے بغیر لکھ کر ان جذبات کی ترجمانی

قاری کی خوش فکری پر چھوڑ دیتے ہیں:

سب ولولے تو دل کے ہوئے رزقِ انتظار
اب مل گئی جو اُن کی اجازت تو کیا ہوا

زمیں کا رزق ہوئے وصل و انتظار کے رنگ
پسِ بہار یہ نشہ اتر ہی جانا تھا

ہمارے اشک چمکتے ہیں اُس کی آنکھوں میں
زمیں کا رزق ہیں اور آسماں میں رہتے ہیں

''ڈھلتی ہے جب شام'' میں انداز دیکھیں:

مٹتے بنتے حرفوں کے اس جادو خانے میں
سب کچھ آخر بن جاتا ہے تاریکی کا رزق
جلتا بجھتا رہتا ہے بس ایک تمہارا نام
ڈھلتی ہے جب شام

''رزق'' امجد کی شاعری میں پیکر تراشی کا ایسا تلازمہ ہے جو اپنے ساغر میں ہر قسم کے مشروب کو سمو لیتا ہے جس کا اندازہ اِن شعروں سے ظاہر ہے۔

ہیں اہلِ ہوس رونقِ ایوانِ تمنا
کانٹوں کا ہوا رزق خیابانِ تمنا

جو ہوا سے الجھ رہا تھا کبھی
وہ دِیا تو دیارِ وحشت میں
آپ اپنی ضیا کا رزق ہوا
وقت کے بے یقیں صحرا میں
حیرتِ بے صدا کا رزق ہوا

(شہر کے بے نشاں رستوں میں)

آنسوؤں کا رزق ہوں گی بے نتیجہ چاہتیں
خشک ہونٹوں پر لرزتی اک دعا رہ جائے گی

خوشبو جو تھی خیال میں رزقِ الم ہوئی
جو رنگِ اعتبار تھا گردِ سفر ہوا

شعری آہنگ میں محبت کے ڈھنگ

امجدؔ کی شعریات میں محبت سے رشتہ جگہ جگہ پر نئے نئے رنگ اور نئے نئے ڈھنگ سے ظاہر ہوتا ہے۔ امجدؔ کی شاعری میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا خوبصورت ملاپ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک غم کو دوسرے غم پر قربان کرنے کے قائل نہیں کیونکہ زندگی کے ہر دور میں یہ احساسی موسم برابر جذبات کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں۔ اگرچہ اس مختصری تحریر میں محبت کو سمونا ناممکن ہے کیونکہ خود امجدؔ کہتے ہیں: ع: ''جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے۔'' پھر بھی ہم کوشش کریں گے اس دلکش، دلآویز، دل سوز، دلربا، دل گداز، اور دل دوز ''محبت'' کے نفسیاتی، احساساتی اور جمالیاتی تقاضوں کو جو امجدؔ کے اشعار میں موجود خیال کی برجستگی اور اس کی بے ساختگی کو اثر پذیری دے کر جذبات برانگیخت کرتے ہیں، کسی حد تک ظاہر ہو جائیں۔

عشق یا محبت کی تفسیر اور تشریح کرنا آسان نہیں جیسا کہ قدیم شعرا نے بھی اعلان کیا ہے۔

ع: ''عین شین و قاف را اندر کتب تفسیر نیست''

محبت کی داستان اور عشق کی واردات داخلی کو بیان کرنا بھی دشوار ہے۔ امجدؔ کہتے ہیں:

ویسے تو ہر شخص کے دل میں ایک کہانی ہوتی ہے
ہجر کا لاوا، غم کا سلیقہ، درد کا لہجہ ہو تو کہو

پھر بتاتے ہیں کہ وہ شخص جو ہجر کے سوز و گداز سے پگھل رہا ہے اسے غم کی تہذیب کی تربیت ہوئی ہے اور اسی وجہ سے اُس کا لہجہ درد کا بیان ہو گیا ہے۔ وہ میں ہی ہوں۔ امجدؔ محبت کا رازداں اور عشق کا میر کارواں ہے۔

منصور کو سزا اس لیے ملی کہ وہ بات جو انھیں خلوت میں کہنی تھی جلوت میں بیان کر دی۔ قیس، فرہاد اور رانجھا اس لیے محبت میں شہید ہو گئے ان کے راز فاش ہو گئے۔ نیا مضمون کلیدی الفاظ کی تکرار، ان کے رد و بدل اور اشتقاق سے امجدؔ یوں تراشتے ہیں:

رازِ محبت کہنے والے لوگ تو لاکھوں مل جاتے ہیں
رازِ محبت رکھنے والا ہم سا دیکھا ہو تو کہو

امجدؔ کے پاس محبت زندگی کی حیات ہے یعنی محبت بغیر زندگی کا وجود نہیں۔ امجدؔ کا عشق باوقار ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں:

جو پیار ہم نے کیا تھا وہ کاروبار نہ تھا
نہ تم نے جیتی یہ بازی نہ میں نے ہاری ہے

کاروبار میں فائدہ اور نقصان ہوتا ہے۔ دنیا کے مسائل میں ہار اور جیت ہوتی رہتی ہے لیکن سچی محبت میں سوائے فدا کاری، ایثار گزشت اور قربانی کے کوئی چیز بھی عشق کی شایان شان نہیں رہتی اسی لیے یہاں جیت بھی ہار اور فائدہ بھی نقصان ہے۔

یہی نہیں بلکہ امجدؔ کہتے ہیں یہاں حسب ونسب وکسب کا لحاظ نہیں رہتا۔ شاید اسی لیے آج تک ایک کنیز انارکلی سے شہزادے سلیم کے عشق نے دلوں میں محبت کے کئی تاج محل بنا چکے ہیں۔ امجدؔ نے ذیل کے شعر میں خوبصورت مضمون سے نشاطِ روح کا بندوبست کیا ہے۔

یہ راہِ عشق ہے اس کی الگ ہی رسمیں ہیں
یہاں مقام کی نسبت کسی نسب سے نہیں

اگر دل میں روشنی چاہتے ہو تو رگوں میں محبت کے شعلوں کو بھرنا ضروری ہے۔ پھر یہ دل خود چراغ بن جائے گا جو ظلمات کو مٹائے گا اور عشق کے مسافروں کو راستہ دکھائے گا۔

محبت نے رگوں میں کس طرح کی روشنی بھر دی
کہ جل اُٹھتا ہے امجدؔ دل چراغِ شام سے پہلے

امجدؔ نے محبت کے فسانے کو خواب اور آنکھوں سے جوڑا ہے جسے ہم نے دوسرے مقامات پر مفصل بیان بھی کر دیا ہے۔ اس مقام پر صرف چند شعر جو محبت کے جذبوں کی تلخی اور شیرینی سے بھرے ہیں اور سلیس سادہ الفاظ میں فطری اور محاکاتی انداز لیے ہوئے ہیں، یہاں نقل کرتے ہیں۔

محبت کی آن، بان، جان اور پہچان سب کچھ وفا اور خلوص و ایثار ہے۔ یہاں تمام تر الزام عاشق اپنے سر لے لیتا ہے جب کہ ملزم کوئی اور ہے۔

بُجھ گئے تھے دِیے بھی، تارے بھی
اک مرا خواب تھا کہ جلتا رہا

خواب کی پیکر سازی چراغ کی علامت میں عمدہ شاعری ہے۔ صنعت مراعات النظیر کے الفاظ میں دِیے، جلتا، بجھ شامل ہیں۔ شاعر تمام رات جاگتا رہا اور معشوق کا منتظر رہا۔ تارے بجھنے میں مجازِ مرسل کی جھلک بھی ہے۔ یہاں خواب محبت کا استعارہ ہے۔ محبت اتنی وسیع اقلیم جذب وکشش ہے کہ کائنات کی ہر شے محبت کی پیکر تراشی کا نشان بن سکتی ہے۔ تب ہی تو امجدؔ نے دو شاہکار اشعار میں اعجاز بیانی کی ہے۔

زمیں سے آسماں تک جس قدر اچھے مناظر ہیں
محبت کے کنائے ہیں وفا کے استعارے ہیں

ہر مسافت کی دوری کا سمٹاؤ ہے
جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

امجدؔ کبھی خواب کو محبت کے منظر نامے میں مختلف رنگوں سے رنگ دیتے ہیں۔ کبھی خواب کو دو آئینوں کے درمیان کھڑا کر کے بے شمار نقش در نقش کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ کبھی خواب کو معشوق کی آنکھوں میں بسا دیتے ہیں اور کبھی آنکھوں سے چرا لیتے ہیں اور یہ عمل جو محبت کی طلسم سازی سے تخیل کی نیرنگی کو رعنائی خیال عطا کرتا ہے ایک پُروقار مخصوص فضا احساسات میں پیدا کر دیتا ہے۔

تری آنکھوں کے گنجِ خوشبو میں
ہم کو بھی ایک خواب بونا ہے

جو میرا خواب تھا سیلاب بن کر
ترے دل سے گزرنا چاہتا ہے

کسی کی دُھن میں کسی کے گماں میں رہتے ہیں
ہم ایک خواب کی صورت جہاں میں رہتے ہیں

رومانوی لَے تیز ہو جائے تو تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ یہاں زبان اور لہجہ کا رکھ رکھاؤ، احساس کی نزاکت رومان پرور فضا میں خیال کی متحرک اور موثر تصویر کشی کرنے لگتی ہے جیسا کہ ذیل کے رومانوی اشعار سے ظاہر ہے۔

غمِ زمانہ سے دل کو بچا کے رکھتے ہیں
تمھارے خواب سے آنکھیں سجا کے رکھتے ہیں

بھٹک رہے ہیں کسی خواب کی طرح کب سے
اس آس پر کہ تری آنکھ میں کریں آرام

جانا ہے ہم کو خواب کی کشتی میں بیٹھ کر
کاجل سے اک بھری ہوئی چشمِ سیاہ تک

ہم ان اشعار کو نقل کر کے امجدؔ کے تخیل کی بوقلمونی اور نفسیاتی احساساتی جزئیات نگاری بتا رہے ہیں۔ امجدؔ ایک لفظ خواب سے سو رنگ کے مضمون باندھتے ہیں اور پھر اس محبت کو وقت اور رزق کی علامتوں سے جوڑ کر خیال افروزی اور حُسن کاری کے مصرعوں کی شمعیں جلا دیتے ہیں۔

نہ جانے کیسے چلا آیا ایک خواب میں وہ
پھر اس کے بعد تو سونا مجھے حرام ہوا

ہمارے اشک چمکتے ہیں اس کی آنکھوں میں
زمیں کا رزق ہیں اور آسماں میں رہتے ہیں

سب ولولے تو دل کے ہوئے رزقِ انتظار
اب مل گئی جو ان کی اجازت تو کیا ہوا

محبت کی گفتگو آنکھوں سے بغیر لب ہلائے ہوتی رہتی ہے۔ محبت کے خوابوں کے علاوہ اس کے غم و درد کے آنسو، فراق میں نیند کو کھوئی ہوئی جاگتی آنکھیں، ترچھی نگاہیں، بیمار نرگسی آنکھیں، خمار بھری مدہوشی نین وغیرہ جگہ جگہ امجدؔ کے دفترِ عشق و محبت میں بکھری پڑی ہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر دو چار اشعار کو محبت کے چہرے پر سجاتے ہیں:

کیسے کہیں کہ کر گئی اک ثانیے کے بیچ
جادو بھری وہ آنکھ وہ جھکتی نگاہ کیا!

آنکھوں کا رنگ بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا

مرے زخموں کو نیند آنے لگی ہے
بہت تسکین خُو آنکھیں تری ہیں

امجدؔ کی محبت کی نظم کی وسعت شاعر کے پیام کو، شش جہت میں روشنی کی طرح پھیلنے میں کارساز ہوتی ہے۔ چنانچہ جب امجدؔ جیسا خیالات سے روشن مینار ان میدانوں میں روشنی بکھرتا ہے تو اس کا لطف ہی کچھ اور رہتا ہے۔ امجدؔ کی نظم ''خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔'' کے چند مقامات دیکھیے:

اک ذرا سی رنجش سے
شک کی زرد ٹہنی پر، پھول بدگمانی کے
اس طرح سے کھلتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی
اجنبی سے لگتے ہیں غیر بن کے ملتے ہیں
پھول رنگ وعدوں کی
منزلیں سکڑتی ہیں
راہ مڑنے لگتی ہے
بے رخی کے گارے سے، بے دلی کی مٹی سے

فاصلے کی اینٹوں سے، اینٹ جڑنے لگتی ہے
خاک اُڑنے لگتی ہے
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
واہموں کے سائے سے، عمر بھر کی محنت کو
پل میں لوٹ جاتے ہیں

یہ نظم کیا ہے۔ ندرتِ خیال کا مرقع ہے۔ کم ترین الفاظ میں طویل مطالب بڑی شاعری کی علامت ہے۔ شک کی زرد ٹہنی، پھول بدگمانی کے، پھول رنگ وعدوں، منزلیں سکڑتی ہیں، بے رخی کے گارے، بے دلی کی مٹی، فاصلے کی اینٹوں نے مصرعوں کو وہ شادابی اور تازگی کے ساتھ تاثیر بخشی ہے کہ نظم فن پارہ بن کر مدتوں ذہن میں بس جاتی ہے۔ یہاں خواب ٹوٹ جاتے ہیں نظم کے Climax میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

عشقیہ شاعری کے دفتر معشوق کی بے وفائی، بے اعتنائی، بے رخی اور بے لطفی سے بھرے پڑے ہیں۔ عشق اور عاشقی کی واردات کی کوئی بھی کیفیت میں تبدیلی ممکن نہیں۔ یہاں صرف زمان اور مکان کے ساتھ ساتھ چہرے بدلتے رہتے ہیں اسی لیے ہر شاعر نے ان مضامین کو الگ الگ طرح سے ادا کیا ہے۔ زیادہ تر اردو ادب کے شاعروں نے اس گھسے پٹے مضمون کی نقالی اور بعض اوقات جگالی بھی کی ہے لیکن ممتاز شاعروں نے جن میں امجد اسلام امجد کا ایک اپنا خاص مقام ہے، انہی کہنہ مضامین میں تازہ خیالی اور رنگا رنگی دکھائی ہے جس کی وجہ سے ان واردات کے جذب و کشش میں اضافہ ہوا اور جذبات برانگیخت ہوئے۔ عاشق کو معشوق کی وفا کی توقع ہے کیوں کہ وہ وفا کر رہا ہے، معشوق کی بے وفائی اس کے درد و غم کی وجہ بن گئی ہے۔ اس عنوان کو امجد نے کس سلیقے سے پیش کیا ہے، دیکھیے:

سوائے دردِ محبت، بجز غبارِ سفر
کوئی رفیق نہ پایا وفا کے رستے میں

عشق کے دشوار راستے پر جہاں معشوق کی رفاقت تو ایک طرف عاشق کا سایہ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا، اس لیے گردِ سفر اور دردِ محبت ہی اس کے ساتھی رہتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ معشوق کے ساتھ اس کی زندگی کی زندہ دلی چلی گئی اب وہ صرف عمر گزار رہا ہے۔ یہاں شاعر نے محبت، وفا اور وقت کے مثلث سے نقشہ کشی کی ہے۔

جو زندگی تھی مری جان تیرے ساتھ گئی
بس اب تو عمر کے نقشے میں وقت بھرنا ہے

مصرعۂ دوم جدید مضمون ہے جس میں ندرتِ بیان اور وقت کی علامت کا عمدہ استعمال ہے۔ اس شعر کا لطف ''مری جان'' کے دلکش انداز سے بڑھ گیا ہے۔ یہاں مری جان سے مراد معشوق اور خود شاعری کی جان بھی ہے۔

امجد شعر میں ایسے الفاظ جما دیتے ہیں کہ مصرعے کی غنائیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ وہ بہت سے ایسے الفاظ ہی

مصرعوں میں جمع کر دیتے ہیں جنھیں کلیدی الفاظ سے خاص مناسبت بھی رہتی ہے۔

معشوق کی بے رخی اور کم توجہ سے عاشق سہا رہتا ہے اس لیے پوری طرح دل کی حالت بیان نہیں کرسکتا جس میں معشوق سے کیا محبت ہے۔

امجدؔ کتابِ جاں کو وہ پڑھتا بھی کس طرح
لکھنے تھے جتنے لفظ انھی حافظے میں تھے

بہت خوبصورت اور سچا شعر ہے۔ کتابِ جاں عمدہ اور نادر ترکیب ہے۔ پورا شعر لفظی مناسبت میں صنعتِ مراعات النظیر کی عمدہ مثال ہے جس میں کتاب، پڑھنا، لفظ، حافظے وغیرہ شامل ہیں۔

ایک اور مقام پر سلیس اور سادہ زبان میں خوبصورت مطلب ادا کرتے ہیں۔

اُسے اندازہ ہی امجدؔ نہیں ہے
اُسے اک شخص کتنا چاہتا ہے

پورا شعر روزمرہ میں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نثر میں بات کر رہا ہے۔ یہ بڑی شاعری اور قادرالکلامی کی نشانی ہے۔

امجدؔ کی محبت کا ایک معروف اور زبان زد عام شعر لاجواب ہے۔ یہاں بیان سمٹے تو دلِ عاشق اور پھیلے تو زمانہ کی کیفیت ہے۔

حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمھیں نکال کے دیکھا تو سب خسارا ہے

شعر میں محبت کی عظمت اور رومانوی اثر پذیری ہے جو شاعر نے خلوص کے ساتھ ایجاز بیانی میں جمالیاتی فضا پیدا کر کے دل کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

شعر سہل ممتنع میں ہے ہر لفظ دل کی گہرائیوں سے نکل کر تصویر کشی کر رہا ہے۔ محبت یادگار ہے اس لیے محبت کے بھولنے کو بھول جانا پڑتا ہے۔ شاعر عشق میں اپنے وجود کو بجھتے ستارے اور اپنے نصیب کو خشک دلی کی حکایت سمجھتا ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہے:

ہر ستارے کی بُجھتی ہوئی روشنی
میرے ہونے کا ہے استعارہ مجھے

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور کے چھت پر برس گئیں
دلِ بے خبر مری بات سُن اُسے بھول جا اُسے بھول جا

لیکن کیسے ممکن ہو کہ ان وعدوں کو بھول جائیں۔ اسی سے تو کچھ روشنی زندگی کے اُفق پر باقی ہے۔

مرے رتجگوں کے فشار میں، مری خواہشوں کے غبار میں
وہی ایک وعدہ گلاب سا، سرِ نخلِ جاں ہے کھِلا ہوا

امجدؔ، حُسن کی دلکشی اور معشوق کے سراپے کو منفرد انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ خدوخال کے ساتھ ان کی کیفیت اور ان کے احوال کا حال بھی شعر میں سمو کر حسن و جمال کا کمال دکھاتے ہیں۔ آخر میں صرف چند شعر اور مصرعے آنکھوں کی حالت ان کی کیفیت اور اشاروں پر لکھ کر محبت کی داستان کو ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔

جاتی ہے کسی جھیل کی گہرائی کہاں تک
آنکھوں میں تری ڈُوب کے دیکھیں گے کسی دن

جانا ہے ہم کو خواب کی کشتی میں بیٹھ کر
کاجل سے اک بھری ہوئی چشمِ سیاہ تک

ع: جادو بھری وہ آنکھ وہ جھکتی نگاہ کیا

تم نے نگاہ پھیر کے دیکھا بس اک پل
اس ایک پل میں کتنے ہی موسم چلے گئے

ع: بادل بادل تیری آنکھیں کیسے اتروں پار

جانِ من، کل سرِ گفتگو تیری ان خوش نما
وحشی ہرنی سی آنکھوں کے ساحل پہ جو
اک ستارا سا لرزا تھا، وہ رات بھر
جیسے آنسو نہ تھا نیم کش تیر تھا
ایک زنجیر تھا

کچھ ایسے اُس کی جھیل سی آنکھیں تھیں ہر طرف
ہم کو سوائے ڈوبنے کے راستہ نہ تھا

اشعار میں آنکھوں کی جلوہ گری

امجدؔ بنیادی طور پر محبت اور رومان کے شاعر ہیں۔ اُن میں اور اُن کی شاعری میں وہ تمام جراثیم پائے جاتے ہیں جن میں ایک رومانی تحریک کا شاعر مبتلا رہتا ہے۔ آنکھیں ان کی بناوٹ، ان کی کھلاوٹ، ان کی کیفیت، ان کی بے صدا گفتگو، اُن کے چہرے پر تاثرات اور ان سے وابستہ لوازمات کے علاوہ نگاہ نظر نور دید اور مختلف نادر مطالب قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ امجد کے مجموعہ ''میرے بھی کچھ ہیں خواب'' میں ایک پوری نظم ''آنکھیں'' ہے۔ یہی نہیں بلکہ نظموں میں کئی نظموں کے ناموں میں آنکھ جھانکتی نظر آتی ہے جیسے ''کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے''، ''دیکھوں جیسے میری آنکھیں''، ''جب آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں''، ''ان جھیل سی گہری آنکھوں میں'' اور ''جاگتی آنکھیں'' وغیرہ وغیرہ۔ آنکھیں کا پہلا بند دیکھیں۔

کیسے اتروں پار
بادل بادل تیری آنکھیں دریا دریا خواب
کیسے اتروں پار
چاروں جانب پھیل رہی ہے کاجل کی آواز
میرے دل کی ویرانی کو سندرتا سے بھر دے
مجھ پہ اپنی پلکیں کر دے

الفاظ کی تکرار نے نغمگی کا آلاپ چھیڑ دیا ہے۔ شاعر کاجل کو آواز، ویرانہ کو سندرتا دیتا ہے اور پلکوں کو اوڑھ لیتا ہے۔ صنعت مراعات النظیر میں آنکھیں، کاجل، خواب اور پلکیں ہیں۔ صنعت تکرار میں بادل اور دریا کی تکرار ہے۔ سندرتا نے مصرعہ کو خوبصورتی دی ہے۔

''اُن جھیل سی گہری آنکھوں میں'' یہاں منظر کشی اور امیجری ہے۔ شاعر سامع اور قاری کو ساتھ لے کر چل رہا ہے۔

ان جھیل سی گہری آنکھوں میں اک شام کہیں آباد تو ہو!
اُس جھیل کنارے پل دو پل
اک خواب کا نیلا پھول کھلے

اُس پھول کے بہتے رنگوں میں
جس وقت لرزتا چاند چلے
اُس وقت کہیں ان آنکھوں میں اُس بسرے پل کی یاد تو ہو

امجدؔ کی شعریت میں پرانے لفظوں کو ایک تازہ لچک دار لفظ لگا کر نئے معنی اور سلگتا اثر پیدا کر دیتے ہیں جو استعارہ کو متحرک بنا دیتا ہے۔ جیسے نیلا پھول، لرزتا چاند، پل دو پل، بسرے پل، جھیل سی آنکھیں وغیرہ۔

میر انیسؔ نے کہا تھا ع: ''اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' کسی فارسی شاعر نے کہا ہے کہ اگر تمھارے کانوں میں نغمہ کئی راگوں میں سنائی دے رہا ہو تو تعجب کی کیا بات ہے ہم ایک نغمے کو ہزار راگ سے باندھتے ہیں۔

نوا بگوشت اگر مختلف رسد چہ عجب
کہ یک ترانۂ مادر ہزار آہنگ است

کسی طرح سے آنکھ اور خواب کا رشتہ امجدؔ کی طرز بیان میں دھنک بن کر ابھرنے لگتا ہے۔ نظم ''جب آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں'' یہاں شاعر کا کمال ہے کہ آنکھیں جل کر راکھ نہیں کہا۔

جب آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں
جب دل کا جوالا سرد پڑا
جب شام و سحر کے صحرا میں
خوابوں کے ستارے ریت ہوئے
جب عمر رواں کے میداں میں
سب زندہ جذبے کھیت ہوئے
اُس وقت مجھے محسوس ہوا
جس عشق میں ساری عمر کٹی شاید وہ نظر کا دھوکا تھا
کرنوں سے کسی کے لہجے میں تنویر تھی میری اپنی ہی
شب تاب بدن کے جادو میں خود میرے لہو کا نشہ تھا

مضمون کے علاوہ نظم کے فقروں میں روانی، قادرالکلامی ہے۔ نظم کے مصرعے اور فقرے ایسے نظم میں پروئے گئے ہیں جیسے کوئی بات کر رہا ہو اور یہی تو روز مرہ ہے۔ شاعر کے بعض قافیے ردیف میں پیوست ہو کر کھو گئے ہیں۔ یہاں ستارے ریت ہوئے زندہ جذبے کھیت ہوئے، دل کا جوالا سرد پڑا لیکن شب تاب بدن کے جادو اور لہو کے نشہ میں گرمی بڑھتی گئی۔

نظم ''کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے'' کے چند مصرعے اور فقرے چُن کر جماتے ہیں تا کہ نظم کا کچھ اثر قاری کے ذہن پر بکھر جائے۔

کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے یہ کمال مجھ پہ کرم کیا
مرا دل کہ شہر ملال تھا اُسے روشنی میں بسا دیا

مری آنکھ اور مرے خواب کو کسی ایک پل میں بہم کیا
مری بے گھری کو پناہ دی مری جستجو کو نشاں دیا
جو یقین سے بھی حسین ہے مجھے ایک ایسا گماں دیا
وہ جو ریزہ ریزہ وجود تھا اُسے ایک پل میں بہم کیا

یعنی یہاں شاعر رومانی تخیل کی وسعت بتا رہا ہے۔ ایک فرق جو علمائے نقد وفن نے کلاسیکیت اور رومانیت کے مابین بتایا ہے وہ رومانی امیجری کی لامنتہا وسعت ہے۔ یہاں تصور کے دروازے کھولیے اور خیالات کی پرچھائیوں میں گم ہوجایئے۔ ہر مصرعے یا بند پر تجزیاتی یا تشریحی گفتگو ہمارا نہ مقصد ہے نہ یہ ممکن۔ چنانچہ اس کیف لطیف کا لطف پڑھنے والے پر چھوڑتے ہیں۔

بڑی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس کے کئی معنی نکلتے ہیں۔ یہاں نظم ''تیرا نام'' میں عشق حقیقی کی خوشبو کے ساتھ عشق مجازی کے لیے رنگ بھی مہیا کیا گیا ہے۔ اب آپ ''چشم جمال'' کو اپنی اپنی نظر کی جمالیات سے پرکھیں۔

نہ تھی روشنی کسی آنکھ میں کسی خواب کی
یہ عجب شام فراق تھی
لب بے نوا کے حصار میں کہیں ایک حرف دعا نہ تھا
وہ فشار تھا مری روح میں کہیں جیسے کوئی خدا نہ تھا
فقط ایک چشم جمال نے مرے کاخ وکو کو بدل دیا
رہ بے چراغ اجال دی، مرے چار سو کو بدل دیا

ناامیدی کی شام فراق جہاں افسردگی، یاسیت کی حکمرانی ہو ایک چشم جمال کی بصیرت نے زندگی کے خدوخال بدل دیے۔ راستے روشن کردیے۔ زندگی کے کون ومکان میں انقلاب برپا کردیا۔ امجد کے الفاظ کا سنگھار عروس سخن کو دلہن بنا دیتا ہے۔ لب بے نوا، فشار روح، چشم جمال، رہ بے چراغ، اجال وغیرہ۔ نظم میں اجالا کیے ہوئے ہیں۔

کبھی کہتے ہیں ''سپنے کیسے بات کریں''

خدشوں کی زنجیر پڑی ہے نیند بھری سب آنکھوں میں
سپنے کیسے بات کریں
اب وہ لوگ اور ان کے سپنے دیکھنے والی
آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں
راکھ کے اس انبار میں ہوں گے کیسے کیسے زندہ خواب
راکھ کی اس انبار کو لیکن چھیڑے کون؟

امجد خواب کے لفظ کو ہر جگہ نیا استعارہ بنا دیتے ہیں اور اس طرح معنی تولیدی کا ظہور ہوتا ہے جہاں معنی سے نئے معنی نکلتے ہیں۔ یہ شاعری کا بڑا حسن ہے۔ ''درد کے رشتے عجب ہیں۔''

ہمارے خواب بھی
اک دن ہمارے ''ہست'' کی شاخوں پہ اتریں گے
دھنک کے رنگ ان بھیگی ہوئی آنکھوں پہ اتریں گے
کہ رشتے درد کے
منزل بھی ہیں قطبی ستارہ بھی
ہمارے خواب کی تجسیم بھی ہیں
استعارہ بھی

رومانی جذبوں کی عکاسی کرتے ہوئے امجدؔ نے حُسن کے سراپا سے یوں تو حسب ضرورت ہر عضو لے کر مضمون کو سنوارا اور سنگھارا ہے لیکن اُن کے کلام میں سب سے زیادہ آنکھ پر توجہ دی گئی ہے۔ مضامین میں آنکھ کی ترکیب بناوٹ، تازگی، نمی، حالت، کیفیت، جگمگاہٹ، بصارت کے علاوہ کئی نادر نکات نکالے ہیں جو ان کی ندرت بیانی اور تخیل کی مہربانی ہے۔ کچھ اشعار ہمارے اساتذہ شعرا نے آنکھ کی کیفیت اور حالت پر لکھے جو آج بھی زبان زدِ عام ہیں۔

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

امجدؔ کے چند اشعار سُنیے:

ہمارے اشک چمکتے ہیں اس کی آنکھوں میں
زمین کا رزق ہیں اور آسماں میں رہتے ہیں

پہلا مصرعہ روزمرہ میں ہے۔ اشک، آنکھوں صنعت مراعات النظیر میں ہیں۔ صنعت تضاد میں زمین اور آسمان ہیں۔ زمین کا رزق کہنا ندرتِ بیانی اور آنکھ کو آسمان بتانا بڑی شاعری ہے۔

خواب کا تعلق آنکھوں سے ہے۔ امجدؔ جب خواب کے مضمون کو آنکھ میں جگا دیتے ہیں تو بیداری میں خواب دیکھنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں ذیل کے شعر میں نادر تشبیہ جو متحرک بھی ہے اور مضمون کے اعتبار سے معتبر بھی۔

کوئے قاتل میں چلے جیسے شہیدوں کا جلوس
خواب یوں بھیگتی آنکھوں کو سجانے نکلے

سہل ممتنع دیکھنے میں سیدھا سادہ لیکن اس کی تشریح کے لیے دفتر بھی کم ہے۔ پورا شعر صداقت، سلاست اور جذبات پر سجایا گیا ہے۔

کسی کی آنکھ جو پُرنم نہیں ہے
یہ نہ سمجھو کہ اس کو غم نہیں ہے

آنکھ کی چمک روشنی اور دن کا منظر پیش کرتی ہے جب کہ زلف تاریکی اور خواب کی تصویر۔ یہاں شاعر نے مضمون بالکل اُلٹا باندھا جس سے نئی شعریت ایک گھسے پٹے مضمون زلف اور آنکھ میں ہوگئی۔ یہی ہے جدید شاعری کا جدت پسند شاعر۔

سوئیں گے تری آنکھ کی خلوت میں کسی رات
سائے میں تری زلف کے جاگیں گے کسی دن

امجدؔ کی شاعری میں صنائع اور صنعتیں خود بہ خود صحرائی پھولوں کی طرح سے نمودار ہوجاتی ہیں۔ یہاں صنعت مراعات النظیر میں سوئیں، آنکھ، رات، زلف شامل ہے۔ تو صنعت تضاد میں رات دن، سوئیں، جاگیں۔ پورے شعر میں ایک بھی اضافت یا نامانوس لفظ نہیں۔ ایسے اشعار عامی اور عالم دونوں سمجھ سکتے ہیں جو اکیسویں صدی کی ضرورت ہے۔

غالبؔ دہلوی نے کہا تھا ع: ''ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں''
امجدؔ نے کمال کا شاہکار شعر کہہ دیا:

ڈرتا ہوں آنکھ کھولوں تو منظر بدل نہ جائے
میں جاگ تو رہا ہوں مگر جاگتا نہیں

یہ شعر معنی آفرینی کا کرشمہ ہے۔ اس میں معانی تہہ در تہہ ہیں۔ یہاں خوف زمانے کی نیرنگی اور معشوق کی رنگینی دونوں لیے جاسکتے ہیں۔ شاعر حسیں منظر کھونا نہیں چاہتا۔ شاعر خواب میں زمانے کی آسودگی کو سچ سمجھنا چاہتا ہے اور اسی لیے اس خواب کو توڑنا نہیں چاہتا۔ اس شعر کا کلیدی مضمون خواب ہے لیکن آنکھ سے جوڑ کر شاعر نے مضمون کو سونے پر سہاگہ کر دیا۔ تمام شعر میں ایک اضافت بھی نہیں۔ صنعت مراعات میں آنکھ، جاگ، منظر وغیرہ شامل ہیں۔ امجدؔ کے اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بڑی شاعری کے لیے عربی فارسی کے شاندار شوکت وحشم سے سجے الفاظ کی ضرورت نہیں کیوں کہ اہم یہ ہے کہ کیا کہا گیا اور کیسے کہا گیا۔ اصل بات شعر میں بات برتنے کی ہے۔

ہم یہاں یہ بتانے کی کوشش کررہے ہیں کہ امجدؔ جیسا اچھی شاعری کرنے والا شاعر آسانی کے ساتھ نظموں میں بھی الفاظ کو معنی ومفہوم کے علاوہ دوسرے محاسن زبان کے پیرایے میں استعمال کر کے کئی تہہ دار اور نادر معنی نکالتا ہے۔ یہ مہارت اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب شاعر کو الفاظ پر وہ قدرت اور تسلط حاصل ہوتا ہے جو خالق کو مخلوق پر۔ ہر شاعر اپنے اشعار کے مزاج سے بڑی حد تک واقف ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض شاعروں نے اس نکتہ پر زور دیا ہے اور ذہنوں کو جھنجھوڑا ہے۔ خود علامہ اقبالؔ پیامِ مشرق کے اشعار کے مطالعہ کے لیے کہتے ہیں کہ اس کو تو خلوت میں پڑھ تا کہ شعر کے تمام معنی اور رمز تجھ پر واضح ہوسکیں۔

اسی طرح ہم یہاں یہ کہیں گے کہ امجدؔ کی نظموں کو صرف مشاعروں کی ہلچل میں سننے سے نظم کا پورا لطف اور اثر ظاہر نہ ہوگا بلکہ ان نظموں کو علاحدہ خلوت اور جلوت میں مصرعوں میں بہتے رُکتے غور کرتے دیکھتے ہوئے آگے بڑھیں تو اس سے فکری جذبی علمی اور احساسی طور پر مستفید ہوسکیں گے۔ ہم آنکھ کے موضوع کو مختصر رکھنے کے لیے صرف چند نظموں کے ٹکڑے پیش کریں گے جنھیں کسی خاص معیار ومعانی یا مقصد کے تحت انتخاب نہیں کیا گیا۔ نظم ''ایک سوال'' میں آنکھیں لال ولال کی تاثیر دیکھیے:

چہرے ہرے کچور ہیں لیکن آنکھیں لال ولال
آنکھیں لال ولال کہ جن میں

ہولے ہولے تیر رہی ہیں پھیکے زرد ملال
قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال
کب تک اس مٹی کے بیٹے ہوں گے یوں بے حال
کب تک ہم کو بننا ہوگا..... نیلامی کا مال

''تمھیں مجھ سے محبت ہے'' امجد کی شاہکار نظم ہے جس کی تشریح اور تفسیر کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ چنانچہ ہم نے صرف اُس آخری حصہ کی آنکھوں پر اپنی نظر رکھی تو وہی کرشمہ نظر آیا جو چاہت یعنی محبت کی تعریف میں تحلیل، تفسیر اور تشریح کا جیسے ایک دھندلکا ہے جو غبار کی صورت محبت کے عظیم پہاڑ کو اوڑھا ہوا ہے۔

یہ سچ ہے نا
ہماری زندگی اک دوسرے نام لکھی تھی
دھندلکا سا جو آنکھوں کے قریب و دور پھیلا ہے
اسی کا نام چاہت ہے

نظم ''تیرے میرے خواب'' میں آنکھوں کا خواب سے رشتہ اور اس سے پیوستہ مضمون کی ندرت، معنی آفرینی کے دروازے کھولتی ہے۔ تخیل کی تہہ داری نے جامد الفاظ کو پَر لگا کر استعاروں کے پرندے بنا دیے۔

دیر رہیں جو آنکھوں میں تو خواب پرندے بن جاتے ہیں
لاکھ انھیں آزاد کرو یہ پھر کر واپس آجاتے ہیں
یہ جو قفس کے دروازے میں پَر پھیلائے بیٹھے ہیں
یہ درماندہ اَوگن ہارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں!

رومانی کیفیت کا ایک رخ ''دل کے آتش دان میں شب بھر'' میں یوں ہے۔

رستہ تکنے والی آنکھیں اور قندیلیں بجھ جاتی ہیں
تو اُس لمحے
تیری یاد کا ایندھن بن کر
شعلہ شعلہ ہم جلتے ہیں
دوری کے موسم جلتے ہیں

آنکھ کا خواب کی منظر کشی ''بارش'' کے تیسرے طویل بند میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ہم تو صرف داستان کے رُخ کو چھیڑ کر تمام نظم کو پڑھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

آنکھ اور منظر کی وسعت میں چاروں جانب بارش ہے
اور بارش میں دور کہیں اک گھر ہے جس کی

ایک ایک اینٹ پہ تیرے میرے خواب لکھے ہیں
جن میں ہم دونوں کے سائے تنہا تنہا بھیگ رہے ہیں

امجد محسوسات کا شاعر ہے اور اس کی شاعری میں بصری حس اور اس کے متعلقات کا ہجوم ہے۔ ہم نے صرف آنکھ کے لفظ سے کچھ اشعار چنے ہیں مگر نگاہ نظر بصری قوت اور ان سے وابستہ الفاظ کو مضمون کے اختصار سے نہیں شامل کیا۔ امجد کی ایک چھوٹی نظم ''ناممکن'' پوری یوں ہے۔ یہاں آنکھ اور خواب کا رشتہ ملاحظہ ہو۔

آنکھوں کو کیسے مل سکے خوابوں پہ اختیار
قوس قزح کے رنگ کہیں ٹھہرتے نہیں
منظر بدلتے جاتے ہیں نظروں کے ساتھ ساتھ
جیسے کہ ایک دشت میں لاکھوں سراب ہوں
جیسے کہ اک خیال کی شکلیں ہوں بے شمار

ایک اور دھماکہ ہونے تک خواب اور آنکھیں کے ساتھ امجد نے ''انبار سے بوجھل'' آنکھیں لکھ کر بتایا کہ ناگہانی موت نے تمام خواب برباد کر دیے۔ شاعر کا درد ہر پڑھنے والے کو غمگسار کر دیتا ہے۔ یہاں شاعری انسانیت کا تحفظ کرتے ہوئے پیامبری کی حدوں میں داخل ہوتی ہے۔

ایک ہی پل میں
اپنے اپنے خوابوں کے انبار سے بوجھل آنکھیں
ریزہ ریزہ ہوجاتی ہیں
اُن کے دنوں آنے والی ساری صبحیں کٹ جاتی ہیں

چند نظموں اور گیتوں سے کچھ شعر اور مصرع چُن کر کسی تشریح اور تجزیہ کے بغیر یہاں نقل کیے جاتے ہیں تاکہ قاری ان کو پڑھ کر پوری نظم پر رجوع کرے۔ ''ان کہا لفظ'' میں تخاطب انداز اور آنکھوں کی کیفیت سُنیے:

جان من، کل سرِ گفتگو تیری ان خوش نما
وحشی ہرنی سی آنکھوں کے ساحل پہ جو
اک ستارا سا لرزا تھا، وہ رات بھر
یوں مرے جسم و جاں میں ترا مورہا
جیسے آنسو نہ تھا نیم کش تیر تھا
ایک زنجیر تھا
خوابوں کی دیکھ بھال میں آنکھیں اجڑ گئیں

(کئی سال ہوگئے۔ نظم)

گاہی کسی کی آنکھ میں بھرتے ہیں اس طرح
آنسو کی ایک بوند میں دجلہ دکھائی دے
اور دوسرے ہی پل میں جو دیکھو تو دور تک
ریگ روانِ درد کا صحرا دکھائی دے

(بادل۔ میں اور تم۔ نظم)

آنکھوں میں شکستہ خواب لیے
سینے میں دل بیتاب لیے
ہونٹوں میں کراہیں ضبط کیے
ماتھے کے دریدہ صفحے پر
اک مہر ندامت ثبت کیے ٹھکرائی ہوئی سی پھرتی ہے (خدا اور خلق خدا)

آخر میں ہم امجدؔ کی چند غزلوں سے اشعار منتخب کر کے رعنائی خیال سے روح کو مسرور کرتے ہیں۔

کیسے ملائیں آنکھ کسی آئینے سے ہم
امجدؔ ہمارے پاس تو چہرہ نہیں رہا

آئینہ سچ بولتا ہے اور آئینے کے مقابل آنے کے لیے جرأت کی ضرورت ہے جو خود شناسی کا پہلا زینہ ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا: ع ''کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ'' شاعر محاورے منہ چھپانے یا منہ دکھانے سے ہٹ کر آئینے کی رعنائیت سے چہرہ کہہ رہا ہے۔ یہاں شاعر کی مراد شناخت کھو دینے اور اپنے نہ ہونے کی کیفیت کے احساس کی ہے۔ اسی لیے آئینے کی ضرورت بھی نہیں اور اُسے دیکھنے کی ہمت بھی نہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی خارج از محل نہیں کہ بعض اشعار اتنے بعید معنی کے حامل ہوتے ہیں کہ ان کے کئی معانی اور تشریحات ضروری ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے مرزا غالبؔ کے کلام کی درجنوں شرحیں موجود ہیں پھر بھی بعض اشعار جو کیف مجہول کا نتیجہ ہیں اب بھی معمہ ہیں۔ یہاں پورا شعر مراعات النظیر میں آئینہ، چہرہ، آنکھ اور محاورہ آنکھ ملانا کے علاوہ جدید محاورہ چہرہ نہ ہونا معنی خیز انداز ہے۔ عمدہ شعر ہے:

تماشا ایک ہے روز ازل سے
فقط آنکھیں بدلتی جا رہی ہے

سنتِ کائنات اور مشیت ایزدی میں کوئی تبدیلی نہیں، صرف افراد اس محفل میں آتے اور جاتے رہیں گے۔ کیوں کہ آنکھیں بدل رہی ہیں اور ہر شخص کا احساس کچھ کچھ مختلف ہوتا ہے اس لیے منظر کشی میں بھی فرق ہوگا۔

کہیں شاعر محبوب کے خیال اور اس کی آنکھوں میں پھرتی صورت کو حیرت اور آسیب سے جوڑتا ہے کیوں کہ عشق لاعلاق اور آشفتہ سری ہے اس کو وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس دریا میں تیرنے کی خاطر دست و پا مار رہا ہو۔

آئینہ خانۂ حیرت ہے کہ آسیب ہے وہ
آنکھ میں رہ کے بھی کرتا ہے پریشاں بہت

محبوب کا لمس اور معشوق کی نظر کبھی مرہم، کبھی سکون کا باعث ہوتی ہے۔

مرے زخموں کو نیند آنے لگی ہے
بہت تسکین خو آنکھیں ہیں تیری

''تسکین خو'' کا جواب نہیں، جدید ترکیب ہے۔ زخموں کو نیند ندرتِ بیانی ہے۔ نظر کا جادو عاشق پر اثر پذیر ہے۔ یہاں رومانی کیفیت کی ترسیل مشکل نہیں۔ اچھا عمدہ احساساتی شعر ہے۔

جو آنسو دل میں گرتے ہیں وہ آنکھوں میں نہیں رہتے
بہت سے حرف ایسے ہیں جو لفظوں میں نہیں رہتے

نیا مضمون ہے۔ مصرعۂ اولیٰ میں درد یہاں آنکھوں سے دل پر گر رہا ہے۔ چنانچہ دل پر اس کا اثر اشکباری بن چکا ہے اور یہ دکھائی نہیں دیتا بلکہ محسوس کیا جاتا ہے۔ کچھ حرف خود آنکھ اور دل غیر مرئی طور پر کہہ دیتے ہیں جو الفاظ میں نہیں رہتے۔ شاید یہاں اشارہ کیفیت چشم اور آنکھ کی بے زبانی ہو۔ اس تحریر کو غزلوں کے چند شعروں پر تکمیل کرتے ہیں۔

دو ستاروں کو جو دیکھوں تری آنکھیں بن جائیں
چاند کو دھیان میں لاؤں ترا چہرہ ہوجائے
حسن کی آنکھ وہ تخصیص طلب ہے امجدؔ
بھیڑ ہو چاروں طرف اور کوئی تنہا ہوجائے

بدلا جو اس کی آنکھ کا انداز تو کھلا
کرتے ہیں رنگ پھول سے پرواز کس طرح

روح کی آنکھیں چکاچوند ہوئی جاتی ہیں
کسی کی آہٹ کا مرے کان میں نغمہ چمکا

کچھ ایسے اس کی جھیل سی آنکھیں تھیں ہر طرف
ہم کو سوائے ڈوبنے کے راستہ نہ تھا

چین چرا کر آنکھوں کا
رہتا ہے دلبر خاموش

یہ کیسے خواب سے جاگی ہیں آنکھیں
کسی منظر پہ دل جمتا نہیں ہے

''سحر آثار'' کی سحر نمائی

(یہ مضمون پچیس سال قبل ۱۹۹۲ء میں نیویارک کے ادبی جلسے میں پڑھا گیا جس کی
صدارت محسن بھوپالی نے کی اور امجد اسلام امجد بحیثیت مہمانِ خصوصی شریک ہوئے)

دنیائے شعر و ادب کی مشہور و معروف شخصیت جناب امجد اسلام امجدؔ، جو اردو سائنس بورڈ پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل ہیں، ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ موصوف عہدِ حاضر کے ممتاز اور مقبول ڈراما نگار ہونے کے علاوہ وہ صفِ اول کے اساتذہ شعرائے کرام میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ امجد اسلام امجدؔ کی تیس سے زیادہ تالیفات، تصنیفات اور تخلیقات ہمارے درمیان موجود ہیں لیکن اس گفتگو کی نوعیت کے اعتبار سے، جو آپ کی شعری خدمات پر منحصر ہے، ہم صرف یہاں پر آپ کے آٹھ شعری مجموعوں کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں، جن میں ''برزخ''، ''ساتوں در''، ''فشار''، ''ذرا پھر سے کہنا''، ''آنکھوں میں تیرے سپنے''، ''اس پار''، ''اتنے خواب کہاں رکھوں گا'' اور ''بارش کی آواز'' قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کا پہلا مجموعہ ''برزخ'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا اور موجودہ تازہ ترین مجموعہ کلام ''سحر آثار'' فروری ۹۲ء میں منظرِ عام پر آیا جو ہماری گفتگو کا ماحصل ہے۔

امجد اسلام امجدؔ کا یہ تخلیقی شاہکار، جو آپ کے تدریجی ارتقا کا ضامن ہے، صرف چالیس دنوں کی فصل کاری کا ثمر ہے۔ چونکہ موصوف کی زمینِ طبعِ سخن، گوناگوں اداری اور سماجی مصروفیات کی وجہ سے چند مدت کے لیے خشک رہی، چنانچہ جیسے ہی خیال و فکر کی گھٹائیں چھائیں، طبعِ موزوں موسلا دھار بارش کی طرح زمینِ سخن پر ایسی برسی کہ چند ہفتوں میں ایک پُر بار فصلِ ندرتِ خیال آمادہ ہوگئی اور بازارِ شعر کی تزئین اور توقیر ثابت ہوئی۔

''سحر آثار'' جو امجد اسلام امجدؔ کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے۔ ۱۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں دو حمدیں، دو نعتیں، اکیس نظمیں اور ستائیس غزلیں شامل ہیں۔ میرے لیے اس مختصر سے مضمون میں یہ بات تو ممکن نہیں کہ اس مجموعۂ کلام کے محاسن، ندرتِ خیال کے مطالب، صنائع لفظی، صنائع معنوی، اسلوبِ بیان، سادہ زبان اور تصوّرات امکان کے بارے میں تمام حقائق پر روشنی ڈالوں، البتہ میری کوشش یہ ہوگی کہ اس دریائے فکر و خیال سے، جو کہ موتیوں کے ہار کی طرح نظم کیا گیا ہے تاکہ ہر قاری اپنی عروسِ فکر کی آرائش کر سکے۔

مشہور ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کرنا بڑے شاعر کا ادنی کرشمہ ہے، لیکن اس حقیقت کو بھی ماننا پڑے گا کہ قطرے کو وسعت دے کر دریائے بیکراں کرنا عظیم المرتبت شاعر کا عظیم ترین معجزہ ہے۔ چونکہ شاعری خداداد قدرت ہے اور بقول:

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ
ایں سعادت بہ زور بازو نیست

اس لیے سچا شاعر وہی ہے، جو ایمانداری کے ساتھ اس قدرت کو استعمال کر کے اس کے ثمر سے عوام کو مستفید کرے، اور یہی پیامبری ہے۔

اس مجموعۂ کلام کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں چند غزلیات اردو کی، سب سے چھوٹی بحروں میں کہی گئیں ہیں اور یہ غزلیں سادہ زبان میں ہوتے ہوئے علم بدیع کی صنعتوں سے مزین ہیں، اور پھر سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ اس میں کم ترین اضافات کا استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ اردو ادب میں چھوٹی بحروں میں غزلیں موجود ہیں، لیکن اغلب اضافات سے بھری پڑی ہیں۔ ''سحر آثار'' کی ایک غزل ۱۳۱ اشعار رکھتے ہوئے بھی صرف ایک اضافت کی حامل ہے۔ ۲۰۳ الفاظ سے بنی ہوئی اس چھوٹی بحر کی غزل میں صرف ۲۴ فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں۔ خیال کی فراوانی کو مکمل طریقے سے ہر شعر میں ادا کیا گیا ہے اور الفاظوں کو اس طرح سے جمایا گیا ہے، جس طرح ایک کہنہ مشق جوہری قیمتی پتھروں کو انگوٹھی میں جوڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مجموعہ کلام میں ایک اور غزل، جو ۲۳ اشعار پر مشتمل ہے اور ۵۰ الفاظ سے بنی ہے، صرف ۱۳ عربی اور فارسی کے الفاظ رکھتی ہے، اور اس میں بھی صرف ایک اضافت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ غزلوں کے جملہ ۳۳۳۳ اشعار میں صرف ۱۹۶ اضافتیں نظر آتی ہیں، جو امجد اسلام امجد کی شاعرانہ انفرادیت کی سند ہے۔ فوق الذکر غزلیات کے کچھ چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

سب کی ایک اوقات
عشق نہ پوچھے ذات

بالکل بُھول گئے
کرنی تھی جو بات

اب سے تیرے ہیں
میرے دن اور رات

کٹ ہی جاتی ہے
کیسی بھی ہو رات

غم کے دھاگوں سے
امجدؔ خوشیاں کات

کہتا ہے درپن
میرے جیسا بَن

بات نہ کرنے سے

بڑھتی ہے الجھن
دھوکا دیتے ہیں
اجلے پیراہن
دونوں جھوٹے ہیں
ساجن اور ساون
اتنی خواہش کر
جتنا ہے دامن

ایک قطعہ بند میں تسلسلِ خیال، تصویرِ جمال اور لفظوں کا کمال دیکھیے:

آؤ ہم اور تم
ایسا کرتے جائیں
آنکھوں آنکھوں میں
باتیں کرتے جائیں
باتوں باتوں میں
غنچے کھلتے جائیں
رنگوں میں نکھلیں
خوشبو ہوتے جائیں

منظوم کلام کی تقسیم بندی میں نظم کی تعریف کو خیال کا تسلسل بتایا گیا ہے یعنی مکمل نظم وہ منظوم کلام ہے، جو ایک لڑی کی طرح سلسلہ رکھتے ہوئے خیال کی تکمیل کرے۔ نظم میں اشعار کی تعداد معین نہیں ہوتی۔ ''سحر آثار'' میں امجد اسلام امجدؔ نے ایک مفرد شعر کو ایک لچک دار مقام پر توڑ کر ایسی مکمل نظم میں تبدیل کیا ہے جو کوزے میں سمندر کو بھرنے کے برابر ہے۔ ۱۸ الفاظ میں ہمارے معاشرے کی دردناک جہیز کی داستان کو محاوروں سے آراستہ کر کے کہتے ہیں:

آندھیوں کی بے ٹھکانہ منزلوں میں
ریت ٹیلے ہو گئے
بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرتے کرتے
آپ نیلے ہو گئے

سچ تو یہ ہے کہ شاعر نے اس نظم میں ایک چھوٹے سے نشتر سے شمشیرِ آبدار کا کام لیا ہے اور یہی آفاقی شاعری ہے۔ ''سحر آثار'' میں نظموں کا رنگ انوکھا ہے، شاعر نے کسی مقام پر معاشرے سے اپنے آپ کو علاحدہ نہیں کیا اور کہیں پر واعظ و ناصح کی طرح آدرش کا درس نہیں دیا، بلکہ ہر جگہ ظلم و جور و استبداد کی نقاب کشائی کی ہے۔ غمِ دوراں ہو کہ غمِ جاناں، عشقِ حقیقی ہو کہ عشقِ مجازی، اشعار کو آئینے کا جوہر بخشا تا کہ ہر قاری اور ہر سامع اس میں صاف طور پر اپنا عکس دیکھ سکے اور پھر خود ہی مسند

انصاف پر بیٹھ کر فیصلہ کر سکے۔ میرا مدعا چند منتخب اشعار سے کسی حد تک ظاہر ہو جائے گا۔ غمِ دوراں کی نسبت سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

شمارِ گردشِ لیل و نہار کرتے ہوئے
گزر چلی ہے ترا انتظار کرتے ہوئے
تمام اہلِ سفر ایک سے نہیں ہوتے
کھلا یہ وقت کے دریا کو پار کرتے ہوئے

آنکھوں کا رنگ بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا
کچھ دن تو مرا عکس رہا آئینہ پر نقش
پھر یوں ہوا کہ خود مرا چہرہ بدل گیا
کہنے کو ایک، صحن میں، دیوار ہی بنی
گھر کی فضا، مکان کا نقشہ بدل گیا

دردِ دل کا جہاں رواج نہیں
ایک انبوہ ہے، سماج نہیں
حرص کھا جاتی ہے غریب کا رزق
ورنہ کچھ کم تو یاں اناج نہیں
بستیوں کو نہ پستیوں میں رکھ
التجا ہے یہ احتجاج نہیں

دَر تھا کھلا پہ بیٹھے رہے، پَر سمیٹ کر
کرتے بھی کیا کہ جائے اماں ہی قفس میں تھی
دیکھو تو کتنے چین سے، کس درجہ مطمئن
بیٹھے ہیں ارضِ پاک کو آدھا کیے ہوئے

اب غمِ جاناں کے متعلق اشعار کا آپ خود فیصلہ کریں:

بھٹکے ہوئے پھرتے ہیں، کئی لفظ جو دِل میں
دنیا نے دیا وقت تو لکھیں گے کسی دن

212

خوشبو سے بھری شام میں، جگنو کے قلم سے
اک نظم ترے واسطے لکھیں گے کسی دن

سارے دھنک کے رنگ تھے، اس کے لباس میں
خوشبو کے سارے انگ اسے سوچنے میں تھے
وصل فراق، دونوں ہیں اک جیسے ناگزیر
کچھ لطف اس کے قُرب میں، کچھ فاصلے میں تھے
جگنو، ستارے، آنکھ، صبا، تتلیاں، چراغ
سب اپنے اپنے غم کے کسی سلسلے میں تھے
امجدؔ کتاب جاں کو وہ پڑھتا بھی کس طرح
لکھنے تھے جتنے لفظ، ابھی حافظے میں تھے

آخر میں اپنی گفتگو کو امجدؔ کی نظم ''ہم لوگ'' کے چند بندوں پر تمام کرتا ہوں:

دائروں میں چلتے ہیں
دائروں میں چلنے سے
دائرے تو بڑھتے ہیں
فاصلے نہیں گھٹتے
گرد اڑتی رہتی ہے
درد بڑھتا جاتا ہے
راستے نہیں گھٹتے
صبح دم ستاروں کی تیز جھلملاہٹ کو
روشنی کی آمد کا پیش باب کہتے ہیں
اک کرن جو ملتی ہے آفتاب کہتے ہیں
دائرہ بدلنے کو انقلاب کہتے ہیں

اور اسی شاعری کے ذہنی انقلاب کے دوسرے نام کو امجد اسلام امجدؔ کہتے ہیں۔

شعریاتِ امجدؔ کے چند ہنری نکات

- امجدؔ کی شاعری میں جذبے کا سوز و گداز ہے لیکن جذباتیت نہیں ہے۔ یہاں وہ فیضؔ کے قریب ہوجاتے ہیں۔ اور یہی راز ان کی شاعری کے دیرپا اثر کا بھی ہے۔
- امجدؔ سچائی کی روایت کے پاسدار ہیں۔ اور وہ اسی رشتے سے ماضی سے جڑے ہوئے ہیں اور ان کا وجود حال سے مستقبل کی طرف رواں دواں ہے جو ایک فطری بڑے شاعر کا تخلیقی تسلسل ہے۔
- زندگی سے سمجھوتہ امجدؔ کی شاعری میں جگہ جگہ نیا ذائقہ دیتا ہے۔

زندگانی، جاودانی بھی نہیں
لیکن اس کا کوئی ثانی بھی نہیں

- امجدؔ کی شاعری میں روایت اور جدّت کا جو ملاپ ہے وہ ان کی شعریت کو توانا بنا دیتا ہے۔ جذبات، حوادث اور تجربات ان کی فکر کو مضطرب کر کے تخیّل سے لبریز خیالات کو دل کے الاؤ میں پکا کر قرطاس پر شعر کی صورت میں بکھرا دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری دل سے نکل کر دوسروں کے دلوں کو چھوتی ہے۔
- امجدؔ کی شاعری میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا خوبصورت ملاپ ہے وہ ایک غم کو دوسرے غم پر قربان کرنے کا قائل نہیں کیونکہ زندگی کے پیچ و خم اور زندگانی کے نشیب و فراز میں یہ دونوں موسم فکر و خیال کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔
- امجدؔ الفاظ کی نشست سے نہ صرف روزمرہ پیدا کرتے ہیں بلکہ اس کو مکالمہ بھی بنا دیتے ہیں۔ کچھ الفاظ جو عام فہم، بول چال میں عوام زیادہ تر بولتے ہیں اسے مصرعوں میں جڑ دیتے ہیں، جیسے:

سب کچھ ایسے ہی ہوجائے جب ہے نا
چاند مری کھڑکی میں آئے تب ہے نا

- خواب سے امجدؔ کا گہرا رشتہ ہے۔ لوگوں نے اسے راشدؔ سے باندھا ہے لیکن امجدؔ کا طرز اور لہجہ دوسرا ہے:

تم بھی ہر شب دِیا جلا کر پلکوں کی دہلیز پہ رکھنا
میں بھی روز اک خواب تمھارے شہر کی جانب بھیجوں گا

مجرّد مصرعوں اور متفرق فقروں میں خواب کے لفظ کی رنگینی، معنی آفرینی، معجز بیانی کی کرشمہ سازی امجدؔ اسلام کا ہنر ہے۔

— اپنے خوابوں کی دہلیز پر مضمحل
— اپنی آنکھوں کی جھولی پسارے ہوئے، خواب اوڑھے ہوئے
— خود اپنے خواب حضوری کی بازگشت میں گم
— اک خواب کا نیلا پھول کھلا
— پھر چاہے آنکھ دریچے سے، ہر خواب گریزاں ہوجائے
— تم جس خواب میں آنکھیں کھولو، اس کا روپ امر

- امجدؔ کے پاس ارسال وترسیل اور ابلاغ کے انداز کرشمائی اور سحر انگیز ہیں۔
- امجدؔ الفاظ کی نفسیات سے آگاہ ہیں۔ وہ کئی الفاظ کو علامات بنا کر نئے مضمون اور معنی تراشتے ہیں۔
- امجدؔ چھوٹی بحر میں بھی بڑے اور گہرے مطالب کہنے کے ہنر سے واقف ہیں۔
- امجدؔ کی غزلوں اور نظموں میں چاند، تارے، شام وسحر، موسم، ہجر و وصال، خواب دشت اور درجنوں الفاظ مجرّد یا تراکیب کی صورت میں استعاروں کا کام کرتے ہیں ان استعاروں سے امجدؔ نئی معانی کی فصل اُگاتے ہیں۔
- امجدؔ نظموں، غزلوں اور گیتوں میں الفاظ کی تکرار سے اور ہم وزن اور ہم قافیہ و ردیف الفاظ سے نغمگی، غنائیت اور ترنم پیدا کرتے ہیں۔
- بڑی شاعری چاہے غزل میں ہو، مثنوی میں ہو، مسدس میں ہو، نظم میں ہو، گیت یا کسی بھی دوسری صنف شاعری میں ہو، وہ الفاظ کے جھروکے اور مضمون کے چہرے سے اپنا دیدار کرا دیتی ہے۔ اس بڑی شاعری کا ایک عظیم مضمون خود شناسی ہے۔ حدیثِ مبارک ہے جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ امجدؔ کی شاعری میں خود شناسی اور خود فہمی کی جستجو ہے۔ خود شناسی کے راستے میں آگہی پھر جہاں شناسی اور خدا شناسی کی منزلیں ہیں۔ امجدؔ کے اشعار کے حوالہ دینے سے قبل ہم زینتِ داستان کے لیے خودی کے فلسفہ کے علم بردار علامہ اقبالؔ کے تین اشعار پیش کرتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں خدا شناسی کا پہلا زینہ خود شناسی ہے یعنی اپنے ضمیر کی روشنی میں اپنا محاسبہ کیا جائے۔

شاہدِ اول شعورِ خویشتن
خویش را دیدن بنورِ خویشتن

دوسرا زینہ خود کا محاسبہ دنیا کے لوگوں کی نظر سے کرنا ہے۔

شاہدِ ثانی شعورِ دیگری
خویش را دیدن بنورِ دیگری

تیسرا اور آخری زینہ جو خدا شناسی کی منزل ہے خود کو نورِ خدا یعنی اس کی تجلیات، احکامات اور شریعت کی روشنی میں دیکھنا۔

شاہدِ ثالث شعورِ نورِ حق
خویش را دیدن بانورِ نورِ حق

امجدؔ کہتے ہیں:

اے خدا کوئی ایسا بھی ہے معجزہ
جو کہ مجھ پر کرے آشکار مجھے

کبھی آگہی کے ذیل میں کہتے ہیں:

ہیں ازل تا ابد ٹوٹتے آئینے
آگہی نے کہاں لا کے مارا مجھے

امجدؔ غزل کے ایک شعر میں کہتے ہیں:

کُن فکاں کے بھید سے مولا مجھے آگاہ کر
کون ہوں میں گر یہاں پر دوسرا کوئی نہیں

حضور اکرم ﷺ سے بھی مانگتے ہیں:

مجھ کو بھی دیجے کبھی
میرے ہونے کا پتا
یا نبی ﷺ صلِ علیٰ

امجدؔ کا ایک شعر جو خدا شناسی کے ذیل میں ہے یہاں پیش کرتے ہیں۔

پہلا لفظ تھا اِسم خدا کا دُوسرا لفظ جدائی
بعد کی گنجل دار عبارت کچھ نہ سمجھ میں آئی

پورا شعر صنعتِ مراعات النظیر میں ہے جیسے اسم عبارت وغیرہ۔ یہاں خالق اور مخلوق کو پہلے اور دوسرے لفظ کی رعایت سے رکھا گیا ہے۔ اللہ اور اس کی مخلوقات میں اشرف المخلوق انسان کی موجودگی اور ظاہری جنت سے دوری جس کے سمجھانے اور سمجھنے کے لیے کئی تصوفی فلسفے ہمہ اوست اور ہمہ از اوست بنائے گئے۔ دوسرے مذاہب اور دھرموں نے بھی مختلف شکلوں میں اس عبد و معبود کے رشتے کو بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تمام تحریریں، تفسیریں، تشریحیں، تصویریں بے معنی اور سمجھ سے دور ہیں۔ امجدؔ نے گنجل دار عبارت میں سب مسائل کو اکٹھا کر کے اس شعر میں یہ مطلب ادا کر دیا ہے کہ عبد و معبود کے رشتے اور توحید کے رموز کو دل کی بصیرت سے صرف سمجھا اور مانا جا سکتا ہے۔

- ہم نے بتایا ہے کہ امجدؔ کی شاعری میں موسم اور وقت کو ہر طریقے سے برتا گیا ہے۔ عاشق کے لیے سب سے کٹھن وہ گھڑی ہوتی ہے جب معشوق رخصت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مشکل ردیف میں ''موسم ملا ہوتا'' میں موسم کے معنی ہی بدل دیے گئے ہیں اور اس جدید پیکر سازی سے مضمون کی ندرت بیانی ہوگئی۔

گزرنے ہی نہ ہم دیتے کوئی لمحہ رفاقت کا
سمے کو روک سکتے تھے اگر موسم ملا ہوتا

موسم ایک ایسا ماحول ہے جو اپنے ساتھ مخصوص حالات لاتا ہے جن کی بدولت تغیرات عمل پیرا ہوتے ہیں۔ موسم صرف

گرما سرما، بہارِ خزاں، بارش دھوپ کا نہیں ہوتا بلکہ رنج و خوشی، دوستی اور دشمنی، محبت و مشقت، اتفاق اور اختلاف وغیرہ کا بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں شاعر نے موسم کے لفظ کو علاحدہ مفہوم دے کر نیا پیکر تراشا ہے۔ مقطعے کے ذیلی شعر میں ایک روزانہ ہونے والے مشاہدے کو نئی سمت دی ہے۔

یہ نقشِ پا سے جو امجدؔ مٹے جاتے ہیں صحرا میں
یہ بن جاتے نئے رستے اگر موسم ملا ہوتا

ایک اور مقام پر موسم سے شعر کی آمد کو جوڑ کر نادر تشبیہہ سے مضمون نگاری کرتے ہیں۔

شاعری کے موسم میں شعر قلبِ شاعر پر
ہجرتی پرندوں سے دم بدم اُترتے ہیں

کہیں رومانوی کیفیت کو موسم کے پیرائے میں تبدیل کر دیتے ہیں:

تم نے نگاہ پھیر کے دیکھا بس ایک پل
اس ایک پل میں کہتے ہی موسم چلے گئے

- امجدؔ چونکہ محبت اور انسان دوستی کا شاعر ہے اس لیے وہ زندگی اور زندہ دلی کو پسند کرتا ہے۔ اُسے ہر ذی شعور اور ذی وقار شخص کی طرح اپنی مٹی سے الفت ہے وہ وطن کے گیت گاتا ہے اور جب اس کا وطن وہ قدروں اور روشنیوں کو نہیں دے سکتا جو صدیوں سے اس کی دین تھی تو استغاثہ بلند کرتا ہے۔ ''رات کیوں ہوگئی'' ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سورج لیے؟

میرے شہروں کو کس کی نظر لگ گئی
میری گلیوں کی رونق کہاں کھو گئی
روشنی بجھ گئی، آگہی سو گئی
پرچمِ روشنی کس طرح پھٹ گیا
کون سا موڑ ہم سے غلط کٹ گیا
پھول رُت میں خزاں کس طرح چھا گئی
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سورج لیے
رات کیوں ہوگئی؟

- امجدؔ کی شاعری کا ایک نمایاں اُفق وقت کے دھاروں میں پیوست احساسِ زیاں ہے۔ وہ ان خسارات اور نقصانات سے آدرش لینا جانتے ہیں وہ ان غلطیوں اور لغزشوں سے مبرّا رہنا چاہتے ہیں جو ایک رواں دواں زندگی کے لیے حیات ہے۔ امجدؔ کا یہ جذبہ وطنیت کے سوز و گداز سے مل کر عزم اور استقلال کی دیوار بن جاتا ہے جس کی جھلک برزخ کے ان اشعار میں نظر آتی ہے۔

تیری آنکھوں میں اب اے نگارِ وطن
شرمساری کے آنسو نہیں آئیں گے

ہم کو تیری قسم اے بہارِ وطن
اب اندھیرے سفر کو نہ دھرائیں گے
گر کسی نے ترے ساتھ دھوکہ کیا تو وہ کوئی بھی ہو
اس کے رستے میں دیوار بن جائیں گے
جان دے کر ترا نام کر جائیں گے

❁ امجدؔ کی نظموں اور غزلوں کی شہرت کا ایک راز اس کی شاعری کے ترسیل و ابلاغ میں بھی ہے۔ ادھر امجدؔ نے مصرعہ پڑھا، اُدھر عام فہم لوگوں نے بھی اسے سمجھا اور داد سے اس کی قیمت ادا کی۔ مصرعوں میں آسان، سلیس عامیانہ الفاظ پنجابی، سندھی اور ہندی لفظوں کے ساتھ اس طرح گتھ دیئے گئے ہیں کہ ان کی اجنبیت باقی نہیں رہتی۔

سمے کے رستے پہ چل کے دیکھیں
اے سُندر متوالی آنکھوں والی ناری سُن
اپنی آنکھیں موند کے مجھ سے سپنے میرے لے لے
بے انت سوالوں کی زنجیر ہے یہ دنیا
جیل کے وارڈن کی طرح ان زمانوں کو پھر
خزاں کی بالکونی سے
ہوا سیٹی بجاتی ہے
کیسے آدرش تھے جن کے سائے

☆ امجدؔ کے مصرعوں میں انگریزی، یورپی، پنجابی، سنسکرت اور ہندی کے رائج الوقت لفظوں کی شعبدہ کاری اور ملمع سازی دیکھیے:

☆ دھرا ہے مگ وہ کافی کا
☆ قلم ہے جس کی نب پر رت جگوں کی روشنائی یوں لرزتی ہے
☆ مری الماریوں کے ہینگروں میں اب بھی لٹکے ہیں
☆ چمکتے واش بیسن میں پڑے ہیں
☆ کلنڈر پر رُکی تاریخ نے پلکیں نہیں جھپکیں
☆ تجھے دروازے کی بیل پر جمی شاید نظر آئے
☆ اپنی یاد کی خوشبو مجھ کو دان کرو اور اپنے دل میں آنے دو
☆ کسی الجھی ہوئی گمنام سی چنتا کے جادو میں
☆ دھرتی تیرا پیٹ بھرن کو کتنی مٹی ہو
☆ من چاہی تعبیر سے روشن سپنا کیسے ہو

- امجدؔ کی شاعری میں محاوروں، کہاوتوں اور ضرب المثل کی کمی نہیں۔ ان محاسن سے معنی آفرینی اور مضمون میں تازہ کاری اور شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ دو چار ضرب المثل یہاں نقل کرتے ہیں۔

دن کے بھولے کو اور کیا کہیے، جو سرِ شام بھی نہیں آیا
جس کے ہاتھوں یہ خون تھا اپنا، اُس پہ الزام بھی نہیں آیا

سنا ہے کانوں کے کچے ہو تم بہت سو ہم
بہت ہے ڈوبنے کو یوں تو تنکے کا سہارا بھی

بیٹھے رہیں گے سایۂ دیوارِ یار میں

- امجدؔ کی شاعری میں ان کا منفرد ایک اور ہنر دو دو یا دو تین الفاظ کی جوڑی کا مصرعوں میں استعمال ہے۔ ان الفاظ میں ترکیب یا وصل نہیں۔ یہ الفاظ علاحدہ علاحدہ ہوتے ہوئے بھی وصل اور ترکیبی الفاظ سے زیادہ حسنِ صوری اور حسنِ معنوی دیتے ہیں۔ مصرعوں میں لفظوں کے شاہزادے، ہوا کے زینوں، آنکھوں کے راکھ دانوں، خوشبو میں سحر، خزاں کی دہلیز، بے وجود سایوں، کاجل کی آواز، خوابوں کے بے کرانی، سبز خواہش وغیرہ کی کرشمہ سازی دیکھیے:

یہ مرے لفظوں کے شاہزادے
ہوا کے زینوں کو ہم نے اپنا رفیق منزل بنا لیا ہے
کئی جزیرے ہماری آنکھوں کے راکھ دانوں میں جل رہے ہیں
تیری خوشبو ہمیں سحر کی مثل ہیں جن میں ہم بند ہیں
مگر دریچوں میں جانے والوں کی راہ تکتے اداس چہرے
خزاں کی دہلیز پر کھڑے ہیں
بے وجود سایوں کا یہ جو کارخانہ ہے
چاروں جانب پھیل رہی ہے کاجل کی آواز
بادل بادل تیری آنکھیں کیسے اتروں پار
ہمارے خوابوں کی بے کرانی، تلاش معنی
کی سبز خواہش کے ایک نقطے سے پھوٹتی ہے

اقربا اور مشاہیر پر دلکش نظمیں

قائد اعظم محمد علی جناح پر خوبصورت ایک نظم میں تمام گفتگو استعاروں اور اشاروں میں کر کے امجدؔ نے انھیں ظلماتِ زندگی میں امید کا سورج اور آرزو کا چاند بتایا ہے جن کے بغیر وطن اور قوم کا وجود ممکن نہ تھا۔ اس نسبتاً طولانی نظم کے چند مصرعے یہاں لکھتے ہیں تا کہ پڑھنے والے پوری نظم کو کلیات میں پڑھ سکیں اور لطف اندوز ہوں۔

ایسا ہی اک سورج تھا وہ آدم زادہ
ٹوٹی اینٹوں کے ملبے سے
ایک عمارت کی بنیادیں ڈال رہا تھا
جن کے کالے تنگ گھروں میں کوئی سورج چاند نہیں تھا
پھولوں کی مہکار نہیں تھی بادل کا امکان نہیں تھا
صبح کا نام نشان نہیں تھا

وہ خود سورج بن کر ابھرا
ڈھلتی شب میں پورے چاند کی صورت نکلا
صبح کے پہلے دروازے پر دستک بن کر گونج اٹھا
آج میں جس منزل پہ کھڑا ہوں
اس پر پیچھے مڑ کر دیکھوں
تو اک روشن موڑ پہ اب بھی
وہ ہاتھوں میں
آنے والے دن کی جلتی مشعل تھامے
میری جانب دیکھ رہا ہے
جانے وہ کیا سوچ رہا ہے

امجد اسلام امجدؔ کی ایک نظم ''احمد ندیم قاسمی'' ہے۔ نظم کیا ہے، متحرک مصوری ہے جس کا ہر نقش جذبی کیفیت کا حامل ہے۔ جب دل سے دل کو راستہ ہوتا ہے تو تاثراتی تصویر احساس کی نزاکت اور تخیل کی پرواز سے ایک جاندار مخصوص فضا پیدا کردیتی ہے جس میں جذبات قلبیہ، خوش اسلوبی، خوش سلیقگی اور خود سپردگی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ نظم کے پہلے حصے میں احمد ندیم قاسمی کے فن اور شخصیت پر استعاراتی ریویو ہے اور دوسرے حصے میں ان سے کسبِ فن اور ان کی سیرِ گلشن کے دوران گلچینی کے فیض کا بھی اقرار ہے۔ پوری نظم ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

میں نے اُس شخص کی آنکھوں میں فروزاں دیکھی
اُس کے نکھرے ہوئے باطن کی چمک
اُس کے مہکے ہوئے لہجے کی کھنک
اُس کے کردار کے پردے میں نمایاں دیکھی
عظمتِ آدمِ خاکی کی جھلک

اُس نے بتلایا مجھے
کیسے فن کار کا فن
اُس کے احساس کی قوت سے جنم لیتا ہے
اُس نے سکھلایا مجھے
کس طرح کوئی زمانے کو مسرت دے کر
اپنے حصے میں اَلم لیتا ہے
آسماں، کون سے لوگوں کے قدم لیتا ہے؟

یہ پوری نظم ''اُس'' اور ''زمین'' کے مکالمے شعری میں شخصیت و فن کا جوہر پارہ ہے۔ سب سے عظیم کردار، انسان کا احترام کرنا اور اس کی عظمت کا احساس ہے جس سے حقوقِ بشر کی تعلیم ہوتی ہے اور یہ سعادت باطنی پاکیزگی سے حاصل ہوتی ہے۔ قاسمی کے لہجے کی خوشبو سے نثر اور نظم عطر آگین ہیں۔ امجدؔ نے بہت اہم نکتے قاسمی سے سیکھے ہیں جس سے وہ اپنے ہنر کو جلا دینے اور لوگوں کے درد و غم کو اپنے اندر اپنا کر فلک کے راستوں پر چلنے کے رازوں سے بھی واقف ہوئے ہیں۔

امجد اسلام امجدؔ نے ایک خوبصورت طولانی نظم ''نیلسن مینڈیلا'' پر لکھی ہے جس کو ۲۷ ستائیس برس قید کیا گیا لیکن زنداں کے در و دیوار اس کی آواز کو کچل نہ سکے جو حریت آزادی اور انسانی حقوق کے لیے تھی۔ قید کی صعوبتیں اس کے عزم واستقلال اور آہنی ارادے کو ختم نہ کرسکیں، اس نے حق گوئی کے لیے اپنی ساری عمدہ عمر تنہائی میں گزار دی مگر ہمیشہ اس کے ذہن میں کروڑوں افراد کی فکروں کا اجتماع تھا۔ امجدؔ کی یہ نظم سچائی کا نقش ہے جو دل پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہوجاتا ہے۔

وہ زندانی، وہ تنہا خاموش ہیولا
اِک ایسا ''اظہار'' تھا جس کے

اِک اِک نقش میں لاکھوں چہرے سمٹ گئے تھے!
اک ایسا ''انکار'' تھا جس میں
بَل والوں کے گھڑے ہوئے لفظوں کے معنی اُلٹ گئے تھے!
ایک ایسی ''دیوار'' تھا جس سے
کتنے ہی طوفان الجھنے آئے تھے اور پلٹ گئے تھے!
اس کی روح کے اندر جیسے چاروں جانب آئینے تھے
اس کو پتہ تھا
حدِ نظر تک پھیلی یہ تاریکی اپنی حد رکھتی ہے
زنداں کی دیوار کے باہر
اُس کے خواب کی روشن خوشبو، سینہ سینہ پھیل رہی ہے
اُس کو پتہ تھا
وہ دن اب کچھ دور نہیں جب، اُس کی دھرتی
''اُس'' کی ہوگی اور سراسر گلشن ہوگی
جب وہ دنیا!
آدرش اور امکان کی دنیا
ناممکن سے ''ممکن'' ہوگی!
آدم کی توقیر کا حصہ جب بھی لکھا جائے گا
جلی قلم سے درج سنہرے اور دمکتے کچھ حرفوں میں
اُس کا نام بھی لکھا ہوگا

امجد اسلام نے خوشحال خاں خٹک کی نظم میں کہکشانی پیکر سازی سے کام لیا ہے جس میں سورج ، چاند، ستارے ، آسمان، زمین اور ان سے وابستہ روشنی سی ساری نظم کو منوّر کیا ہے۔ مضمون کو پیکروں، علامتوں، اشاروں اور نشان میں بیان کرنا امجد کا پسندیدہ اور انفرادی شناختی عمل ہے۔ اس نظم میں پہلے کہکشاں کے مختلف تاروں ، ستاروں کی فنا اور بقا پر تمہید باندھ کر شاعر اصل موضوع پر یوں گریز کرتا ہے۔

کئی مہتاب خُو سورج بکف ایسے بھی ہوتے ہیں
کہ جو خود ٹوٹ بھی جائیں تو ان کی
روشنی موجود رہتی ہے
صدائے بازگشت اُن کی ہَوا کے ساتھ بہتی ہے
وہ اپنی موت سے لوحِ ابد پر زندگی تحریر کرتے ہیں
فنا تسخیر کرتے ہیں!

مرے خوشحال کے نغمے بھی اِک ایسے ہی لافانی ستارے
کی ضیا ہیں
مری مٹّی کے چہرے کی حیا ہیں!
اِنہی نغموں کے پرتو سے اُمنگیں جگمگاتی ہیں
اِنہی سے اس زمیں کی آنکھ میں دُلہن کی آنکھیں مسکراتی ہیں
اِسی تارے کی مشعل سے ہے اپنا تن بدن روشن!
کرن اندر کرن روشن!
مرے خوشحال کے نغمے سے ہے میرا وطن روشن!

پوری نظم میں ہر لفظ قندیل معلوم ہوتا ہے۔ نظم میں نئے سائنسی تجربات کا بھی ذائقہ موجود ہے۔ روشنی اور نغمے کا ملاپ اور اسے وطن سے جوڑنا دلکشی اور عمدہ صناعی ہے۔ شاید ایک ہنرمند کو دوسرے ہنرمند سے خراجِ عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔

امجدؔ نے جو نظم اپنے بیٹے ''علی ذیشان'' کے لیے لکھی اس میں باپ اور بیٹے کے درمیان جو عمر، ماحول، عادات و اطوار کے فاصلے ہوتے ہیں اُس پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

ازل سے ایک منظر ہے فقط آنکھیں بدلتی ہیں
مری نظروں کا دھوکہ تھا کہ یہ چیزیں بدلتی ہیں

نئی نسل کی فکر ان کی نگاہ اور نظر ان کا انداز اور اسلوب قدیم نسل سے جداگانہ رہتا ہے۔ جو فرق باپ بیٹے اور ماں بیٹی میں دیکھنے میں آتا ہے۔ زندگی کے خواب کی تعبیر کتابوں کے اوراق میں نہیں بلکہ تجربے اور سر کے بال سفید کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہر دور کچھ اقدار اپنے ساتھ لاتا ہے اور کچھ قدریں متروک ہو جاتی ہیں۔

مرے بیٹے نے آنکھیں اک نئی دنیا میں کھولی ہیں
اُسے وہ خواب کیسے دوں
جنھیں تعبیر کرنے میں مری یہ عمر گزری ہے
مگر جو زندگی اُس کو ملی ہے اس کے دامن میں
انوکھے پھول ہیں اس کے نرالے اس کے موسم ہیں
خود اپنی ذات کی مستی میں بہنا چاہتا ہے وہ
نئی دنیا نئے منظر میں رہنا چاہتا ہے وہ
اُسے کیسے بتاؤں میں کہ میرے باپ کی باتیں
جو اک بھولا فسانہ تھا
میں اس کے جیب کے متروک سکوں کو کہاں رکھتا

نئے بازار تھے میرے کرنسی اور ہی تھی
اُسے کیسے بتاؤں میں
اُسے بھی اپنے بیٹے کو یہی قصہ سنانے میں
یہی دشواریاں ہوں گی

یہاں بڑے خوبصورت طریقہ پر جنریشن گیپ (Generation Gap) کے مسائل کو واضح کیا گیا ہے۔ بڑا شاعر ہر موضوع میں آپ بیتی سے جگ بیتی کو جوڑ دیتا ہے تا کہ اس سے عوام کو بھی سمجھنے میں مدد ہو سکے۔

امجدؔ کی ایک پانچ شعر کی نظم جو مثنوی کی ہیئت میں ہے ''فردوس کے لیے'' ہے جو ان کی شریکِ حیات ہے جو شاعر کی لہجہ شناس، اس کے ہر دکھ اور خوشی میں شامل ہے جسے وہ اپنی زندگی کا سپنا اور زندگانی کی کتاب کا منوّر باب سمجھتا ہے۔ امجدؔ فردوس کے ساتھ ایسے رہتے ہیں جیسے خوشبو سے ہوا عطر آگین رہے۔ یہ سچ ہے عشق کی حالت کی مصوری ممکن نہیں۔ احساس کتنا ہی نازک ہو اور تخیل کتنا ہی بلند ہو پھر بھی شوق و عشق کی لطافت اور سحر طرازی کو بیان نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ خود امجدؔ نے اشارہ بھی کیا ہے۔

جس سے ہو آشکار مرے دل کی کیفیت
الفاظ کی گرفت میں آتی نہیں ہے بات
یوں ہیں بیانِ شوق کی راہوں کے پیچ و خم
بے نام کہکشاؤں میں الجھی ہو جیسے رات

کیا شریکِ حیات، ہمسفر اور ہمسرِ زندگی کی اس سے عمدہ جذبے اور خیال کی شگفتگی اور خوش سلیقگی کی تصویر کشی ہو سکتی ہے، جو نفسیاتی اور احساساتی خلوص کی چاشنی کے ساتھ سچائی کی خوشبو بکھیر کر میاں بیوی کے رشتے کو زعفران کر دے۔

وہ میری ہم سفر بھی ہے لہجہ شناس بھی
خوشبو مثال ہے جو میرے آس پاس ہے
دھڑکن میں اعتماد تو ہاتھوں میں ہاتھ ہے
ہر دکھ میں ، ہر خوشی میں مرے ساتھ ساتھ ہے
آئی وہ میری زیست میں اک خواب کی طرح
حاصل ہو جو کتاب کا اس باب کی طرح

یہ مشہور ہے کہ ہر کامیاب شخص کے پیچھے ایک پردہ نشین کا ہاتھ بھی ہوتا ہے۔ جو اس کامیابی کا ساز اور راز بھی ہوتا ہے۔ امجدؔ کی گونا گوں فتوحات میں ان کی ہمسر بھی شامل ہیں اور یہی امجدؔ کی دنیا میں فردوس بھی ہے۔

امجدؔ کی ایک طولانی پر تاثیر نظم ''ماں'' ہے۔ نظم دراصل ''ماں'' پر شخصی مرثیہ ہے۔ اس نظم کے لفظ بیٹے کے دل کی تہوں سے اُبلے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ وہ ماں جس کا سایہ ساتھ ساتھ ہمیشہ رحمت بن کر، مہربان رہ کر زندگی کا امین بھی تھا، وہ شاعر کے حق میں اجڑ گیا جس نے اس کے گمان کو یقین بنا دیا تھا اور اس کے لیے دنیا کو بہشت کر دیا تھا۔

وہ جو ایک باغ ارم نما سبھی موسموں میں ہرا رہا

وہ اُجڑ گیا
وہ جو اک دعا کا چراغ سا مرے راستوں میں جلا رہا
وہ بکھر گیا
وہ جو اک دعائے سکون تھی مرے رخت میں
وہی کھو گئی

شاعر پھر خدائے لم یزل کی سنّت اور مشیّت کا اقرار کرتا ہوا کہتا ہے:

یہ جو زندگی کی متاع ہے
تری دین ہے ترا مال ہے
مجھے ہے تو اتنا ملال ہے
کہ جب اُس کی ساعتِ آخری سرِ راہ تھی
سرِ شام غم مجھے ڈھونڈتی مری ماں کی بجھتی نگاہ تھی

اللہ کی محبت، ماں کی محبت سے لاکھوں درجے زیادہ ہے جس کا اقرار بھی یہاں رحم اور عفو کی التجا کے ساتھ شامل ہے۔ اس نظم کے آخری حصے میں پہلے تو شاعر اپنی زندگی ماں کی دعاؤں کی چھاؤں میں جو اللہ کی برکتوں کے طفیل ہے بسر کرنا چاہتا ہے اور پھر ماں کے درجاتِ عالیہ اور پُرسکون لحد کا امیدوار ہے۔

مری زندگی کا جو وقت ہے، کٹے اس کی اجلی دعاؤں میں
تری برکتوں کے حصار میں
تری بخششوں کے دیار میں
مری ماں کی روحِ جمیل کو
سدا رکھنا اپنے جوار میں
سدا ابرِ فضا وہ لحد رہے ترے لطفِ خاص کی چھاؤں میں

امجدؔ اسلام امجدؔ کی ایک چھوٹی سی نظم اپنی ننھی منّی نواسی ''آئنین'' کے لیے ہے۔ یہاں نظم کا مرکزی خیال جو ''محبت'' ہے الفاظ اور بیان کی محدودیت پر ہے۔ غالبؔ نے جب تنگنائے غزل کا شکوہ کیا تھا تو یار لوگوں نے اسے غزل کی ہیئت تک محدود رکھ کر لن ترانیاں کیں جب کہ غالبؔ ہیئت اور بیان جو الفاظ کی وجہ سے وجود میں آتا ہے دونوں کی تنگ دامنی کا شاکی تھا چونکہ غزل میں بیان اور ہیئت محدود اور ذہن میں خیالات لامحدود ہوتے ہیں۔ امجدؔ بھی اس خوبصورت جذبی کیفیت سے لبریز رسیلی نظم میں اسی درد کا اظہار کر رہے ہیں کہ جو کیفیت احساس کی اس کی مسکان سے، اس کے ہاتھوں کی لمس سے، اس کی نگاہوں کی معصومیت سے شاعر کے رگ و پے میں پیدا ہوتی ہے لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی۔ اس نظم کا Climax خدا کا شکر ہے کہ ایسا انعام اُس نے عطا کیا ہے کہ کوئی لفظ بھی اس شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس طرح شاعر نے یہاں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں میں الفاظ اور بیان کی محدودیت پر جذبات نگاری کی ہے۔ نظم یوں ہے:

ابھی تو اتنی نازک اور چھوٹی ہے وہ
کہ اُسے اٹھاتے ڈر لگتا ہے
اُس کے لبوں پر کھلنے والی
پیاری سی مُسکان ہے ایسی
جس پر آ کر سب تشبیہیں رُک جاتی ہیں
اُس کے ننھے ہاتھ کے لمس میں جو ملتی ہے!
اُس راحت کو لفظوں میں اب لاؤں کیسے؟
ایسی زندہ کیفیت کو ظاہر کرنے والی زبانیں
ابھی کہاں بن پائی ہیں!
میرے بلانے پر وہ مجھ کو ایسی نظروں سے تکتی ہے
یوں لگتا ہے جیسے اُس کو ہر اک بات سمجھ آتی ہے

آیتین کے روپ میں تُو نے جو انعام دیا
جتنے لفظ دھیان میں لاؤں چھوٹے پڑتے جائیں
کیسے شکر ادا ہو مولا اس رحمت کا!

ہماری تہذیب میں کنبہ پروری اور اس کی نگہداری مغرب کی تہذیب کے مقابل زیادہ ہے۔ قدیم زمانے میں ایک پریوار، ایک بڑے گھر میں رہتا اور اس میں بزرگ لوگ اس خاندان کے سرپرست ہوتے جو ہر بڑے چھوٹے سے ان کی عمر اور رشتے ناتے کے لحاظ سے شفقت اور نصیحت کرتے رہتے۔ آج کل کے دور میں یہ سہولت تو نہیں مگر فیملی کے افراد کی آمدورفت اور خاندان کے بزرگوں کی موجودگی ہر چھوٹی بڑی تقریب کا اہم حصہ ہیں۔ اسی لیے امجد اسلام امجد کی کئی نظمیں ان کے کلیات میں موجود ہیں جو اسی تہذیب کی تاریخ اور تشریح بھی ہیں۔ ایک ایسی ہی نظم ''زیبندہ بیٹی کے لیے'' موجود ہے۔ اس نظم میں بھی وہی جذبوں کی گھلاوٹ، خیال کی رعنائی اور روح کی نشاط موجود ہے جو ایک نہ قابل فراموش احساس نانا کو نواسی کے ننھے ہاتھوں کو چھو کر اور اس کی مسکان دیکھ کر ہوتا ہے جس کو وہ ھذا من فضل ربی جان کر زیبندہ اور اس کے ماں باپ کو خوشیوں کی دعائیں دیتا ہے۔

بیس برس کی بات ہے لیکن یوں لگتا ہے
جیسے کل کی بات ہو، جب وہ
ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر مجھ کو چھوتی، میری جانب آتی تھی تو
اُس کے لبوں پر ایک ستارہ کھلتا تھا
میری روح کی ساری خوشبو اور سچائی

اُس کے لمس میں جاگ اُٹھتی تھی
اللہ! کیسے اچھے دن تھے!!

اب میں اس کی پیاری پیاری
پھولوں جیسی زینہ ہ کو چھوتا ہوں تو
یوں لگتا ہے
جیسے سب کچھ لوٹ آیا ہو
مولا، جیسے تو نے میری عرض سنی اور
اپنے جاری فیض سے میرے من کو شانت رکھا
مجھ پر اور اِک رحمت فرما
زینہ ہ کو اُس کی ماں کی خوشبو دے کر
عاقب اور روشین کی دنیا
پہلے سے بھی روشن کر دے
اس تازہ معصوم ہنسی سے
ان کے سارے گھر کو بھر دے!!

امجدؔ نے ایک نظم ''میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی'' میں بچہ کی ہنسی کو مرکزی موضوع بنایا ہے۔ یہاں شاعر وہی احساسات اور جذبات جو بچی کی آواز سن کر، اس کی مسکان دیکھ کر اور اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو چھو کر سرشار ہوتا ہے دکھا کر اس کی ہنسی کی طرف دعائیہ انداز میں کہتا ہے:

اے دنیا کے رب
کوئی نہیں ہے اس لمحے تیرے میرے پاس
سچ سچ مجھ سے کہہ
تیرے ان معمور خزانوں کی بے انت گرہ میں
بچے کی معصوم ہنسی سے زیادہ پیاری شے
کیا کوئی ہے؟

امجدؔ کی ایک چھوٹی سی نظم ''شفیق الرحمن'' ہے۔ پوری نظم میں اصلی نکتہ یہی ہے کہ اس عجیب شخص نے دوسرے لوگوں کی خوشی اور مسرت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

بہت عجیب شخص تھا
تمام عمر جس قلم سے دوسروں کے واسطے

لکھے تھے اُس نے قہقہے
اُسی قلم سے اپنا کوئی ایک دکھ نہ لکھ سکا

امجد اسلام امجدؔ نے اپنی دھرتی کے معجز نما شاعر ''رحمان بابا'' کے لیے جو نظم میں خراج عقیدت پیش کیا ہے اس کا مبدا حیرت اور گیرائی ہے، جو ان کے لشکوں اور گیتوں کے توسط سے آج تک فضاؤں میں رقص کرتے رہتیہیں۔ چند مصرعوں کو یہاں جوڑ کر بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

وہ ایک حیرت کا شامیانہ سا چار سُو تھا
تھی جس کے لشکوں سے اُس کے لفظوں کے بخت جاگے
پہاڑ جھمکے، گلاب چمکے، درخت جاگے
وہ وادیوں کی گھنی اداسی میں چپ کی آواز سننے والا
وہ اَن لکھے لفظ پڑھنے والا وہ اَن بہے اشک چُننے والا
وہ میری ارضِ وطن کا شاعر جو اپنے لفظوں میں جی رہا ہے
میں جس تحیّر کی راہ میں ہوں وہ اس کی منزل سے آشنا ہے

امجد اسلام امجدؔ کی نظمیں جو شخصیتوں پر لکھی گئی ہیں خاص نکات کی حامل ہیں۔ ہر نظم میں اہلِ دل، اہلِ درد اور اہلِ نظر کے لیے روشنی، لطافت خیال اور موضوع کی مناسبت سے فطری انداز میں حقیقت نگاری موجود ہے۔ قائد اعظم جناح، نیلسن منڈیلا، خوش حال خان خٹک، رحمان بابا، نصرت فتح علی خاں، نور جہاں، اور خاندان میں ماں، بیگم، بیٹی، بیٹا، نواسیوں کے علاوہ غالبؔ اور اساتذہ ہم عصر شاعروں میں یعنی فیضؔ، حبیب جالب، اختر حسینؔ جعفری، جون ایلیا، پروینؔ، پیرزادہ قاسم، گلزار پر خوبصورت نظمیں نظر آتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مختلف دنیا کے مقامات پر بھی نظمیں موجود ہیں۔ جہاں تک شاعروں کو خراج پیش کرنے کا رواج اردو شاعری میں صدیوں سے چلا آرہا ہے ہر ممتاز اور بڑے شاعر نے میر کو خدائے سخن کہہ کر اچھے شاعر کی توصیف کرنے کی رسم قائم کی ہے۔ عرفیؔ نے حافظؔ کی غزلوں سے متاثر ہوکر اس کو کعبۂ سخن کہا تھا اسی بنا پر غالبؔ بھی اردو غزل میں کعبۂ سخن کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ میرؔ خدائے سخن ہیں۔ جس طرح فردوسی فارسی کا خدائے سخن ہے۔ خدا خالق اور کعبہ مخلوق ہے۔ یہ فرق ملحوظِ خاطر رہے۔

امجدؔ کی شاعروں پر جو نظمیں ہیں اُس گلدستۂ منظوم میں سب سے عالی نظم غالبؔ پر ہے وہ گُلِ سرسبد سخن ہے۔ غالبؔ کی نظم کا کمال یہ بھی ہے کہ پوری نظم غالبؔ کے ڈکشن میں کشید کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر غالبؔ کی تراکیب، فقرے، مصرعے اور معنی آفرینی کی تہہ داری بھی غالبؔ ہی کے گنجینۂ معنی کے طلسم سے لی گئی ہے جو امجدؔ کی غالبؔ پر گہری نظر اور شاعری پر غالبیت محسوب ہوتی ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ پوری نظم یہاں پیش کروں لیکن مضمون کی طوالت مانع ہے اس لیے چند مصرعے چھوڑ کر کچھ جوڑ کر نقل کرتے ہیں تاکہ پوری نظم کلیات میں پڑھ کر لطف حاصل کیا جاسکے۔

قطرے میں اُس کی آنکھ کو دجلہ دکھائی دے
تھا جامِ جم سے مٹّی کا کوزہ جسے عزیز

اُلٹا پلٹ وہ آتا تھا کعبے کے در سے بھی
معنی کا اک جہان تھا اُس کا ہر ایک لفظ
شاہد ہے اس بیان پر خود اُس کی شاعری

اس نظم میں غالبؔ کے مصرعوں اور فقروں کی اعجاز بیانی دیکھئے:

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شاعری کی رسم ہے ایک ہنرمند دوسرے ہنرمند کا احترام کرتا ہے۔ یہاں امجدؔ کی سلامی تمام ہم عصر شاعروں کی طرف سے ہے۔

امجدؔ سلام کرتی ہے اُس کو ہر ایک صبح
آتی ہے جو بھی شام وہ لیتی ہے اُس کا نام
ہم عاشقانِ شعر کا محبوب ہے وہی
شاعر بہت ہیں سب سے مگر خوب ہے وہی
وہ روبرو ہے کیجئے اہلِ نظر سلام
ہونے لگا ہے بزم میں غالبؔ غزل سرا
جو نکتہ داں ہیں ان کے لیے ہے صلائے عام

امجدؔ کی ایک اور دلکش نظم ''فیض صاحب'' ہے امجدؔ نے فیضؔ سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی شاعری سے سیکھا ہے اسی لیے فیضؔ کا ڈکشن بھی امجدؔ کے پاس نظر آتا ہے۔ اس نظم میں ان کی دلربا شاعری استعاروں، آزادی بخش خیالوں کے علاوہ ان کی شخصیت اور ان کا منکسر المزاج رویہ بھی دکھایا گیا ہے۔

بہت خوش بخت ہیں آنکھیں، جنھوں نے اُن کو دیکھا ہے
بہت خوبصورت ہیں وہ لفظ
جو اُن کے قلم کی نوک پر چمکے، سخن کے آسمانوں پر
ستاروں کی طرح دمکے
بہت خوش رنگ ہیں وہ پھول جو اُن کے جہانِ فکر میں مہکے
اور اُن کی موہنی خوشبو ہمارے صحن تک آئی
وہ کہتے تھے بہار آئی ہے بولو اے چمن والو!
تمھارے در پہ آیا ہے لبِ آزادی کا موسم
نہیں صیاد کا موسم

چہکنے کا سماں آیا گیا فریاد کا موسم
وہ اُن کی سوچتی آنکھیں وہ اُن کا ٹوٹتا لہجہ
وہ اُن کا دل جو ہر مظلوم کے غم میں تڑپتا تھا
سحر ہو سب گزیدہ تو میں ان کو یاد کرتا ہوں
نظر ہو آبدیدہ تو میں اُن کو یاد کرتا ہوں
مری مٹّی کی خوشبو بولتی ہے اُن کے شعروں میں
وہ شاعر تھے
قلم نے اُن کا جو لکھا، جو دیکھا اُن کی آنکھوں نے
وہی تو گوشوارہ ہے، اندھیروں اور اُجالوں کا
وہی تو استعارہ ہے
مجھے بس اتنا کہنا ہے کہ فیضِ فیض ہے جاری
ہم اُن کو یاد کرتے ہیں
اور اکثر یاد کرتے ہیں!!

امجدؔ اور گلزار ہم عصر شاعر ہیں، ہمدرد ہیں اپنے دور کے درد بھرے لوگوں کے، وہ دونوں اگرچہ سرحد کے اِدھر اُدھر ہیں لیکن قلم اور دل کے رشتے سے جڑے ہوئے ہیں۔ نظم میں اس رخ پر کچھ مصرعے دیکھئے۔ امجدؔ کہتے ہیں۔

تم مرے دوست ہو گلزار مرے ساتھی ہو
سرحدیں اپنی جگہ، میرے لیے کافی ہے
یہی احساس کہ ہر سانس میں ہم دونوں کے
دل دھڑکتے ہیں اسی ایک فلک کے نیچے
یہ قلم اور دلوں کا رشتہ
اس کو درکار نہیں اور سہارا کوئی

یہ وہ دریا ہے جو بہتا ہی چلا جاتا ہے
جیسے خوشبو کا نہیں ہوتا کنارا کوئی

امجدؔ نے گلزار کی شخصیت اور ان کے فن پر خوبصورت ریویو کیا ہے۔ شخصیت پر داخلیت کا اثر عمدہ ہے۔

یوں تو گمبھیر ہو خاموش سمندر کی طرح
تم نے جو گیت لکھے اُن کی بنت ایسی ہے
سب کو وہ اپنے ہی اندر کی صدا لگتے ہیں

جس شخص نے بھی گلزار کی تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس راز سے واقف ہے کہ گلزار کے پاس تخیل کی بلند خیالی،

ندرت، عینیت اور آفاقیت ہے۔ وہ الفاظ کی تازہ کاری سے متحرک مصوری کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں بول کی مٹھاس اور گنگا جمنی زبان کا مزا ہے۔ گلزار کی شاعرانہ صناعی ان کی دوسری تخلیقی اُپج سے لطیف اور شیریں ہے جس کا اشاروں میں امجدؔ نے یوں ذکر کیا ہے۔

جیسے فنکار کو پتھر میں چھپے نقش نظر آتے تھے
تم نے بھی لفظ کے باطن میں نہاں
ایسے امکان چُنے
جو بہت دیر سے ایسی ہی کسی آنکھ کے متلاشی تھے
تم نے اُن اُن بنے رنگوں میں وہ نظمیں ڈھونڈیں
جن کی خوشبو تمھیں پہچانتے ہو!
تم کو معلوم ہے کس حرف کا جوہر کیا ہے؟
کس کو پلکوں پہ بٹھانا، کسے رد کرنا ہے!
تم بھی اک اپنا ہنر جانتے ہو

ایک منظر کے جلو میں جو کئی منظر تھے
اُن کی آواز سنی، ان کی اُجالا تم نے!
دامنِ شوق سے لپٹی ہوئی تصویروں کو
صوت و آہنگ کے ارژنگ میں ڈھالا تم نے!
جتنے کردار بھی لکھے تم نے
ان کے ہر نقش سے مانوس تھیں آنکھیں یوں تو
پھر بھی وہ سب سے الگ سب سے جدا لگتے ہیں

امجدؔ جب کسی ہم عصر شاعر پر نظم لکھتے ہیں تو منظوم فن اور شخصیت پر اظہار خیال، خلوص کی حقیقت نگاری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس دور کے ممتاز اور عمدہ شاعروں میں پیرزادہ قاسم نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کی روشنی اور لطافت خیالی مشاعروں کی جان بن جاتی ہے۔ وہ ملنسار بہت ہی اچھے اخلاق کے عمدہ انسان ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع انسان ہے جو آج کے دور کے لیے مشعل راہ ہے۔ امجدؔ نے اس نظم میں پہلے وقت زمان و مکان اور راز و رموز کے راستوں کی تمہید باندھی پھر پیرزادہ سے یوں جوڑا ہے۔

تم نے سوچا ہے بہت
اپنے اشعار میں انسان کی حرمت کے لیے
تم نے لکھا ہے بہت

منتخب لوگ ہیں وہ
جن کے دل اور دماغ
ایک ہی لَے میں سفر کرتے ہیں
جو محبت کو بنا لیتے مشعلِ جاں
اور آباد نگر کرتے ہیں
جن کو توفیقِ عمل، جرأتِ اظہار ملی
تحفۂ حرف ملا، گرمیٔ افکار ملی

روشنی بانٹتے لوگوں کی تگ و تاز سے جو
ہر زمانے میں نمو پاتی ہے
اُسی تسبیح کے دانے تم ہو
مجھ کو ہے ناز کہ اس رزم گہِ ہستی میں
مرے ساتھی، مرے دمساز، پرانے تم ہو!
تم سے اس دور میں الفت کا بھرم ہے مرے دوست!
جو بھی اعزاز ملے تم کو وہ کم ہے مرے دوست!

جون ایلیا کی نظم میں ان کی شاعری کی انفرادیت، ان کی شخصیت کی خصوصیت اور ان کی ہمہ وقت فکر میں گمشدگی کی طرف امجدؔ نے خوبصورت اشارے کیے ہیں۔ چند مصرعے تسلسل داستان کے لیے۔

تھا وہ اک عجب ستارہ
کسی اور کہکشاں کا
کسی اور کہکشاں میں
وہ تلاش کر رہا تھا
کسی روشنی کی جھلمل
کسی واہمے کا سایا
وہ تھا شاعری میں زندہ
اُسے زندگی نے مارا
تھی تلاش جس کی اُس کو
اُسی آگہی نے مارا

امجدؔ کی بعض نظمیں جو اپنے ہم عصروں اور ممتاز شاعروں پر لکھی ہیں وہ ایک طرح کے شخصی مراثی معلوم ہوتے ہیں جن

میں ان کی وفات کا سوگ کے ساتھ ان کی شاعری کی خوبیاں اور ان کی شخصیت کی خوش کلامیاں جو اُن کو صدیوں زندہ رکھے گی، شامل ہیں۔ بقول ذوقؔ:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے رہے یہی دو پشت چار پشت

امجدؔ انقلابی شاعر حبیب جالبؔ کے انتقال پر کہتے ہیں:

جس آوارہ دیوانے کو جالب کہتے تھے
ہستی کی اس راہ گزر سے اب وہ جاتا ہے
اے مٹی! اے ارض وطن لے اپنی بانہیں کھول
تیری جانب لوٹ کے تیرا شاعر آتا ہے

سچ تو یہ ہے کہ وہ تند و تیز انقلابی اور باغی شاعر تھا۔

ظالم کے ہر ظلم کی رد میں نظمیں لکھنے والا
محکوموں کی آزادی کے نغمے لکھنے والا
بجھ گئی وقت کے آتش داں میں وہ باغی آواز
جس کی ہر اک تان میں لاکھوں شعلے جلتے تھے
سو گئیں مٹی اوڑھ کے اب وہ آنکھیں جن کے خواب
دنیا بھر کے مظلوموں کے غم میں پلتے تھے

اختر حسین جعفری کے مرحوم ہونے پر امجدؔ کہتے ہیں:

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
''تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں''

اختر جعفری کی شاعری کی عظمت اور اہمیت پر یوں مصرعوں میں حقائق کو پرو دیتے ہیں۔

آئینے جس کو ڈھونڈتے تھے خود
ایسا بے مثل عکس گر تھا وہ
جس نے اک روشنی کی رخصت پر
یہ ابد تاب لفظ لکھے تھے
آج وہ خود بھی بجھ گیا یارو
کتنے سپنے ہوئے ہیں بے چہرہ
اُس کو کس روشنی میں دفنائیں

اس کو کس خواب کا بدن ہم دیں

نور جہاں ملکہ ترنم کو جس نے ساٹھ برس سے زیادہ نغموں کو رنگوں میں بکھیرا امجدؔ کہتے ہیں:

وہ اک ایسا خواب تھی جس کو
دیکھنے والی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں
اس کی صدا کی جھلملتا میں
روحیں سدھ بدھ کھو جاتی تھیں
وہ گاتی تو روح کے اندر پھول سے جیسے کھل جاتے تھے
قوس قزح کے رنگ تھے جتنے اُس کے سر میں مل جاتے تھے

نصرت فتح علی خاں کی ناگہانی موت نے کلاسیک موسیقی کی ٹھوس دیوار میں رخنے ڈال دیے۔ جب یہ چراغ بجھ گیا تو اُس کی روشنی کی عظمت اور اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ وہ آواز جو دلوں کو گرماتی اور روحوں کو سلگاتی تھی اچانک خاموش ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ فلک موسیقی کی روشنی اور رعنائی اس تارے کے بجھ جانے سے ختم ہوگئی۔ اسی لیے تو امجدؔ کہتے ہیں:

ابھی جو ٹوٹ کر بکھرا
وہ ایسا ہی ستارہ تھا
ہماری نصرت و فتح و ظفر کا استعارہ تھا

امجدؔ نے اس نظم میں جو نصرت فتح علی خاں پر لکھی ہے تمہید میں کائناتی نظام جو فنا پر منظم کیا گیا ہے اس میں بتایا کہ یوں تو ہر روز کئی ستارے فنا ہوتے رہتے ہیں (جیسا کہ دنیا میں آئے دن لوگ مرتے رہتے ہیں) مگر ایک ایسا توانا پُرنور ستارہ جس سے دنیا استفادہ کر رہی تھی اچانک ٹوٹ کر بکھر گیا۔ نظم کے آخری حصے میں فن پر خوبصورت گفتگو ہے جس میں موسیقی کی اصطلاحات اور اس سے پیدا ہونے والے جذبات کی نامرئی کیفیت اور پیکر سازی بھی شامل ہے۔

اُسے نغمے سلامی پیش کرتے اور ''سرگم'' اٹھ کے ملتی تھی
اُسے وہ سُر بھی ازبر تھے جنھیں سُن کر
فرشتے وجد کرتے اور ہوائیں جھوم اٹھتی تھیں
یہ جتنے ساز ہیں
سب اس کی انگلی کے اشارے پر
ہمہ تن راگ بنتے تھے
جو روحوں میں سُلگ اٹھے
اک ایسی آگ بنتے تھے!!

اچھا شاعر ایک دردمند دل اور حساس جذبات کے ملاپ سے تصویر کشی کرتا ہے۔ وہ کسی پر بھی خنجر چلے تڑپتا ہے۔ چنانچہ جن سے اس کو الفت کا رشتہ ہوتا ہے اس کے درد کی انتہا لفظوں میں دیکھی اور سُنی جاسکتی ہے۔ اردو شعر و ادب کی معروف

منفرد لہجہ کی شاعرہ پروین شاکر کی اچانک موت نے دوستوں اور پروین کی شاعری کے پرستاروں کے دل و دماغ کو بے حس اور مفلوج کر دیا اور اس حادثے کے بعد پروین کا اکلوتا بیٹا گیتو پروین کی یادگار رہا جس پر امجدؔ نے دوستی اور ہم جلیسی کا حق ادا کر دیا۔ امجدؔ نے گیتو پر دو نظمیں لکھیں۔ ایک پروین کے انتقال کے فوری بعد ''پروین کے گیتو'' اور دوسری گیتو کی شادی پر ''پروین گیتو اور عرشین'' کے نام پر۔ یہ دونوں نظمیں دل کی آوازیں ہیں جو الفاظ کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ پہلی نظم میں امجدؔ نے اپنے خاص علائم خواب اور آنکھوں سے مضمون کی آنکھوں کو اشکبار کیا ہے۔ نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے:

ہاں مری جان، مرے چاند سے خواہر زادے
بجھ گئیں آج وہ آنکھیں کہ جہاں
ترے سپنوں کے سوا کچھ بھی نہ رکھا اس نے
کتنے خوابوں سے سرابوں سے الجھ کر گزری
تب کہیں تجھ کو ترے پیار کو پایا اس نے

آخری دو مصرعوں میں پروین کی ازدواجی مشکلات کا بین السطور ذکر ہے۔ پھر شاعر نے گیتو کو پروین کے مجموعے کلام کے مضامین سے جوڑا ہے جو مہارت اور قادر الکلامی ہے۔

تو وہ ''خوشبو'' تھا کہ جس کی خاطر
اُس نے اس باغ کی ہر چیز سے انکار کیا
دشتِ ''صد برگ'' میں وہ خود ہی رہی محوِ کلام
اپنے رنگوں سے تری راہ کو گلزار کیا

پھر نظم کے آخر میں پروین کی شاعری کی توصیف اور اُسی کے مصرع سے نیا مضمون بھی پیدا کیا ہے۔ کچھ مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں:

شاعری جس کی اثاثہ تھی جواں جذبوں کا
جس کی توصیف سبھی اہلِ ہنر کرتے ہیں
وہ تری ماں ہی نہ تھی
پورے اک عہد کا اعزاز بھی وہ
کس کو معلوم تھا خوشبو کے سفر میں جس کو
کو بکو پھیلتی اک بات شناسائی کی
دیکھتے دیکھتے مٹی میں اتر جائے گی

گیتو پر دوسری نظم جو اس کی شادی پر ہے احساسی ہے۔ یہاں شاعر نے پروین کو مخاطب کیا ہے کیوں کہ بیٹا کا سہرا دیکھنا ہر ماں کی آرزو ہوتی ہے۔

سنو پروین اِدھر دیکھو

تمھارا چاند سا گیتو اور اس کی پھول سی دُلہن
تمھیں آداب کہتے ہیں

پھر امجدؔ پروین کی نظم جو بیٹے کے سوال پر لکھی تھی اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

وہ گیتو کہ جس کے ''کیا لکھوں ممّا''
کے استفسار پر تم نے
اُسے اک نظم کا تحفہ دیا تھا اور کہا تھا
سو میرے خوش گماں بچے
''تو اپنی لوح آئندہ پہ سارے خوبصورت لفظ لکھنا
سدا سچ بولنا، احسان کرنا، پیار بھی کرنا
مگر آنکھیں کھلی رکھنا''

امجدؔ نے غزلوں میں بھی ہم عصر شاعروں کا خوبصورتی سے تذکرہ کیا ہے۔ غزل کے مقطع میں جمیل الدین عالی کو یوں خراج پیش کرتے ہیں:

دوستوں کا وہ دوست ہے امجدؔ
نام جس کا جمیل عالیؔ ہے

عمدہ نعت گو شاعر حفیظ تائب پر مضمون یوں باندھتے ہیں:

یوں تو حضور پاک ﷺ کے لاکھوں ہیں مدح خواں
تائب سی لکھ رہا ہے مگر کون نعت اور

میر تقی میرؔ کے مضمون سے یہ سوال قطعہ بند میں کرتے ہیں:

جو ہو سکے تو کبھی میرؔ جی سے یہ پوچھیں
یہ جان ان کی غزل پر نثار کرتے ہوئے
یہ کارخانہ اگر سرتا پا توہّم ہے؟
تو لوگ کیسے چلیں اعتبار کرتے ہوئے

امجدؔ نے ایک اور غزل جو ''نذر میر'' کی ہے اس کے مقطعے میں کہتے ہیں:

یہ جہاں ہے نہیں گلی اس کی
تو کہاں منہ اٹھائے جاتا ہے

ایک غزل میں میرؔ اور غالبؔ کی سرداری کو یوں پیش کرتے ہیں

کسی کو پھر نہ ملا رنگ میرؔ و غالبؔ کا
اگرچہ یوں تو ہزاروں ہی خوش بیاں گزرے

امجدؔ نے ایک چھ اشعار کی غزل غالبؔ کی نذر کی ہے جس میں غالبؔ کا ڈکشن ہے۔ غالبؔ کے پاس جو اہم علامتی لفظ آئینہ ہے، ہم یہاں امجدؔ کی غزل کا شعر نقل کرتے ہیں:

سامنے آیا ہے تو میرے رگ و پے میں اُتر
میں تو آئینہ نہیں جو صرف حیرانی کرے

''نذرِ اقبال'' کی غزل میں اقبالؔ کے مصرعے سے یوں استفادہ کیا ہے۔

ع: تغیرات پہ قائم ہے وقت کی بنیاد

اقبالؔ نے کہا تھا: ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں''

امجدؔ نے ایک غزل کے مطلع میں علی سردار جعفری کے مصرعے سے استفادہ کیا ہے:

دل مجھے دیکھے چلا جاتا ہے میں دل کی طرف
راستے بند تھے سب کوچۂ قاتل کی طرف

آخر میں ہم باوائے اردو ولیؔ دکنی کے مصرعے پر تخلیق کی گئی غزل کے اُس شعر پر گفتگو تمام کرتے ہیں جو وقت اور زمانے کو ملائے ہوئے ہے:

ایک لمحے میں ہوئے سارے زمانے روشن
''آتشِ عشق پڑی حُسن کے سامان میں آ''

امجد کا شاعر اور شاعری پر منظوم تبصرہ

شاعر اور شاعری پر ریویو

یوں تو ہر شاعر نے تعلّی کو اس لیے بھی جائز سمجھا ہے کہ اسے تلمیذ الرحمٰن کا خطاب ملا ہے اور چونکہ اپنی تعریف صرف اللہ کو ہی زیبا ہے اس لیے اللہ کے بندوں کو بھی یہ حق کم و بیش پہنچتا ہے کہ اپنے بارے میں کچھ ہنری حقائق کو بالیدگی کے ساتھ بیان کریں۔ مولانا رومؔ کا شعر شاعروں کے لیے نہیں، کیونکہ مولانا نے خود بھی اپنے اشعار کی تعریف کی ہے۔

خوش تر این باشد کہ سرِّ دلبران
گفتہ آید در زبانِ دیگران

صائبؔ تبریزی نے کہا تھا کہ دو چیزیں شعر کی قدر توڑ دیتی ہیں، ایک جاہلوں کی پکار اور دوسری سخن شناسوں کی خاموشی۔

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

امجدؔ نے اسے شاعر کا نقصان بتایا ہے۔

چاہو گے اگر دادِ ہنر بے ہنروں سے
مشہور تو ہوجاؤ گے عزّت نہ رہے گی

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

مزا کلام کا بزمِ سخن وراں میں ہے
کہ چاند اجڑے گھروں کی چھتوں پہ کیا نکلے!

اسی لیے تو ایک اور غزل کے شعر میں بے ہنروں کو رسوا کرتے ہیں۔

بے ہنر چھپ نہیں سکتے ہیں ہنرمندوں سے
جوہری ایک نظر میں ہی نگیں دیکھتے ہیں

آمد پر امجدؔ کا شعر متحرک تشبیہہ کے ذیل عمدہ ہے۔

شاعری کے موسم میں، شعر قلب شاعر پر
ہجرتی پرندوں سے دم بہ دم اترتے ہیں

اس شعر میں ہر لفظ خوبصورت طریقے سے منتخب اور عمدہ برتا گیا ہے۔ سچ ہے شعر شاعر پر اترتا ہے اور وہ بھی آمد کے موقع پر جوق در جوق۔ شاعر کہتا ہے:

مرے فن سے پھیلے جو روشنی
اُسے پھر کبھی نہ زوال دے

حرف یوں شعر میں دمکیں امجدؔ
رشک سے اہلِ زباں تک دیکھیں

سخن کی ساکھ بنتی ہے اسی سے
کہ ہیں کس بات کے معنی کہاں تک!

امجد محسوسات کا شاعر ہے اس لیے حساس ہے اور یہ احساس شاعری کے بیان اور زبان یعنی فن سے جڑا ہوا ہے۔ فن پر ان کے دو شعر دیکھیے:

یہ ہنر بھی ہے اور فن بھی ہے
بکھرے لفظوں کو شاعری نہ سمجھ

اک دن نکھرے گا سچا ہے گر فن
کیسے روک سکے خوشبو کو گلشن

سچے شاعر کو شاعری کے باغ کی دیکھ بھال اس لیے بھی کرنی پڑتی ہے کہ اُس نے چمنستان میں رنگین پھولوں کو سجانے کے لیے سیروں خون خشک کیا ہے، دن میں عرق ریزی اور راتوں کو جاگتی آنکھوں میں گزارا ہے۔

لفظوں کی دیکھ بھال سے بنتی ہے شاعری
مہکیں گے کیسے باغ اگر باغباں نہ ہو

کبھی کہتے ہیں:

شمعِ غزل کی لَو بن جائے ایسا مصرعہ ہو تو کہو
اک اک حرف میں سوچ کی خوشبو، دل کا اجالا ہو تو کہو

اگر درد اور فطری جوش کے تحت آمدی شعر ہوگا تو وہ خود شہرت کا میدان جیت لے گا جسے ہر شخص محسوس کرے گا۔ کسی نے کہا ہے:

کاغذی پھول لاکھ رنگ بھرلیں
شاملِ گل ستاں نہیں ہوتے

اسی لیے امجدؔ اور اس کی شاعری کی شہرت کا ڈنکا اردو دنیا کے کونے کونے میں بج رہا ہے۔

پھولوں کی تختی پہ جیسے رنگوں کی تحریر
لوحِ سخن پر ایسے امجدؔ شہرت رہتی ہے

شاعروں کے دفتر میں اکا دُکا شعر آمدی اور نزولِ شاعری کے مضمون پر ملتے ہیں۔ فیضؔ شاید ہمارے دور کے وہ ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے لندن میں ان کی معروف نظم ''آج بازار میں پا بہ جولاں چلو'' کی آمد اور اس کے نزول کی کیفیت کو تفصیلی طور پر بیان کیا وہ بات ریکارڈ کی گئی ہمارے درمیان موجود ہے۔ امجدؔ نے اگرچہ ایک شعر میں شعر کے نزول کی نفسیاتی جزئیات نگاری پر کہا تھا:

امجدؔ نزول شعر کے کیسے بنیں اصول
سیلاب کے لیے کوئی ہوتی ہے راہ کیا

مگر خود شاعر نے ایک ''نظم بننے لگی'' لکھ کر اس میں تخیل اور لفظ کے اتصال سے پیدا جوشیوہ بیانی اور مضمون آفرینی ہوتی ہے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ نظم کہاں جنم لیتی ہے اسے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ کہتے ہیں ذہن کے بلیک مادہ (Black Matter) (یعنی لاشعور میں نظم پیدا ہوتی ہے پھر وہ آشیاں گم کردہ پرندے کی طرح جیسے ہی تحت الشعور یا (Subconsious) حصے میں آتی ہے تو شاعر فوری اِسے تحت الشعور کی فضا میں شکار کرلیتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ کوئی خیال مجرد یعنی بغیر الفاظ کا جامہ پہنے اس فضا میں داخل نہیں ہوسکتا۔ فطری شاعر لمحوں میں ان لفظوں سے جو اس شعر کے لیے مناسب ہوں اس کو فکر میں قید کرکے ان کے بال و پر سنوار کر قرطاس کے قفس میں ہمیشہ کے لیے قید کردیتا ہے۔ امجدؔ نے نظم کے نزول پر یوں بات چھیڑی ہے۔

جب کبھی بے گماں، بات سوجھی کوئی
بے ارادہ اُسے ذہن میں رکھ لیا
پھر اچانک کسی اور ہی بات سے
آپ ہی آپ سے
بات سے بات کا یوں سرا مل گیا
حرف جُڑتے گئے، لفظ ملتے گئے
دل کے اندر کہیں رُت بدلنے لگی
دیکھتے دیکھتے، پاؤں چلنے لگی
نظم بننے لگی
ایک مصرعے کو جب راستہ مل گیا

بے سہارے کو جیسے خدا مل گیا
استعارے کئی
خود بخود آ گئے آ منے سامنے
اور کچھ دیر میں، بھیڑ سی لگ گئی
دل کی دہلیز پر
پھر اُسی ایک مصرعے کی انگلی پکڑ
اک رواں بحر میں، جانے کس لہر میں
اجنبی اک مسافر نے دستک جو دی
شہرِ امکان کے بابِ اظہار پر
ایک سے اک نیا باب کھلنے لگا
روشنی چلمنوں سے نکلنے لگی
ہم کھڑے رہ گئے، راہ چلنے لگی
نظم بننے لگی

شعر کی آمد اور پھر بے وجہ رخصت کا گِلہ ہر فطری شاعر نے کیا ہے۔ شعر جب لاشعور سے تحت الشعور میں آ کر مقید ہوجاتا ہے تو وہ شاعر سے باتیں کرنے لگتا ہے اور شاعر اُسے سنوارنے میں مگن ہوجاتا ہے۔ امجد کی ایک نسبتاً طولانی نظم ''میں اور میری شاعری'' ہے جس میں امجدؔ نے آمد سے آخر تک خوبصورت طریقے سے موضوع کی مرکزیت برقرار رکھتے ہوئے لطیف اور شیریں پیرائے میں لہجے کی گھلاوٹ اور بول کی مٹھاس کے رس سے شیریں بیانی کی ہے۔ ہم یہاں امجد کی نظم کے مصرعوں کو بغیر تشریح اور تبصرے کے جوڑ کر سلکِ شاعری کی دستاویز بناتے ہیں۔

سوچا بہت پہ راز یہ اب تک نہ کھل سکا
کیسا عجب ہے شعر کی آمد کا سلسلہ
ہوتی ہیں جیسے زور سے موسم کی بارشیں
آتے چلے ہی جاتے ہیں یوں غیب سے خیال
لہجے بدل بدل کے، نئے زاویوں کے ساتھ
کوئی دِکھا رہا ہے یہ منظر نئے نئے
بہتا چلا ہی جاتا ہوں موجِ خیال میں
پھر جیسے پھیل جاتی ہے سارے میں تیز دھوپ
اُڑتی ہے بھاپ بن کے گئی بارشوں کی یاد
خود ہی لکھے تھے لفظ جو لگتے ہیں اجنبی

یوں دیکھتے ہیں جیسے ہمیں جانتے نہیں
سوچیں ہزار ، پھر نہیں آتے یہ ہاتھ میں
کتنا لگائیں زور مگر سوجھتا نہیں
پڑتا ہے دشتِ ذہن میں کچھ اس طرح کا قحط
سعدیؔ نے بھی جو قحط نہ دیکھا دمشق میں
ان دونوں کیفیات کے بھیدوں سے آشنا
جتنے ہیں لوگ ان میں ہے میرا شمار بھی
اس ماہ رُو کی، شعر کی دیوی کہیں جسے
صحبت بھی میں نے دیکھی ہے اور انتظار بھی
اس ایک ہی نگار کے دونوں یہ روپ ہیں
صحرا میں اڑتی ریت بھی اور آبشار بھی
امجد سخن کے باب میں اتنی ہے بس دعا
خلقت بھی مجھ سے خوش رہے، پروردگار بھی

اس دلکش تحریر کے آخر میں ہم امجدؔ کی شعر گوئی کے بارے میں جو انہوں نے دیباچوں میں کہا ہے نقل کرتے ہیں۔

امجدؔ اسلام امجد سحر آثار کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔ ''گزشتہ بیس برسوں میں تقریباً ہر انٹرویو میں یہ پوچھا گیا کہ میری ڈرامہ نگاری اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے میری شاعری کی مقدار اور معیار پر کچھ منفی اثر پڑا ہے اور ہر بار اس کا میں نے یہی جواب دیا کہ شاعری تو ایک خود رو پودے کی طرح ہوتی ہے جو اپنے اظہار کے لیے سوائے اپنی قوتِ نمو کے کسی اور چیز کی محتاج نہیں ہوتی اور پہاڑی چشمے کی طرح اپنا رستہ خود بنا لیتی ہے۔ اوسطاً ایک سال میں میں بارہ سے پندرہ غزلیں اور نظمیں کہہ لیتا ہوں۔ بعض اوقات کئی کئی مہینے ایک بھی مصرعہ کے بغیر گزر جاتے ہیں۔

لیکن پھر کچھ یوں ہوتا ہے کہ دو دن سے لے کر چار پانچ دن کے دورانیے کی ایک لہر سی آتی ہے اور اوپر تلے پانچ سات چیزیں ہو جاتی ہیں۔ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے اس کا میرے پاس کوئی منطقی اور شافی جواب نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔

میں ذہنی طور پر اس صورتِ حال کو تقریباً تسلیم کر چکا تھا کہ ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا، ایک ایسا واقعہ جو میری تیس سالہ شعر گوئی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی منفرد اور انوکھا ہے۔

ہُوا یوں کہ ''بارش کی آواز'' کی اشاعت کے بعد تقریباً دس ماہ پر محیط ایک ''بنجر پن'' کا دور چل رہا تھا جس میں سوائے مرحوم استاد نصرت فتح علی خاں کی وفات پر لکھی جانے والی تعزیتی نظم کے شاعری کی ایک سطر بھی لکھی نہ جا سکی تھی کہ اکتوبر ۹۷ء کے آخری ہفتے میں لاہور سے اسلام آباد جاتے ہوئے طبیعت ایک دم رواں ہو گئی اور آئندہ چار پانچ دنوں میں تقریباً آٹھ نو چیزیں ہو گئیں۔ گزشتہ تجربے کے مطابق یہ صورتِ حال معمول کے عین مطابق تھی اور میں ذہنی طور پر اب اس ''آمد'' کے انقطاع کے لیے تیار ہو چکا تھا مگر دن پر دن گزرتے گئے اور ہر روز کاسۂ سخن میں کچھ نہ کچھ گرتا رہا اور یوں تقریباً ڈیڑھ مہینے میں ایک

پوری کتاب کا سامان مکمل ہوگیا۔ اب اگرچہ اس Spell کو ختم ہوئے تقریباً دو ماہ ہو چکے ہیں مگر اس تجربے کی خوشگوار حیرت اب بھی میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔

امجدؔ اپنی شعر گوئی کی آمد کا ذکر حمد، نعت اور سلام کے مجموعہ ''اسباب'' میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واقعہ یہ ہے کہ مجھے شعر کہتے ۴۰ برس سے زیادہ ہو چکے ہیں اور اس دوران میں معروف ادبی اصطلاح ''آمد'' کے حوالے سے مجھ پر کئی ایسے تخلیقی دور آئے ہیں جب میں نے ایک ساتھ بہت سی شاعری کی لیکن عام طور پر اس کیفیت کا دورانیہ دو سے چار پانچ دن کے درمیان ہوتا تھا اس سارے عمل میں واحد استثنا چند برس پہلے میرے آٹھویں شعری مجموعے ''سحر آثار'' کی تکمیل کے دنوں میں ہوا جب میں نے دو تین ماہ کے دوران وقفے وقفے سے پچیس تیس کے لگ بھگ نظمیں اور غزلیں کہیں لیکن تخلیقی وفور کے جس تجربے سے میں اس برس حج کے دوران گزرا ہوں اس کی کوئی مثال میرے پورے شعری سفر میں موجود نہیں کہ میں نے ۲۴ دن بغیر کسی وقفے کے ہر روز حمد یا نعت (یا دونوں) لکھیں اور صورتِ حال کچھ ایسی رہی کہ جہاں سے ایک چیز ختم ہوتی تھی وہیں سے دوسری شروع ہو جاتی تھی اور سوائے نماز پڑھنے سونے اور کھانا کھانے کے وقفوں کے کاغذ اور قلم مسلسل میرے ساتھ ساتھ رہے۔

گزشتہ ہر عمرے کے دوران میں نے کچھ حمدیہ اور نعتیہ اشعار کہے تو ضرور تھے مگر جو کچھ اور جس طرح سے کہنا چاہ رہا تھا اُس میں پوری طرح سے کامیاب نہیں ہو سکا سو جب حج کے انتظامات مکمل ہو گئے تو روانگی سے پہلے میں نے اور دعاؤں کے ساتھ یہ دعا بھی مانگی کہ اس بار مجھے حسبِ خواہش تخلیقی لمحے اور کیفیات ارزانی ہوں کہ دل کی حسرت نکل سکے۔ پتہ نہیں وہ قبولِ دعا کا کون سا لمحہ تھا کہ جدہ کی فلائٹ پر بیٹھتے ہی طبیعت کچھ ایسی رواں ہوئی کہ آئندہ چوبیس دن تک میں نے ایک ولایتی محاورے کے مطابق پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ شروع شروع میں خیال تھا مکہ مکرمہ میں تمام تر توجہ حمدیہ اشعار پر رکھی جائے اور نعت کی بات مدینہ منورہ میں گزرنے والے شب و روز پر چھوڑ دی جائے کہ شاید پروٹوکول کا یہی تقاضہ ہے لیکن بہت جلد سب ارادے اس تخلیقی وفور کی رَو میں بہہ گئے جس نے مجھے ایک ''معمول'' کی طرح بے بس کر دیا۔ میں غالب کی طرح یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میری صریرِ خامہ بھی نوائے سروش بن گئی تھی لیکن حقیقت یہی ہے کہ جو مضامین غیب سے خیال کی قلم رو میں داخل ہو رہے تھے انہوں نے مجھے سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں دی اور میں بے اختیار جو سمجھ میں آیا لکھتا چلا گیا۔ اس دوران میں مجھے یہ احساس تو ضرور رہا کہ فنی اعتبار سے کہیں کہیں توجہ کی ضرورت ہے لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے لکھے ہوئے پر نظرِ ثانی کر سکتا اور زبان و بیان یا فنی اسقام کی بہتری اور تصحیح کا کام کر سکتا ''آمد'' کی گھنگھور گھٹاؤں کی اگلی بارش شروع ہو جاتی۔ جب یہ سلسلہ رُکا اور میں نے بکھرے ہوئے اوراق کو جمع کیا تو معلوم ہوا کہ کل میزان ۴۳ حمدیہ نعتیہ اور مناجاتیہ غزلوں اور نظموں تک پہنچ چکا ہے۔

امجدؔ کا کلاسیک شعرا پر ریویو اور شعری انتخاب

امجد اسلام امجدؔ نے ''نئے پرانے'' کے عنوان سے ایک ایسا گراں قدر تحفہ اردو کے شعر و ادب کو دیا ہے جس سے عوام تو ایک طرف خواص شعر و ادب بھی زیادہ مستفید ہوتے نظر نہیں آتے۔ اردو ادب اور برصغیر کی شاعری کا ہجوم انہیں دوسری جہات سے جانتا اور مانتا ہے لیکن وہ ''نئے پرانے'' کی اہمیت اس لیے بھی نہیں پہچانتا کیونکہ امجد کی گونا گوں تخلیقی روشنی کی تیزی اور تندی میں اس کی آنکھیں ایسی چکاچوند ہوجاتی ہیں کہ وہ کسی دوسری شئے کو پوری طرح دیکھنے سے قاصر رہتا ہے۔ ہماری اس تحریر کا مقصد اسی قلزمِ بے کراں کو دکھانا ہے جہاں قطرے میں دجلہ اور اس کی پُرزور روانی کی اَن کہی کہانی اس کی بے زبانی سے بیان کرنی ہے۔

اس کتاب میں جو ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے نو کلاسیک شعرا کے اشعار کا انتخاب اور آٹھ بڑے کلاسیک شعرا پر تنقیدی تبصرہ شامل ہے۔ یہاں امجدؔ نے پرانے کلاسیک شعرا کے ان اشعار کا انتخاب کیا ہے جو اپنے عہد کے اعتبار سے نئے اور تر و تازہ تھے اور جن کی تازگی آج بھی قائم ہے۔

شعرا کے کلام میں اس التزام سے انتخاب امجد اسلام سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے تذکروں اور انتخابوں میں مشہور و معروف اشعار کے ساتھ اپنی اپنی پسند کے اشعار بھی شامل کیے گئے جس کی وجہ سے منتخبین رسوا بھی ہوئے اور انہیں کہنا پڑا۔

ع: ''شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا ہمیں'' اس کی سب سے اہم وجہ انتخاب کی محدود نظر تھی جس کے نتیجے کو آج ہم کئی تذکروں اور انتخابوں میں بھگت رہے ہیں۔

امجدؔ نے ابتدائیہ کلمات میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ ''تخلیقی شاعر کو اپنے خیالات پر اظہار سے پہلے سنسر شپ عائد نہیں کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے جو بات آج وہ معمولی اور قبل از وقت سمجھ کر کہنے سے گریز کر رہا ہے کل کو اسے پکڑائی ہی نہ دے اور یوں وہ اس بات میں موجود امکان کو محفوظ کرنے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجائے۔''

سچ تو یہ ہے کہ اسی سنسر شپ کے پتھر کے نیچے کتنے رنگین پھولوں اور خوش ذائقہ میووں کے بیج دب کر ہمیشہ کے لیے فنا فی الارض ہوگئے۔ اگرچہ تمام تخلیق کاروں کو اس زمرے میں ہم نہیں رکھ سکتے جنھوں نے اپنے عہد سے مقابلہ اور مجادلہ کیا اور شعروں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کا جواز بھی حاصل کیا۔ چنانچہ غالب دہلوی نے کہا:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

ع: گویم مشکل وگر نا گویم مشکل
ع: ورائے شاعری چیزی دگر است

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

علامہ اقبال نے خود کو ع: ''من شاعر فردا ہستم'' کہہ کر علاحدہ کرلیا۔ کبھی کہا کسی نے بھی وہ راز بیان نہیں کیا جو میں نے کہا ہے۔

ع: ہیچ کس رازی کہ من گفتم نہ گفت

کبھی یوں بھی دل کو تسلی دی کہ جو مطالب میں نے بیان کیے ہیں ان کا تعلق دوسری دنیا سے ہے میری شاعری کا نزول علاحدہ آسمان سے ہے۔

آنچہ گفتم از جہانِ دِگر است
ایں کتاب از آسمانِ دِگر است

بہرحال یہ وہ موتی ہیں جو ہر صدف میں نہیں ملتے چنانچہ ان کو شاعروں کے شعری سمندروں میں غوطہ زن ہوکر جمع کرنا اور پھر ان موتیوں کو ایک خاص رشتے میں پروکر شعری تسبیح بنانا آسان کام نہ تھا لیکن امجد کے لیے دشوار بھی اس لیے نہیں تھا کہ بقول ایلیٹ To Judge a poet is the faculty of a poet. ایک شاعر دوسرے شاعر کو آسانی کے ساتھ سمجھ اور پرکھ سکتا ہے۔

یہ جو مشہور ہے کہ "World is not fair" دنیا میں انصاف نہیں! یقیناً شعری دنیا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ہر انگور کے دانے سے شراب نہیں بنتی اور ہر قطرہ باراں سے موتی پیدا نہیں ہوتا اور جب شراب اور موتی بنتے ہیں تو بڑے مراحل اور کشمکش سے یہ منازل طے ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو شاعر کا سیروں لہو جل جاتا ہے تب ایک آبدار شعر برآمد ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

مقامِ بَست و شکست و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیساں و آتشِ عنبی

امجدؔ نے صحیح کہا ہے کہ ''پہاڑوں کی کوکھ سے ابلنے والا ہر قطرہ دریا کا دھارا نہیں بنتا بالکل اسی طرح ہر تجربہ اور جدت بھی شعری روایت کا حصہ نہیں بنتے۔ ایک عمدہ اور نادر بات جو امجدؔ نے دیباچہ میں چھیڑی ہے وہ صحیح ہے جو لسانی تجربات اور تشکیلات پر مشتمل ہے۔ شاعروں کی الفاظ پر حکومت ہے، بڑا شاعر الفاظ پر وہی حاکمیت رکھتا ہے جو خالق مخلوق پر۔ الفاظ بھی جاندار ہیں اسی لیے وقت کے ساتھ بے جان ہوجاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی عظمت نمایاں اور بعض موقعوں پر مخفی رہتی ہے۔

بعض آگ لینے جاتے ہیں اور جل کر خاکستر ہوجاتے ہیں اور بعض پیغمبری لے کر پلٹتے ہیں۔

امجدؔ نے لفظ ''خودی'' کی مثال دے کر بتایا ہے کہ وہ لفظ جو لغت کے صفحہ پر صدیوں مخفی تھا کس طرح ایک شاعر کے امکانات اور تخلیقی تجربات سے ہمہ گیر فلسفہ کا مرکز بن کر ظاہر ہوا۔ یہ لفظ خود (اپنے ساتھ) اپنی نئی تفسیری اور تشریحی دنیا ساتھ لایا۔

''نئے پرانے'' میں جن شعرا پر ریویو اور ان کا شعری انتخاب کیا گیا ان میں میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، مرزا سوداؔ، نظیرؔ اکبرآبادی، مصحفیؔ، آتشؔ، غالبؔ اور اقبالؔ شامل ہیں۔ جن شعرا کا صرف کلام منتخب کیا گیا ان میں ولیؔ دکنی، قائمؔ چاند پوری، انشاؔ، جرأتؔ، مومنؔ، ذوقؔ، شیفتہؔ، حالیؔ اور داغؔ کے نام نظر آتے ہیں۔

اس انتخاب کی رونق میں اضافہ ہوتا اگر اردو کے چار بڑے عظیم شاعروں یعنی میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ میں انیسؔ کو فراموش نہیں کیا جاتا۔ راقم نے صرف انیسؔ کے سلاموں سے منتخب اشعار کا تجزیہ کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مرثیوں اور رباعیوں کو چھوڑ کر صرف انیسؔ سلام ہی کہتے تو بھی ان میں موجود اخلاقی اور ادبی اشعار انہیں اردو کے عظیم شعرا کی صف میں کھڑا کر دیتے۔

امجد نے کتاب کا نام ''نئے پرانے'' اس لیے رکھا ہے کہ اس میں پرانے شاعروں کے نئے خیالات ہیں یعنی نئے زمانے میں اور آیندہ بھی ان میں جدیدیت اور نیاپن رہے گا جیسا کہ خود کتاب کے ابتدائیہ میں انہوں نے کہا ہے کہ ''کلاسیکی شاعروں کے یہاں کون سے ایسے اشعار ہیں جو ان کے عہد میں نئے تھے۔'' اسی معیار کا دوسرا زینہ یہ تھا کہ ان میں سے کتنے اشعار ہیں جو آج بھی نئے اور تازہ دکھائی دیتے ہیں۔

اس کتاب میں آٹھ کلاسیک شعرا پر ریویو شامل ہے اور ہر شاعر کے منتخب اشعار بھی لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اور نو (۹) کلاسیک شعرا کے صرف عمدہ اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ہماری نظر میں یہ انتخاب اتنا وسیع اور عمدہ ہے کہ یہ بذات خود ایک علاحدہ کتاب بن سکتا ہے۔ ہم یہاں صرف چند شعروں پر اکتفا کریں گے اور قارئین کو دعوت دیں گے کہ اس گلشن کی سیر تو دل سیر اس وقت ہوگی جب ''نئے پرانے'' کا مکمل مطالعہ کیا جاسکے۔ یہاں یہ بھی تذکرہ لازم ہے کہ یہ انتخاب در انتخاب ہے اور ہر ایک کی پسند مختلف بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم یہاں ہر ایک شاعر کے کچھ نمونے کے شعروں کو ان کے ریویو یا ان کے نام کے ساتھ سجاتے ہیں۔

میر تقی میرؔ

اردو کے خدائے سخن میر تقی میرؔ کی شخصیت اور فن پر تین چار صفحات میں گفتگو کی گئی ہے۔ میرؔ جس زمانے میں زندگی بسر کر رہے تھے اسے ایک شعر اور ان کی شخصیت کو ایک مرکب جملے میں بند کیا ہے۔

''میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

میرؔ کا پرابلم یہ ہے کہ اس کی دستار ہمیشہ خطرے میں رہی ہے۔ جب تک جیتا رہا، مختلف دکان داروں اور دست

کاروں کے لڑکوں اور مغل بچوں کے عشق میں خوار و زبوں رہا۔ اس کی سید زادگی، ہم جنس پرستی، انا، شکست خوردی اور عشق بازی کی معجون مرکب، ایک تباہ ہوتے ہوئے ملک اور بکھرتے ہوئے معاشرے کے آشوب میں کھرل ہوتی رہی اور اس کے قلم سے اس کی شخصیت کا یہ تضاد وہ حیرت انگیز پھول کھلاتا رہا جس کی وجہ سے اس کے کلام میں جگہ جگہ ایسی بلندی، ایسی پستی کا سماں نظر آتا ہے یہ وہ تضاد ہے جس کا احساس خود میر کو بھی تھا۔"

امجد نے میر شناسی میں ان تین چار صفحات میں وہ جادو بیانی کی ہے کہ اکثر ادیب ساری کتاب میں بیان نہیں کر پاتے۔ چند اہم نکات یہ ہیں۔

ا۔ میر کو نقصان اپنے نقادوں سے نہیں بلکہ مداحین اور شارحین سے پہنچا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان کے یہاں بہتر نشتر ڈھونڈتے ہیں اور انتخاب کرتے وقت چُن چُن کر اچھے اشعار خارج کر دیتے ہیں میر ان کے نزدیک ایک انتہائی قنوطی دردمند اور محروم شخص ہے جس کی ساری عمر روتے رُلاتے گزری ہے اور جس کا دیوان، دیوان کم اور عزا خانہ زیادہ ہے۔

ب۔ میر ہر دور میں اردو کے اہم ترین شعرا میں شامل رہا۔ اس کا فطری تخلیقی جوہر غیر معمولی تھا۔ میر نے زندگی بھر اپنی چھاتی کے گھاؤ اور اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔

ج۔ میر ایک ناکام عاشق، کچا پکا صوفی اور تلاش معاش میں سرگرداں ایک دل زدہ اور سراسیمہ شخص نہیں تھا۔ اس نے زندگی کی تلخیوں، پستیوں اور انقلابات کو آنکھیں کھول کر اور اپنے پورے وجود کی شمولیت سے دیکھا اور چکھا تھا۔

د۔ میر کے بدن میں انتہائی دردمند دل، حقیقت آشنا آنکھیں اور لاجواب تخلیقی ذہن تھا۔ جو مروجہ علوم اور شعری اسالیب پر مکمل دسترس رکھتا تھا جن میں اس کے عصری شعری رجحانات تشکیل پا رہے تھے۔

ھ۔ اردو کی کلاسیکی شاعری میں میر کی حیثیت پرکار کے مرکزی نقطے جیسی ہے اور اس کے کھینچے ہوئے دائرے کے محیط میں ایک پورا دور سانس لے رہا ہے۔ ان کے پاس حسن و عشق، حیات و کائنات، تصوف اور خمریات کے موضوعات ہیں۔

(i) حسن و عشق کے ضمن میں وہ ایک ناکام عاشق ضرور ہے لیکن اس کے عشق میں مکر نہیں۔

(ii) حیات و کائنات کے بارے میں فلسفہ سے زیادہ حیرت زدگی ہے۔

(iii) ان کے تصوف میں بہت سے رنگ ملیں گے۔ تصوف صوفیانہ نہیں۔ وہ درویش فقیر یا مجذوب بھی نہیں بلکہ وہ ان سب کا مجموعہ ہے۔

(iv) خمریات پر فارسی مضامین کی چھاپ ہے۔

(v) میر کے پاس استعارے، تشبیہ، تلمیح کے ساتھ ساتھ تمثال اور تلازمے کا بھی غیر معمولی استعمال ہے۔

(vi) میر کے پاس دوسری زبانوں اور بولیوں کے الفاظ آزادی کے ساتھ مستعمل نظر آتے ہیں۔

(viii) میر کی خود اعتمادی خود سند ہے اس لیے اسے فارسی کی سند کی ضرورت نہیں۔

امجد نے محمد حسین آزاد کی میر کے بارے میں داستان آرائی کی منطقی مخالفت کی ہے جو ان کے کلام سے پیدا ہے۔ وہ قاری کو میر کے شعری قلزم بیکراں میں اترنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہاں میر کے منتخب اشعار کے نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

247

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

سبزہ نورُستہ رہگزر کا ہوں
سر اٹھایا کہ ہوگیا پامال

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

وقفۂ مرگ اب ضروری ہے
عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

چار دیواریٔ عناصر میرؔ
خوب جاگہ ہے پر ہے بے بنیاد

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

سر کسو سے فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

حقیقت نہ میرؔ اپنی سمجھی گئی
شب و روز ہم نے تامل کیا

سبھوں سے آرسی کے مثل وا ہو
کسو کے منہ پہ دروازہ نہ کر بند

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

خواجہ میر دردؔ

امجد نے خواجہ میر دردؔ پر تین درجن صفحات میں خوبصورت ریویو اور اشعار کا انتخاب کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے جو نکات اور مطالب پر روشنی ڈالی ہے اس کو دردؔ کے اشعار سے معتبر کیا ہے۔ امجد کا اردو کی تصوفی شاعری اور تصوف کے شعرا پر کتنا صحیح محاسبہ ہے۔

''یہ امر واقعہ ہے کہ بابا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، سلطان باہو، خواجہ غلام فرید، شاہ عبداللطیف بھٹائی، رحمان بابا، سچل سرمست اور میاں محمد جیسے نامور شاعروں کے مقابلے میں اردو ادب کے پاس لے دے کر ایک ہی بڑا نام ہے اور وہ ہے خواجہ میر دردؔ۔ یوں تو مظہر جانِ جاناں سے لے کر اصغر گونڈوی تک بہت سے شعرا اس میدان میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ لیکن اصلی اور وڈا صوفی دردؔ ہی ٹھہرتا ہے۔ دردؔ کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ صرف صوفیانہ مسلک ہی کا حامل نہیں تھا بلکہ باقاعدہ طور پر ایک صوفیانہ فرقے کا نمایندہ رہنما اور خانقاہ کا سجادہ نشین تھا اور اس اعتبار سے آپ اسے ایک Practising Sufi بھی کہہ سکتے ہیں۔ عقیدے کے اعتبار سے وہ وحدت الوجودی تھا۔''

دردؔ کی شاعری میں میرؔ اور سوداؔ کی طرح تمثال کاری کے اعلیٰ اور نادر نمونے ملتے ہیں۔ دردؔ کی تمثالوں میں تجرید اور تجسّم کو ملانے کا رجحان بھی نظر آتا ہے جو آگے چل کر غالبؔ کی شاعری میں ہمیں ایک جزو اعظم کے طور پر ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔

دردؔ فلسفی نہیں تھا لیکن اس کی غزل میں کہیں کہیں فلسفیانہ اندازِ فکر کا حیرت انگیز حد تک انوکھا اور پُراثر اظہار ملتا ہے۔ حیات و کائنات کے مختلف مسائل پر اس کے بعض اشعار سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دردؔ کا ایک اور کمال اس کی غزلوں کے مطلعے ہیں۔ ایسے عمدہ مطلعے اتنی وافر مقدار میں درد سے پہلے تو کیا اس کے بعد کی غزل میں بھی بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ دردؔ کی غزل میں ایک طرح کی صفائی، شستگی اور فرحت کا سا احساس ہوتا ہے۔

امجدؔ دردؔ کی تصوفی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں۔

''دردؔ کی شاعری کا صوفیانہ پہلو آزاد خیالی اور حیات و کائنات کے بارے میں روحانیات اور فلسفے سے مزین افکار میں تو نمایاں ہوتا ہے لیکن اس کا صوفیانہ تجربہ آگے چلتا نظر نہیں آتا اور اس حوالے سے اصغر گونڈوی کو دردؔ کے سلسلے کا شاعر قرار دینا صحیح ہوتے ہوئے بھی ''بالکل صحیح'' نہیں ہے۔ دردؔ کے یہاں عبودیت کی جو سرشاری ہے اس کا سلسلہ اگر کسی سے ملتا ہے تو وہ شمالی ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کے شاعر ہیں۔ مَیں صوفیا کے مختلف سلسلوں کی اندرونی سیاست سے زیادہ واقف نہیں ہوں لہٰذا اس بحث میں پڑے بغیر کہ دردؔ کے مذہبی اعتقادات کیا تھے، اس کے چند ایسے صوفیانہ اشعار پیش کرتا ہوں جن کی بازگشت

بعض بدلی ہوئی شکلوں میں ہمیں جدید تر غزل میں بھی سنائی دیتی ہے:

آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موجزن تمام یہ دریا حباب میں''

دردؔ کے کچھ منتخب اشعار یہ ہیں:

جیدھر گزرے، پھرے اُدھر سے
آوازۂ کوہسار ہیں ہم

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

زمانے نے اے دردؔ جُوں گرد باد
دکھائی بلندی و پستی مجھے

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تُو کہاں مجھے

اَرض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

یہ تحقیق ہے یا کہ افواہ ہے
کہ دل کی تئیں دل سے یاں راہ ہے

کبھو رونا کبھو ہنسنا کبھی حیران ہو رہنا
محبت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے

250

غم ناکیٔ بیہودہ رونے کو ڈبوتی ہے
گر اشک بجا ٹپکے آنسو نہیں موتی ہے

دونوں جگہ میں معنیٔ مولا ہے جلوہ گر
غافل ایاز کون ہے محمود کون ہے

اک عمر گزر گئی سمجھتے
معلوم کیا نہ میں نے کیا ہوں

مرزا رفیع سوداؔ

امجدؔ کا ریویو سوداؔ پر بالکل الگ نوعیت کا ہے۔ ہمارے ناقدین نے سوداؔ کا صرف ایک رخ پیش کیا جبکہ امجدؔ نے سودا کی شش جہاتی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ اگر ناقدین نے میرؔ سے تقابل اور قصیدہ اور ہجو پر زور دیا تو امجدؔ نے سوداؔ کی پنہاں قوتوں کو عیاں کیا اور تقریباً بیس صفحات میں مطالب کو ان کے انتخابی اشعار سے مزین کیا۔ ذیل میں مزید کسی تشریح اور تفسیر کے امجدؔ کے تنقیدی نکات کو پیش کرتے ہیں جن سے سوداؔ کی شخصیت اور فن سے آگاہی ہوتی ہے۔

''سوداؔ ہماری کلاسیکی شاعری کا ''پرابلم چائلڈ'' ہے۔'' عام طور پر ''سکّہ بند'' ناقدین میرؔ اور سوداؔ کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے انہیں دو مختلف اور متضاد رویوں کے شاعر قرار دیتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری کو ''آہ'' اور سوداؔ کی شاعری کو ''واہ'' کہنے سے جملے میں قافیے کا حسن تو پیدا ہو جاتا ہے لیکن نہ تو اس سے مسئلہ حل ہوتا ہے اور نہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ کوئی اور صاحب انہیں داخلیت اور خارجیت کی ''مدھانی میں رڑ کتے'' ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ وہ اردو کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ہے۔ چلیے مان لیا لیکن اگر اس بنیاد پر ہم اسے ایک دنیادار، خوشامدی، کم ظرف، مطلبی اور آرام طلب شخص قرار دے دیں تو پھر میرؔ اور غالبؔ کے قصیدوں اور مدحیہ نظموں کو کہاں چھپائیں گے۔ آج دنیا کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں میں سے بہت سے حکومت یا حکومتی اداروں سے متعلق نہیں ہیں؟ تو کیا ہم ماضی کے شعرا کو محض اس لیے رجعت پرست قرار دے دیں کہ وہ درباروں سے منسلک تھے؟ اس طرح کا فیصلہ دیتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ شاعر کی تخلیقی شخصیت کے علاوہ اس کی ایک اور شخصیت بھی ہوتی ہے اور اس شخصیت کو زندہ رہنے کے لیے وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو اس کے اردگرد فضا میں اس کی دسترس میں ہے۔

اب میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں بھی کوئی قافیے دار جملے لکھوں۔ مثلاً یہ کہ میرؔ اگر رنگ کا شاعر ہے تو سوداؔ نیرنگ کا یا میرؔ ٹھہراؤ ہے تو سوداؔ بہاؤ یا یہ کہ میرؔ ذات میں کائنات دیکھتا ہے تو سوداؔ کائنات میں ذات لیکن میں قافیہ بازی کی اس خواہش کو رد کرتا ہوں کیونکہ ہم عصر شاعروں اور باکسروں میں فرق ہوتا ہے۔ تنقید کے رنگ (Ring) میں شاعر کو اتاریں گے تو دو دو مکّوں میں

دونوں ہی ٹیکنیکل ناک آؤٹ ہوجائیں گے اور رنگ میں صرف ریفری رہ جائے گا۔ ریفری جسے تقابلی مطالعے کا شوق ہے اور اس شوق کے چکر میں وہ سانپ کو کبھی ممولے سے اور کبھی نیولے سے لڑاتا رہتا ہے۔

میرے نزدیک سوداؔ کی شاعری کا بنیادی جوہر اس کے خیال اور اظہار کے درمیان پھیلی ہوئی حواس خمسہ کی وہ خوب صورت تمثیل ہے جس میں طرح طرح کے رنگ پھوٹتے، مہکتے اور جگمگاتے ہیں۔ سوداؔ کی تمثالیں(Images)اپنی خوبصورتی، گہرائی، معنویت اور پہلو داری کے باوجود عام انسانی تجربے سے حیرت ناک حد تک قریب رہتی ہیں اور شاید اس کے محسوسات کا یہی ''اپنا پن'' ہے جس نے اسے شعری روایت کا ایک انتہائی جاندار اور فعال حصہ بنا دیا ہے۔

مجھے سوداؔ کی شخصیت ہمیشہ فطرت سے قریب تر محسوس ہوتی ہے۔ اسے غصہ آتا ہے تو وہ ہجو لکھتا ہے۔ عشق کرتا ہے تو غزل کہتا ہے۔ اردگرد دیکھتا ہے تو شہر آشوب لکھتا ہے۔ زندہ رہنے کی سوچتا ہے تو قصیدہ نگاری کرتا ہے اور جب کوئی دشمن مرجائے تو اسے ایک باوضع اور شریف آدمی کی طرح معاف بھی کر دیتا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں یہ ساری خصوصیات ایک نارمل انسان کی ہیں لیکن سوداؔ کا نارمل ہونا ہی اس کا اصل پرابلم ہے کیونکہ ہماری شعری روایت میں نارمل کے بجائے آئیڈیل کا غلبہ رہا ہے۔''

امجد کی گفتگو کے بعد اب ہم یہاں مشتی از خروارے سوداؔ کے وہ منتخب اشعار لکھیں گے جو نئی طرز اور کشش کے حامل ہیں۔

عبث تو گھر بناتا ہے مری آنکھوں میں اے پیارے
کسی نے آج تک دیکھا نہیں پانی پہ گھر ٹھہرا

لاتا ہے بلندی سے شکم سب کو بہ پستی
طائر کو بھی ہوتے نہ سنا سیر ہوا پر

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ضعف و ناطاقتی و سستی و اعضا شکنی
ایک گھٹنے میں جوانی کے بڑھا کیا کیا کچھ

حالِ مردمِ ماضی و حال و مستقبل
سنا تو ایک سی کچھ داستان ہے سب کی

توڑ کر نخلِ محبت سے جو پھر باندھیے دل
یوں ہے جوں شاخ سے باندھا ہو ثمر رشتے سے

نظیر اکبر آبادی

امجدؔ نے نظیر کو اپنے انتخاب میں جگہ دے کر شعر و ادب سے نہ صرف انصاف کیا ہے بلکہ شعر و ادب کے پرستاروں پر احسان کیا ہے کہ یہ ریویو تمام اردو کے سچے چاہنے والوں کی جانب سے واجب کفائی ثابت ہوا۔ نظیرؔ پر گفتگو کرنا اس لیے بھی بہت مشکل ہے کہ وہ بہت سادہ اور آسان شاعر ہے جس کی رگوں میں شاعری زندگی بن کر دوڑتی ہے چنانچہ جتنے رنگ زندگی کے ہو سکتے ہیں اتنے ہی آہنگ ڈھنگ اور رنگ نظیرؔ کی شاعری کے بھی ہیں۔ ہم صرف اس بات کی تاکید کر رہے ہیں کہ امجدؔ کے جملوں کو سرسری نہ لیجیے بلکہ ہر لفظ پر رُک کر غور و خوض سے مطلب ڈھونڈیے، کیونکہ امجدؔ اگرچہ فطری شاعری کے سکّے ''لفظ'' کو برتنے کا ماہر ہے بلکہ وہ معمولی الفاظ کے کاندھوں پر آسمانوں کا بوجھ ڈالنے کا ہنر بھی جانتا ہے۔ آیئے دیکھیں امجد کیا کہتا ہے۔

''نظیر اکبر آبادی ایک اعتبار سے اردو شاعری کا محمد تغلق ہے کہ دونوں کی باتیں اور کارنامے بہت دنوں بعد دنیا والوں کی سمجھ میں آئے۔ محمد تغلق کے چلائے ہوئے کاغذی نوٹ آج کی دنیا میں خدا کے بعد اور بعض صورتوں میں اس سے بھی پہلے سب سے بڑی حقیقت ہیں جب کہ خود بادشاہ موصوف کو ان کے اجرا پر شرمندہ ہونا پڑا۔ نظیر اکبر آبادی کے ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ شرمندگی کا موقع کبھی نہیں آیا نہ اس کی زندگی میں، نہ بعد میں اور نہ اب لیکن یہ بات یقیناً غور طلب ہے کہ ہمارے ادب اور استادانِ ادب نے کم و بیش ڈیڑھ دو سو سال تک اتنے بڑے شاعر سے چشم پوشی کیسے کر لی؟ عام طور پر اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جاگیرداری نظام کے وضع کردہ اخلاقی اور ادبی معیارات سے انحراف اور بعض صورتوں میں بغاوت کی وجہ سے یہ صورتِ حال پیدا ہوئی اور اس کا خاتمہ ہندوستان کی سیاسی بیداری اور ترقی پسند تحریک کے آغاز کی وجہ سے ہوا۔ بلاشبہ یہ ایک انتہائی معقول تجزیہ ہے لیکن یہ ''پورا سچ'' نہیں ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ نظیرؔ کے یہاں فکر کی گہرائی، ہنسی مذاق، ٹھٹھے، طنز اور جنسی استعاروں اور کیفیات کے حوالے سے رونما ہوئی تھی اور یہ سب باتیں ہمارے کلاسیکی ادب میں غیر سنجیدہ یا سطحی بیان کے ذیل میں آئی تھیں اور ذریعے کے بجائے مقصود بالذات سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ دیکھنے والوں نے اسے دیکھا ضرور لیکن کسی نے اس کی تہہ تک جانے یا اسے سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ایک ایسا جوگی اور درویش تھا جو بازار کی بھیڑ بھاڑ میں ایک والہانہ گیت گاتا گزر گیا۔ لوگوں نے گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں سے سر نکال نکال کر اُسے دیکھا لیکن اس کے حلیے اور عجیب و غریب باجے کو دیکھ کر پھر بازار کی روشنیوں میں محو ہو گئے۔ نظیرؔ نے اپنی موت کے بعد ایک نیا جنم لیا۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ نظیرؔ کی از سرِ نو دریافت کا عمل بڑھتا گیا لیکن یہاں آ کر پھر گڑبڑ ہو گئی۔ نظیرؔ کے عہد نے یہ غلطی کی کہ اسے ایک رمتا جوگی سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور ترقی پسندوں سے یہ بھول ہوئی کہ وہ اسے ایک باقاعدہ مارکسی فلسفی ثابت کرنے پر تل گئے۔ نظیرؔ فلسفی ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایک حساس، دانشمند اور زندہ دل آدمی تھا۔ آزاد منش زندگی بسر کرنے والا تھا۔ نظیرؔ اردو کے تمام کلاسیکی شعرا سے مختلف ہے۔ اُس کی نظم اس کے زمانے میں ایک اجنبی اور نامانوس صنفِ شعر تھی لیکن غزل میں ہم عصر روایت کا اثر نمایاں تھا۔ میرے خیال میں اس کی غزل کو جو چیز انفرادیت عطا کرتی ہے وہ اس کی شعری لسانیات ہے۔ اردو غزل میں یگانہؔ اور انشاؔ کے علاوہ کسی اور شاعر نے غزل کی زبان کے ساتھ وہ جارحیت نہیں برتی جو نظیر نے روا رکھی تھی۔ نظیرؔ شاعری کے لیے کسی مخصوص زبان، ذخیرۂ الفاظ یا اسلوب کی پروا نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک ہر لفظ شاعری کا لفظ ہے بشرطیکہ اس سے شعری خیال کو مدد اور توانائی حاصل ہو۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

نظیرؔ کا سب سے بڑا کمال ہے یہ ہے کہ وہ Artistic Detachment یعنی فن کارانہ علاحدگی کی عظیم صلاحیت سے مالا

مال ہے۔ وہ اپنی ذات اور اجتماع کے درمیان حائل تمام فاصلوں کو ایک ہی جست میں طے کر جاتا ہے۔ اس کے یہاں صیغہ واحد متکلم میں آپ اس کے سارے عہد کو دھڑکتا ہوا سُن سکتے ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جو بہت ہی کم فن کاروں کے حصہ میں آئی ہے۔ نظیر کے یہاں معاملات کی فہم تو ہے ہی لیکن وہ ان پر گفتگو عالمانہ تبادلۂ خیالات کے انداز میں نہیں کرتا۔ وہ عوام سے عوام کی گفتگو کرتا ہے۔ اس کی باتوں میں ایک دل کو کھینچنے والی کشش ہے جس میں سادگی بھی ہے، جذبہ بھی اور خلوص بھی! نظیر اور اس کے عظیم ہم عصروں مثلاً میر، سودا اور درد میں یہی فرق ہے کہ نظیر کے یہاں تہذیب ذات اور اظہار ذات کے پیمانے بدل گئے ہیں۔

نظیر کے لہجے کی بازگشت یوں تو اس کے بعد آنے والے بہت سے شعرا میں نظر آتی ہے لیکن شاعری اور زندگی کے بارے میں اس کے رویے کی باقاعدہ تقلید کسی سے نہیں ہو پائی۔ آتش، یگانہ، میراجی اور اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے شباب کے دور کی شاعری میں اس کی مختلف خصوصیات جلوہ گر نظر آتی ہیں لیکن یہ سب اس کے بہت دھندلے دھندلے عکس ہیں۔

ایک اور یاد رکھنے والی بات یہ بھی ہے کہ میر تقی میر سے داغ دہلوی تک شاعری کا مرکز دہلی اور لکھنؤ رہے ہیں اور تقریباً تمام قابلِ ذکر شاعر انہی دو علاقوں میں مقیم رہے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی واحد مثال ہے جس نے ساری زندگی آگرے میں گزار دی اور ہم عصر شعری روایت کے مراکز سے دور رہ کر اپنا علم بلند تر رکھا۔

کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نظیر صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی علاقائی زبانوں کے درویش اور صوفی شاعروں کے قبیلے سے تھا۔ کبھی اسے شاہ حسین، باہو، بلھے شاہ، خواجہ فرید اور وارث شاہ یا بھگت کبیر، تلسی داس اور میرابائی کے ساتھ ملا کر پڑھیے۔ ہوسکتا ہے آپ میرے اس احساس کی تائید کریں۔

منتخب اشعار

یوں تو ہم کچھ نہ تھے پر مثلِ انار و مہتاب
جب ہمیں آگ لگائی تو تماشا نکلا

بحرِ ہستی میں صحبتِ احباب
یوں ہے جیسے بروئے آب، حباب

عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے
مثلِ تحریرِ موج نقش برآب

بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا
صد شکر کہ ہے کاتبِ تقدیر کوئی اور
پڑی ہے خاک گورستاں میں کیا کیا قدِ موزوں پر
اُگی ہے گھاس کس کس گل بدن کے روئے گل گوں پر

دیکھا جو خوب غور سے ہم نے تو یاں نظیرؔ
بازارِ مصطفیٰ ﷺ ہے خریدار ہے خدا

ایام شباب اپنے بھی کیا عیش اثر تھے
کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اُس وقت ہنر تھے

چراغ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ
یہ بزم تم کو مبارک ہو ہم تو چلتے ہیں

مصحفیؔ امروہوی

یہ سچ ہے مصحفیؔ امروہوی اردو کے عمدہ شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ دلّی اور لکھنؤ کے کلچر کی ملی جلی، چلتی پھرتی تصویر تھا۔ اگرچہ انشاء اللہ خاں انشاؔ ایک بانکی طبیعت کے مالک شاعر تھے لیکن ان کا شعری، ادبی اور فنی مرتبہ مصحفیؔ سے بڑھا ہوا تھا جس کا اقرار تقریباً ہر تذکرہ اور تنقید نگار نے کیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اردو شعر و ادب کے مداریوں نے اپنی تمام طاقت ان دونوں بڑے شاعروں کی معرکہ گیری میں صرف کر کے بندر کا تماشا کر دیا جس کی وجہ سے انشاؔ پر تو خیر کچھ اور ادبی کام دھام ہوا لیکن مصحفیؔ صرف کچھ اشعار اور اپنے تذکرہ ہندی تک محدود رہ گئے۔ امجد اسلام امجدؔ نے ''نئے پرانے'' میں مصحفیؔ کی ادبی تلاش کر کے تحقیق اور تنقید مصحفیؔ کا دروازہ کھولا ہے۔ امجد کے اس بسیط مضمون اور مصحفیؔ کے اشعار کو غنیمت جانیے ورنہ ہمارے پاس کچھ مصحفیؔ پر چیدہ چیدہ مضامین میں دہرائی ہوئی باتوں اور تذکرہ ہندی کے چند نکات اور انشاء سے معرکہ گیری اور اوباش شاگردوں کی دہشت گری کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ صرف چند مضامین جس میں فراقؔ کا مضمون جن کی خود شاعری مصحفیؔ سے متاثر تھی قابلِ دید ہے۔

امجدؔ لکھتے ہیں:

> ''فراقؔ کے ''اندازے'' والے مضمون سے قطع نظر کسی اور نقاد نے اس کی شاعری کی گہرائی اور وسعت کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو کلاسیکی روایت کے بارے میں ہمارے نقادوں کا یہ عمومی رویہ ہے لیکن ایک اور وجہ خود مصحفیؔ اور اس کی شاعری ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا بیشتر کلام شاگردوں اور تلامذہ کی نذر ہو گیا کیونکہ اسے پیٹ پالنے کے لیے اپنی شاعری کی کلیرنس سیل (Clerance Sale) لگانی پڑی۔ اس کے باوجود جو کچھ بچا ہے وہ بھی مقدار میں میرؔ کے دیوان سے زیادہ ہے۔''

یہ سچ ہے مصحفیؔ کا کلام آٹھ دیوانوں میں جمع ہے۔ ذیل میں ہم امجد اسلام کے ریویو سے نکات پیش کرتے ہیں جو مصحفیؔ فہمی میں مددگار ثابت ہوں گے۔

ف ا: مصحفیؔ کا کمال یہ ہے کہ اُس نے دلی سکول کے شاعروں سے جو کچھ ورثے میں حاصل کیا اُسے لکھنؤ کے مزاج سے اس طرح مربوط کیا ہے کہ دونوں دبستانوں کے اچھے پہلو یکجا ہو گئے ہیں۔ دلی والوں کی عینیت پسندی، دل گرفتگی اور

خوش سلیقگی اور لکھنؤ کی مادیت پسندی، مال پرستی اور تکلفات آپس میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ شعری خیالات عام لوگوں کے احساسات اور تجربوں سے قریب تر آ گئے ہیں۔''

ف ۲: مصحفی کے اظہارِ غم میں تلخی کے ساتھ ساتھ صبر اور کم ہمتی کو بھی خاصا دخل ہے۔ اس کے غم میں نہ تو میر کی سی گہرائی ہے اور نہ دل گدازی، بس ایک ہلکی سی کسک اور غمگین سا تبسم ہے۔ اس کے غم میں Concentrate کرنے کی فضا نہیں ہے۔ یہ مطالعہ بڑا دلچسپ ہے کہ مصحفی کو کبھی میر، سودا اور درد کے پائے کا شاعر نہیں سمجھا گیا لیکن آج کے مقبول شعرا فراق، فیض، اور فراز پر سب سے زیادہ اثر مصحفی ہی کا ہے۔

ف ۳: مصحفی کے کلام کے ایک پہلو کی طرف فراق صاحب نے خصوصیت سے اشارہ کیا ہے۔ وہ اس کے یہاں تمثیل کاری (Imagery) کا حیرت ناک حد تک دلکش استعمال ہے۔ مصحفی کے یہاں انسانی حواس خمسہ میں سے قوت باصرہ پر بہت زیادہ زور ملتا ہے۔

ف ۴: مصحفی کے یہاں متحرک تصاویر بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ ان تصویروں میں مختلف کردار نہ صرف حرکت میں نظر آتے ہیں بلکہ ان کی حرکات ایسے مناظر سے پیدا ہوتی ہے جو خود بھی تصویر میں موجود ہوتے ہیں۔

ف ۵: ہندوستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلیاں ذرائع ابلاغ کی کمی کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے بہت مبہم اور غیر واضح تھیں خصوصاً انگریز کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ سے ملحقہ امکانی خطرات تو بہت ہی کم لوگوں کی نظر میں تھے۔ مصحفی کے یہاں اس امنڈتے ہوئے طوفان کی دھمک کے ساتھ ساتھ اس طریقۂ واردات کا شعور بھی نظر آتا ہے جو انگریزوں نے اپنا رکھا تھا۔

یارب شفا دے اس کو کہ عضووں کو چین ہو
خیلی خلل میں ہے سرِ ہندوستاں کا مغز

ہندوستاں نشانِ دشتِ بلا ہے کیا
جو اس زمیں پہ تیغ ہی چلتی ہے اب تلک

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ بھی تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی
نہ نکلے کیوں کہ تری چشمِ سرمہ سے نگاہ
وقار ہند میں کمتر ہے اب سپاہی کا
ہاتھ میں گوروں کے جانبر ہوویں کیونکر اہلِ ہند
کام کرتے ہی نہیں ہرگز یہ بن کونسل کیے

ف ۶: مصحفی نے اردو غزل کو مجرد تجربوں کے ہجوم سے نکال کر اسے معاشرتی حوالوں اور زندہ تجربوں سے روشناس کروایا ہے۔ وہ ہماری غزل کو انسان اور اس کی نفسیات سے قریب تر لایا ہے اور آج کی غزل میں انسانی فطرت کے جن

پہلوؤں کا دلکش اظہار ملتا ہے ان کا ایک بڑا گہرا اور مضبوط رشتہ مصحفی کی غزل سے بھی ہے۔
کچھ مصحفی کے منتخب اشعار ذیل ہیں:

بھلا درستیٔ اعضاے پیر کیا ہووے
کہ جیسے رسّی سے ٹوٹا کواڑ باندھ دیا

اس دل میں میاں تری محبت
جیسے کہ نمک کباب میں ہے

بیٹھے بیٹھے جو ہوگیا وہ کھڑا
اک ستارہ سا شب زمیں سے اٹھا

لے گئے سب بدن زمیں میں ہم
مصحفی اک زبان چھوڑ گئے

لوح و قلم و کرسی و عرش اور یہ افلاک
اونچے ہیں پہ ہیں قوتِ ادراک سے نیچے

آتش لکھنوی

آتش کی ظاہری تصویر جو ان کی قلندرانہ وضع قطع پر بنائی گئی ہمارے درمیان موجود ہے۔ امجد نے ان پر ریویو کرتے ہوئے ان کے نقش شاعری سے نفس شاعری کا سفر کیا ہے اور اس نقش میں عزتِ نفس کا رنگ دکھایا ہے۔
امجد لکھتے ہیں۔ ''آتش اردو غزل کا ایسا شاعر ہے جو سودا اور مصحفی کی روایت سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کی اپنی منفرد حیثیت بھی ہے جس کا رکنِ رکین اس کے یہاں ''عزتِ نفس'' کا ایک مخصوص تصور ہے۔ اس کی طبیعت میں ایک طرح کی عاجزی اور حلیمی تھی جو صرف ان لمحوں میں اس کے کڑے پن سے دبتی تھی جب اس کی عزتِ نفس کو چیلنج کیا جاتا تھا ورنہ عام حالات میں وہ ایک قلندر اور صلح کل آدمی تھا۔

برنگِ سایہ گزر شاہراہِ ہستی سے
کسی کے دوش کا آتش جنازہ بار نہ ہو

امجد کہتے ہیں'' آتش، مصحفی سے ایک زمانے میں باقاعدہ اصلاح بھی لیتا رہا۔ مصحفی سے جو بات سیکھی وہ رویے کی سطح پر حقیقت پسندی اور اسلوب کی سطح پر تمثالوں میں حواسِ خمسہ کے وافر اور تخلیقی استعمال سے رنگا رنگی اور گہرائی پیدا کرنا ہے۔ اردو

شاعری میں نشاطیہ لب و لہجے کا بہت فقدان ہے۔ خصوصاً غزل کے لہجے میں عام طور پر مایوسی بددلی، ملال، رنج اور پژمردگی کا غلبہ رہتا ہے۔ آتشؔ ان چند شاعروں میں سے ہے جن کے پاس آپ کو ایسے مضامین کثرت سے ملیں گے جن میں خوشی اور انبساط کی فضا پائی جاتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی شاعری ایک نارمل انسان کی رودادِ حیات ہے جس میں اگر آنسو ہیں تو مسکراہٹیں بھی ان کے دوش بدوش ہیں۔"

امجد اسلام امجدؔ نے اشعار کی مثالوں سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تخیلی تمثالیں جن کا مبدا قوتِ متخیلہ ہے اور وہ تمثالیں جو حواسِ خمسہ کے مظاہرے سے تعبیر کی جاسکتی ہیں دونوں کا آتشؔ نے اپنی شاعری میں استفادہ کر کے انہیں کمال کے درجے پر پہنچایا ہے۔

آتشؔ کے منتخب اشعار

پھٹے کپڑے گزی کے اُس سے ہم بہتر سمجھتے ہیں
اگر اترا ہوا ہووے تنِ نوّاب کا جوڑا

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بے دار نے سونے نہ دیا

مسند شاہی کی حسرت ہم فقیروں کو نہیں
فرش ہے گھر میں ہمارے چادر مہتاب کا

فقیری جس نے کی گویا کہ اُس نے بادشاہی کی
جسے ظلِ ہما کہتے ہیں درویشوں کا کمبل ہے

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جاہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

258

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

پست فطرت سے سوائے رنج کچھ حاصل نہیں
پا بہ گِل کشتی کو کر دیتا ہے پانی تھاہ کا

بیاں خواب کی طرح جو کہہ رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

بت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے

مِلاؤں خاک میں اہلِ سخن کے دشمن کو
اکھیڑوں جڑ سے میں وہ دانت جو زباں کاٹے

ہر شب شبِ برأت ہے ہر روز عید ہے
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کر

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتشؔ
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انساں ہووے

شعرِ الہامی یہ لاتی ہے وہ لاتا ہے وحی
فکرِ عالی مرتبت بھی ہمرہِ جبریل ہے

برنگ سایہ گزر شاہرہ ہستی سے
کسی کے دوش کا آتشؔ جنازہ بار نہ ہو

پست فطرت کو ہمیشہ سربلندوں سے ہے لاگ
زلزلہ ڈھاتا ہے دیوار و در و محراب کو

باقی رہے گا نام ہمارا نشاں کے ساتھ
اپنی بھی چند باتیں ہیں اپنی عمارتیں

یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصور پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے، نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں

فقیر بن کے قدم مار اس میں اے آتش
طریق احمدِ مرسل ﷺ سی شاہرہ نہیں

پھوڑنا شیشے سے اپنا سر نہ تھا اے کوہ کن
چھیننا شیریں کو تھا پرویز کا سر توڑ کر

جوانی کو غنیمت جان غافل
ہری ہوتی نہیں پھر سوکھ کر شاخ

امتیاز خوب و زشت اپنے زمانے میں نہیں
ایک سا ہے آہوے مست و سگِ دیوانہ آج

غالب دہلویؔ

امجد اسلام امجدؔ نے ''نئے پرانے'' میں تقریباً ستر (۷۰) صفحات میں غالبؔ پر گفتگو کر کے ان کے منتخب اشعار پیش کیے ہیں۔ اس طویل اور جامع تنقید سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لیے اس تمام چیپٹر کے مطالعے کی ضرورت ہے لیکن ہم اس مختصر تحریر میں صرف چند نکات پیش کر کے آخر میں اشعار دیں گے تا کہ کسی حد تک غالبؔ کا حق ادا ہو سکے۔

ف ۱: غالبؔ ایک غیر معمولی ذہن تھا۔ اگر وہ کسی ترقی یافتہ اور طاقت ور قوم کا فرد ہوتا تو یقیناً شیکسپیئر، گوئٹے اور ملٹن سے زیادہ نام کماتا۔

ف ۲: غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ اُس نے اس زوال اور انتشار میں بھی نہ صرف بنیادی نوعیت کے سوال اٹھائے بلکہ ان کے ایسے ایسے گوشوں کو سامنے لایا جن کے وجود سے بھی اس کے اردگرد کے لوگ آگاہ نہیں تھے۔

ف ۳: غالبؔ کے پاس ''اندازِ بیاں اور'' والا پینترا ہے جو ہر موقع پر اس کے کام آتا ہے۔ وہ بیسیوں مرتبہ کہی ہوئی بات بھی اس طرح سے کہتا ہے کہ نئی معلوم ہونے لگتی ہے۔

ف ۴: غالبؔ کی شاعری کا ایک اور وصف یہ ہے کہ اس میں بہت سی ایسی اصنافِ ادب کے ابتدائی آثار ملتے ہیں جنھوں نے آگے چل کر ہمارے ادب میں بڑے صحت مند اور طاقتور رجحانات کو جنم دیا۔

ف ۵: غالبؔ نے شعری خیالات کو سائنسی اور فلسفیانہ بنیادوں پر استوار کرنے کی وضع ڈالی ہے۔

ف ۶: غالبؔ کے یہاں وہی شمع جو امراء القیس سے لے کر میرؔ و سوداؔ تک کی شاعری میں روشن رہی ہے۔ ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

ف ۷: غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ معمولی باتوں سے ایسے ایسے حیرت انگیز اور گہرے نتائج اخذ کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ف ۸: غالبؔ نے فکر اور زبان کی خون سے آبیاری کی چنانچہ آگے چل کر اس درخت سے ایسی سرسبز اور پھل دار شاخیں پھوٹیں جن کی روشنی شجر کی جڑوں تک کو منور کر گئی۔

ف ۹: غالبؔ کے قول کے مطابق وہ عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ تھا لیکن اس کا شعری پیرایہ اور ذخیرہ الفاظ بھی اسی حوالے سے خصوصی اہمیت اور توجہ کا حامل ہے۔

ف ۱۰: غالبؔ کے یہاں محبوب ایک جیتی جاگتی عورت ہے اس کی شاعری میں یہ عورت اپنی شخصیت کے ساتھ بکھری پڑی ہے۔

ف ۱۱: غالبؔ ۱۸۵۷ء کا ایک تماشائی نہیں تھا اس نے متاثر ہو کر اس ظلم و ستم پر شعر بھی لکھے۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

ف ۱۲: غالبؔ شاعر تھا۔ اس پر اعتراض کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی اپنی معاشرتی صورتِ حالات کا اسی طرح اسیر تھا جس طرح اس کے اردگرد کے لوگ۔

ف ۱۳: غالبؔ ایک زندہ استعارے کی طرح ہماری تہذیبی اور ادبی روایت میں رواں دواں رہا ہے۔ اس کے ساتھ کی سب چیزیں پرانی ہو گئیں مگر وہ پرانا نہیں ہوا۔

مرزا غالبؔ کا کلام خود انتخاب ہے اور اس میں سے امجد اسلام امجدؔ نے منتخب اشعار نکالے ہیں اور اب ہم یہاں انتخاب در انتخاب کر رہے ہیں اس لیے اگر کچھ اشعار کی تعداد بڑھ بھی جائے تو سخن شناسوں پر گراں نہ ہوگا۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

261

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں تنگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

262

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

محرم نہیں ہے تُو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اس کی اُمّت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

پُوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

بندگی میں بھی وہ آزادہ خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تبِ گرمیِ رفتار ہنوز

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
وا ماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

ہوتے ہیں بے قدر در کنجِ وطن صاحب دلاں
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

اگلے وقتوں کے یہ ہیں لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر قدم دُوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی امید
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام، حلقۂ دامِ خیال ہے

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

مہرباں ہو کہ بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

بتو توبہ کرو تم کیا ہو؟ جب ادبار آتا ہے
تو یوسف سا حسیں بکنے سرِ بازار آتا ہے

بسکہ تھی فصلِ خزاں در چمنستانِ سخن
رنگ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

حسد سزائے کمالِ سخن ہے ، کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ
ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گرداندہ
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد، جہاں میں ورقِ ناخواندہ

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

رنج سے خُوگر ہُوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
نشوونما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

نَے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

علامہ اقبالؔ

یہ سچ ہے کہ اقبالؔ کی شاعری ایک زندہ روایت بن کر روز بہ روز مستحکم ہوتی جارہی ہے۔ امجد اسلام امجدؔ نے اقبالؔ شناسی کے ذیل میں کچھ سوالات کے تشفی بخش جوابات دیے ہیں جو اقبال کے نادان دوست اور دانا دشمنوں نے تراشے ہیں۔

س ا: کیا اقبالؔ خواص کا شاعر ہے؟

جواب: یہ پڑھے لکھے اور ناقدوں کے ایک گروہ کے بے جان احساسِ برتری کی نشاندہی کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کون سی شاعری کس حد تک اپنے عہد کے لوگوں کے جذبات، احساسات، معاشرتی، معاشی اور تاریخی محرکات کی عکاسی کرتی ہے۔ اقبالؔ کی شاعری ہر اردو جاننے والے کے لیے ایک زندہ اور جیتا جاگتا جہان ہے جس میں وہ بلا جھجک داخل ہوسکتا ہے۔

س ۲: اقبال ایک عظیم فلسفی ہے اور اس کی شاعری جذبے کے بجائے علم کی مظہر ہے۔

جواب: مولانا رومؒ نے کہا تھا:

علم را بر تن زنی ماری بود
علم را بر دل زنی یاری بود

اقبال کا علم اس کی شاعری میں موجیں مارتا نظر آتا ہے لیکن یہ وہ علم ہے جو دلوں کو چھوتا اور دماغوں کو جگاتا ہے۔ اُس کے فلسفیانہ اندازِ شاعری کو تو یاروں نے ''جزویست پیغمبری'' تک قرار دیا ہے۔ ہر بڑے شاعر کے کلام میں اس کی روح عصر اور فلسفۂ حیات ڈلکیں مارتا ہے۔ اقبال نے صرف اتنا کیا ہے کہ اس نے مجرد فلسفیانہ خیالات کے بجائے ایک مخصوص طرزِ فکر سے کام لیا ہے۔

س ۳: اقبال صرف ہندوستانی مسلمانوں کا شاعر ہے۔ اس لیے اس کی رسائی محدود ہے۔

جواب: اقبال کے مخاطب ہندوستان کے مسلمان تھے۔ تسلیم! مگر یہ پوری بات نہیں۔ بات کا ایک حصہ ہے اقبال نے خود کو اسلامی تاریخ تک محدود نہ رکھا اور نہ ہی اسلام کے تصور کو مسلمانوں تک محدود کرنے کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آپ کو زرتشت، رام، گرونانک، گوئٹے، نطشے، کارل مارکس اور برگساں کے حوالے اور اثرات بھی ملتے ہیں۔

س ۴: اقبال کی شعری زبان میں غنائیت تغزل اور اثر آفرینی کی کمی ہے۔

جواب: غنائیت تغزل اور اثر آفرینی اقبال نے اپنے ابتدائی کلام کے چند تبرکات ''بانگ درا'' میں محفوظ کر لیے ہیں۔ اقبال کے یہاں انیسویں صدی کے زوال پذیر تہذیبی ڈھانچے کے پس منظر میں قائم کیے گئے تصورِ تغزل یا غنائیت اور اثر پذیری بے مصرف بلکہ احمقانہ بھی ہے۔

ہم یہاں امجد کی گفتگو کے ذیل میں یہ کہیں گے کہ دشمن بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اقبال کا ہر مصرع اثر جاوداں اور پُرتاثیر ہے۔ اقبال کا کلام اثر آفرینی سے لبریز ہے۔ جہاں تک تغزل کا تعلق ہے ان کی غزلوں اور نظموں میں تغزل بھرا پڑا ہے ہاں چوما چاٹی کی گفتگو نہیں ہے۔ اقبال کے مصرعوں میں غنائیت بھی زیادہ ہے وہ کون سی غزل یا نظم کے بند ہیں جنھیں ترنم اور خوش لحنی سے پڑھا نہ جا سکے۔ غنائیت صرف ڈھولک کے گیتوں کا نام نہیں۔

س ۵: اقبال اردو کی سٹینڈرڈ شعری زباں استعمال نہیں کرتا۔

جواب: حقیقت صرف اتنی ہے کہ اعتراض کنندگان نے اپنے آپ کو سٹینڈرڈ فرض کر رکھا ہے۔ ایک عظیم تخلیقی فن کار پر روزمرے اور محاورے کے جھروکوں سے کنکریاں مارنا دراصل ایک خاص طبقے کی بیمار اور رجعت پسندانہ ذہنیت کا عکاس ہے۔

س ۶: اقبال کی بنا کردہ شعری روایت اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

جواب: ایک انتہائی جاہلانہ بات ہے۔ بڑی شاعری قارون کا مال و زر نہیں ہوتی کہ اس کے ساتھ دفن ہو جائے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا مخصوص اسلوب اپنی عظمت کی وجہ سے بعد کے لوگوں کی گرفت میں نہیں آ سکا۔ یہ جو ہم آج جدید شاعری میں اتنی رنگا رنگی دیکھتے ہیں تو اس طرف کھلنے والے بیشتر دروازے اقبال ہی کی شعری روایت کی دیواروں میں پیوست ہیں۔

امجد اسلام امجدؔ نے اقبالؔ کے اردو کے مجموعوں ''بانگ درا''، ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' سے انتخاب کیے۔ اقبالؔ کے مجموعوں اور اس کے انتخابات کی بازار میں کمی نہیں لیکن یہ انتخاب ان سے ملا جلا اور الگ تھلگ بھی ہے۔ ہم چند اشعار یہاں لکھتے ہیں:

بستاں و بلبل و گل و بُو ہے یہ آگہی
اصلِ کشاکشِ من و تو ہے یہ آگہی

طشتِ گردوں سے ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبالؔ اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

سودا گری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

فیضِ ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں
مجھ کو پیدا کرکے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصور سے گِلا رکھتا ہوں میں

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

زندگی قطرے کو سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

وہ کلیمِ بے تجلی وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

خودی سے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم
خودی سے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا
تُو ہی آمادۂ ظہور نہیں

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس
ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانۂ آباد

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

امجدؔ نے ''نئے پرانے'' میں بغیر کسی مزید تشریح وتفسیر کے کلاسیک نو(۹) شاعروں کے منتخب اشعار پیش کیے ہیں جو اس لحاظ سے بھی ایک اچھا قدم ہے کہ ان شاعروں کے کلام کا ذکر زیادہ نہیں ہوتا اور پھر ان کے دیوان عموماً لائبریریوں کی زینت بنے رہتے ہیں چنانچہ اس انتخاب سے گھر بیٹھے قاری کو ان فراموش شدہ گلشنوں کی بھی سیر ہو جاتی ہے۔

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا (ولیؔ)
گر نہیں رازِ عشق سوں آگاہ

فخر بے جا ہے فخرِ رازی کا (ولیؔ)

حکمتِ عشق بُوعلی سوں نہ پوچھ
نئیں وہ قانوں شناس اس فن کا (ولیؔ)

برجا ہے گر اہلِ ہوس طالب نہیں مجھ شعر کے
جن کوں سخن کی بوجھ نئیں ان کوں سخن سوں کیا غرض (ولیؔ)

باعثِ رُسوائی عالم ولیؔ
مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی (ولیؔ)

ولیؔ وصل وجدائی سوں سجن کی
کبھو صحرا کبھو گل زار ہیں ہم (ولیؔ)

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل رُوسوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ (ولیؔ)

دل پا کے اس کی زلف میں آرام سو گیا
درویش جس جگہ کہ ہوئی شام سو گیا (قائمؔ)

اٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا
دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا (قائمؔ)

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جاکر کہاں کمند
کچھ دُور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا (قائمؔ)

الٰہی واقعی اتنا ہی بد ہے فسق و فجور
پر اس مزہ کو سمجھتا جو تو بشر ہوتا (قائمؔ)

زاہد مرے مولا کے اسرار نہیں پاتا
غافل اسے کیا پاوے ہشیار نہیں پاتا (انشاؔ)

کہانی ایک سنائی جو ہیر رانجھا کی
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا (انشاؔ)

صحرائے لق و دق میں سلگتا ہوں آپ ہی آپ
وہ آگ ہوں گیا ہو جسے کاروان چھوڑ (انشاؔ)

بس نہ دنیا کی رکھ اے صاحبِ ادراک ہوس
خاک ہی خاک ہے سب، خاک کی کیا خاک ہوس (انشاؔ)

نہ چھیڑ اے نکہتِ باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں (انشاؔ)

یاں کسی کی کوئی بھی بات ٹک نہیں سنتا
غور کر جدھر دیکھو دورِ خود فروشاں ہے (انشاؔ)

سوچ رہ رہ کر یہی آتا ہے اے جرأت مجھے
خلق کرنے سے مرے، خالق کو حاصل کیا ہوا (جرأت)

گل کو کیا رو رہی ہے تُو بلبل
یہ گلستاں نہیں ہے رہنے کا (جرأت)

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومنؔ)

عمر پوری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخرِ عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے (مومنؔ)

پہنچا ہے شب کمند لگا کر وہاں رقیب
سچ ہے حرام زادہ کی رسّی دراز ہے (ذوقؔ)

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے (ذوقؔ)

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے (ذوقؔ)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے (ذوقؔ)

دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یوں ہی جب تک چلی چلے (ذوقؔ)

ہم طالبِ شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا (شیفتہؔ)

ایک دن شام ہماری بھی سحر کردے گا
وہی جو شام کو ہر روز سحر کرتا ہے (شیفتہؔ)

اہلِ زمانہ دیکھتے ہیں عیب ہی کو بس
کیا فائدہ جو شیفتہ عرضِ ہنر کریں (شیفتہؔ)

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام ہے فقیہو ممنوں بہت تمہارا (حالیؔ)

ادبار بھی دیکھوگے جہاں پاؤگے اسلام
اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا (حالیؔ)

حاجیو ہے ہم کو گھر والے سے کام
گھر کے محراب اور ستوں سے کیا غرض (حالیؔ)

جانور آدمی فرشتہ خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں (حالیؔ)

ہمیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دیکھیں گے
تمہیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا (داغؔ)

رہتا ہے عبادت میں ہمیں موت کا کھٹکا
ہم یاد خدا کرتے ہیں کرلے نہ خدا یاد (داغؔ)

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں (داغؔ)

دل کے سوا نہ کعبے میں ہے وہ نہ دیر میں
گر ہے تو بس یہیں ہے نہیں تو کہیں نہیں (داغؔ)

نہیں حیدر آباد پیرس سے کچھ کم
یہاں بھی سجے ہیں مکاں کیسے کیسے (داغؔ)

غمِ حسینؓ میں اُٹھے گا سُرخرُو اے داغؔ
یہ بوجھ تُو نے اُٹھایا علیؓ علیؓ کر کے (داغؔ)

امجدؔ کی شاعری پر مشاہیرِ شعر و ادب کے تاثرات

امجد اسلام امجدؔ کی شخصیت من موہنی ہے اور ان کی تخلیقی جہتیں کئی ہیں جن میں شاعری کے علاوہ ڈرامے، افسانے، ٹی وی سیریل، سفرنامے، کالم، تنقیدی، ادبی اور تفریحی مضامین شامل ہیں۔ چنانچہ مشاہیران شعر و ادب نے اپنے مضامین، تقاریظ اور فنی ریویو میں ان تمام گوشوں پر کم و بیش روشنی ڈالی ہے جس کا احاطہ ایک مختصر اور جامع مضمون میں ممکن نہیں۔ اس لیے یہاں ہم نے صرف اور صرف امجدؔ کی شاعری کو محور بنا کر مختصر معتبر اور مستحکم مطالب کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ امجدؔ کی شاعری پر چند مستند خیالات امجد شناسی کے ذیل شامل ہو جائیں۔ یہاں ہم نے مضمون کی طوالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ اشعار کی نقل سے بھی گریز کیا ہے۔ ہم نے اس ریویو میں امجد کی وہ شاعری بھی شامل کی ہے جو دوسری زبانوں سے ترجمہ کی صورت میں فلسطینی اور نیگرو شاعری کے ذیل ہوئی اور جس پر مشاہیر نے اظہارِ نظر کیا ہے۔ اس التزام کی وجہ سے یہاں بعض مشاہیر کا طولانی اقتباس اور بعض کا بہت مختصر اقتباس مشاہیر کے عناوین سے ارتباط رکھتا ہے۔

فیض احمد فیضؔ

امجد اسلام کے مجموعۂ کلام ''ساتواں در'' میں لکھتے ہیں:

امجد اسلام امجد کا تازہ مجموعہ کلام ''ساتواں در'' اسی پر شاہد ہے۔ اس میں امجد اسلام امجد نے مطالب و معانی اور اظہار و ابلاغ کا ایک متنوع ذخیرہ تالیف کیا ہے۔ واعظانہ، فاسقانہ، ناصحانہ، عاشقانہ، غنائیہ، بیانیہ، ذاتی، عمومی، جدید سبھی طرح کے سنجیدہ نمونے موجود ہیں لیکن یہ تنوع محض طبع آزمائی یا مضمون آفرینی کی خاطر نہیں ہے، فکر و خیال اور جذبات و تجربات کی مناسبت اور ان کے تقاضوں سے مطابقت کی خاطر سے ہے جو شعر کی پرکھ کا مسلمہ معیار ہے۔ اس کا تعلق قدرت کلام سے نہیں جو اپنی جگہ ایک دوسری قدر ہے بلکہ سلامتیٔ اظہار سے ہے۔ جو معانی کے جسم نازنین کے لیے رنگِ قبا کا کام دیتی ہے۔

''اس مجموعے میں تعداد اور حجم کے اعتبار سے نظموں پر غزلیات کا پلّہ بھاری ہے لیکن مجھے محسوس

ہوتا ہے کہ اس کے باوجود امجد اسلام امجد صاحب کی طبع شاید نظم ہی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ غزل ایک طرح سے کشیدہ کاری کا کام ہے جس میں ایک دیے ہوئے ڈیزائن کی چوکھٹ میں شاعر کے جذبہ وخیال کی بُنت سے ہزار رنگ کے پھول پتیاں اور نقش ونگارا بھرتے ہیں لیکن اس بنیادی ڈیزائن میں ایجاد واختراع کی گنجایش بہت کم ہوتی ہے اور امجد صاحب چونکہ طبعاً جدّت پسند واقع ہوئے ہیں اس لیے انہیں نظم کی صورت میں آہنگ واظہار کے نئے پیرائے بروئے کار لانے میں زیادہ کامیابی ہوتی ہے۔''

احمد ندیم قاسمی:

''امجد اسلام امجدؔ کے فکر وفن کا تدریجی ارتقا'' میں لکھتے ہیں:

ظاہر ہے کہ شاعری میں خواب ایک جمالیاتی قدر ہے اور نوجوان نظم نگاروں میں امجد ان چند شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی آزاد نظموں کو بھی اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کے ساتھ نہایت حسن اور سلیقے سے وابستہ رکھا ہے۔ وہ نوجوان نسل کے سبھی حساس اور ذہین شعرا کی طرح باغی ہے مگر ان شعرا کے برعکس اپنی بغاوت کی باگیں اس کے اپنے شعور، اپنی قوت فیصلہ اور اپنی دیانت کی گرفت میں ہیں۔ چنانچہ اس کی بغاوت، اس کی نظموں کے پیکر میں کم مگر نظموں کے معنی ومفہوم میں زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ امجد بغاوت کو اتنا محدود نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی وضع قطع یا نظموں کی تراش خراش یا زبان کی شکست وریخت کو بغاوت کی نشانیاں قرار دے کر اپنی بغاوت کی حقیقت منوانے پر مصر ہو۔ اس کی بغاوت تو دماغ ودل اور فکر واحساس سے پھوٹتی ہے اور یوں بھرپور انداز میں پھوٹتی ہے:

تم اگر اپنے ان شیشہ خانوں سے باہر نہیں آؤ گے
تو سنو
ہم بھی اندھے سفر پر نہیں جائیں گے
زخم کھائیں گے تو خود بھی خنجر کی صورت نکل آئیں گے

امجد اس بغاوت تک خود شناسی کی اس معراج تک زقند لگا کر نہیں پہنچا بلکہ اس کا سفر مسلسل اور تدریجی ہے اور یاد رکھیے کہ یہ تدریج نظریاتی استقامت کی بنیاد ہوتی ہے۔ کسی نظریے کو محض فیشن کے طور پر اپنانے والوں کے ہاں استقامت نہیں ہوتی، محض پھلجھڑی ہوتی ہے جو چکا چوند مچا کر راکھ ہوجاتی ہے۔ ''برزخ'' کی نظمیں شاہد ہیں کہ امجد کو سب سے پہلے اپنے آس پاس کی صورتِ حال سے شدید صدمہ پہنچتا ہے اور وہ کبھی اداس ہوجاتا ہے کبھی طیش میں آجاتا ہے اور کبھی مکمل تباہی تک کو دعوت دے ڈالتا ہے مگر اس دعوت نامے کا آخری مصرعہ وہ اسم ہے جو امجد کو بے معنویت کی اس کھوہ میں گرنے سے بچا لیتا ہے جس میں کتنے ہی ذہین نوجوانوں کی جوانیاں ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئیں۔ ''اسرافیل کہاں ہے'' میں وہ کہتا ہے:

کیوں زمیں پھٹتی نہیں..... اندھیر ہے!

آسمانو! دیکھتے ہو کس کا منہ.....کیا دیر ہے
کوہسارو، روئی کے گالے بنو.....اور اے سمندر ساحلوں کے باب سے باہر نکل
اور آخری مصرع: 'نقش فردا.....خواب سے باہر نکل

امجد نے ''فریب خوردہ نسل کا عہد نامہ'' اور پھر ''نئی نسل کا نوحہ'' کی سی نظمیں لکھ کر جرأت مندانہ خود تنقیدی کی ایک مثال قائم کی ہے۔ اہم تر بات یہ ہے کہ اس نے یہ دو اہم تجزیاتی نظمیں اپنے وطن کے حوالے سے لکھی ہیں اور یہ سوال اٹھایا ہے:

زمین پاؤں تلے نہیں ہے تو کیسے تاروں کی سمت جاؤں؟

اس سوال کے تاریخی اور نفسیاتی اسباب تو بڑے بڑے دانشور ہی ڈھونڈیں گے۔ میں بحیثیت شاعر دو ہم عصر شاعروں کو بطور گواہ پیش کرتا ہوں۔ سجاد باقر رضوی کہتے ہیں:

مٹی کو یہاں پاؤں پکڑنا نہیں آتا

انہوں نے زمین پر پاؤں نہ ہونے کا جواز پیش کرنے کے لیے زمین ہی کو مورد الزام ٹھہرایا ہے مگر بہرحال یہ ضرور تسلیم کیا ہے کہ پاؤں زمین پر نہیں ہیں۔ حمایت علی شاعر نے کوئی لگی لپٹی اٹھا رکھے بغیر اعتراف کیا ہے کہ:

زمیں پہ پاؤں نہیں اور آسماں پہ دماغ

یہ زمین وہ حقیقت ہے جسے ہم اپنا وطن کہتے ہیں۔ امجد کے پاس اپنے وطن کی غیر مشروط محبت کی مشعل ہے اور اس محبت نے اس کے پاؤں اس زمین میں نہایت مضبوطی سے جما دیے ہیں۔ امجد کے فن میں ''عدم اطمینان محض'' اس مرحلے پر پہنچ کر یکسر ختم ہو جاتا ہے۔ ''شہر بے مثال'' میں وہ جبر کے اس لمحے کو اپنی گرفت میں لیتا ہے جس میں سے گزرتے ہوئے ہمارا وطن کچلا گیا مگر وہ اس سے نہ مرعوب ہوتا ہے نہ مایوس۔ اسے یہ اعتماد حاصل ہے کہ:

ہم وہ دیوار ہیں
جس کی تعمیر میں جس قدر سنگ ہیں
سارے یک رنگ ہیں

اردو نظم کی تہی دامانی کے مغالطے کو امجد کی ان نظموں نے فیصلہ کن انداز میں شکستہ پا کیا ہے۔ یہ نظمیں جن میں ایک ایسا شاعر بول رہا ہے جس کی تین نمایاں پہچانیں ہیں کہ وہ اپنی دھرتی سے غیر مشروط پیار کرتا ہے۔ وہ بیراگی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے معاشرے، اپنی تہذیب اور تاریخ سے مربوط ہے اس لیے مضبوط شخصیت رکھتا ہے اور مسائل پر سوچتا ہے، فکر کرتا ہے، جستجو کرتا ہے۔ امجد کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے جدید شاعری کو ان لوگوں کے چنگل سے نکال لیا ہے جو آزاد نظم میں الفاظ کی اندرونی موسیقی سے چونک اور گھبرا کر الفاظ کی جگہ پتھر لڑھکانے لگتے ہیں یا جو اپنے ہاں جذبہ و خیال کی کمی کو اپنے شاعرانہ ''کرافٹ'' سے پورا کرتے ہیں اور غیر مانوس لفظوں اور اصطلاحوں کے روّیے روا رکھ کر اپنے فن کے گرد اگرد ایک فصیل کھڑی کر لیتے ہیں۔ امجد کی نظموں نے ان سب مداریوں کے طلسم توڑ دیے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

''برزخ کا شاعر'' میں لکھتے ہیں:

صاف اندازہ ہوتا ہے کہ امجد نے جو کچھ کہا ہے اور جس طرح کہا ہے ہر قسم کے جھوٹ اور جھوٹی روایت سے نجات پانے کی کوشش میں کہا ہے لیکن روایت سے نجات پانے کی کوشش کا یہ مطلب نہیں کہ امجد، ماضی کو سرے سے بے وقعت جانتا ہے یا وہ حال اور مستقبل کو ماضی سے منقطع کر کے دیکھتا ہے، ایسا نہیں ہے، زندگی کی ابدی سچائیوں اور مثبت قدروں سے امجد کے فکر وفن کا رشتہ بہت استوار ہے۔ یہ رشتہ اس کے یہاں ماضی، حال اور مستقبل کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے دیکھنے، ان کی پہنائیوں میں جھانکنے اور ان میں موجود حیاتِ امکانی کو گرفت میں لینے کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امجد کی شاعری زندگی سے نروان حاصل کرنے کا اپدیش بننے کے بجائے اس دھرتی کے باسیوں کے لیے جیون آس بن گئی ہے خواہ یہ جینا برزخ ہی کا جینا کیوں نہ ہو۔

امجد اسلام نئی نسل کے ان شاعروں میں سے ہے جن کا نیاپن ہر قسم کے خوف، احساسِ کمتری، تصنع، فیشن پرستی کی اس بے جان روایت سے یکسر پاک ہے جو اردو میں غزل کے ہاتھوں پروان چڑھی اور پھر اردو شاعری کے مزاج میں کچھ اس طرح داخل ہوگئی کہ آج تک بہتوں کو اس سے نجات نہ مل سکی۔ امجد نئی نسل کے نمایندہ ادیبوں اور شاعروں میں خاصا ذکی، دراک اور شوخ وطرار ہے۔ اس کی یہ ذکاوت و دراکی اور شوخی وطراری اس کی نثر ونظم دونوں میں بہت نمایاں ہے اور اسی سے اس کے لب ولہجے میں ایک طرح کی تندی و تیزی پیدا ہوئی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ امجد نے اپنے لب ولہجے کو شعوری طور پر تند و تلخ و تیز بنا رکھا ہے، اس سے اس کا منشا خواہ مخواہ دوسروں کو چونکانا اور اپنی طرف دوسروں کو متوجہ کر کے خود کو نمایاں کرنا ہے۔

امجد کی شاعری میں صرف سوچ اور سوچ کے فنی برتاؤ کے اعتبار سے نہیں بلکہ ہیئت اور تکنیک کے لحاظ سے ایک طرح کا نیاپن ہے۔ اس نئے پن کا احساس ''برزخ'' کے ابتدائی صفحوں ہی سے ہونے لگتا ہے اردو شاعری میں حمد ونعت اور سلام، اپنے موضوعات اور تکنیک دونوں کے لحاظ سے ایک اپنا خاص ڈھرا رکھتے ہیں لیکن امجد کے یہاں یہ ڈھرا بالکل بدلا نظر آتا ہے۔ اس نے حمد، نعت اور سلام کو ہیئت و معنی کی ایک نئی روایت دی ہے۔ یہ روایت صفات الٰہی، شمائلِ نبوی ﷺ اور واقعات کربلا کو خوبصورت پیرایہ بیان دے دینے تک محدود نہیں بلکہ ان کے تناظر میں زندگی کے تازہ حقائق کی دریافت کا کام لیا گیا ہے۔ دوسری نظموں کی ہیئت میں بھی کسی کی تقلید کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ فیض احمد فیض اور منیر نیازی سے وہ متاثر ضرور معلوم ہوتا ہے۔ امجد کے مصرعوں کی ترتیب، ایجاز واطناب، بند کی تشکیل، امیج تراشی، ترکیب لفظی سب میں ایک طرح کی جدت، انفرادیت اور بانکپن ہے۔

جمیل الدین عالی:

چند برس پہلے کسی نے کہا تھا کہ امجد بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہے۔ مجھے یہ بات بری لگی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ غزل کا بھی کوئی بہت بڑا شاعر ہے بلکہ اس لیے کہ شاعر کو، شاعری کو، معیار کے لحاظ سے خانوں میں تقسیم کرنا میرے ایک بنیادی موقف کے

خلاف ہے۔ شاعر تو صاحبو شاعر ہوتا ہے۔ شاعری تو صاحبو شاعری ہوتی ہے..... یہ تقسیم فی الاصناف وغیرہ عموماً کاغذ کا پیٹ بھرنے کے لیے ہوتی ہے۔ ہاں یہ ذرا Over Simplification لگے گا۔ پیچیدہ نویسوں کو، سو لگے۔ اب تھوڑی بہت جدیدیات سے میں بھی واقف ہو چکا ہوں۔ مگر ہوں تو پرانے زمانے کا آدمی..... آہ اور واہ کا آدمی (ایسا آدمی نہ جانے کیسی کیسی ثقافتی، فکری Input کا حامل ہوتا ہے)

ہاں امجد کی غزلیں اور نظمیں اپنی چند خصوصیات رکھتی ہیں اور دو تین ایک ساتھ پڑھی جائیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ امجد بول رہا ہے۔ اسے جدید زبان میں شناخت سے جوڑ دیتے ہیں۔

ہاں مجھے عمومی طور پر، اس کی غزلیں بھی بہت پسند ہیں۔ یعنی وہ غزل کا بھی شاعر ہے مگر غزل تو بڑا علم دریاؤ ہے بادشاہو۔ ایک بہت لمبا چوڑا عجیب عجیب نقش و نگار سے مزین قالین جس پر نہ جانے کیسے کیسے اہلِ فکر، اہلِ ہنر، اپنے بڑے بڑے دائرے بنائے بیٹھے ہیں۔ شکر کہ امجد کو ایک بہت اچھی جگہ بھی مل چکی ہے۔ یہ الگ بات کہ بڑے بڑوں کی طرح اس کی غزل بھی کسی قدر یا بس سے خالی نہیں۔ غزل ہے بھی تو بڑی قیامت کا راستہ۔ بے شمار مرحلے، اور سب مرحلے..... سب شعر..... برابر کے نہیں ہوتے۔ بہت ہی بڑوں میں کسی کسی کی دس بارہ غزلیں ایسی مل جاتی ہیں جن میں ہر شعر اعلیٰ ہو، سب شعر برابر کے ہوں۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس کی بیشتر غزلوں کے بیشتر شعر داد طلب ہیں اور کچھ انوکھی جمالیات سے مزین۔ لیکن لفظیات..... کسی حد تک خلافِ روایات اور بڑی حد تک جدیدیات سے متاثر، اس کی اپنی ہیں۔ کاش یہاں میں ان غزلوں سے اپنا انتخاب دے سکتا۔ جو اس وقت ممکن نہیں۔

نظموں میں اس کے ہاں بیان و تاثر کی ایک قوسِ قزح ہے۔ وہ بیک وقت کئی اچھے خاصے مشہور بیرونی شاعروں کی یاد دلاتا ہے۔ مختصر مثالیں..... جوزف براوسکی، ڈے رک والکاٹ، ڈولے شوبرکا..... یشتوشنکو..... کتنے نام گنواؤں۔

سید محمد عبداللہ

''ساتواں در'' میں لکھتے ہیں:

جہانِ نو کو شعورِ مسافرت دیں گے
ہم اپنے خون سے شمعیں جلا کے رستے میں

امجد کے کلام میں سفر کا استعارہ صرف زندگی کی گریز پائی اور وقت اور لمحے کی ہر ساعت کی بے مطلب روانی تک محدود نہیں بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زندگی کا ارتقا پذیر تغیر بھی اس کے مدِ نظر ہو۔ لیکن شاعر کے چند دوسرے استعارے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اس کے مدِ نظر زندگی کا لمحہ گریزاں ہی ہے جو اچھی بھلی سہانی محفل کو فوراً خواب اور خیال میں بدل دیتی ہے۔ یہ استعارے ہیں خواب، عکس، سائے، چھاؤں وغیرہ۔ وہ کہیں کہیں محمود شبستری کی ''گلشنِ راز'' کا مسافر بھی نظر آتا ہے جو اقبال کے مسافر کی ضد ہے۔

امجد اسلام کے کلام میں گہرے اندھے کنویں کم سے کم ہیں۔ اس طرح گٹر بھی نابود ہیں۔ اس کے یہاں خوف تو ہے

مگر گٹر کی ناگوار کیفیتیں بحمد للہ بالکل غائب ہیں۔ شاعر کے خواب سہانے ہیں ڈراؤنے نہیں۔ اس کے پاس لاشعور کی خوفناک وحشتوں کا مکمل علاج موجود ہے اور وہ ہے محبت..... نظم ''جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے'' کتنی عظیم گہری ابدی ازلی حقیقت کا اظہار کر رہی ہے:

جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے
تیرے میرے ابد کا کنارا ہے یہ استعارہ ہے یہ

یہ تو سچ ہے کہ امجد نے ایسی حقیقت ہمارے سامنے رکھ دی ہے جسے نوشدارو کہیے یا کیمیا..... ہے یہ عجیب شے اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ شاعر پیارا انسان بھی ہے جو محبت کی ابدیت میں یقین رکھتا ہے اور ساتواں در اس پیارے انسان کا ہے اور اگر میں اس تذکرے کے ساتھ اپنے مشرب کا پیوند بھی لگا دوں تو کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کے اس طوفانِ شور افزا میں اجتماعی سطح پر بھی اور نجی داخلی دائرے میں بھی شفقتوں اور محبتوں سے ہی گھاؤ مندمل ہوتے ہیں۔

اشفاق احمد

اپنے مضمون امجد اسلام امجد میں لکھتے ہیں:

امجد اسلام امجد کے اختیار کردہ دوسرے اصناف سخن پر بڑی آسانی کے ساتھ بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن اس کی شاعری پر کچھ کہنے کے لیے ایک لمبے وقفے اور طویل مکالمے کی ضرورت ہے۔ ہمارے اس عہد کے شاعروں میں امجد دوسرا شاعر ہے جو ''کلی شے'' سے اجتناب کر کے چلا ہے۔ اگر کلی طور پر نہیں تو اپنے ساتھی شاعروں کے مقابلے میں کبھی کبھی اور کہیں کہیں کلی شے کو اس نے صرف قاری کی آسانی اور اس کی دلجمعی کے لیے برقرار رکھا ہے، خوش دلی سے نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اسی اصالت نے اسے ایک توجہ طلب شاعر بنا دیا ہے۔

امجد اسلام امجد کے کلام میں آپ کو اسی حقیقت کا بڑا حیران کن احساس ہوگا کہ امجد زبان کے حسن و جمال کو بڑی سندرتا کے ساتھ محاسن کی اسٹیج پر اتارتا چلا جاتا ہے، پھر جو فرحت، آنند اور رضامندی اظہار کے سگھڑاپے سے حاصل ہوتی ہے وہ ساری کی ساری قاری کے پھیلے ہوئے ذہن کی جھولی میں ڈالے جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں کہ امجد اسلام امجد کی مضبوط، پکی اور مکمل نظمیں وہ ہیں جہاں پہلے احساس نے خیال کو ڈھونڈا پھر خیال نے اٹھ کر صحیح الفاظ تلاش کر کے مطلوبہ بنا استوار کر دی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا اور ابھی امجد کی نئی نظمیں نظر سے گزریں تو اس سے میرا احساس یقین میں تبدیل ہو رہا ہے کہ امجد اسلام امجد بھی رابرٹ فراسٹ کی طرح اس کی Road not taken اختیار کر رہا ہے اور رواجی اور روایتی خیال سے بڑی شرافت اور سبھاؤ کے ساتھ الگ ہو رہا ہے۔

میرزا اَدیب

''اذکار و افکار'' میں لکھتے ہیں:

امجد کی شاعری میں جذبے کی حرارت تو لازماً ہے اور ہونی بھی چاہیے کہ وہ چیز بہت کم ہے جسے جذباتیت کہا جاتا ہے۔

ندی کی شوریدگی آہستہ آہستہ کم ہوکر سمندر میں منتقل ہوجاتی ہے۔

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ امجد کے یہاں سمندر، موج، دریا، ساحل بطور استعاروں کے مختلف مقامات پر نظر آتے رہتے ہیں۔ سمندر سے اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس کی ایک بہت مقبول ڈرامہ سیریز کا نام بھی سمندر ہے۔

امجد اسلام امجد بیسویں صدی کی جدید تر نسل سے متعلق ہونے کے باوصف اور سابقہ کے اجتماعی شعور اور کلاسیکی روایات سے بھی فیض یافتہ ہے اور اسی کو ہم تخلیقی تسلسل کا نام دیتے ہیں۔

انسانی تجربات میں اشتراک ایک فطری عمل ہے مگر ہر تجربہ فکری سطح پر اپنے کچھ عناصرِ ترکیبی مسترد اور کچھ نئے اجزائے ترکیبی کو قبول کرنے کا عمل بھی جاری رکھتا ہے۔ امجد کے ہاں یہ صورت بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔

امجد اسلام نے خوبصورت شاعری دی ہے۔ خوبصورت شاعری زندگی کی خوبصورتیوں سے متعارف کراتی ہے۔ اس کی اپنی یہ افادیت بڑی قابل قدر اور قابل تحسین ہے۔

امجد کے ہاں فکری تروتازگی بھی ہے۔ تجربات کی بوقلمونی بھی اور وہ غنائیت بھی جو حسنِ تغزل کی نمایاں اور امتیازی خصوصیت ہے۔ اس غنائیت کا اظہار جا بجا محسوس ہوتا ہے۔ بھرپور اظہار۔ ہوا سیٹی بجاتی ہے۔ یہ پوری نظم ایک نغمہ ہے۔ اس میں داخلی نغمگی بھی ہے اور خارجی نغمگی بھی۔

ایک اور بات جس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ امجد کی عشقیہ واردات میں جوانی کی ندی کے تیز پانی کے شور و خروش کی کیفیت تو ہے اور ہونی بھی چاہیے مگر یہ کیفیت پاکیزگی کے تصور کا بھی احساس دلاتی ہے۔ اس میں سطحیت قطعی نہیں ہے۔

وحید قریشی

''ساتواں در'' پر لکھتے ہیں:

امجد کی جذباتی کیفیات فیض کی رومان پسندی سے خاصی نسبت رکھتی ہیں اور جب وہ شعوری طور پر قاسمی کی تقلید میں حیات وکائنات کے مسائل اٹھانے اور مشیّت کے بارے میں اظہار رائے کی کوشش کرتا ہے تو اس وقت وہ قاسمی بننے کی بجائے بقراط بن جاتا ہے۔ فیض اور قاسمی سے اثر پذیری ایک لحاظ سے اس کے شعور اور لاشعور کے درمیان مسلسل جنگ قرار پاتی ہے۔ وہ ابھی تک جذباتی طور پر اس آویزش سے رہائی نہیں پاسکا۔ اس کشمکش سے نکلنے کے لیے شاعر بعض عصری رجحانات کا سہارا لیتا ہے جو اسے اپنے ماحول سے قریب لائے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ قرب بھی اسے ایک وحدت میں تبدیل نہیں کرتا۔ میرا جی کے دور میں آنچل کی سرسراہٹ، ہوا کی کسمساہٹ اور بادل اور سایوں کے متعلقات، شعری تحریک کے خام مواد تھے۔ ہمارے زمانے میں شہر، گاؤں، دروازہ، روزن، تاریکی، سورج، سایہ اور سفر کے الفاظ شعری علامات کا کام دے رہے ہیں۔ امجد اسلام امجدؔ، فیضؔ اور قاسمیؔ کے اثر سے نکلنے کے لیے ان کا سہارا بھی اختیار کرتا ہے اور انہیں علامتی حیثیت دے کر اپنے انفرادی جذباتی رویوں کا پتہ لگاتا ہے۔ ''برزخ'' کے مقابلے میں ''ساتواں در'' میں امجد انفرادی رنگ کو اجاگر کرنے میں زیادہ کامیاب ہے۔ اس لیے کہ مذکورہ الفاظ اس کے لیے محض فرار کا راستہ نہیں رہے بلکہ علامتی روپ میں اس کے ذاتی احساسات کو بیرونی سطح پر مشخص کرنے کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ امجد اسلام امجد کی محبوب تراکیب اس کے جذباتی رویوں کی وضاحت کا لسانی پیکر ہیں۔ شہر،

دروازہ، سورج، سایہ، تاریکی، موج، سمندر، ہوا، خوشبو، آنسو، اجالے، خواب، ویرانی اور آئینہ الفاظ کے وہ رنگ ہیں جن سے امجد کے جذباتی رویوں کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے اور انہیں کے حوالے سے اس کا انفرادی رجحان نمودار ہونے لگا ہے۔ وہ ان محدود الفاظ کی مدد سے بعض نئی امیجز وضع کرتا ہے۔ یہ امیجز اس کی ذات کے ناتمام حصوں کی تکمیل کرتی ہیں۔ داخلی ضرورتوں کو یہ الفاظ خارجی طور پر ہی معین نہیں کرتے بلکہ مادی زندگی کے بعض واضح حصوں سے بھی منسلک ہیں۔ زمین، مٹی اور رزق کے الفاظ شاعر کو اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کا باعث بھی ہیں۔ خارج سے ناتا جوڑنے کی یہ کمزور کوشش اسے بار بار الفاظ کے مجازی استعمال کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ رزق کا لفظ امجد کے لیے ناگزیر ضرورت ہے جو اسے رسمی اور رواجی شاعری سے الگ کرتی ہے۔ افق کا رزق، رزقِ غبار، خاک کا رزق، زمین کا رزق، آنسوؤں کا رزق، کائنات کو نگل جانے والے سمبل کے طور پر امجد کے جبلی رجحان کے مظہر ہیں:

اپنی اپنی شام میں جو اس دشتِ افق کا رزق ہوئے پر
روشن ہیں، گہنائے نہیں

عمر اسی تضاد میں، رزق غبار ہوگئی
جسم تھا اور عذاب تھے، آنکھیں تھیں اور خواب تھے

گلزار

امجد اسلام امجد میں لکھتے ہیں:

ان کے سب کاموں کے علاوہ امجد بھائی کی شاعری ماشاء اللہ۔ شاعری کی تقریباً ہر صنف میں لکھا ہے۔ غزل بھی، گیت بھی، نظم بھی، نعت بھی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے اتفاق رکھتے ہیں یا نہیں، لیکن نظم میں وہ اس طرح سنائی دیتے ہیں جیسے بات کر رہے ہوں۔ کسی طرح کا کوئی اٹکاؤ ان کے انداز بیان میں نظر نہیں آتا۔

سب کچھ ایسے ہی ہوجائے جب ہے نا
چاند مری کھڑکی میں آئے تب ہے نا

''تب ہے نا'' پڑھتے ہوئے میں ان کی ہلتی ہوئی گردن دیکھ سکتا ہوں۔ روانی یوں ہے کہ بغیر لَے کے پڑھا جائے تو نثر کی طرح بہتی ہے۔ بحر میں پڑھا جائے تو ترنم سنائی دیتا ہے۔ اتنے ہلکے ہلکے پیروں سے چلتی نظموں کا یہ شاعر اپنے پیچھے ایک بہت بڑا سماجی شعور رکھتا ہے۔ وہ اپنے وقت کی آواز سے بے بہرہ نہیں۔ وہ ہر آہٹ پر کان لگائے بیٹھا ہے اور جانتا ہے کہ وقت صحراؤں کی طرح کروٹ لیتا ہے۔ وہ چلا کر عوام کے کان نہیں کھاتا۔ بڑی نرمی سے بات کرتا ہے۔ سوال کرتا ہے اور جان نکال لیتا ہے۔

میرے شہروں کو کس کی نظر لگ گئی
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سورج لیے
رات کیوں ہوگئی

میں کہاں تک حوالے دیتا رہوں۔ امجد اسلام امجد کی شاعری کے دیوان کے دیوان دوبارہ نوٹ کرنے پڑیں گے۔

اعجاز حسین بٹالوی

''لفظوں کا ہجر و وصال'' میں لکھتے ہیں۔

امجد اسلام امجدؔ لفظ شناس ہیں۔ الفاظ کا استعمال کفایت سے کرتے ہیں۔ وہ لفظ کے جادو سے بھی واقف ہیں، اور اس کی بے بسی سے بھی آشنا ہیں۔ وہ لفظ کی وسعت اور اس کی محدودیت دونوں کے راز دان ہیں۔

امجد اسلام امجد کی شعری لفظیات میں موسم ستارہ، خوشبو اور خواب کے الفاظ کی تکرار ہے۔ ان کے شعری ڈکشن میں خواب کا لفظ بہت حاضری دیتا ہے۔

امجد اسلام امجدؔ کی شعر سازی اور حرف شناسی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ لفظ قفل بھی ہے کلید بھی، لفظ ہجر بھی ہے وصال بھی، لفظ خوف بھی ہے نوید بھی۔ وہ تلاش کر کے لفظوں کو جوڑتے ہیں کہ شاید اس ملاپ سے انسانوں کی خوشی کا گیت بن سکے۔

اختر حسین جعفری

امجد اسلام امجدؔ ''برزخ سے ذرا پھر سے کہنا'' تک میں لکھتے ہیں:

برزخ میں امجد اسلام امجد ایک ایسے صاحب اسلوب نظم گو کی حیثیت سے ابھرتا ہے جسے اس صنفِ سخن کے تکنیکی پس منظر اور روایت کی مکمل شناخت حاصل ہے۔ ن م راشد، میرا جی اور مجید امجد کے حوالے سے آزاد نظم میں شعری اظہار کی جو روایت اور Pattern موجود تھے، امجد نہ صرف ان ماڈلز سے پوری طرح آگاہ ہے بلکہ وہ ان کے اطلاقی عمل میں کانٹ چھانٹ کی استعداد اور ہنرمندانہ اہلیت بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ برزخ (جو اس کی ابتدائی کتاب ہے) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محولہ بالا ماڈلز میں سے وہ صرف انہی تمثالوں سے استفادہ کرتا ہے جو اس کے فکری مواد کی شعری شناخت کے عمل میں سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔ برزخ میں امجد کے ہاں راشد کے طویل سطری اظہار Long Line Naration اور مجید امجد کی نظم آٹو گراف میں موجود صوتی پیکر Sound Pattern سے نمو پذیر ہونے والے تکنیکی منظر نامے کے شواہد ملتے ہیں لیکن ان ہر دو شعرا میں سے کسی ایک کی بھی مکمل چھاپ اس کی کسی نظم پر موجود نہیں۔ ہاں ان شعرا کی تکنیکی تمثالوں اور تجربوں کو وہ اتنی ہنرمندی سے استعمال کرتا ہے کہ وہ اس کی شعری شخصیت کا حصہ بن کر عالم وجود میں آتے ہیں۔ تکنیک کے استعمال میں اس انفرادیت تک رسائی میں جو عوامل کارفرما نظر آتے ہیں ان میں پہلا سبب یہ ہے کہ اپنے فکری مواد کے اعتبار سے امجد آئیڈیالوجی کا شاعر ہے جب کہ راشد اپنی انتہائے کار تک آتے آتے محض مجرد خیالات کا شاعر ہو کر رہ جاتا ہے۔

شعری اسلوب کے حوالے سے امجد کا برزخ سے لے کر ذرا پھر سے کہنا تک کا سفر نصف ابلاغ سے مکمل ابلاغ کی کیفیات کا حامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ Over Simlplification کے مندرجہ بالا طریقے نے اسے یک سطحیت کا شکار ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ اثر آفرینی کے اعتبار سے اس کا تخلیقی راستہ Method اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کوئی اور طریق اظہار۔

فکری سطح پر اس کے ہاں باقاعدہ سسٹم دکھائی دیتا ہے جس کے دائرہ کار کے اندر تصوراتی ، سیاسی، سماجی اور حیاتی نوعیت کے چھوٹے بڑے بہت سے سوالات ہیں۔ اپنے تخلیقی عمل میں وہ مطلق سچائی/حقیقت کی تعریف اور جستجو میں ان چھوٹے بڑے سوالوں کے جواب ڈھونڈتا ہے کہ اس کرۂ ارض میں انسان کی اصل حیثیت کیا ہے، کیا وہ لفظ بولنے والا حیوان ہے یا پھر کوئی مادی اشیا رنج و راحت کے سامان پیدا کرنے والی مشین یا پھر ایک ایسی روح جو اپنی ظاہری ساخت اور وجود سے نکل کر ایک دوسرے وجود کی تعمیر و تشکیل میں مصروف ہے، یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے سوالات ہیں جن کے جواب کے حصول کی سعی اس کے تخلیقی عمل کا حصہ بن کر سامنے آتی ہے۔

نئی شعری زبان تشکیل کرنے کے حوالے سے امجد کے ہاں کسی منضبط مساعی کے نشانات نظر نہیں آتے ،مگر ایسا بھی نہیں کہ اس علاقہ میں اس کے قدموں کے نشان ہی موجود نہ ہوں، برزخ میں دوسرے علوم کی لغت کو Poetify کرنے کی گواہی موجود ہے۔

محمد علی صدیقی

''امجد اسلام امجد'' ایک کامیاب تمثال ساز شاعر میں لکھتے ہیں:

انہوں نے اپنا شعری سفر کلاسیکی شاعری سے خصوصی رغبت کے ساتھ شروع کیا اور شاید اس لیے ان کے کلام میں روایتی رچاؤ کے ساتھ عصری حسیت کا اظہار اس قدر عمدگی کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ نہ تو روایتی شاعری کا مقلد نظر آتا ہے اور نہ ہی بعض جدید شاعروں کی طرح روایتی شعری اقدار سے بیزار اور لاتعلق۔

امجد اسلام امجد کی نظموں میں محبت کے موضوع پر کچھ انوکھے لیکن حیرت ناک طور پر سادہ صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا محبوب حقیقت پسند رومانوی محبوب ہے جو زندگی کے کارزار میں اسی قدر منہمک ہے جس قدر کہ شاعر۔ اگر امجد کی نظمیں (محبت کی) بالترتیب پڑھی جائیں تو پھر ان کی شاعری کا مزاج بڑی حد تک واضح ہوجاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس کے لیے محبت کے بارے میں نظریہ ہی سے متشکل ہوتے ہیں۔

امجد کی شاعری کا دوسرا اہم پہلو اپنی نسل میں شکستِ خواب کے فزوں تر احساس کی ترجمانی ہے۔ وہ ترقی پسند شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس کی شاعری غاصبوں، آمروں اور وطن کی عزت و ناموس سے کھیلنے والوں کے خلاف صدائے احتجاج کا درجہ رکھتی ہے۔ امجد اسلام امجد کی نظمیں اپنی جذباتی برجستگی کے باوجود جن میں نادر تمثال سازی کا فن نمایاں نظر آتا ہے۔ اظہار کی احتیاط اور کفالت کی عمدہ مثالیں پیش کرتی ہے اور وہ اس بنا پر جدید اردو شاعری کے چند معتبر ناموں میں سے ایک ہیں۔

شہزاد احمد

''امجد کی شاعری محبت اور وقت کے آئینے میں'' میں لکھتے ہیں:

امجد اسلام امجد کو بنیادی طور پر ایک رومانوی شاعر ہی کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس کا مرکزی مسئلہ محبت ہے۔ یہ الگ بات

کہ وہ محبت کا ایک روپ نہیں کئی رُوپ بیان کرتا ہے۔ محبت اس کے نزدیک بیک وقت اجاڑ دینے والی اور آباد کرنے والے شئے ہے مگر اس دوہرے رویہ کے باوجود ہر شئے پر محیط ہے اور کوئی بھی لمحہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں۔ زندگی کے بارے میں اس کا یہ رویہ اس کے سبھی شعری مجموعوں میں جاری و ساری ہے حتیٰ کہ گیتوں کا مجموعہ ''آنکھوں میں تیرے سپنے'' بھی اظہار کا یہی پہلو لیے ہوئے ہے۔ محبت کے موضوع کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں وقت کے بارے میں ایک نیم مابعد الطبیعاتی تصور چلا آرہا ہے۔ فی الحال یہ سمجھ لیں کہ امجدؔ کے لیے وقت کا مسئلہ ایک غیر معمولی اہمیت کا مسئلہ ہے اور محبت کے بعد شاید سب سے زیادہ اس نے اسی موضوع پر لکھا ہے۔

سمے کے سمندر، کہا تو نے جو بھی، سُنا پر نہ سمجھے
جوانی کی ندی میں تھا تیز پانی، ذرا پھر سے کہنا

فتح محمد ملک

امجد اسلام امجدؔ ''دل اور دنیا سے باتیں'' میں لکھتے ہیں۔

امجد کی شاعری اور امجد کی تمثیل نگاری ایک دوسرے کی زوجین ہیں۔ اگر شاعری نے تمثیل نگاری کو فکر و تخیل کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے تو تمثیل نگاری نے شاعری کو مکالمہ نگاری بیانِ واقعہ اور ڈرامائیت کے ہنر سکھلا دیے ہیں۔ یہ ہنرمندی اور تازہ کاری امجد کی نظموں میں بدرجہ اتم جلوہ گر ہے۔ اب جان و جہان و جاناں کی واردات نے باتوں کا پیرایۂ بیان اختیار کر لیا ہے۔ گزشتہ بیس برس کے دوران امجد نے محبت کے اعجاز اور جسم کے اسرار پر علمی سے زیادہ تخلیقی انداز میں غور و فکر کیا ہے۔ جذبۂ عشق اور محبت کا چلن کی معنویت کو عقلی استدلال کی مدد سے سمجھنے میں ناکامی انہیں اپنے تجربات سے پھوٹنے والی آگہی کی روشنی میں لا بٹھاتی ہے۔ چنانچہ وہ روح و بدن کے اسرار پر اپنے محبوب کے ساتھ مل کر غور و فکر کرنے لگتے ہیں۔ اس موضوع پر کہی گئی متعدد خوبصورت نظموں میں سے ایک کا عنوان ہے ''کیا کبھی تم نے سوچا ہے۔'' جسمانیت کے روحانی ابعاد کا احساس طبعیات اور مابعد الطبعیات کا ابتدائیہ بنا کر رکھ دیتا ہے اور اپنے رفیق کو اپنی باہمی جسمانی وابستگی اور پیوستگی کی روحانی معنویت بتانے لگتے ہیں۔ امجد کے ہاں خلقِ خدا کا تصور تجریدی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ وہ قومی ملی حدود میں بسنے والی مظلوم مخلوق کو دائرہ انسانیت سے باہر سمجھ کر اپنی انسان دوستی کا پرچار کرنے والوں سے بہت مختلف فنکار ہے۔ وہ مسلمانوں کو بھی انسان سمجھتے ہیں اور ان کے انسانی حقوق کے تحفظ کی جنگ کو بھی انسانیت کی عمومی بقا کی جنگ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ میں آسانی کی خاطر ان کی شاعری کو قومی، ملی اور آفاقی حصوں میں بانٹ کر دیکھنے کی جسارت کرتا ہوں۔

افتخار عارف

امجد اسلام امجدؔ ایک تاثر میں لکھتے ہیں:

کلاسیکی شاعری کے گہرے مطالعے نے امجد کے لیے غزل میں بہت آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ امجد کی شاعری کا عنصر غالب تمام اچھے شاعروں کی طرح ''محبت'' ہے۔ رومان سے لے کر عشق تک کی ساری منزلیں امجد کی شاعری میں ملتی ہیں لیکن

اصل بات یہ ہے کہ اس کے ہاں جو کچھ بھی ہے وہ ''محبت کا پھیلاؤ'' ہے۔ یہی پھیلاؤ اس کی غزل میں بھی نظر آتا ہے۔ نظموں میں بھی لشکارے مارتا ہے اور اس کے گیتوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امجد کو رشتوں اور قدروں کو سمجھنے اور پرکھنے والی نظر دی ہے۔ زندگی کی جدوجہد نے اسے تجربوں کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ مطالعے نے اس کو زبان و بیان کے ادب آداب سے مکمل آگہی بخشی ہے اور پھر یہ کہ آغازِ سفر ہی سے قابلِ رشک مقبولیت نے امجد کی ذات میں ایک ایسا اعتماد پیدا کر دیا ہے کہ جس نے اس کے سفر کی ممکنہ منزلوں کو سہل اور بہت خوشگوار بنا دیا ہے۔ امجد کے بعض ''بہی خواہ دوست'' یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ اگر وہ میڈیا اور مشاعرہ بازی اور مجلسی زندگی سے احتراز کرتے تو ان کے شعری قدوقامت میں اور اضافہ ہوتا۔ مجھے اس کے ماننے میں ذرا تامل ہے۔ ادب اور شعور کے سلسلے میں کوئی فارمولہ نہیں ہوتا۔ بہت مصروف مجلسی زندگی یا دنیاوی زندگی گزارنے والے بھی تخلیقی وفور سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں کہ وہ تحریر کی طرف واپس آئیں۔ امجد کے شعری سفر کا تسلسل اس کی سب سے بڑی گواہی ہے۔ غزل کے علاوہ نظم میں بھی امجد نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک سے زیادہ فنون میں استعداد رکھنے والے لوگ اظہار کی منزل میں ایک خاص طرح کے تخلیقی امتزاج سے گزرتے ہیں۔ ٹیلی ویژن ڈرامے کے بعض عناصر امجد کی نظموں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ Climax کی طرف بڑھتی ہوئی نظمیں اور ایک خاص طرح کے بصری پیکر اور ایسا پیرایۂ بیان کہ ایک سے زیادہ سطحوں تک ابلاغ کی صورتیں پیدا ہو جائیں۔ یہ امجد کی شاعری کو امجد کے ڈرامے کی دین ہے۔ ستر کی دہائی کے شعرا میں کم دوست ایسے ہوں گے جنھوں نے اتنی خوبصورت نظمیں پیش کی ہوں جتنی امجد کے ہاں ملتی ہیں۔ سہل، رواں اور مترنم بحروں میں امجد کے شعری آہنگ کے کمالات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر زبان و بیان کے حوالے سے امجد بہت پکے اور اچھے شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں۔

انور مسعود

امجد اسلام امجد ''فکر و فن'' میں لکھتے ہیں۔ یہاں ہم صرف چند اہم نکات پیش کریں گے۔

ا: امجد ستر کی دہائی میں ابھرنے والا وہ ممتاز ترین شاعر ہے جس نے لسانی تشکیلات کے ہنگامے میں اپنی سلامتیٔ طبع کو قائم رکھا۔ یہ وہ دور تھا جس میں قافیے کو اچھوت قرار دے کر نظم سے بے دخل کر دیا گیا تھا اور نظم کی نغمگی گھائل ہو کر رہ گئی تھی۔ امجد کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ زیادہ پائیدار چیزیں تجربے اور روایت کے امتزاج سے جنم لیتی ہیں۔

ب: امجد کا کمال یہی ہے کہ اس نے پابند نظم سے ایسا انحراف کیا ہے جو انحراف محسوس نہیں ہوتا۔ یہی غیر محسوس انحراف کا گلِ دستار ہے۔

ج: یہ طلسم کار نظم میں قافیے بھی ایسے لاتا ہے جن کی موسیقی نظم کے مجموعی موڈ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

د: امجد کے اسلوب ترکیب سازی میں بہارِ عجم دکھائی دیتی ہے۔

ھ: امجد کی غزلوں اور نظموں کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جس کا آغاز حمد و نعت سے نہیں۔

و: امجد کے ہاں ترقی پسندی کے بڑے صحت مند عناصر موجود ہیں لیکن وہ نعرہ بازی سے اپنے دامن کو بچا رکھتا ہے۔

ز: امجد نے عہدِ حاضر کے فرعونوں، نمردوں، قارونوں اور ہامانوں کی سیہ کاریوں اور ستم رانیوں کی ڈٹ کر مذمت کی ہے۔

ح: امجد کی شاعری کے بارے میں یہ بات سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے کہ اس کی اپیل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ امجد کی

شاعری میں کوئی بھید ایسا ہے جو خواص کو بھی اور عوام کو بھی رضامند کرتا ہے۔ اس نے یہ طے کرلیا ہے کہ فقط وہ بات کروں گا جو سب سمجھتے ہیں۔

ط: امجد نے جو کچھ کہا ہے وہ بھی بہت اہم ہے جس طرح سے کہا ہے وہ محبت میں بھیگا ہوا رومانی پیرایہ اور ریشمی لہجہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ امجد کی شاعری محبت کے جزیروں پر انتظار کرنے والوں کی شاعری ہے۔

ی: میں سمجھتا ہوں امجد کے انکسار کے باوجود اس کی غزل کم توجہ طلب نہیں۔ امجد غزل میں ایسے ایسے شعر کہہ گیا ہے جو سیدھے دلوں میں اترتے ہیں اور انسانی حافظے میں مستقل قیام کرتے ہیں۔

خورشید رضوی

''شاعر امجد'' میں لکھتے ہیں:

امجد کی شاعری اس کی ذات کی طرح متنوع ہے۔ امجد کی نظر میں روح اور جسم عشق اور ہوس دونوں اسے ایک ہی سکّے کے دو رخ نظر آتے ہیں وہ صرف منظر کو نہیں پس منظر بھی دیکھتا ہے۔ اس کی نظموں میں جو اس کے کلام کی غالب صنف ہے زندگی اپنے تمام تر پھیلاؤ کے ساتھ عکس فگن ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ خالص فنی سطح پر سخت گیر نقاد امجد کے ہاں کہیں کہیں بعض پہلوؤں سے گرفت کی گنجایش نکال سکتا ہے لیکن سخت گیری اگر خوش مذاقی سے یکسر خالی نہ ہو تو اس کے دل و دماغ پر حرفِ شیریں کے ان برجستہ نمونوں کی گرفت زیادہ دیر پا ثابت ہوگی جن میں تجربے کا عمق احساس کی صداقت اور اظہار کے بے ساختہ پن کا رچاؤ چونکاتا ہے۔ امجد کی نظموں میں وہ حصے بطور خاص رکنے، سوچنے اور محسوس کرنے کا تقاضا کرتے ہیں جہاں احساس اسلوب اور موضوع باہم گھل کر ایک اکائی میں ڈھل جاتے ہیں۔

محمد منشایاد

''امجد ایک توانا تخلیق کار'' میں لکھتے ہیں:

امجد بنیادی طور پر شاعر ہے اور اسی حوالے سے اپنی پہچان کو باعثِ عزت و فخر خیال کرتا ہے۔ وہ جدید عہد کا شاعر ہے اس کا لہجہ توانا اور دلکش ہے اس کی شاعری عصر کے فنی اور فکری تقاضوں پر ہر لحاظ سے پورا اترتی ہے۔ امجد کو محبت حسن اور خیر کا شاعر کہنا چاہیے۔ امجد کی محبتوں کی فہرست طویل ہے وہ محبوب کو حقیقی اور مجازی کے خانوں میں تقسیم کرنے کا بھی قائل نہیں۔ امجد شعر کہتے ہوئے شعری زبان میں سوچتا ہے اس لیے اس کی نظم یا شعر کو نثر میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ امجد کی لفظیات اور علامات مظاہر فطرت اور زمین سے متعلق ہوتی ہیں جن میں وہ اپنی وارداتوں، تجربوں اور متنوع کیفیات کو استعاراتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ تارا ستارا اور نجم اس کا مرغوب ترین استعارہ ہے۔ امجد نے غزلوں کے مقابلے میں نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔ اس کی غزلوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کی لفظیات نئی اور ذائقہ تازہ ہے ان میں خوبصورت امیجری ہے۔ امجد نے نظم میں تغزل کو راہ دی ہے اکثر نظموں کو پڑھتے ہوئے فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ غزل کا شعر پڑھ رہے ہیں یا نظم کی لائنیں۔ تغزل نے نظم کو وہ دلآویزی عطا کی جو اس کے اکثر ہم عصروں کو نصیب نہیں۔

عارف عبدالمتین

''وسیع الاساس کمٹمنٹ کی شاعری'' میں لکھتے ہیں:

امجد اسلام کی ساری شاعری ہمیں ایک واضح اور وسیع الاساس کمٹ منٹ کی حامل نظر آتی ہے۔ ایسی کمٹ منٹ جو اپنے اندر انسانی اخوت کی عالمگیریت رکھتی ہے اور جس کا اظہار اس نے حمد اور نعت کے فوراً بعد ''نئے لفظوں کی خوشبو'' میں یوں کیا ہے:

میں ایسے لفظ لکھوں گا جو سب کے دل میں ہیں
فقط وہ بات کروں گا جو سب سمجھتے ہیں
اور ایسے رنگ چنوں گا جو میری گل میں ہیں

ہمارے بعض شعرا کے ہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نعرہ (پروپیگنڈہ) بنتی دکھائی دیتی ہے۔ یوں وہ شاعری کو پروپیگنڈہ کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں مگر جب ہم امجد کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی شاعری کو کہیں بھی نعرہ نہیں بننے دیا بلکہ اس نے شعری حسن و جمال اور شعریت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے کلام میں ایک گلی، محلے، شہر، ملک اور دنیا اور ان میں بسنے والے تمام انسانوں کے مسائل کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ دنیا میں بالخصوص تیسری دنیا میں ہونے والے تمام تبدیلیوں سے بخوبی آگاہ ہے۔

امجد ایک سچا اور کھرا محبِ وطن ہے۔ وہ وطن کے حوالے سے اپنی شناخت کرواتا ہے۔ وہ وطن کے لیے گیت لکھتا ہے اور اس کے ترانے گنگناتا ہے اور اس کی گونج چاروں اُور پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔

کہساروں کی گونج کی صورت پھیل گیا ہے وہ
میں نے اپنے آپ میں چھپ کر جسے پکارا تھا

اس کا خمیر حُبِ وطن سے اٹھنا چاہیے۔ انسان دوستی کا شجر صرف اسی وقت تناور اور ثمر بار ہوسکتا ہے جبکہ اس کی جڑیں اپنے مقدس وطن کی مٹی میں دور تک اتر گئی ہوں۔ عینیت پسندانہ اور مطلق انسان دوستی کی پرداخت اس شجر کو پروان چڑھانے کی کوشش کے مترادف ہے، جو خلا میں معلق ہو اور ظاہر ہے اس کوشش کی لاحاصلی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

امجد اسلام امجد کی انسان دوستی نے اسے تمام ممالک کے عوام سے محبت کرنا سکھایا ہے اور اسے ان کے حسن کارکردگی کی بے محابہ تحسین کا حوصلہ عطا کیا ہے اور اس کی حبِ وطن نے اسے اپنی دھرتی کے باسیوں سے پیار کرنے کا درس دیا ہے اور ان کے دکھ سکھ میں بھرپور شرکت کی توفیق ارزانی کی ہے، جہاں انسان دوستی نے امجد اسلام امجد کو ''فرزند چین کے نام ایک نظم'' جیسے فن پاروں کی تخلیق پر قادر کیا ہے، وہاں حبِ وطن نے اسے ''سوا گت'' جیسی نگارشات کو وجود میں لانے کی استعداد بخشی ہے۔

مشفق خواجہ

''شہر در شہر'' امجد کے بعض دوستوں کا اعمال نامہ بھی ہے'' میں سات آٹھ صفحات کی ہنسی مذاق اور ادھر اُدھر کی باتیں لکھنے کے بعد دو تین جملے جو امجد کی شاعری اور نثر پر لکھتے ہیں وہ یہاں من وعن پیش ہے۔

''ہم نے امجد اسلام امجدؔ کی شاعری بھی پڑھی ہے اور اب ان کا سفرنامہ ''شہر در شہر'' بھی پڑھ لیا ہے وہ بہت اچھے شاعر ہی نہیں، نہایت عمدہ نثر نگار بھی ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شاعری میں وہ داغ بہ دل نظر آتے ہیں اور نثر میں خندہ بلب۔ امجد زندگی کی محبت اور محبت کی زندگی کے قائل ہیں، اس لیے ان کی شاعری دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہے اور پڑھنے والے کو سوچنے کی راہ دکھاتی ہے۔ اس کے برخلاف امجد کی نثر قاری کو تو کیا خود امجد کو بھی سوچنے کا موقع نہیں دیتی۔ امجد کی طبع کی روانی ہی ان کی نثر کی روانی بن جاتی ہے جس کے ساتھ قاری خس و خاشاک کی طرح بہتا چلا جاتا ہے۔

پیرزادہ قاسم

''امجد اسلام امجدؔ کی شاعری'' میں لکھتے ہیں:

مشاہدے اور تجربے کی روشنی سے اس نے اپنے سخن کے در و بام کو اُجالا ہے۔ عصری آگہی اور سماجی شعور نے اس کے موضوعات کو جلا بخشی ہے اور یوں امجد کی شاعری محبت، دیانت، شائستگی، دردمندی اور خیرِ کثیر کے جذبوں سے مالا مال کیا ہے۔ تخلیقی شعور اور بیش حسی نے اس کی فکر کی تربیت اس طرح کی ہے کہ وہ خوشبو کو دیکھ سکتا ہے ہوا سے مکالمہ کر سکتا ہے، خواب کو تعبیر بنا سکتا ہے اور یوں ایک حساس تخلیق کار کے طور پر امجد گزرے اور آنے والے زمانوں کے درمیان اپنے ہونے سے ایک خوبصورت رابطہ پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ امجد کی شاعری کا بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کی نظمیں اپنے موضوعات، اپنے پھیلاؤ اور اپنی اثر انگیزی کے حوالے سے اپنی الگ پہچان بنا چکی ہیں۔

امجد کی سنجیدہ اور Motivatang شاعری اپنے کئی روپ اور انداز رکھتی ہے۔ لیکن ان تمام صورتوں میں اس کی سوچ کا محور انسان، انسان دوستی اور انسانیت کی فضیلت ہے۔ امجد کی غزلیں بھی ہیں جو دامن کھینچتی ہیں۔ اس کے اشعار غزل کی عظیم زندہ روایت پر قائم اور جڑے ہوئے ہیں اور اختصار و اعجاز کی یہ کرشمہ سازیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں اسی لیے امجد کی غزل ایک الگ مطالعہ کی متقاضی ہے۔

اے بی اشرف

''امجد اسلام امجدؔ دورِ جدید کا ایک اہم شاعر'' میں لکھتے ہیں:

امجد بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں اور ان کی شناخت کا سب سے بڑا حوالہ ان کی شاعری کو ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ امجد کی شاعری میں وہ سارے عناصر موجود ہیں جن کی بدولت وہ زندہ بھی رہے گی اور اپنی الگ پہچان بھی کرائے گی۔ امجد اسلام

امجد نئی نسل کے ان شاعروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے شاعرانہ اظہار کے لیے نظم کا سانچہ اختیار کیا۔ ان کی غزل بھی ایک نیا ذائقہ رکھتی ہے۔ امجد اسلام امجد کا امیج فیض، راشد، مجید امجد اور احمد ندیم قاسمی کی طرح ایک حساس مروجہ نظام اقدار کے باغی اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والے شاعر کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ امجد جیسے حساس شاعر کے اندر کا انسان تو بے حد متحرک رہتا ہے۔ اس کی نظموں میں ڈرامائی کیفیت واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے کبھی یہ ڈرامائی عکس مناظر کی صورت میں دکھائی دیتا ہے، کبھی مکالموں کی شکل میں اور کبھی قصے اور کہانی کی سی کیفیت میں۔

امجد نے ہمارے دور کی داخلی تاریخ اپنی نظموں میں رقم کی ہے۔ ہمارے دور کی منافقتیں، ریاکاریاں، دہرا معیار، تضادات اور منفی اقدار ان سب کا حوالہ جو ہماری زندگی کا حوالہ ہے ان کی نظموں میں بار بار ملتا ہے۔

امجد کے ایک ایک حرف میں سوچ کی خوشبو، دل کا اجالا، ہجر کا لاوا، غم کا سلیقہ اور درد کا لہجہ موجود ہے۔ اس کی غزل میں شمع کی لو بنتی ہے ایسی لو جو روشنی کی علامت ہے اور ان کی نظم میں غم کا سلیقہ اور درد کا لہجہ موجود ہے جو اسے دوسرے بہت سے شاعروں سے منفرد بناتا ہے۔

بلاشبہ امجد کی شاعری میں بنیادی حوالہ محبت کا بنتا ہے لیکن ان کی محبت کا تصور روایتی اور تقلیدی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان کی دورِ شباب کی نظموں میں بھی غیر حقیقی اور خواب ناک خیالی محبت کا وجود ناپید ہے۔ وہ سایوں، سہاروں، خوابوں اور سرابوں کے تعاقب میں نہیں رہتے۔ ٹھوس اور سچی محبت کی تلاش میں ملتے ہیں۔ وہ واہموں کا پیچھا نہیں کرتے، حقیقتوں کو چھونے کی تمنا کرتے ہیں۔ خواہ ان حقیقتوں کے عقب میں کتنی کلفتیں، کتنی نارسائیاں اور کتنی ناکامیاں ہی کیوں نہ چھپی ہوں۔ اسی طرح مظلوم کی طرف داری، جاگیرداری اور استحصالی نظام کے خلاف صدائے احتجاج، قومی اور بین الاقوامی واقعات و سانحات کے حوالے، معاشرے میں پھیلے ہوئے جبر اور گھٹن کی فضا کی عکاسی، وطن کی بے حرمتی اور عوام کی بے بسی کے مناظر، مادیت پرستی کے شکوے، موجودہ ظالمانہ اقدار و نظام کے خلاف بغاوت اور نئے معاشرے کی تعمیر کی خواہش و آرزو ان کے کلام کے نمایاں موضوعات ہیں، لیکن ان سب سے الگ خالصتاً شعری حسن کے لحاظ سے ایسی نظمیں اور غزلیں اور اشعار بھی موجود ہیں جو ذوقِ جمال کے لیے دلکشی کا باعث بنتے ہیں۔ ان میں خالص رومانی شاعری کا عکسِ جمیل ہے۔ ایسی نظمیں یا غزلوں کے ایسے اشعار لطیف طرزِ احساس اور جدید تر اسلوب اظہار کا نمونہ ہیں۔

منصورہ احمد

امجد اسلام امجد میں کہتی ہیں:

وقت امجد کی شاعری کا سب سے بڑا کردار ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ہی اس کے شب و روز کی باگ ڈور ہے۔ یہ اسے کبھی ناسٹلجیا دیتا ہے اور کبھی احساس زیاں۔ امجد کی شاعری صرف ظاہر کی آنکھ سے نظر آنے والی زندگی کا ہی احاطہ نہیں کرتی، مابعد الطبیعیات اور ورائے نظر حیات پر بھی غور کرتی ہے۔ امجد کی شاعری کا دوسرا بڑا قصر محبت کے مٹی اور گارے سے تعمیر ہوتا ہے۔ وہ محبت جو اس نے کرنا چاہی اور کی یا جو اس سے چھن گئی اپنے گلابی اور سرمئی رنگوں کے ساتھ اس کی شعری کائنات میں

جابجا موجود ہے۔ امجد کے نزدیک جو کچھ بھی ہے محبت کا پھیلاؤ ہے۔ خواہ تلاطم ہو یا ٹھہراؤ، ہر کیفیت محبت کے عکس سے ہی بامعنی ہوتی ہیں۔ امجد نے بیک وقت اس کو روپ کا داؤ اور پیار کا گھاؤ کہا ہے۔

شفیع ضامن

''چراغ اور آئینہ'' میں لکھتے ہیں:

امجد کی شاعری روایت اور جدت کا ایک دلکش امتزاج ہے۔ اس کے اشعار میں ایسی ایسی نئی تراکیب، نئی تمثالیں اور نئی علامتیں بکثرت پائی جاتی ہیں جو اگر ایک طرف ہماری شاعری کے عصری مزاج کی آئینہ دار ہیں تو دوسری طرف ان کا رشتہ ہماری کلاسیکی شاعری سے مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں امجد فطرتاً ایک خواب پرست اور رومانیت پسند نوجوان ہے۔ خواب ایک بہت بڑا شعری محرک ہے اور جمالیاتی قدر بھی ہے۔ امجد کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے خوابوں کے بکھر جانے کے باوجود ان سے دست کش ہونے کو تیار نہیں۔

عبدالخالق تنویر

''امجد اسلام امجدؔ محبت کا شاعر'' میں لکھتے ہیں:

زندگی اور اس کی رعنائیوں کا اسیر فنکار تاریکی، جبر، بدصورتی، نفرت، بے حسی اور ناانصافی کو قبول نہیں کرسکتا۔ وہ فنکارانہ سطح پر آمادہ پیکار رہتا ہے۔ حسن وخیر کے نغموں کے ذریعے پڑھنے والے کے ذوقِ جمال کی تربیت کرتا ہے۔ ظلم وجور کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ امجد ہر بڑے فنکار کی طرح وطن اور اہلِ وطن کے خلاف روا رکھے جانے والے ستم اور گلیوں کی ویرانی پر کڑھتے ہوئے پکار اٹھتا ہے:

تاریخ کے چکّر میں وہ موڑ نہیں آیا
جب شاد مکیں ہوں گے آباد نگر ہو گا

امجد اسلام امجدؔ کا آزاد نظم لکھنے والے ان شعرا میں ایک معتبر نام ہے جنھوں نے اس صنف کو جمال و رعنائی بخشی۔ پابند نظم یا غزل کے توانا وجود کے مقابل آزاد نظم کو جو اعتماد و اعتبار ملا وہ امجد جیسے شاعروں کا رہینِ منت ہے۔ امجد الفاظ کے محتاط انتخاب، ان کی ماہرانہ تنظیم و ترتیب، بعض مواقع پر پابند مصرعوں کا اہتمام، الفاظ کی تکرار اور قوافی کے التزام سے ایسا آہنگ پیدا کرتا ہے جو نظم کی فکری توانائی کے ساتھ مل کر قاری کو سحر زدہ کر دیتا ہے۔ نظم کو اس انجام تک پہنچانے میں فنکار کو تہذیبِ شعر کے جن جاں گسل لمحوں سے گزرنا پڑتا ہوگا اس کا اندازہ کچھ مشکل نہیں۔

نوشی گیلانی

''پہلی بات'' میں لکھتی ہیں:

اس عہد سوگوار میں جہاں ہر حساس وجود ایک مسلسل اداسی کے حصار میں ہے امجد بھی کہاں اس سے گریز کر سکا۔ کہیں کہیں اَن کہی بات کا کرب اور ان سنی صدا کی تڑپ اس کی شاعری کے چہرے پر یوں پھیل جاتے ہیں کہ آنکھیں پاگل ہونے لگتی ہیں۔

امجد اسلام امجدؔ کی شاعری نظریہ محبت کے پھیلاؤ کی شاعری ہے۔ اس نے اپنے اندازِ تخلیق سے غیر محسوس طور پر معاشرتی شعور بھی بیدار کیا اور رومان کے قرینے بھی وضع کیے۔ محبت کی عالمگیر چاندنی اس کی شاعری میں اتر آئے تو مصلحتوں اور منافقتوں کے غبار میں بھی دلوں تک اپنا راستہ بنالیتی ہے:

خواب خوشی کے بو جاتے ہیں لوگ محبت کرنے والے
زخم دلوں کے دھو جاتے ہیں لوگ محبت کرنے والے
تتلی تتلی لہراتے ہیں پھولوں کی امید لیے
اک دن خوشبو ہو جاتے ہیں لوگ محبت کرنے والے

سیّد ضمیر جعفری

''کچھ امجد، کچھ امجدستان'' میں لکھتے ہیں:

''برزخ'' سے لے کر ''ساتواں در'' تک، اس کا تخلیقی سفر اتنا طویل نہیں، جتنا جمیل ہے۔ قوت اور مسرت کی لہریں، اس کے فکر وفن میں، جڑواں بہنوں کی طرح، بانہوں میں بانہیں ڈالے جیسے ''کلی'' ڈال رہی ہوں۔ اس کا اسلوب پتھر پر رگڑا اور شبنم میں دھلا ہوا ہے۔ اس کی شاعری، عشق کے لائق بھی ہے اور احترام کی مستحق بھی۔ وہ اپنے شعر کی پھلکاری شعور اور وجدان کے تارِ حریر دو رنگ سے کچھ اس طرح فن کاری سے بنتا ہے کہ انسان اور زندگی کے مختلف روپ، آئینہ آئینہ اس کے مصرعوں میں بکھر جاتے ہیں۔ اس کے ہاں حسن اور مقصدیت کے امتزاج کی ایک ایسی خوش پیرہنی کیفیت ملتی ہے کہ کشش و کرامت کی اس ادا کا کوئی نام مجھے نہیں سوجھ سکا۔ قافیے، ردیف کی زنجیریں عموماً ہر مصرعے پر شاعر کو آواز دیتی ہیں۔ حضور آہستہ آہستہ، جناب آہستہ آہستہ! امجد اسلام امجدؔ میں یہ کمال دیکھا کہ وہ ان زنجیروں کو پگھلا کر خاصی تیزی سے مسافت طے کر لیتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی

''جان جاناں'' میں لکھتے ہیں:

یہ وہ امجد ہے جو فرد اور معاشرے کے بحران سے آنکھیں چار کرتا ہے جو وطن اور اہلِ وطن کی زبوں حالی دیکھتا ہے جیسے تیسری دنیا کے مسائل کا ادراک ہے جو امریکہ کے پابہ زنجیر نیگرو غلاموں کی بیڑیوں کی جھنکار سنتا ہے اور پھر شعری احساس کے ساتھ وہ سب کچھ قلم بند کرتا چلا جاتا ہے جو اس کے بیشتر ہم عصروں کا مسئلہ نہیں ہے اور اگر یہ سب کچھ کسی کا مسئلہ ہے بھی تو وہ اپنی بات تجرید کے پردوں میں چھپا دیتا ہے کہ اسے سمجھنا بذات خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

آپ یقین جانیں کہ اس معصوم سے شخص کی آدھی دشمنیاں ایسے معصوم فقروں سے جنم لیتی ہیں جو یہ اپنوں اور غیروں کی موجودگی یا عدم موجودگی میں ان کی طرف لڑھکا دیتا ہے، میں نے اسے کئی بار کہا ہے کہ تم اپنے طنز و ظرافت سے معمور فقروں کا رخ صرف اپنے دوستوں ہی کی طرف رکھا کرو کہ وہ جانتے ہیں تم ان لمحوں میں صرف ادب برائے ادب کے قائل ہوتے ہو، خدا کے لیے اس سلسلے میں غیروں کو معاف کر دیا کرو وہ تمہیں پوری طرح نہ جاننے کی وجہ سے یہ جملے ہضم نہیں کر پاتے اور پھر وہ پورے شہر میں ڈکار مارتے پھرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ عینک کے شیشے میں سے اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے مجھے جھانکتا ہے اور کہتا ہے تم ٹھیک کہتے ہو آئندہ میں تمہارے سلسلے میں احتیاط برتوں گا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبدؔ

امجد اسلام امجد میں کہتے ہیں:

جہانِ عشق میں قلب و نظر کے ترجماں امجدؔ
محبت کی زباں امجد محبت کا جہاں امجدؔ
رہے گا اہلِ الفت میں ہمیشہ تذکرہ ان کا
سبھی کو چاہنے والا سبھی پہ مہرباں امجدؔ
سدا پرواز میں رہتا ہے ان کی فکر کا طائر
ادب اور شعر کی دنیا کا بحرِ بیکراں امجدؔ

ریحانہ قمرؔ

امجد ہی جانتا ہے محبت کی شاعری
اس کی ہر ایک نظم گلابوں بھرا مکاں
اس کی ہر ایک نظم محبت کی داستاں
اس کی ہر ایک نظم بدن اور غم ہے جاں
اس کی ہر ایک نظم محبت کی زندگی
امجد ہی جانتا ہے محبت کی شاعری

''عکس'' پر مشاہیر کی آرا

یہاں ہم صرف امجد کے ایک مجموعہ جو فلسطینی نظموں کا ترجمہ ہے جو اردو شعر و ادب کی زینت بنا۔ جس پر مشاہیر نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کو پیش کرتے ہیں تا کہ امجدؔ شناسی میں مدد مل سکے۔

احمد ندیم قاسمی

امجد اسلام امجدؔ نے فلسطینی نظموں کے تراجم کے ذریعے ہمیں محض جدید عرب فکر ہی سے متعارف نہیں کرایا بلکہ مشرق وسطیٰ کی تاریخ کے اس نہایت نازک موڑ کے تمام امکانات، پاکستان کے اردو خوان طبقے کے لیے نہایت نفاست اور بلاغت کے ساتھ منتقل کر دیے ہیں۔ ''عکس'' ایک ادارے کا کام تھا جسے ایک فرد نے کمال چابک دستی اور فنکارانہ ذمہ داری کے ساتھ مکمل کیا ہے۔ نظم کا نظم میں اس سے بہتر اور دیانت دارانہ ترجمہ اردو میں شاید ہی دستیاب ہو سکے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

امجد اسلام امجدؔ کے عکس کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ خوش ہونے کی باتیں اور بھی بہت ہیں مگر خاص خوشی اس لیے ہوئی کہ اس میں مجھے اپنی ایک آرزو کی پہلی کرن نظر آئی ہے۔ میں نے ان نظموں کے بارے میں صحیح تاثر حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے امجد کا لکھا ہوا پیش لفظ پڑھا۔ اس کے بعد براہ راست اردو نظموں کا مطالعہ شروع کر دیا اور یہ بالکل فراموش کر دیا کہ یہ کسی اور زبان سے ماخوذ نظمیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر شاعر براہ راست عربی نظموں کی نقل اتارتا تو کامیاب نہ ہوتا مگر یہ تو عرب شاعروں کے احساسات ہیں۔ اردو شاعری میں اصل سے بہتر صورت میں یہ کیسے گھس آئے۔ یہ امجد اسلام امجد کی اختراع و ایجاد اور عربوں کی جذباتی زندگی سے یگانگی کی قوت کی کرامت اور سید محمد کاظم کی تاثراتی نفسیاتی اور شخصیت کا کمال ہے۔

محمد کاظم

میں عربی اور اردو دونوں طرف کی نظموں کو سامنے رکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ امجد نے اردو نظم میں ہر جگہ اصل شاعر کی جذباتی کیفیت اور مزاج اور احساس اپنے اوپر طاری کیا ہے اور اس میں اپنے مزاج اور طرزِ احساس کو کہیں مخل نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ جذباتی اور احساسی کیفیت دونوں زبانوں میں ایک ہی ہے۔ لیکن اس کے اظہار کے لیے وہ بارِ الفاظ کی پابندی نہیں کرتے۔ کہیں کوئی لفظ یا ٹکڑا زائد لانا پڑتا ہے، کہیں کوئی لفظ حذف کرنا پڑتا ہے تاکہ ترجمے میں شاعر کا موڈ اپنی اصل صورت میں برقرار رہے۔ شاعری کے ایک مترجم کے سامنے جب بھی یہ اختیار (Option) آئے گا کہ وہ یا تو اصل مفہوم و مدعا کا حق ادا کرے اور اس کی خاطر الفاظ اور جملوں میں ضروری ردو بدل روا رکھے اور یا وہ الفاظ اور مصرعوں کی پابندی ایک مذہبی فریضے کی طرح کرے اور اصل شاعر کی بات کے ابلاغ کو لفظوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے تو ایک ذہین اور فن کار مترجم ہمیشہ پہلی صورت کو ترجیح دے گا اور اسی کو اختیار کرے گا۔ یہی میرے دوست امجد اسلام امجدؔ نے اپنے ان منظوم ترجموں میں کیا ہے۔

سید ضمیر جعفری

''عکس'' کو امجد اسلام امجدؔ کی رنگا رنگ ذہانت کی شادابی و رعنائی کا ایک نیا عکس کہنا چاہیے۔ اس کی بے چین روح نامعلوم کن کن نامعلوم جزیروں کو دریافت اور ویران چوٹیوں کو آباد کر کے رہے گی۔ ادب کے زخار سمندر کی جولاں لہروں نے گزشتہ چند برسوں میں جن تابدار موتیوں کو اچھال کر ساحلوں اور آبادیوں کو روشن کیا ہے، ان میں امجد اسلام امجدؔ کی چھب بہت ہی خیرہ کن ہے۔ عجیب البیلا سا لڑکا ہے کہ زندگی کی گرد سمیٹتا ہوا انسانوں کے دلوں میں سماتا چلا جا رہا ہے۔

عارف عبدالمتین

امجد اسلام امجدؔ نئی نسل کے ان چند نمایندہ شاعروں میں سے ایک ہیں جو اپنی غیر معمولی ذہانت اور پُر مایہ خلاقیت کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ ''عکس'' کے حوالے سے انہوں نے اپنی ذہنی بالادستی کا اظہار ان عربی نظموں کے انتخاب سے کیا ہے جنھوں نے فلسطین کی اس تحریک آزادی کی کوکھ سے جنم لیا ہے، جو تیسری دنیا کی جملہ سامراج دشمن مزاحمتوں اور مقاومتوں کے نقطۂ عروج کی عکاس ہے اور جسے آج ہر نوع کی غلامی اور استعمار کے خلاف ضمیرِ انسانی کے شدید ردِ عمل کی روشن ترین علامت کا شرف حاصل ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو امجد اسلام امجد کا یہ انتخاب حریت کی اس عظیم انسانی تحریک کو ان کا خراجِ عقیدت ہی نہیں بلکہ اسے اس تحریک میں فنی سطح پر ان کی لائقِ تحسین شرکت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ''عکس'' کے وسیلے سے ان کی خلاقانہ پُر مایگی کے انشراح کا تعلق ہے وہ اس حقیقت سے آئینہ ہے کہ انہوں نے منتخبہ نظموں کا لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ ان کی اس انداز سے جمالیاتی ترجمانی کی ہے کہ ہم ہر قدم پر ارفع درجہ کی تخلیقِ مکرر کا احساس کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ عمل اپنی دشواری کے حوالے سے جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں اور کوہکن کو یہ معجزہ دکھانے کے لیے اگر ایک طرف ذہن و روح کی کاہش مسلسل کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے تو دوسری طرف تیشۂ فن کی ضرب پیہم کو بروئے کار لانا پڑتا ہے اور میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ امجد اسلام امجدؔ نے اپنے حسن کارانہ منصب کو کامرانی سے ہمکنار کرنے کے لیے دونوں تقاضوں کو بہ طریق احسن پورا کیا ہے۔

گلزار وفا چودھری

امجد اسلام امجدؔ نے والہانہ اور جذباتی شیفتگی کے ساتھ فلسطینی عوام کے کرب میں ڈوب کر ان نظموں کو اردو کا روپ عطا کیا ہے جس کی وجہ سے یہ نظمیں منظوم ترجموں کی بجائے بڑی حد تک تخلیق نظر آتی ہیں۔ عکس میں جناب محمد کاظم کا عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے جس میں انہوں نے مسئلہ فلسطین کے تاریخی عوامل کے پس منظر میں عرب شاعری کے ارتقا اور مزاج کا بے حد وقیع جائزہ پیش کیا ہے۔ عکس کی نظمیں وطن سے محبت، عوام سے محبت، سامراجی قوتوں کے خلاف مزاحمت، قومی غیرت اور قومی تشخص کے حوالے سے پاکستان کے پس منظر میں بھی اپنی بھرپور معنویت کو برقرار رکھیں گی اور اس لحاظ سے ہماری شعری و ادبی روایات میں ایک طاقت ور اور ناگزیر اضافہ تسلیم ہوں گی۔

مستنصر حسین تارڑ

امجد خود کہتا ہے کہ اسے عربی واجبی سی آتی ہے اور اس پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیے کہ عمر خیام کے مترجم فٹز جیرالڈ کو بھی فارسی واجبی سی آتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے رباعیات کا لازوال ترجمہ کیا۔ یہی بات تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ امجدؔ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

حفیظ تائب

امجد اسلام امجد نے عرب کے سوزِ دروں کو عجم کے حسنِ طبیعت اور قدسی ذوقِ جمال کے ساتھ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بڑا شاعر بھی ہے اور قافلۂ حق کا حدی خواں بھی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

عربی زبان کے چیدہ چیدہ جدید شعرا کی وہ نظمیں جن میں جدید طرزِ احساس کا اظہار ہوا ہے۔ امجد نے بڑی کامیابی سے اردو میں منتقل کی ہیں اور انہیں عکس کا خوبصورت نام دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

''عکس'' میں امجد اسلام امجد کو فلسطینی عربی نظموں کے ترجمے میں جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ انہوں نے پیکر شاعری سے زیادہ روح شاعری سے تعلق رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ ملی شعور کے حوالے سے انسانی قدروں کے ساتھ ان کا وہی کومٹ منٹ ہے جو فلسطین کے نوجوان عربی شاعروں کا۔ ایسے میں اگر امجد کے ترجموں میں جہدِ حریت کا وہی اضطراب و التہاب نظر آئے جس کا دوسرا نام نشیدِ حریت ہے اور جس کے لیے عربی نظموں میں خود فلسطینی شعرا کی روح ملتہب و مضطرب دکھائی دیتی ہے تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔

اعجاز حسین بٹالوی

امجد اسلام امجد صاحب نے اردو پڑھنے والوں پر احسان کیا کہ محمد کاظم صاحب کی مدد سے جدید عربی نظموں کا ترجمہ کر ڈالا۔ عکس کی نظمیں اپنے سوز ناتمام اور جذبے کی شدت کے اعتبار سے بہت موثر ہیں۔ فلسطینیوں کی ایک پوری نسل جس نے ساری عمر بے وطنی میں گزار دی اور بچپن اور جوانیاں مہاجرین کے کیمپوں میں بسر کر دیں کس طرح سوچتی اور کس طرح محسوس کرتی ہے۔ یہ نظمیں اُنہیں خیالات اور محسوسات کا آئینہ ہے۔

خالد احمد

امجد اسلام امجدؔ اپنی نظموں میں حرکی حقیقت نگار کے طور پر ابھرتے ہیں ''عکس'' کی اصل عربی نظمیں اپنے حرکی مواد کے بطون میں بیانیہ لہجہ رکھتی ہیں اور کسی حرکی تمثیل کاری سے مزین نہیں مگر امجد اسلام امجدؔ نے اصل نظموں کے متحرک مواد کو متحرک تمثیل کاری سے ممزوج کر کے انہیں ایک فنی تحریک سے بھی ہم کنار کر دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ امجد اسلام امجد نے فلسطینیوں کے تحرک کو پاکستان کے فنی تحرک سے ہم آہنگ کر کے ان زوردار بیانیہ نظموں کو جدید تر حسیت کی حامل جدید نظموں کے درجے پر فائز کر کے اس کی قدر و منزلت میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا اہتمام مترجم کو اپنے قارئین کا ذوق و معیار شعر پیش نظر رکھ کر بہر طور کرنا چاہیے تھا ورنہ تراجم تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

مرتضیٰ برلاس

امجد اسلام امجد نے چھ جدید عربی شعرا کی منظومات کا شعری ترجمہ کر کے اردو ادب کے قاری کو ان احساسات اور تجربات سے روشناس کرایا ہے جن سے فلسطینی قلم کار گزشتہ ربع صدی سے دوچار ہیں۔ اس ناقابلِ تردید حقیقت کے باوجود کہ شعری ترجموں میں اصل تخلیق کی باریکیاں، استعارے اور تشبیہات الفاظ میں چھپے ہوئے معنی اور مفاہیم کا صوتی آہنگ اور تراکیب لفظی کی نزاکتیں اور لطافتیں وہ آب و تاب قائم نہیں رکھ سکتیں جو ہر زبان کی ''شناخت کی ضامن ہیں لیکن امجد اسلام امجد کے تراجم کو پڑھ کر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر مترجم بھی ان کیفیات سے آشنا ہو جن میں ڈوب کر بنیادی تخلیق کار کسی شہ پارے کو تخلیق کرتا ہے تو مترجم بھی بڑی حد تک بنیادی تخلیق کی جذباتی کیفیت کو من و عن اپنے قاری کو پہنچا سکتا ہے۔

شعری انتخاب امجد اسلام امجد

(70 منظومات)

ترتیب

حمد	اے ربِّ ملائک وجن و بشر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں	امجد اسلام امجد	9
مناجات	مرے خدا، مرے آقائے محترم کے خدا!		
نعت	اَبر، خورشید، قمر		
معراج	ہے یوں تو ایک گردشِ پیہم میں کائنات		
سلام	بھٹک رہی ہے زمیں پہ خلقِ خدا ہراساں		
نظمیں	بس یہی بات پُوچھنی تھی مجھے	امجد اسلام امجد	
	روبوٹ		
	کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا		
	زیارت ریذیڈنسی میں ایک شام		
	اپنے دوست گلزار کے لیے ایک نظم		
	علی ذیشان کے لیے ایک نظم		
	ماں		
	ارضِ وطن کے لیے ایک نظم		
	ہم لوگ		
	میں نے دیکھا اُسے		
	تُمہیں مجھ سے محبت ہے		
	سیلف میڈ لوگوں کا المیہ		
	تو چل اے موسم گریہ		
	کلنٹن ٹھیک کہتا ہے		
	بے وفائی کی مشکلیں		
	رات کیوں ہوگئی؟		
	مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے!		
	ایک کمرۂ امتحان میں		

یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے
محبت کی ایک نظم
میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی
ہوائے شہرِ وفا شعاراں
سلسلے خیالوں کے
نئی نسل کا نوحہ
گواہی

غزلیں
تیرے اردگرد وہ شور تھا، مری بات بیچ میں رہ گئی — امجد اسلام امجد
آقا سے ہم غلام کریں گے حساب کیا!
اوجھل سہی نگاہ سے، ڈوبا نہیں ہوں میں
کیا کیا ہمارے خواب تھے، جانے کہاں پہ کھو گئے
دیر کائنات جو وا کرے اُسی آگہی کی تلاش ہے
شہرت، عروج، حُسن کی دولت، کسی سے بھی!
آنکھوں کا رنگ، بات کا لہجہ بدل گیا
بدن سے اُٹھتی تھی اُس کے خُوشبو، صبا کے لہجے میں بولتا تھا
کون سی چیز دل کے بس میں نہیں
چہرے پہ مرے زُلف کو پھیلاؤ کسی دن
کہاں آ کے رُکنے تھے راستے! کہاں موڑ تھا! اُسے بُھول جا
بھیڑ میں اک اجنبی کا سامنا اچھا لگا
تلاشِ منزلِ جاناں تو اک بہانہ تھا
دل کے دریا کو کسی روز اُتر جانا ہے
گزر گیا جو زمانہ اُسے بُھلا ہی دو
چاند کے ساتھ کئی درد پُرانے نکلے
حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارا ہے
اَب تک نہ کھل سکا کہ مرے رُوبرو ہے کون!
کچھ وضاحت نہ التجا کیجے

گیت
امبر کی آنکھوں میں بادل کا کاجل ہے — امجد اسلام امجد
اے وقت ذرا تھم جا

مَیں ترے سنگ کیسے چلوں ساجنا
پیا نام کا دِیا جلا ہے ساری رات
مَیں تارا تارا جاگوں تیرے نام
جو بھی کُچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے
تُن تُن تُن تُن تارا
گلزار بنا دیں گے

ماہیے	ماہیے	امجد اسلام امجد
تراجم	اجازت ہو اگر مجھ کو (عرب شاعر نزار قبانی کی نظم کا منظوم ترجمہ)	امجد اسلام امجد
	(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا عربی ترجمہ)	مترجم: یاسمین تعبیر
		مترجم: یاسمین تعبیر
		مترجم: یاسمین تعبیر
		مترجم: یاسمین تعبیر
	WAKING EYES (امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا انگریزی ترجمہ)	مترجم: ڈاکٹر بیدار بخت
	THE LAMENT OF NEW GENERATIONS	مترجم: ڈاکٹر بیدار بخت
	THE CHAIN	مترجم: ڈاکٹر بیدار بخت
	SHAIL (امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا تُرکش ترجمہ)	مترجم: خلیل توقر
	KARA BUYU (امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا تُرکش ترجمہ)	مترجم: خلیل توقر

حمد

اے ربِّ ملائک و جن و بشر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
خدمت میں تری شرمندہ نظر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

جو تیری ثنا کے لائق ہو، اک حرف بھی ایسا پاس نہیں
کیا تابِ سخن، کیا عرضِ ہنر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

قطرے کی نگاہِ حیراں پر دریا کی حقیقت کیسے کھلے!
میں جانتا ہوں یہ بات، مگر،میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مرے چاروں طرف ہیں دروازے، مرا سرمایہ کچھ اندازے
مجھ بے خبرے کو بخش خبر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

یہ اَرض و سما کی پہنائی، یہ میری ادھوری بینائی
ہے شوقِ سفر ہی زادِ سفر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مرے کان تری آہٹ سے سجیں ، مرے سانس تری خوشبو میں پلیں
مری آنکھیں اپنے خواب سے بھر ، میں حاضر ہوں ، میں حاضر ہوں

اے نُورِ ازل ، اے حُسنِ ابد، سُبحان اللہ، سُبحان اللہ
رہیں روشن تیرے شمس و قمر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مناجات

مرے خدا، مرے آقائے محترم کے خدا!
کرم کہ اب مری سختی معاف ہو جائے
وہ جس میں درج ہے احوال عہدِ رفتہ کا
اب اُس کتاب کے صفحے بکھرتے جاتے ہیں
مرے وطن کے بغیچے اُجڑتے جاتے ہیں

قدم قدم پہ زمانہ ہنسی اُڑاتا ہے
خود اپنے عکس سے اب مجھ کو خوف آتا ہے
کوئی بھی کرتا نہیں اب کسی سے ہنس کر بات
کہ دو قدم نہیں چلتے ہیں ہم سفر اب ساتھ
سَروں پہ پھیلتی جاتی ہے گھپ اندھیری رات
اب اختلاف کی برداشت ہی نہیں باقی
مکالمے کی روائت نہیں، کہیں باقی!

مرے خدا! مرے آقائے محترم کے خدا!
رہیں گے ہم اِسی پستی میں بے نشاں کب تک!
اثر سے خالی رہے گی مری فغاں کب تک!

بنامِ روحِ محمد ﷺ اب آسرا دے دے
ہمارے نقشۂ اعمال کی طرف مت دیکھ
بس اس بھنور سے نکلنے کا راستہ دے دے

نعت

اَبر، خورشید، قمر
روشنی، پھول، صدا
سب تھے موجود مگر
ان کا مفہوم نہ تھا
کوئی بھی چیز کوئی چیز نہ تھی

سرِ مخفی تھا خُدا
کوئی تخلیق نہ تھی
حرفِ اقرار نہ تھا
مُہرِ توثیق نہ تھی
سنگ اور گوہرِ نایاب میں تفریق نہ تھی
آپ نے سرد عناصر کو حرارت بخشی
آپ نے صلِ علیٰ
اَبر، خورشید، قمر
روشنی، پھول، صدا
سب کو مفہوم دیا
حاجتِ کون و مکاں، مقصدِ نوعِ بشر
مجھ پہ بھی ایک نظر
مجھ کو بھی دیجیے کبھی
میرے ہونے کا پتا
یا نبی صلِ علیٰ ..... یا نبی صلِ علیٰ۔

شبِ معراج

ہے یُوں تو ایک گردشِ پیہم میں کائنات
جتنے نجوم اور ہیں سیارگاں یہاں
روزِ ازل سے اِن کے لیے حکم ہے یہی
''سب اپنے اپنے دائروں میں گھومتے رہیں
کوئی کہیں رُکے گا نہ بدلے گا راستہ''
سو آج تک اُسی طرح جاری ہے یہ نظام
ہر شے ہے اپنی حد کی اور اوقات کی غلام
لیکن وہ ایک رات کہ جس رات میں کہیں
ٹھہرا تھا وقت صاحبِ معراج کے لیے
اور اُس کے ساتھ ساتھ ہی ٹھہری تھی کائنات
جانے وہ وقت کتنا تھا! کیسا تھا وہ مقام؟
لَوٹے حضورﷺ جب تو عجب ماجرا ہُوا
بستر بھی گرم، حلقۂ در بھی تھا مُرتعش
اللہ ہی جانتا ہے یہ سب کس طرح ہُوا!
اپنے لیے تو اِس کی ہے بس ایک ہی سَند
یہ سچ ہے اس لیے کہ ہے اُنﷺ کا کہا ہُوا

سلام

بھٹک رہی ہے زمیں پہ خلقِ خدا ہراساں
کہ رہبری کا کمال دُنیا سے اٹھ گیا ہے
پھر اہلِ زر کی تونگری ہی نشانِ رُتبہ و جاہ ٹھہری
ہُنر وری کا جمال دُنیا سے اُٹھ گیا ہے

تلاشِ رزقِ حلال کس کو ہو اور کیوں ہو؟
کہ جن کی آنکھوں میں تھی حیا وہ
چراغ مجرم بنے کھڑے ہیں
وہ جن کے سینوں میں روشنی تھی
وہ لوگ چپ چاپ بُجھ گئے ہیں
سروں کو ہاتھوں پہ لے کے چلنے کے مدّعی ہیں ہزار لیکن
کسی کے رستے میں کربلا کا سفر نہیں ہے
کہاں گئے اے زمیں وہ راہِ وفا کے جویا؟
کہ لاکھ اہلِ نظر ہیں لیکن ''نظر'' نہیں ہے

میں منتظر ہوں ہَوا کے راستے میں اُس خبر کا
جو روشنی کا پیام لائے
میں منتظر ہوں گزرتے لمحوں میں اُس گھڑی کا
جو اِس سفر کے محیطِ غم میں کوئی سکوں کا مقام لائے!

زباں پہ کانٹے سے اُگ رہے ہیں
پھر آج شدّت وہ پیاس میں ہے
مرے وطن کی فضا عجب اک ہراس میں ہے
حسینؑ تیری تلاش میں ہے!
یہ راہ بھولا ہوا قبیلہ
حسینؑ تیری تلاش میں ہے!

بس یہی بات پُوچھنی تھی مجھے

بس یہی بات پُوچھنی تھی مجھے
وقت کی برق پا روانی سے
بخت کی سرنگوں گرانی سے
مجھ کو سونپا گیا ہے جو کردار
اس کے ہونے کا یا نہ ہونے کا
کیا تعلق ہے اس کہانی سے؟
بس یہی بات پُوچھنی تھی مجھے!

کھوج میں کس کی چاند نکلا ہے؟
کیوں یہ ہلچل سی ہے ستاروں میں!

بادلوں کو تلاش کس کی ہے؟
بے کلی سی ہے کیوں بہاروں میں!
آخری پہر کی خموشی میں دم بدم یہ چراغ کی رنگت
کس لیے زرد ہوتی جاتی ہے
آگ کیوں لگ رہی ہے پانی میں
رات کیوں سرد ہوتی جاتی ہے
بس یہی بات پُوچھنی تھی مجھے!

کھڑکیاں بند ہیں مکانوں کی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
یہ اُداسی ہے کن زمانوں کی!
کس تحیّر نے ڈال رکھے ہیں ان کے ہونٹوں پہ، ان کی آنکھوں میں
چُپ کے اتنے بڑے بڑے تالے
در و دیوار پر لگے جالے
بولتے کیوں نہیں ہیں آپس میں
بھیگتے جا رہے ہیں کیوں موسم
بے یقینی کی تیز بارش میں
کیوں دریچے اداس رہتے ہیں
دُوریاں کیوں ہیں خواب و خواہش میں؟

روز کہتا ہوں آج پوچھوں گا، حوصلہ ساتھ ہی نہیں دیتا
عکس سے ہو مکالمہ کیسے! آئنہ ساتھ ہی نہیں دیتا

روبوٹ

مجھے فطرت کے حسنِ بے نہایت سے محبت ہے
کہ میں خود اس کا حصہ ہوں
اسی کی بے کناری میں مجھے حیران رہنے دو

مجھے روبوٹ بننے سے بہت ہی خوف آتا ہے
مری آسانیوں کے واسطے اے مہربانو تم
یہ اب جو لے کے آئے ہو یہ سب سامان رہنے دو

نہ چھینو مجھ سے میرے خواب کی یہ اَن بنی دُنیا
مرے رشتے، مرے ہم دم
کتابیں، شاعری، موسم
مسلسل پھیلتی خوشبو، ازل کے ایک لمحے کی
کئی بھولے ہوئے چہرے، کسی آواز کی رِم جھم
مجھے روبوٹ کی صورت
مشینی زندگی کی بے ثمر بھٹی میں مت ڈالو
مری پہچان رہنے دو
مجھے انسان رہنے دو۔

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا

ایک ہی چھت کے تلے سانس لیا کرتے ہیں
میرے والد، مرا بیٹا، مرا پوتا اور میں
کتنا خوش بخت ہوں میں
کیسا خوش رنگ و سکوں پرور ہے
مرے گھر کا منظر

ساری دُنیا کی طرح
اپنے بچّوں سے بہت پیار ہے مجھ کو بھی مگر
جانے یہ بھید ہے کیا
اُن کے بچوں کی محبت کی ہے دُنیا کچھ اور
ایک بے نام سمندر کی طرح
جس کی وسعت کا ٹھکانہ ہے نہ گہرائی کا
ہر ادا ایک نئے دن کی بشارت جیسی
سلسلہ سا ہے کوئی جیسے مسیحائی کا

اُن کے لہجوں کی کھنک اور ضیا پاشی سے
بُجھ چکے تھے جو دریچے ہوئے روشن پھر سے
جی اُٹھا ہے مرے اندر مرا بچپن پھر سے
"اب جو مہکا ہے نیا گُل یہ مرا "ابراہیم"
رابعہ اور علی شان کا عکسِ رنگیں
کسی ارژنگ سا لگتا ہے یہ گلشن پھر سے

دستکیں دیتے ہیں یوں دل سے در و بام تلک
اُس کی آواز کے خوش رنگ ستارے اور وہ
اِک عجب کیف کی بے نام سی سرشاری میں
جُھومتے رہتے ہیں دن رات ہمارے اور وہ

دوڑتا پھرتا ہے سارے میں وہ آہو کی طرح
اُس کی آنکھوں میں کوئی چیز ہے جادو کی طرح
بھاگتا جب ہے شرارت کر کے
ہاتھ پھر آتا نہیں پھیلتی خوشبو کی طرح
شکر اُس رحمتِ ربّی کا ہو جتنا، کم ہے
مرے بچوں کے یہ بچے ہیں امیں خوشیوں کے
ان کے ہونے سے میرے گھر میں سدا

"میرے پوتے رافع کا نام اب ابراہیم رکھ دیا گیا ہے۔ سو اس حوالے سے اس مصرعے میں بھی تبدیلی کر دی گئی ہے جو پہلے یوں تھا کہ "اب جو مہکا ہے نیا پھول یہ "رافع ذی شان"

چاندنی رات ہے، پھولوں کا حسیں موسم ہے
کوئی پچھتاوا، نہ حسرت ہے، نہ کوئی غم ہے

مستقل لطف وعنایات وکرم کی بارش
مرے ماں باپ پہ، مجھ پر، مری اولاد پہ ہے
بے کراں سی کوئی رحمت ہے مرے چاروں طرف
مشکلیں لاکھ ہوں رُکتا نہیں رستہ میرا
جیسے اک ہاتھ مسلسل مری امداد پہ ہے

زیارت ریذیڈنسی میں ایک شام

یہیں کہیں تھی وہ خوشبو کہ جس کے ہونے سے
ہمیں بہار کے آنے کا اعتبار آیا
یہیں کہیں تھا وہ بادل کہ جس کے سائے میں
نجانے کتنی ہی صدیوں کے دُھوپ کھائے ہوئے
ہر ایک دل کو، ہر اک جان کو قرار آیا

یہیں کہیں کسی دالان میں رُکی ہوگی
سَمے کے رُخ کو بدلتی وہ خُوش خبر آواز
کہ جس نے چاروں طرف روشنی سی کر دی تھی
کہ جس کو سُن کے ہُوا تھا یہ گُل سفر آغازا

یہیں کہیں تھا وہ بستر کہ جس کی ہر سلوٹ
گماں میں رینگتے خدشوں کی اک گواہی تھی
وہ دیکھتا تھا انہی کھڑکیوں کے شیشوں سے
سنہری دھوپ کے دامن میں جو سیاہی تھی

وہی فضا، وہی منظر ہے اور وہی موسم
پھر آج جیسے ستاروں سے بھر گئی ہے رات
اُتر رہی ہے تھکن بے جہت مسافت کی
مہک رہی ہے سماعت میں اُس کی ایک اک بات

اُبھر رہی ہے کہیں دُور سے وہی منزل
کہ جس کو بھولے ہوئے ہم کو اِک زمانہ ہُوا
یہیں کہیں پہ وہ لمحہ کھڑا ہے بار دگر
کہ جس نے بھیڑ کو اِک قافلے کی صُورت دی
کہ جس کے سائے میں وہ کارواں روانہ ہُوا

کروں میں بند جو آنکھیں تو ایسے لگتا ہے
کہ جیسے رکھا ہو اُس نے دلِ حزیں پر ہاتھ
یہیں کہیں پہ جو اُس کے لبوں سے نکلی تھی
اُسی دُعا کا اثر چل رہا ہے میرے ساتھ

اپنے دوست گلزار کے لیے ایک نظم

جیسے فن کار کو پتھر میں چُھپے نقش نظر آتے تھے
تم نے بھی لفظ کے باطن میں نہاں
ایسے امکان چُنے
جو بہت دیر سے ایسی ہی کسی آنکھ کے متلاشی تھے
تم نے اُن اَن بنے رنگوں میں وہ نظمیں ڈھونڈیں
جن کی خوشبو تمھیں پہچانتے ہو!
تُم کو معلوم ہے کس حرف کا جوہر کیا ہے؟
کِس کو پلکوں پہ بٹھانا، کِسے ردّ کرنا ہے!
تُم بھی اِک اپنا ہنر جانتے ہو

ایک منظر کے جلو میں جو کئی منظر تھے
اُن کی آواز سُنی، اُن کو اُجالا تم نے!
دامنِ شوق سے لپٹی ہوئی تصویروں کو
صَوت و آہنگ کے ارژنگ میں ڈھالا تُم نے!
جتنے کردار بھی لکھے تم نے

اُن کے ہر نقش سے مانوس تھیں آنکھیں یوں تو
پھر بھی وہ سب سے الگ، سب سے جُدا لگتے ہیں
تُم نے جو گیت لکھے اُن کی بُنت ایسی ہے
سب کو وہ اپنے ہی اندر کی صدا لگتے ہیں

نہیں معلوم کہانی کے خم و پیچ میں جو
ایک شے دل کو پکڑتی ہے، کہاں سے آئی
تم نے یہ خواب، یہ کردار کہاں دیکھے تھے!
کیسی بستی میں گزارے تھے یہ جادو بھرے دن
اور یہ رات کے اسرار کہاں دیکھے تھے!

یوں تو گمبھیر ہو خاموش سمندر کی طرح
دشتِ تحریر میں دریا کی طرح بہتے ہو
اَن کہی بات بتانا کوئی تم سے سیکھے
اِس طرح کہتے ہو جیسے کہ نہیں کہتے ہو!
تم مرے دوست ہو گلزار! مرے ساتھی ہو
سرحدیں اپنی جگہ، میرے لیے کافی ہے
یہی احساس کہ ہر سانس میں ہم دونوں کے
دل دھڑکتے ہیں اسی ایک فلک کے نیچے
اور ہم اپنی دعاؤں میں، مناجاتوں میں
اِک دُوجے کا بھلا چاہتے ہیں

وقت کی طرح کسی حد سے ورا ہوتا ہے
یہ قلم اور دلوں کا رشتہ
اِس کو درکار نہیں اور سہارا کوئی!

اِس تعلق کے ستارے سے زیادہ خوش رنگ
کہکشاؤں میں نہیں اور ستارا کوئی

یہ وہ دریا ہے جو بہتا ہی چلا جاتا ہے
جیسے خوشبو کا نہیں ہوتا کنارا کوئی

علی ذیشان کے لیے ایک نظم

مرے بیٹے نے آنکھیں اِک نئی دنیا میں کھولی ہیں
اُسے وہ خواب کیسے دُوں
جنہیں تعبیر کرنے میں مری یہ عمر گزری ہے!

مری تعظیم کی خاطر وہ ان کو لے تو لے شاید
مگر جو زندگی اُس کو ملی ہے، اُس کے دامن میں
ہمارے عہد کی قدریں تو کیا یادیں بھی کم کم ہیں
انوکھے پھول ہیں اُس کے نرالے اُس کے موسم ہیں
خود اپنی ذات کی مستی میں بہنا چاہتا ہے وہ!
نئی دُنیا ، نئے منظر میں رہنا چاہتا ہے وہ!

سمجھ میں کچھ نہیں آتا اُسے کیسے بتاؤں میں
زمیں پر آج تک جتنے بھی آدم زاد آئے ہیں

اِسی مشکل سے گزرے ہیں
اِنہی رستوں میں اُلجھے ہیں

اسی منزل سے گزرے ہیں
ازل سے آج تک جتنے محبت کرنے والے ہیں
سبھی کی اک کہانی ہے
نئی لگتی تو ہے لیکن حقیقت میں پُرانی ہے

اُسے کیسے بتاؤں میں کہ میرے باپ کی باتیں
مجھے بھی ایک ایسے وقت کا احوال لگتی تھیں
جو اک بُھولا فسانہ تھا
میں اُس کی جیب کے متروک سکّوں کو کہاں رکھتا
کہ یہ میرا زمانہ تھا
نئے بازار تھے میرے ، کرنسی اور تھی میری
وہ بستی اور تھی میری

مگر پھر یہ کُھلا مجھ پر ، نیا کچھ بھی نہیں شاید
اَزل سے ایک منظر ہے فقط آنکھیں بدلتی ہیں!
مری نظروں کا دھوکہ تھا کہ یہ چیزیں بدلتی ہیں!

اُسے کیسے بتاؤں میں!
کہ یہ عرفان کا لمحہ ابھی تک اُس تک نہیں پہنچا!
مگر جس وقت پہنچے گا
اُسے بھی اپنے بیٹے کو یہی قصّہ سنانے میں
یہی دشواریاں ہوں گی۔
کہ وہ بھی تو کچھ اپنی بات کہنا چاہتا ہو گا!
نئی دُنیا ، نئے منظر میں رہنا چاہتا ہو گا!
اور اپنی ذات کی مستی میں بہنا چاہتا ہوگا!

ماں

میں جدھر گیا میں جہاں رہا
مرے ساتھ تھا
وہی ایک سایۂ مہرباں
وہ جو ایک پارۂ اَبر تھا سرِ آسماں
پسِ ہر گماں
وہ جو ایک حرفِ یقین تھا
(مرے ہر سفر کا امین تھا)
وہ جو ایک باغِ ارم نما، سبھی موسموں میں ہرا رہا
وہ اجڑ گیا
وہ جو اِک دُعا کا چراغ سا، میرے راستوں میں جلا رہا
وہ بکھر گیا

مرے غم کو جڑ سے اُکھاڑتا
وہ جو ایک لمسِ عزیز تھا
کسی کپکپاتے سے ہاتھ کا وہ نہیں رہا

وہ جو آنکھ رہتی تھی جاگتی مرے نام پر
وہی سو گئی
وہ جو اِک دُعائے سکون تھی مرے رَخت میں
وہی کھو گئی
اے خدائے واحد و لم یزل
ترے ایک حرف کے صید ہیں
یہ زماں مکاں!
تیرے فیصلوں کے حضور میں
نہ مجال ہے کسی عذر کی، نہ کسی کو تابِ سوال ہے

یہ جو زندگی کی متاع ہے
تری دَین ہے ترا مال ہے
مجھے ہے تو اتنا ملال ہے

کہ جب اُس کی ساعتِ آخری سرِ راہ تھی
میں وہاں نہ تھا!
مرے راستوں سے نکل گئی وہ جو ایک جائے پناہ تھی
میں وہاں نہ تھا!
سرِ شامِ غم مجھے ڈھونڈتی مری ماں کی بجھتی نگاہ تھی
میں وہاں نہ تھا!

مرے چار سُو ہے دُھواں دُھواں
مرے خواب سے مری آنکھ تک
یہ جو سیلِ اشک ہے درمیاں
اُسی سیلِ اشک کے پار ہے
کہیں میری ماں!

ترے رحم کی نہیں حد کوئی!
ترے عفو کی نہیں انتہا
کہ تُو ماں سے بڑھ کے شفیق ہے
وہ رفیق ہے
کہ جو ساتھ ہو تو یہ زندگی کی مسافتیں
یہ اذیّتیں، یہ رکاوٹیں
فقط اِک نگاہ کی مار ہیں
یہ جو خار ہیں
ترے دستِ معجزہ ساز میں
گُلِ خوش جمالِ بہار ہیں۔

مری التجا ہے تو بس یہی
مری زندگی کا جو وقت ہے، کٹے اُس کی اُجلی دُعاؤں میں
ترے دَر گزر کے حضور میں
تری برکتوں کے حِصار میں!
وہ جو خاص چشمِ کرم میں ہے
اُسی روشنی کی قطار میں!!
کسی چیز کی بھی کمی نہیں
تری بخششوں کے دِیار میں!
میری ماں کی روحِ جمیل کو
سدا رکھنا اپنے جوار میں!!
سدا پُر فضا وہ لحد رہے ترے لطفِ خاص کی چھاؤں میں۔

ارضِ وطن کے لیے ایک نظم

اِک نظم لکھیں
اے ارضِ وطن، ہم تیرے لیے اِک نظم لکھیں
تتلی کے پَروں سے رنگ چُنیں
اُن سازوں سے آہنگ چُنیں
جو رُوح میں بجتے رہتے ہیں
اور خواب بُنیں اُن پھولوں کے
جو تیری مہک سے وابستہ ہیں
ہر آنکھ میں سجتے رہتے ہیں
ہر عکس ہو جس میں لاثانی
ہم ایسا اِک ارژنگ چُنیں
تتلی کے پروں سے رنگ چُنیں
اور نظم لکھیں

وہ نظم کے جس کے حرفوں جیسے حرف کسی ابجد میں نہیں

وہ رنگ اُتاریں لفظوں میں جو قوسِ قزح کی زد میں نہیں
اور جس کی ہر اک سطر میں خوشبو ایسے لہریں لیتی ہو
جو وہم و گماں کی حد میں نہیں

اور جب یہ سب انہونی باتیں، اَن دیکھی، اَن چُھوئی چیزیں
اِک دُوجے میں مل جائیں تو نظم بنے
اے ارضِ وطن وہ نظم بنے جو اپنی بُنت میں کامل ہو
جو تیرے رُوپ کے شایاں ہو اور میرے ہنر کا حاصل ہو

اے ارضِ اماں! اے ارضِ وطن!!
تُو شاد رہے، آباد رہے
میں تیرا تھا، میں تیرا ہوں
بس اتنا تجھ کو یاد رہے!
اس کشتِ ہنر میں جو کچھ ہے
کب میرا ہے!
سب تجھ سے ہے، سب تیرا ہے
یہ حرف و سخن، یہ لوح و قلم
سب اُڑتی دُھول مسافت کی
سب جوگی والا پھیرا ہے
سب تجھ سے ہے، سب تیرا ہے
سب تیرا ہے۔

ہم لوگ

دائروں میں چلتے ہیں!
دائروں میں چلنے سے
دائرے تو بڑھتے ہیں
فاصلے نہیں گھٹتے!

آرزوئیں جلتی ہیں!
جس طرف کو جاتے ہیں
منزلیں تمنا کی
ساتھ ساتھ چلتی ہیں!
گرد اُڑتی رہتی ہے
درد بڑھتا رہتا ہے
راستے نہیں گھٹتے!
صبح دم ستاروں کی، تیز جھلملاہٹ کو
روشنی کی آمد کا پیش باب کہتے ہیں
اک کرن جو ملتی ہے، آفتاب کہتے ہیں
دائرہ بدلنے کو انقلاب کہتے ہیں!

میں نے دیکھا اُسے

میں نے دیکھا اُسے،
اجنبی سی کسی ایک محفل میں، میری طرح
وہ بھی ہونٹوں پہ اِک بے ارادہ تبسم سجائے ہوئے
ایک کونے میں بیٹھی کبھی اپنے ناخن،
کبھی سامنے نیم خالی پڑے جامِ مشروب کو
اور کبھی میز کی آڑ میں
اپنی نازک کلائی پہ باندھی ہوئی وہ گھڑی دیکھتی تھی
جسے آگے چل کر.....
مگر یہ تو سب بعد کے واقعے ہیں
ابھی تو اُسے اِس تکلّف بھری اجنبی بزم میں
غالباً
میری موجودگی کی خبر، میرے ہونے کا احساس تک بھی نہ تھا!
میزباں تھا کوئی یا کوئی اور ہی مہرباں تھا
کہ جس نے ہمیں ایک دُوجے کے نام

اور ان کے کناروں سے لپٹے ہوئے کچھ حوالے بتائے
کسے یہ خبر تھی کہ اُس سرسری سے تعارف کا وہ
ایک پل، ایک ایسے تعلق کی تمہید ہے
جو ہمارے لیے.....
مگر یہ بھی سب بعد کی بات ہے!

تو پھر یوں ہوا
اپنی اپنی اُداسی کی شالوں میں لپٹے ہوئے، دیر تک
ہم وہیں ایک کونے میں بیٹھے رہے

پھر کسی نے ڈنر کے لیے سب کو آواز دی
اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، کھانا
بہت پُرتکلّف تھا اور میزبانوں
کے حُسنِ مدارات کے ساتھ ان کے تمول کا بھی ترجماں تھا، مگر
وہ کسی اور ہی سوچ میں دیر تک
اِک منقّش رکابی اُٹھائے ہوئے ایستادہ رہی
میں نے اس کے لیے
میز کے سامنے اِک جگہ سی بنائی اور اس کی طرف
دوستانہ تبسم سے دیکھا کہ وہ
آگے بڑھ کر رکابی میں کچھ ڈال لے!
اُس نے آدابِ محفل میں لپٹی ہوئی

مسکراہٹ سے مجھ کو نوازا مگر، آگے آئی نہیں
ایک لمحے کو جب میری اُس کی نگاہیں ملیں
تو مجھے یوں لگا، جیسے وہ
اپنی اُن خوشنما جھیل سی خواب آنکھوں میں
پھیلی اُداسی..... چھپاتے چھپاتے بہت تھک چکی ہے

سبز قہوے کے دَور اور اقبال بانو کی مسحور کُن
دِل نشیں گائیکی سے مہکتی ہوئی اُس فضا میں وہ یوں
بے تعلق سی بیٹھی رہی، جیسے وہ اُس گھڑی،
واں پہ تھی ہی نہیں

میں نے اُس سے کہا،
اوخدا! یہ تو پھر بعد کی بات ہے!
اُس گھڑی تو فقط میں نے چاہا کہ اُس سے کہوں
کچھ کہوں! اُس کو بتلاؤں
''اے اجنبی ہم نشیں
اس اُداسی کو کچھ دیر کے واسطے بھول جا، مُسکرا
دیکھ، دنیا میں غم کے سوا بھی بہت کچھ ہے، آنکھیں
فقط آنسوؤں کے لیے ہی نہیں، خواب بھی
ان کی جاگیر ہیں!
دیکھ میری طرف!

مُجھ سے بھی زندگی نے ہمیشہ رقیبوں سا ہی
ایک رشتہ رکھا،

میں نے بھی آج تک اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھی نہیں
سنگ و خشتِ تمنا چُنے ہیں سدا
بخدا، کوئی تعمیر دیکھی نہیں!''

رات ڈھلنے لگی،
اور آہستہ آہستہ کمرے سے مہمان گھٹنے لگے،
میزبانوں کے ہونٹوں کے لفظ
الوادعی مصافحوں کی یکسانیت میں بکھرتے ہوئے
اپنی گرمی سے محروم ہوتے گئے
اور باہر سے آتے ہوئے شور کی
دُور ہوتی صداؤں کے ہنگام میں
میزبانوں سے کچھ بات کرتے ہوئے
اُس نے دیکھا مجھے، اُس کے ہونٹوں کے کونے ذرا کپکپائے
وہ جیسے کسی نیند میں مسکرائی،
چلی، پھر رُکی، رُک کے دیکھا مجھے!

ہاں یہی وہ نظر تھی
یہی وہ مقدر بداماں نظر تھی
جو میرے لیے، صرف میرے لیے تھی

کہ جس میں اُلجھ کر
مری زندگی کی،
مرے آنے والے شب و روز کی
اور مرے سارے خوابوں کی منزل نہاں تھی
زماں و مکاں کے سبھی فاصلے
ایک پل کے لیے بے نشاں ہو گئے
اُسی اک نظر میں دُھواں ہو گئے
پھر نہ میں تھا کہیں اور نہ کچھ اور تھا
بس ازل تا ابد ایک خوشبو رواں تھی
فقط وہ۔ وہاں تھی!

تمہیں مجھ سے محبت ہے

محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے
کہ یہ جتنی پرانی جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اسے تائید تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے

یقیں کی آخری حد تک دلوں میں لہلہاتی ہو!
نگاہوں سے ٹپکتی ہو، لہو میں جگمگاتی ہو!
ہزاروں طرح کے دلکش، حسیں ہالے بناتی ہو!
اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے

محبت مانگتی ہے یوں گواہی اپنے ہونے کی
کہ جیسے طفلِ سادہ، شام کو اِک بیج بوئے
اور شب میں بارہا اُٹھے
زمیں کو کھود کر دیکھے کہ پودا اب کہاں تک ہے!
محبت کی طبیعت میں عجب تکرار کی خُو ہے

کہ یہ اقرار کے لفظوں کو سُننے سے نہیں تھکتی
بچھڑنے کی گھڑی ہو یا کوئی ملنے کی ساعت ہو
اسے بس ایک ہی دُھن ہے
کہو ___ ''مجھ سے محبت ہے''
کہو ___ ''مجھ سے محبت ہے''
تمہیں مجھ سے محبت ہے
سمندر سے کہیں گہری، ستاروں سے ہوا روشن
پہاڑوں کی طرح قائم، ہواؤں کی طرح دائم
زمیں سے آسماں تک جس قدر اچھے مناظر ہیں
محبت کے کنائے ہیں، وفا کے استعارے ہیں
ہمارے ہیں۔
ہمارے واسطے یہ چاندنی راتیں سنورتی ہیں
سنہرا دن نکلتا ہے
محبت جس طرف جائے' زمانہ ساتھ چلتا ہے''

(۲)

کچھ ایسی بے سکونی ہے وفا کی سرزمینوں میں
کہ جو اہلِ محبت کو سدا بے چین رکھتی ہے
کہ جیسے پھول میں خوشبو، کہ جیسے ہاتھ میں پارا
کہ جیسے شام کا تارا

محبت کرنے والوں کی سحر راتوں میں رہتی ہے،
گماں کے شاخچوں میں آشیاں بنتا ہے الفت کا!
یہ عینِ وصل میں بھی ہجر کے خدشوں میں رہتی ہے،
محبت کے مسافر زندگی جب کاٹ چکتے ہیں
تھکن کی کرچیاں چنتے ' وفا کی اجرکیں پہنے
سمے کی رہگزر کی آخری سرحد پہ رکتے ہیں
تو کوئی ڈوبتی سانسوں کی ڈوری تھام کر
دھیرے سے کہتا ہے
''یہ سچ ہے نا!
ہماری زندگی اِک دوسرے کے نام لکھی تھی!
دُھندلکا سا جو آنکھوں کے قریب و دُور پھیلا ہے
اِسی کا نام چاہت ہے!
تمہیں مجھ سے محبت تھی
تمہیں مجھ سے محبت ہے!''
محبت کی طبیعت میں
یہ کیسا بچپنا قُدرت نے رکھا ہے!

سیلف میڈ لوگوں کا المیہ

روشنی مزاجوں کا کیا عجب مقدر ہے
زندگی کے رستے میں، بچھنے والے کانٹوں کو
راہ سے ہٹانے میں،
ایک ایک تنکے سے، آشیاں بنانے میں
خوشبوئیں پکڑنے میں، گلستاں سجانے میں
عمر کاٹ دیتے ہیں،
عمر کاٹ دیتے ہیں
اور اپنے حصے کے پھول بانٹ دیتے ہیں

کیسی کیسی خواہش کو قتل کرتے جاتے ہیں
درگزر کے گلشن میں اَبر بن کے رہتے ہیں
صبر کے سمندر میں کشتیاں چلاتے ہیں
یہ نہیں کہ اِن کو اِس روز و شب کی کاوش کا
کچھ صلہ نہیں ملتا!

مرنے والی آسوں کا خُوں بہا نہیں ملتا!
زندگی کے دامن میں جس قدر بھی خوشیاں ہیں
سب ہی ہاتھ آتی ہیں
سب ہی مل بھی جاتی ہیں
وقت پر نہیں ملتیں ___ وقت پر نہیں آتیں!

یعنی اِن کو محنت کا اجر مل تو جاتا ہے
لیکن اس طرح جیسے،
قرض کی رقم کوئی قسط قسط ہو جائے
اصل جو عبارت ہو ''پس نوشت'' ہو جائے

فصلِ گُل کے آخر میں پُھول اِن کے کھلتے ہیں
اِن کے صحن میں سُورج دیر سے نکلتے ہیں

تو چل اے موسمِ گریہ

تو چل اے موسمِ گریہ، پھر اب کی بار بھی ہم ہی
تری اُنگلی پکڑتے ہیں تجھے گھر لے کے چلتے ہیں
وہاں ہر چیز ویسی ہے کوئی منظر نہیں بدلا
ترا کمرہ بھی ویسے ہی پڑا ہے، جس طرح تُو نے
اُسے دیکھا تھا، چھوڑا تھا
''ترے بستر کے پہلو میں رکھی اُس میز پر اب بھی
دھرا ہے مگ [1] وہ کافی کا
کہ جس کہ خشک اور ٹوٹے کناروں پر
ابھی تک وسوسوں اور خواہشوں کی جھاگ کے دھبّے نمایاں ہیں
قلم ہے، جس کی نِب [2] پر رَت جگوں کی روشنائی یوں لرزتی ہے
کہ جیسے سوکھتے ہونٹوں پہ پپڑی جمنے لگتی ہے
وہ کاغذ ہیں
جو بے روئے ہوئے کچھ آنسوؤں سے بھیگے رہتے ہیں
ترے چپّل بھی رکھے ہیں

کہ جن کے بے ثمر تلووں سے وہ سب خواب لپٹے ہیں
جو اتنا روندے جانے پر بھی اَب تک سانس لیتے ہیں
ترے کپڑے،
جو غم کی بارشوں میں دُھل کے آئے تھے
مری الماریوں کے ہینگروں[3] میں اب بھی لٹکے ہیں
دلاسوں کا وہ گیلا تولیہ
اور ہچکیوں کا اَدھ گھُلا صابن،
چمکتے واش بیسن[4] میں پڑے ہیں اور
ٹھنڈے گرم پانی کی وہ دونوں ٹُونٹیاں اب تک
رواں ہیں تُو جنھیں اُس دن
کسی جلدی میں چلتا چھوڑ آیا تھا
دریچے کی طرف دیوار پر لٹکی گھڑی
اب بھی، ہمیشہ کی طرح،
آدھا منٹ پیچھے ہی رہتی ہے
کلنڈر[5] پر رُکی تاریخ نے پلکیں نہیں جھپکیں
اور اس کے ساتھ آویزاں!!
وہ اِک منظر،
وہ اِک تصویر جس میں وہ
مرے شانے پہ سر رکھے مرے پہلو میں بیٹھی ہے
مری گردن اور اس کے گیسوؤں کے پاس اِک تتلی
خوشی سے اڑتی پھرتی ہے

کچھ ایسا سحر چھایا ہے
کہ دل رُکتا ہوا چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔"

مگر اے موسمِ گریہ!
اُسی ساعت
نجانے کس طرف سے تُو چلا آیا
ہمارے بیچ سے گزرا
ہمارے بیچ سے تُو اس طرح گزرا
کہ جیسے دو مخالف راستوں کو کاٹتی سرحد
کہ جس کے ہر طرف بس دُوریوں کی گرد اُڑتی ہے

اُسی اک گرد کی تہہ سی
تجھے دروازے کی بیل[6] پر جمی شاید نظر آئے
کوئی تصویر کے اندر کمی شاید نظر آئے
تمنا سے بھری آنکھیں جو ہر دم مسکراتی تھیں
اب اُن آنکھوں کے کونوں میں نمی شاید نظر آئے!

(1) Mug (2) Nib (3) Hangers (4) Wash Bason (5) Calander (6) Bell

کلنٹن ٹھیک کہتا ہے

کلنٹن ٹھیک کہتا ہے
کلنٹن جو بھی کہتا ہے، ہمیشہ ٹھیک کہتا ہے

اگر وہ یہ کہے،
''صدّام اک جنگلی درندہ ہے،
قذافی باؤلا ہے،
مشرقی یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے
اُس کے ڈانڈے رُوس کے ٹکڑوں سے ملتے ہیں
کہ جس کو سوشلسٹوں نے
نئی دُنیا کا اِک ہمبل [1] بنایا تھا
جو اَب یہ خواب ٹوٹا ہے
تو اس کی کرچیاں تکلیف تو دیں گی!
فلسطینی مہاجر بستیوں پر ظلم جائز ہے
کہ اسرائیل کرتا ہے

مسلمانوں کی سرکوبی بہت ہی لازمی ٹھہری
کہ فنڈامینٹلسٹوں[2] نے بہت آفت مچائی ہے،
یہ جتنا بوجھ ہے اِس تیسری دنیا کے ملکوں کا
اِسے مغرب کے کاندھے مفت میں کیونکر اُٹھائیں گے!
سو امریکی سفارت کار کی تعظیم لازم ہے
کہ اس کے مشورے کو جس کسی نے بھی نہ مانا ہے
وہ کوئی قوم ہو یا اُس کا کوئی سرپھرا لیڈر
اُسے بندا بنانا امنِ عالم کا تقاضا ہے"

یہ ورلڈ آڈر[3] کی اُس نے جو بساط نو بچھائی ہے
یہاں پر سب ہی مُہرے ہیں
کھلاڑی بس کلنٹن ہے کہ جو ہر چال چلتا ہے
کلنٹن ٹھیک کہتا ہے کہ یہ اُس کا زمانہ ہے
ہمیں تو بل کلنٹن کو فقط اتنا بتانا ہے
"زمانہ اِس سے پہلے بھی کئی ہاتھوں سے گزرا ہے
زمانے نے تمہارے ہاتھ سے آگے بھی جانا ہے!"

(1) Symbol (2) Fundamentalist (3) World Order

بے وفائی کی مشکلیں

جو تُم نے ٹھان ہی لی ہے
ہمارے دل سے نکلو گے
تو اِتنا جان لو پیارے!
سمندر سامنے ہوگا اگر ساحل سے نکلو گے!

ستارے، جن کی آنکھوں نے ہمیں اِک ساتھ دیکھا تھا
گواہی دینے آئیں گے!
پرانے کاغذوں کی بالکونی سے بہت سے لفظ جھانکیں گے
تمہیں واپس بلائیں گے،
کئی وعدے، فسادی قرض خواہوں کی طرح رستے میں روکیں گے
تمہیں دامن سے پکڑیں گے

تمہاری جان کھائیں گے!

چھپا کر کس طرح چہرہ
بھری محفل سے نکلو گے!
ذرا پھر سوچ لو جاناں!
نکل تو جاؤ گے شاید
مگر مشکل سے نکلو گے!

رات کیوں ہوگئی؟

میرے شہروں کو کس کی نظر لگ گئی
میری گلیوں کی رونق کہاں کھوگئی
روشنی بجھ گئی، آگہی سوگئی
ہم تو نکلے تھے، ہاتھوں میں سورج لیے
رات کیوں ہوگئی!
رات کیوں ہوگئی، طالبانِ سحر!
ہم سے کیوں روشنی نے یہ پردا کیا!
کیوں اندھیروں نے رستوں پہ سایہ کیا!
آؤ سوچیں ذرا،
ہم بھی سوچیں ذرا، تم بھی سوچو ذرا
آگہی سے پَرے، روشنی کے بِنا
جتنے امکان ہیں سارے مر جائیں گے
جو بھی تخلیق ہے، وہ بکھر جائے گی
زندگی اپنے چہرے سے ڈر جائے گی

طالبانِ سحر، آؤ سوچیں ذرا، آؤ دیکھیں ذرا
آرزو کے ستاروں سے دَمکا ہوا
پرچمِ روشنی کس طرح پھٹ گیا!
کون سا موڑ ہم سے غلط کٹ گیا!
پھول رُت میں خزاں کس طرح چھا گئی!
بیج کیا بوگئی!
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سورج لیے،
رات کیوں ہوگئی!

مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے!

ستارا ڈھونڈنا ہے
ستاروں سے بھرے اِس آسماں کی وسعتوں میں
مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے!

فلک پر کہکشاں در کہکشاں اک بے کرانی ہے
نہ اُس کا نام ہے معلوم، ناں کوئی نشانی ہے

بس اتنا یاد ہے مجھ کو
ازل کی صبح جب سارے ستارے
الوداعی گفتگو کرتے ہوئے رستوں پہ نکلے تھے
تو اُس کی آنکھ میں اِک اور تارا جھلملایا تھا
اُسی تارے کی صورت کا

مری بھیگی ہوئی آنکھوں میں بھی اِک خواب رہتا ہے
میں اپنے آنسوؤں میں اپنے خوابوں کو سجاتا ہوں
اور اُس کی راہ تکتا ہوں
سنا ہے گمشدہ چیزیں
جہاں پر کھوئی جاتی ہیں
وہیں سے مل بھی جاتی ہیں

مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے!

ایک کمرۂ امتحان میں

بے نگاہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں پرچے کو
بے خیال ہاتھوں سے
اَن بنے سے لفظوں پر اُنگلیاں گھماتے ہیں
یا سوالنامے کو دیکھتے ہی جاتے ہیں!

ہر طرف کنکھیوں سے بچ بچا کے تکتے ہیں
دوسروں کے پرچوں کو رہنما سمجھتے ہیں،
شاید اس طرح کوئی، راستہ ہی مل جائے!
بے نشاں جوابوں کا کچھ پتہ ہی مل جائے!
مجھ کو دیکھتے ہیں تو
یوں جواب کاپی پر، حاشیے لگاتے ہیں
دائرے بناتے ہیں
جیسے اُن کو پرچے کے سب جواب آتے ہیں

اس طرح کے منظر میں
امتحان گاہوں میں، دیکھتا ہی رہتا تھا
نقل کرنے والوں کے
نت نئے طریقوں سے
آپ لطف لیتا تھا، دوستوں سے کہتا تھا

کس طرف سے جانے یہ
آج دل کے آنگن میں اک خیال آیا ہے
سیکڑوں سوالوں سا اک سوال لایا ہے !
''وقت کی عدالت میں
زندگی کی صورت میں
یہ جو تیرے ہاتھوں میں، اک سوال نامہ ہے
کس نے یہ بنایا ہے!
کس لئے بنایا ہے!
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟''

زندگی کے پرچے کے
سب سوال لازم ہیں، سب سوال مشکل ہیں!

بے نگاہ آنکھوں سے دیکھتا ہُوں پرچے کو
بے خیال ہاتھوں سے
اَن بنے سے لفظوں پر اُنگلیاں گھماتا ہوں
حاشیے لگاتا ہوں
دائرے بناتا ہوں،
یا سوالنامے کو
دیکھتا ہی جاتا ہوں!

یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے

یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے یہ رُکے اگر
یہ رُکے اگر تو نشاں ملے۔ یہ نشاں ملے
کہ جو فاصلوں کی صلیب ہے
یہ گڑی ہوئی ہے کہاں کہاں!
مرے آسماں سے کدھر گئی ترے التفات کی کہکشاں!
مرے بے خبر، مرے بے نشاں
یہ رُکے اگر تو پتا چلے
میں تھا کس نگر، تُو رہا کہاں!
کہ زماں مکاں کی یہ وسعتیں
تجھے دیکھنے کو ترس گئیں
(وہ مرے نصیب کی بارشیں
کسی اور چھت پہ برس گئیں!)

مرے چار سُو ہے غبارِ جاں، وہ فشارِ جاں
کہ خبر نہیں مرے ہاتھ کو مرے ہاتھ کی
مرے خواب سے ترے بام تک
تری رہگزر کا تو ذکر کیا
نہیں ضو فشاں ترا نام تک!
ہیں دُھواں دُھواں، مرے اُستخواں
مرے آنسوؤں میں بجھے ہُوئے مرے اُستخواں
مرے نقش گر، مرے نقشِ جاں

اسی ریگِ دشتِ فراق میں، رہے منتظر، ترے منتظر
مرے خواب، جن کے فشار میں
رہی میرے حال سے بے خبر
تری رہگزر
تری رہگزر کہ جو نقش ہے مرے ہاتھ پر
مگر اس بلا کی ہے تیرگی
کہ خبر نہیں مرے ہاتھ کو مرے ہاتھ کی

وہ جو چشمِ شعبدہ ساز تھی وہ اُٹھے اگر
مرے اُستخواں میں ہو روشنی
اُسی ایک لمحۂ دید میں تری رہگزر
میری تیرہ جاں میں چمک اُٹھے
مرے خواب سے ترے بام تک
سبھی منظروں میں دُمک اُٹھے
اُسی ایک پَل میں ہو جاوداں
مری آرزو کہ ہے بے کراں
مری زندگی کہ ہے مختصر
یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے یہ رُکے اگر

محبت کی ایک نظم

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاند راتوں کی نرم دل گیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا۔
اگر وہ نخلِ فلک سے اُڑ کر تمہارے قدموں میں آ گرے تو
یہ جان لینا، وہ استعارہ تھا میرے دل کا،
اگر نہ آئے.....
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو
تو اُس کی دیوارِ جاں نہ ٹُوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بُھول جائے!
اگر کبھی میری یاد آئے
گریز کرتی ہَوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
میں خُوشبوؤں میں تمہیں ملوں گا۔
مجھے گلابوں کی پتّیوں میں تلاش کرنا
میں اَوس قطروں کے آئنوں میں تمہیں مِلوں گا
اگر ستاروں میں، اوس قطروں میں، خُوشبوؤں میں، نہ پاؤ مجھ کو
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمہیں ملوں گا۔

کہیں پہ روشن چراغ دیکھو تو جان لینا
کہ ہر پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکا ہوں
تم اپنے ہاتھوں سے ان پتنگوں کی خاک دریا میں ڈال دینا
میں خاک بن کر سمندروں میں سفر کروں گا
کسی نہ دیکھے ہوئے جزیرے پہ رُک کے تم کو صدائیں دُوں گا
سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اُس جزیرے پہ بھی اُترنا!
سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اُس جزیرے پہ بھی اُترنا!

میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی

چینی کی گڑیا سی جب وہ
چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی
میری جانب آتی ہے، تو
اُس کے لبوں پر ایک ستارا کھلتا ہے
''پاپا''
اللہ ___ اس آواز میں کتنی راحت ہے
ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر
جب وہ مجھ کو چُھوتی ہے تو یوں لگتا ہے
جیسے میری روح کی ساری سچائی
اُس کے لمس میں جاگ اُٹھی ہے
اے مالک، اے ارض و سما کو چٹکی میں بھر لینے والے
تیرے سب معمور خزانے

میری ایک طلب!
میرا سب کچھ مجھ سے لے لے
لیکن جب تک
اِس آکاش پہ تارے جلتے بجھتے ہیں
میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی،

اے دُنیا کے ربّ!
کوئی نہیں ہے اس لمحے میں تیرے میرے پاس
سچ سچ مجھ سے کہہ
تیرے ان معمور خزانوں کی بے اَنت گرہ میں
بچّے کی معصوم ہنسی سے زیادہ پیاری شے
کیا کوئی ہے؟

ہوائے شہرِ وفا شعاراں

ہوائے شہرِ وفا شعاراں
ہماری بستی کے پاس آئی تو ہم نے دیکھا
کہ اُس کے دامن میں بُوئے مقتل بسی ہوئی تھی
اور اُس کی پھیلی ہوئی نگاہوں میں خُوں کی سرخی
چھلک رہی تھی
ہماری بستی کے پیڑ ششدر تھے، سرد گلیاں،
مکاں، دریچے سبھی تعجب سے تک رہے تھے
عجیب طرزِ خرام تھا وہ کہ چلنے والے ٹھٹک رہے تھے!

ہَوا چھتوں کے سپاٹ ماتھوں کو چُھو کے گزری
تو کھڑکیوں کے نصیب جاگے

کہ آج بستی کی ساری خلقت کواڑ کھولے ہُوئے کھڑی تھی
ہر ایک نتھنے پُھلا پُھلا کر ہوا کی خوشبو کو سونگھتا تھا
کہ جس میں خُوں کی مہک رچی تھی
تمام سینوں میں ایک خدشہ سوال بن کر دھڑک رہا تھا
تو آج شہرِ وفا شعاراں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا!
ہَوا نے چپکے سے سر ہلایا
ہَوا نے چپکے سے سر ہلایا تو کھڑکیوں کے کواڑ کانپے
تو بیبیوں نے کُھلے سروں سے امیرِ مقتل کو بددعا دی
کہ جس کا خوفِ مہیب بستی کے چار جانب تنا ہوا تھا
اور اپنے مَردوں کو چوڑیاں دیں
کہ اُن کے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا۔

ہَوا کی پاگل بنانے والی مہک نے دیوار و دَر سے پُوچھا
تمہاری غیرت کو کیا ہُوا ہے؟
یہ کن مکینوں میں رہ رہے ہو!
تمام بستی پکار اُٹھی
قسم شہیدوں کے بہتے خوں کی
قسم سویروں کی، چاند راتوں کی
آبشاروں کی اور بچوں کی، ہم نے مقتل کو چُن لیا ہے
قسم ہے اُن کی کہ جن کے آنسو ہماری ہستی سے معتبر ہیں

اور اُن کی جن کے بدن ہمارے لہو سے تخلیق پا رہے ہیں
اور اُن کی جن کے جوان بوسوں میں سُرخ پھولوں کی تازگی ہے
کہ ہم نے مقتل کو چُن لیا ہے

ہوائے شہرِ وفا شعاراں، گواہ رہنا
گواہ رہنا کہ ہم نے خوفِ مہیب بستی کے بام و دَر سے ہٹا دیا ہے
ہمارے خُوں سے مہک کے اُٹھے تو اگلے شہروں کی سمت جانا
اُنہیں بتانا

وفا کا رستہ سَروں کی کثرت سے پٹ گیا ہے
کہ سرفروشی کی ابتدا ہے
اُنہیں بتانا کہ صحنِ مقتل بنا ہُوا ہے کُوئے نگاراں
ہوائے شہرِ وفا شعاراں، ہوائے شہرِ وفا شعاراں

سلسلے خیالوں کے

مگر وہ مجھ سے عظیم تر ہے
مرے تعلق بغیر اس کا وجود ہر چند بے اثر ہے
مگر وہ مجھ سے عظیم تر ہے

گزرتے لمحو، مجھے بتاؤ کہ زندگی کا اُصول کیا ہے!
تمام چیزیں اگر حقیقت میں ایک ہی ہیں
تو پھول کیوں ہے، بُول کیا ہے!
جو میری آنکھوں کے دائرے میں، ہزاروں رنگوں میں منتشر ہے
ہر ایک منظر، ہر ایک آہٹ، ہر ایک رستے کا ہم سفر ہے
کہیں سمندر سا محوِ حیرت کہیں ہواؤں سا بے خبر ہے
یہ سب تماشا، مری ہی خواہش کا عکس گر ہے
تو پھر بتاؤ، سوائے خواہش کے میرے ہاتھوں میں کیا ہنر ہے!
گھروں سے نکلو تو سوچ لینا

کہ بے گھری کا حصول کیا ہے!
دلوں کی تعمیر مت گراؤ کہ خواہشوں کا یہی تو گھر ہے

(۲)

تمام ہاتھوں میں آئنے ہیں تو کون کس سے چُھپا ہوا ہے!
اگر صدا کا وجود کانوں سے منسلک ہے
تو کون خوشبو میں بولتا ہے!
اگر سمندر کی حد ہے ساحل
تو کون آنکھوں میں پھیلتا ہے!
تمام چیزیں اگر یہی ہیں
تو کون چیزوں سے ماورا ہے،
کسے خبر ہے بدلتی رُت نے پُرانے پتّوں سے کیا کہا ہے،
یہ کون بادل سے جا کے پُوچھے کہ اتنے موسم کہاں رہا ہے!
جو آج دیکھا ہے کل نہ ہوگا
کوئی بھی لمحہ اٹل نہ ہوگا
اگر زمیں پر تمہارے میرے قدم نہ پڑتے تو کون ہوتا!
یہ ایسا جادُو ہے جو حسابوں سے حل نہ ہوگا
ہزار منظر قدم سے لپٹیں گزرنے والے نہیں رُکیں گے،
ہوا جو تحریر لکھ کے جائے گی
اُس پہ کوئی عمل نہ ہوگا
ذرا تمنا کی شکل دیکھو، تمہارے آنے کی منتظر ہے!

(۳)

''ہواؤ اُس کی گلی سے گزرو تو اُس کو میرا سلام کہنا''
مجھے خبر ہے کہ میرے گھر سے گزرنے والی ہوا کا رستہ
تمہارے گھر تک نہیں گیا ہے
سلام میرا تمہارے کانوں سے نارسا ہے
میں جانتا ہوں یہ بچپنا ہے
مگر حقیقت کو جان کر بھی نہ جاننے میں عجب مزا ہے
ہوا سے میں نے یہ پھر کہا ہے،
''گزر رہے ہیں تمہاری یادوں کے دم سے ہی صبح و شام کہنا
ہواؤ! اُس کی گلی سے گزرو تو اُس کو میرا سلام کہنا''
تمہارے گھر کا کسے پتا ہے، ہوا کے رُخ کی کسے خبر ہے؟

(۴)

گزرتے لمحو، میں تھک گیا ہوں، بکھر گیا ہوں
میں ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں
یہ ساتھیوں کی مفارقت بھی عجیب شے ہے
کہ جتنا عرصہ یہ ساتھ چلتے ہیں
چھوٹی چھوٹی فضول باتوں پہ روٹھ جاتے ہیں اور لڑتے ہیں
دوستوں کے جواں ارادے شکست کرتے ہیں
راستے کی صعوبتوں سے انہیں ڈراتے ہیں آپ ڈرتے ہیں
منزلوں کو پکارتے ہیں
مگر انہی کے وجود ہیں جو مسافتوں کو نکھارتے ہیں

گزرتے لمحو! میں ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں
میں اپنی تنہائی کے تحیّر سے ڈر گیا ہوں
میں وہ مسافر ہوں جس کے پاؤں میں منزلیں ہیں نہ رہگزر ہے

(۵)

مری نگاہوں کے آئنوں میں عجیب منظر جھلک رہے ہیں
کہیں اُجالوں پہ تیرگی ہے کہیں اندھیرے چمک رہے ہیں
کہیں شگوفوں میں روشنی ہے، کہیں دریچے مہک رہے ہیں
کہیں پہ صدیاں رُکی کھڑی ہیں، کہیں زمانے بھٹک رہے ہیں
سفر ہے کیسا کہ میرے پاؤں بغیر چلنے کے تھک رہے ہیں
میں اپنی آنکھوں میں جھلملاتے گئے زمانوں کو دیکھتا ہوں
گئے زمانے، کہ جن کے شانوں سے سبز آنچل ڈھلک رہے ہیں
گئے زمانے، وہ کارواں ہیں کہ جن کے رُکنے میں بھی سفر ہے۔

(۶)

خموش پیڑو!
تمہارے سائے میں کتنی نسلوں نے دَم لیا ہے!
مجھے بتاؤ کہ موڑوں کے دُھوئیں سے پہلے جو گرد اُڑتی تھی
اُس کے پردے سے آنے والے مسافروں میں کمال کیا تھا
مجھے بتاؤ کہ مجھ سے پہلے گئے ہوؤں کا جمال کیا تھا!

تمہاری آنکھیں تو چاند سُورج کی ابتداؤں سے آشنا ہیں

مجھے بتاؤ کہ پہلے سورج کا حال کیا تھا!
تمہارے شانوں پہ چاندنی کی طویل زلفیں بکھر کے مہکیں
تو آسماں کو ملال کیا تھا!
تمہارے قدموں میں سر جھکاتے اُداس رستے کی بندگی میں
سوال کیا تھا!
ہوائیں پہلی دفعہ چلیں تو تمہارے دِل میں خیال کیا تھا!
تمہاری شاخوں نے کِن گھٹاؤں کی بے قراری سے نَم لیا ہے!
مجھے بتاؤ جو سب سے پہلے
تمہارے سائے میں آ کے ٹھہرا تھا اُس مسافر کی کیا خبر ہے!

(۷)

اُجاڑ شہرو!
تمہاری گلیوں میں چلنے والے کدھر گئے ہیں!
گلاب چہرے،
کہ جن سے راتوں میں روشنی تھی کہاں چُھپے ہیں!
گزرتی صدیوں نے جانے کیسی زباں میں اپنے اَلم لکھے ہیں!
شکستہ اینٹوں پہ درج کیا ہے،
عبارتیں ہیں کہ زاویے ہیں!
مجھے یقیں ہے اُجاڑ شہرو!
کہ اب سے پہلے بھی میرے پاؤں تمہاری مٹی کے جادوؤں سے
گزر چکے ہیں
میں اپنے شہروں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں

زمانہ آئے گا جب یہ چہروں سے پُر دریچے
نظر میں کھبتی بہار گلیاں، نگار کوچے اُجاڑ ہوں گے
رُکیں گی مٹّی سے آبشاریں سمندروں میں پہاڑ ہوں گے
مجھے یقیں ہے اُجاڑ شہرو!
نئی پُرانی تمام چیزوں میں رابطے ہیں
کہ سب زمانے روایتوں کے تلازمے سے ملے ہوئے ہیں
گزرتے لمحوں کے سلسلوں سے کسے مَفر تھا، کسے مَفر ہے!

(۸)

گزرتے لمحو! مجھے بتاؤ زمین کس کی تلاش میں ہے!
ستارے کیا چیز ڈھونڈتے ہیں
وہ کیا تحیّر تھا جس میں اب تک پہاڑ گم سم کھڑے ہوئے ہیں!
سمندروں کا جمال کیا ہے کہ پیڑ اُلجھن میں پڑ گئے ہیں!
مجھے بتاؤ وہ رنگ کیا ہے جو میرے اندر ہے اور مجھ پر عیاں نہیں ہے!
وہ کیا صدا ہے کہ جس کی کوئی زباں نہیں ہے!
وہ کون ہے جو کہیں نہیں پر کہاں نہیں ہے!
مرے قلم سے جو لفظ نکلے ہیں سب اُسی کے لکھے ہوئے ہیں
سوائے خواہش مری تمنا کے سرد ہاتھوں میں کیا ہنر ہے!
میں اُس کو جھک کے سلام کرتا ہوں جو مجھی میں قیام کرتا ہے
اور مجھ سے عظیم تر ہے

نئی نسل کا نوحہ

میں سوچتا ہوں،
لکھا ہے جو کچھ پڑھا ہے جو کچھ، وہ کس لیے تھا
کہاں سے پوچھوں!
وہ کس لیے ہے کسے بتاؤں!
مجھے عقیدوں کے خواب دے کر کہا گیا، ان میں روشنی ہے
چمکتی قدروں کی چھب دکھا کر مجھے بتایا یہ زندگی ہے
سکھائے مجھ کو کمال ایسے
یقیں نہ لائیں سکھانے والے اگر انہیں کو میں جا سناؤں
میں کہنہ آنکھوں کی دسترس میں نئے مناظر کہاں سے لاؤں!
کہاں پہ جنسِ کمال رکھوں، خیالِ تازہ کہاں سجاؤں!
زمین پاؤں تلے نہیں ہے،تو کیسے تاروں کی سمت جاؤں!

پرانی قدریں جو محترم ہیں
انہیں سنبھالوں کہ آنے والے نئے زمانوں کا بھید پاؤں

وہ سب عقیدے، تمام قدریں، خیال سارے
جو مجھ کو سکّے بنا کے بخشے گئے تھے میرے حواسِ خمسہ سے معتبر تھے
جب اُن کو رہبر بنا کے نکلا
تو میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے
میں ایسے بازار میں کھڑا ہوں جہاں کرنسی بدل چکی ہے!

گواہی

اس سے پہلے کہ یہ ساون کی جھڑی تھم جائے
جتنے اقرار کے الفاظ ہیں کہہ دو مجھ سے
بھیگتے پیڑ ہیں ، میں ہوں ، تم ہو
اس برستے ہوئے بادل کی طرح
لفظ اگر مڑ کے نہ بھی آئے تو کیا

بھیگتے پیڑ کسے جا کے گواہی دیں گے!!



تیرے اِرد گرد وہ شور تھا، مِری بات بیچ میں رہ گئی
نہ میں کہہ سکا نہ تُو سُن سکا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

مرے دل کو درد سے بھر گیا، مجھے بے یقیں سا کر گیا
ترا بات بات پہ ٹوکنا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

ترے شہر میں مِرا ہم سفر، وہ دُکھوں کا جَمِّ غفیر تھا
مجھے راستہ نہیں مل سکا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

وہ جو خواب تھے مِرے سامنے، جو سراب تھے مِرے سامنے
میں اُنہی میں ایسے اُلجھ گیا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

عجب ایک چُپ سی لگی مجھے، اُسی ایک پَل کے حِصار میں
ہُوا جس گھڑی ترا سامنا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

کہیں بے کنار تھیں خواہشیں، کہیں بے شمار تھیں اُلجھنیں
کہیں آنسوؤں کا ہجوم تھا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

تھا جو شور میری صداؤں کا، مری نیم شب کی دعاؤں کا
ہُوا مُلتفت جو مرا خدا، مری بات بیچ میں رہ گئی

تری کھڑکیوں پہ جُھکے ہوئے، کئی پُھول تھے ہمیں دیکھتے
تری چھت پہ چاند ٹھہر گیا، مری بات بیچ میں رہ گئی

مری زندگی میں جو لوگ تھے، مرے آس پاس سے اُٹھ گئے
میں تو رہ گیا اُنہیں روکتا، مری بات بیچ میں رہ گئی

تری بے رُخی کے حصار میں، غمِ زندگی کے فشار میں
میرا سارا وقت نکل گیا، مری بات بیچ میں رہ گئی

مجھے وہم تھا ترے سامنے، نہیں کُھل سکے گی زباں مری
سو حقیقتاً بھی وہی ہُوا، مری بات بیچ میں رہ گئی



آقا سے ہم غلام کریں گے حساب کیا!
لینی اگر ہو بھیک تو پھر انتخاب کیا!

دن میں جلے چراغ تو کیا اُس کی روشنی
لالچ ہو جس نماز میں اُس کا ثواب کیا!

اے حسنِ کائنات کبھی کُھل کے ہم سے مِل
ہم تو ترا ہی عکس ہیں ہم سے حجاب کیا!

اُس بے وفا کی دید کا اِک راستہ تو ہے
گو جانتے ہیں ہم کہ ملے گا جواب کیا!

نیت کو دیکھتا ہے وہ تسبیح کو نہیں
کرتے ہو اُٹھتے بیٹھتے تم یہ حساب کیا!

شاید یہیں پہ ختم ہو ذلّت کا یہ سفر
اس سے زیادہ اور تو ہوں گے خراب کیا!

زندہ نظر نہ آئے گی تعبیر کیا کبھی!
مرتے چلے ہی جائیں گے آنکھوں میں خواب کیا!

مانوس ہو چلی ہیں یہ آنکھیں سراب سے
دیکھیں، ہمیں دکھائے گا یہ انقلاب کیا!

جو آگ تھی لہو میں رواں، کب کی بُجھ چکی
امجدؔ ہے دل کی راکھ میں یہ اضطراب کیا!

اوجھل سہی نگاہ سے، ڈوبا نہیں ہوں میں
اے رات ہوشیار کہ ہارا نہیں ہوں میں

خوابوں کی سبز دھند سی اب بھی ہے ہر طرف
لگتا ہے یوں کہ نیند سے جاگا نہیں ہوں میں

گرمی مرے شعور کی دیتی ہے مجھ کو شکل
قسمت کے سرد ہاتھ کا لکھا نہیں ہوں میں

درپیش صبح و شام یہی کشمکش ہے اب
اُس کا بنوں میں کیسے کہ اپنا نہیں ہوں میں

اِک حرفِ رائگاں سہی مانا مرا وجود
کیسے کہوں کتاب کا حصہ نہیں ہوں میں!

مجھ کو فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں مگر
جتنا بُرا سمجھتے ہو اُتنا نہیں ہوں میں

اس طرح پھیر پھیر کے باتیں نہ کیجیے
لہجے کا رُخ سمجھتا ہوں، بچّہ نہیں ہوں میں

میری تو بات بات کی شاہد ہے کائنات
دل سے گھڑا ہوا کوئی قصّہ نہیں ہوں میں

دیکھی ہوئی سی لگتی ہے ہر رہ گزار کیوں
ان راستوں سے پہلے تو گزرا نہیں ہوں میں!

دل کو گواہ کر کے لکھا جو بھی کچھ لکھا
کاغذ کا پیٹ بھرنے کو لکھتا نہیں ہوں میں

ممکن نہیں ہے مجھ سے یہ طرزِ منافقت
دُنیا، ترے مزاج کا بندا نہیں ہوں میں

امجدؔ تھی بھیڑ ایسی کہ چلتے چلے گئے
گرنے کا ایسا خوف تھا ٹھہرا نہیں ہوں میں

کیا کیا ہمارے خواب تھے، جانے کہاں پہ کھو گئے
تم بھی کِسی کے ساتھ ہو، ہم بھی کسی کے ہو گئے

جانے وہ کیوں تھے! کون تھے آئے تھے کس لیے یہاں!
وہ جو فشارِ وقت میں، بوجھ سا ایک ڈھو گئے

اُس کی نظر نے یُوں کیا گردِ ملالِ جاں کو صاف
ابر برس کے جس طرح، سارے چمن کو دھو گئے

کٹنے سے اور بڑھتی ہے اُٹھے ہوئے سروں کی فصل
اپنے لہو سے اہلِ دل، بیج یہ کیسے بو گئے!

جن کے بغیر ایک پل، جینا ہمیں مُحال تھا
شکلیں بھی اُن کی بُجھ گئیں، نام بھی اُن کے کھو گئے

آنکھوں میں بھر کے رت جگے، رستوں کو دے کے دُوریاں
امجدؔ وہ اپنے ہم سفر، کیسے مزے سے سو گئے!



درِ کائنات جو وا کرے اُسی آگہی کی تلاش ہے
مجھے روشنی کی تلاش تھی، مجھے روشنی کی تلاش ہے!

غمِ زندگی کے فشار میں، تری آرزو کے غُبار میں
اِسی بے حسی کے حِصار میں مجھے زندگی کی تلاش ہے

یہ جو سرسری سی نشاط ہے، یہ تو چند لمحوں کی بات ہے
مری روح تک جو اتر سکے مجھے اس خوشی کی تلاش ہے

یہ جو آگ سی ہے دبی دبی، نہیں دوستو مرے کام کی
وہ جو ایک آن میں پھونک دے اُسی شعلگی کی تلاش ہے

یہ جو ساختہ سے ہیں قہقہے مرے دل کو لگتے ہیں بوجھ سے
وہ جو اپنے آپ میں مست ہو مجھے اس ہنسی کی تلاش ہے

یہ جو مَیل جَول کی بات ہے یہ جو مجلسی سی حیات ہے
مجھے اس سے کوئی غرض نہیں مجھے دوستی کی تلاش ہے



شہرت، عروج، حُسن کی دولت، کِسی سے بھی!
کرتا نہیں یہ وقت، رعایت کسی سے بھی!

جو بھی ہُوا، وہ ایسے ہی ہونا تھا، ہو گیا
یعنی نہیں ہے ہم کو، شکایت کسی سے بھی!

دل ہے کُھلی کتاب کی صُورت رکھا ہوا
کرتے نہیں ہیں ہم تو سیاست، کسی سے بھی!

سُود و زیاں کا جوڑتے رہتے ہیں جو حساب
کرتے نہیں وہ لوگ محبت، کسی سے بھی

آنے کو آ تو سکتا ہے پتّھر پہ بھی یہ دل
ہونے کو ہو تو سکتی ہے اُلفت، کسی سے بھی

ہے کون سی زبان! یہ کیسے حروف ہیں؟
کُھلتا نہیں ہے عُقدۂ قسمت، کسی سے بھی

دنیا کی دُھوپ چھاؤں پہ تکیہ نہ کیجیے
کرتی نہیں نباہ یہ عورت، کسی سے بھی

(ق)

کیسی چتاونی ہمیں غالبؔ یہ دے گئے
حاصل نہ کیجے دہر میں عبرت، کسی سے بھی

امجدؔ تماش بین ہیں سارے یہ غمگسار
کیجے نہ اپنے غم کی وضاحت، کسی سے بھی



آنکھوں کا رَنگ، بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کِتنا بدل گیا

کُچھ دن تو میرا عکس رہا آئنے پہ نقش
پھر یُوں ہُوا کہ خُود مِرا چہرا بدل گیا

جب اپنے اپنے حال پہ ہم تم نہ رہ سکے
تو کیا ہوا جو ہم سے زمانہ بدل گیا

قدموں تلے جو ریت بچھی تھی وہ چَل پڑی
اُس نے چھڑایا ہاتھ تو صحرا بدل گیا

کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہی
جاتے ہی ایک شخص کے کیا کیا بدل گیا!

اِک سرخُوشی کی موج نے کیسا کیا کمال!
وہ بے نیاز، سارے کا سارا بدل گیا

اُٹھ کر چلا گیا کوئی وقفے کے درمیاں
پردہ اُٹھا تو سارا تماشا بدل گیا

حیرت سے سارے لفظ اُسے دیکھتے رہے
باتوں میں اپنی بات کو کیسا بدل گیا

کہنے کو ایک صحن میں دیوار ہی بنی
گھر کی فضا، مکان کا نقشہ بدل گیا

شاید وفا کے کھیل سے اُکتا گیا تھا وہ
منزل کے پاس آکے جو رستہ بدل گیا

قائم کسی بھی حال پہ دُنیا نہیں رہی
تعبیر کھو گئی، کبھی سپنا بدل گیا

منظر کا رنگ اصل میں سایا تھا رنگ کا
جس نے اُسے جدھر سے بھی دیکھا، بدل گیا

اَندر کے موسموں کی خبر اُس کو ہو گئی!
اُس نو بہارِ ناز کا چہرا بدل گیا

آنکھوں میں جتنے اشک تھے جگنو سے بن گئے
وہ مُسکرایا اور مری دُنیا بدل گیا

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھونڈتے ہیں لوگ
امجدؔ یہ کون شہر کا نقشہ بدل گیا!

بدن سے اُٹھتی تھی اُس کے خُوشبو، صبا کے لہجے میں بولتا تھا
یہ میری آنکھیں تھیں اُس کا بستر، وہ میرے خوابوں میں جاگتا تھا

حیا سے پلکیں جُھکی ہوئی تھیں، ہوا کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں
وہ میرے سینے میں سر چھپائے، نجانے کیا بات سوچتا تھا

کوئی تھا چشمِ کرم کا طالب، کسی پہ شوقِ وصال غالب
سوال پھیلے تھے چار جانب، بس ایک میں تھا جو چُپ کھڑا تھا

عجیب صحبت، عجیب رُت تھی، خموش بیٹھے ہوئے تھے دونوں
میں اُس کی آواز سُن رہا تھا، وہ میری آواز سُن رہا تھا

بہار آئی تو تتلیوں کے پَروں میں رنگوں کے خواب جاگے
اور ایک بھنورا کلی کلی کے لبوں کو رہ رہ کے چُومتا تھا

وہ اور ہوں گے کہ جن کو امجدؔ نئے مناظر کی چاہ ہو گی
میں اُس کے چہرے کو دیکھتا ہوں، میں اُس کے چہرے کو دیکھتا تھا!

کون سی چیز دِل کے بس میں نہیں
دل مگر اپنی دسترس میں نہیں

یہ تو ہم ہیں، جو خار و خس میں ہیں
منزلِ گُل تو خار و خس میں نہیں!

کب سے آنکھیں تلاشتی ہیں اُسے
ایک دن، جو کسی برس میں نہیں

جسم کتنی بڑی حقیقت ہو
دل کی تسکیں مگر ہوس میں نہیں

کامراں، عاشقی کی منزل میں
ہے وہی دل جو پیش و پس میں نہیں

دیکھ لی جَنتری زمانے کی
وصل کا دن کِسی برس میں نہیں

(ق)

نارسائی کی دُھند کے اُس پار
عشق میں کیا ہے، جو ہَوس میں نہیں!

لذّتِ پَر کُشادگی کے سوا
باغ میں کیا ہے، جو قفس میں نہیں!

چہرے پہ مرے زُلف کو پھیلاؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو برس جاؤ کسی دن

رازوں کی طرح اُترو مرے دل میں کسی شب
دستک پہ مرے ہاتھ کی کُھل جاؤ کسی دن

پیڑوں کی طرح حُسن کی بارش میں نہا لُوں
بادل کی طرح جُھوم کے گھر آؤ کسی دن

خُوشبو کی طرح گزرو مرے دل کی گلی سے
پُھولوں کی طرح مجھ پہ بکھر جاؤ کسی دن

پھر ہاتھ کو خیرات ملے بندِ قبا کی
پھر لُطفِ شبِ وصل کو دُہراؤ کسی دن

گزریں جو مرے گھر سے تو رُک جائیں ستارے
اس طرح مری رات کو چمکاؤ کسی دن

میں اپنی ہر اک سانس اُسی رات کو دے دوں
سر رکھ کے مرے سینے پہ سو جاؤ، کسی دن

کہاں آ کے رُکنے تھے راستے! کہاں موڑ تھا! اُسے بُھول جا
وہ جو مِل گیا اُسے یاد رکھ، جو نہیں مِلا اُسے بُھول جا

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دلِ بے خبر مری بات سُن، اُسے بُھول جا، اُسے بُھول جا

میں تو گُم تھا تیرے ہی دھیان میں، تری آس، تیرے گمان میں
صبا کہہ گئی مرے کان میں، میرے ساتھ آ، اُسے بُھول جا

کسی آنکھ میں نہیں اشکِ غم، ترے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بُھلا دیا، تُو بھی مسکرا، اُسے بُھول جا

کہیں چاکِ جاں کا رَفو نہیں، کسی آستیں پہ لہو نہیں
کہ شہیدِ راہِ ملال کا نہیں خُوں بہا، اُسے بُھول جا

کیوں اَٹا ہوا ہے غُبار میں، غمِ زندگی کے فشار میں
وہ جو دَرج تھا ترے بخت میں، سو وہ ہو گیا، اُسے بُھول جا

نہ وہ آنکھ ہی تری آنکھ تھی، نہ وہ خواب ہی ترا خواب تھا
دلِ منتظر تو یہ کس لیے، ترا جاگنا، اُسے بُھول جا

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا، اسے دیکھ، اس پہ یقیں نہ کر
نہیں عکس کوئی بھی مستقل، سرِ آئنہ، اُسے بُھول جا

جو بساطِ جاں ہی اُلٹ گیا، وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اُسے روکنے سے حصول کیا، اُسے مت بُلا، اُسے بُھول جا

تو یہ کس لیے شبِ ہجر کے اُسے ہر ستارے میں دیکھنا
وہ فلک کہ جس پہ مِلے تھے ہم، کوئی اور تھا، اُسے بُھول جا

تجھے چاند بَن کے مِلا تھا جو، ترے ساحلوں پہ کِھلا تھا جو
وہ تھا ایک دریا وصال کا، سو اُتر گیا، اُسے بُھول جا



بھیڑ میں اِک اجنبی کا سامنا اچھا لگا
سب سے چُھپ کر وہ کسی کا دیکھنا اچھا لگا

سُرمئی آنکھوں کے نیچے پھول سے کِھلنے لگے
کہتے کہتے کچھ کسی کا سوچنا اچھا لگا

بات تو کُچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کا ایک دَم
ہاتھ کو ہونٹوں پہ رکھ کر روکنا اچھا لگا

چائے میں چینی ملانا اُس گھڑی بھایا بہت
زیرِ لب وہ مسکراتا ''شکریہ'' اچھا لگا

دل میں کتنے عہد باندھے تھے بُھلانے کے اُسے
وہ ملا تو سب ارادے توڑنا اچھا لگا

بے ارادہ لمس کی وہ سنسنی پیاری لگی
کم توجہ آنکھ کا وہ دیکھنا اچھا لگا!

نیم شب کی خامشی میں، بھیگتی سڑکوں پہ کل
تیری یادوں کے جلو میں گھومنا اچھا لگا

اُس عدوئے جاں کو امجدؔ میں بُرا کیسے کہوں
جب بھی آیا سامنے وہ بے وفا اچھا لگا

تلاشِ منزلِ جاناں تو اِک بہانہ تھا
تمام عمر میں اپنی طرف روانہ تھا

میں تیری دُھن میں رَواں تھا مجھے پتہ نہ چلا
غبارِ راہ میں شامل غمِ زمانہ تھا

مَیں اُس کو حشر میں کس نام سے صدا دیتا
کہ میرا اُس کا تعارف تو غائبانہ تھا

عجب کشش تھی سمندر کی سبز آنکھوں میں
ہر ایک چشمہ اُسی کی طرف روانہ تھا

وہی نہیں تو وَرق کس لئے سیاہ کریں
سُخن تو عرضِ تمنّا کا اِک بہانہ تھا

سمندِ شوق تھا امجدؔ رَواں دَواں جب تک
قدم کے نیچے ستاروں کا شامیانہ تھا



دل کے دریا کو کسی روز اُتر جانا ہے
اِتنا بے سمت نہ چل، لَوٹ کے گھر جانا ہے

اُس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے
جیسے پانا ہی اُسے، اصل میں مَر جانا ہے

بول اے شامِ سفر، رنگِ رہائی کیا ہے
دِل کو رُکنا ہے کہ تاروں کو ٹھہر جانا ہے!

کون اُبھرتے ہوئے مہتاب کا رستہ روکے
اُس کو ہر طَور سُوئے دشتِ سحر جانا ہے

میں کِھلا ہوں تو اسی خاک میں مِلنا ہے مجھے
وہ تو خوشبو ہے، اُسے اگلے نگر جانا ہے

وہ ترے حُسن کا جادُو ہو کہ میرا غمِ دل
ہر مسافر کو کسی گھاٹ اُتر جانا ہے

گزر گیا جو زمانہ اُسے بھلا ہی دو
جو نقش بن نہیں سکتا اُسے مِٹا ہی دو

کھلے گا ترکِ تعلق کے بعد بابِ فنا
یہ ایک آخری پردہ بھی اَب اُٹھا ہی دو

رُکی رُکی سی ہَوا ہے، تھکا تھکا ہے چاند
وفا کے دشت میں حیراں کھڑے ہیں راہی، دو

گزر رہا ہے جو لمحہ اسے اَمر کر لیں
میں اپنے خُون سے لکھتا ہوں، تم گواہی دو

کسی طرح سے تغافل کا بابِ شک تو کھلے
نہیں میں پیار کے قابل تو کچھ سزا ہی دو

میں کائنات کو غم سے نجات دے دُوں گا
مِری گرفت میں اِک دِن اگر تباہی دو

چاند کے ساتھ کئی درد پُرانے نکلے
کِتنے غم تھے جو ترے غم کے بہانے نکلے

فصلِ گُل آئی، پھر اِک بار اسیرانِ وفا
اپنے ہی خُون کے دریا میں نہانے نکلے

ہجر کی چوٹ عجب سنگ شِکن ہوتی ہے
دل کی بے فیض زمینوں سے خزانے نکلے

عُمر گزری ہے شبِ تار میں آنکھیں ملتے
کس اُفق سے مرا خُورشید نہ جانے نکلے

کُوئے قاتل میں چلے جیسے شہیدوں کا جلوس
خواب یوں بھیگتی آنکھوں کو سجانے نکلے

دِل نے اِک اینٹ سے تعمیر کیا تاج محل
تُو نے اِک بات کہی، لاکھ فسانے نکلے

دشتِ تنہائی ہجراں میں کھڑا سوچتا ہوں
ہائے کیا لوگ مرا ساتھ نبھانے نکلے!

میں نے امجدؔ اُسے بے واسطہ دیکھا ہی نہیں
وہ تو خوشبو میں بھی آہٹ کے بہانے نکلے



حسابِ عمر کا اِتنا سا گوشوارا ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارا ہے

کسی چراغ میں ہم ہیں، کسی کنول میں تُم
کہیں جمال ہمارا کہیں تمہارا ہے

وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشے میں
تمام عُمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے

ہر اِک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نجانے ہم ہیں دوبارا کہ یہ دوبارا ہے

وہ مُنکشِف مِری آنکھوں میں ہو کہ جلوے میں
ہر ایک حُسن کسی حُسن کا اشارہ ہے

عجب اصول ہیں اس کاروبارِ دُنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اُتارا ہے

کہیں پہ ہے کوئی خُوشبو کہ جس کے ہونے کا
تمام عالمِ موجود استعارا ہے

نجانے کب تھا! کہاں تھا مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گزارا ہے

یہ دو کنارے تو دریا کے ہو گئے ، ہم تم!
مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارا ہے

اَب تک نہ کُھل سکا کہ مرے رُوبرو ہے کون!
کس سے مکالمہ ہے! پسِ گفتگو ہے کون!

سایا اگر ہے وہ تو ہے اُس کا بدن کہاں؟
مرکز اگر ہوں میں تو مرے چار سُو ہے کون!

ہر شے کی ماہیت پہ جو کرتا ہے تُو سوال
تجھ سے اگر یہ پوچھ لے کوئی کہ تُو ہے کون!

اشکوں میں جھلملاتا ہوا کس کا عکس ہے!
تاروں کی راہگذار میں یہ ماہ رُو ہے کون!

باہر کبھی تو جھانک کے کھڑکی سے دیکھتے،
کس کو پکارتا ہوا یہ گُو بہ گُو ہے کون!

آنکھوں میں رات آ گئی لیکن نہیں کُھلا
میں کس کا مدّعا ہوں، مری جستجو ہے کون!

کس کی نگاہِ لطف نے موسم بدل دیئے
فصلِ خزاں کی راہ میں یہ مُشکبو ہے کون!

بادل کی اوٹ سے، کبھی تاروں کی آڑ سے
چُھپ چُھپ کے دیکھتا ہوا یہ حیلہ جُو ہے کون!

تارے ہیں آسمان میں جیسے زمیں پہ لوگ
ہر چند ایک سے ہیں مگر ہُو بہو ہے کون!

ہونا تو چاہیے کہ یہ میرا ہی عکس ہو
لیکن یہ آئینے میں مرے رُو برُو ہے کون!

اس بے کنار پھیلی ہوئی کائنات میں
کس کو خبر ہے کہ کون ہوں میں! اور تُو ہے کون

سارا فساد بڑھتی ہوئی خواہشوں کا ہے
دل سے بڑا جہان میں امجدؔ، عدُو ہے کون!



کچھ وضاحت نہ التجا کیجے
سچ کہا ہے تو حوصلہ کیجے

ہم نے مانا کہ معتبر ہے دماغ
دل نہ مانے اگر تو کیا کیجے

آپ بھی تو یہیں پہ رہتے ہیں
خود کو بھی وقت کچھ دیا کیجے

کرنا چاہیں جو شہر کی تعمیر
اپنے ہی گھر سے ابتدا کیجے

خود شناسی مرض ہی بن جائے
خود کو اتنا نہ مبتلا کیجے

جس طرح ہے زبان دانتوں میں
ایسے ہر بزم میں رہا کیجے

دل و دیدہ میں کون مجرم ہے؟
آپ منصف ہیں، فیصلہ کیجے

دل نہ دنیا سے ہار مانے کبھی
میرے حق میں یہی دعا کیجے

آئنے ٹوٹ کر نہیں جڑتے
دوستوں کو نہ یوں خفا کیجے

لفظ سے بھی خراش پڑتی ہے
تبصرہ سوچ کر کیا کیجے

جھوٹ سے بھی بُرا ہے آدھا سچ
اس سے بہتر ہے چپ رہا کیجے

آپ تو موسموں کے بھیدی ہیں
دھند بکھرے گی کب، پتا کیجے

امبر کی آنکھوں میں بادل کا کاجل ہے

امبر کی آنکھوں میں بادل کا کاجل ہے
کاجل میں تارے ہیں گُم
میری نگاہوں میں تُم

بے چین باہوں میں
بے خواب راہوں میں
پیاسی نگاہوں میں
گُم سُم نظارے ہیں، مدہوش تارے ہیں
سارے کے سارے ہیں
سپنوں کی دُنیا میں گُم
میری نگاہوں میں تُم
جھل مِل زمانے ہیں
لب پہ ترانے ہیں
سپنے سہانے ہیں
کرنوں کا گھیرا ہے، روشن سویرا ہے
پھر بھی اندھیرا ہے
آنکھوں سے اوجھل ہو تُم
سپنوں کی دُنیا میں گُم

امبر کی آنکھوں میں بادل کا کاجل ہے
کاجل میں تارے ہیں گُم
میری نگاہوں میں تُم

اے وقت ذرا تھم جا

اے وقت ذرا تھم جا
اے موجِ ہَوا ___ آہستہ
آہستہ چلو لہرو
کچھ اَور ذرا ___ آہستہ

بے گانہ ہوئے اپنے، کیا پاس رہا اپنے
کچھ بُھولی ہوئی باتیں، کچھ ٹوٹے ہوئے سپنے
یہ کس نے ہَواؤں میں
ہَولے سے کہا ___ آہستہ
اے وقت ذرا تھم جا
اے موجِ ہَوا ___ آہستہ
کم تاب اُجالوں میں، بے ربط سوالوں میں
ہر چیز مقیّد ہے، الفاظ کے جالوں میں
اَن جھیل سی آنکھوں میں
ہے رقصِ فنا ___ آہستہ
آہستہ چلو لہرو
کچھ اور ذرا ___ آہستہ

مَیں ترے سنگ کیسے چلوں ساجنا

مَیں ترے سنگ کیسے چلوں ساجنا
تُو سمندر ہے مَیں ساحلوں کی ہَوا

تُو بہاروں کی خوشبو بھری شام ہے ___ مَیں ستارا ترا
زندگی کی ضمانت ترا نام ہے ___ تُو سہارا مرا
مَیں غبارِ سفر، مَیں خزاں کی صدا
مَیں ترے سنگ کیسے چلوں ساجنا

تُو مرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر چلے ___ مہربانی تری
تیری آہٹ سے دِل کا دریچہ کھلے ___ مَیں دیوانی تری
مَیں نے ساری خُدائی میں تجھ کو چُنا
مَیں ترے سنگ کیسے چلوں ساجنا

تُو چلے تو ستارے بھی چلنے لگیں ___ آنسوؤں کی طرح
خواب، بے خواب آنکھوں میں جلنے لگیں ___ جگنوؤں کی طرح
میری منزل بنے، تیرا ہر راستہ
مَیں ترے سنگ کیسے چلوں ساجنا
تُو سمندر ہے مَیں ساحلوں کی ہَوا

پِیا نام کا دِیا جلا ہے ساری رات

پِیا نام کا دِیا جلا ہے ساری رات

قطرہ قطرہ درد کی شبنم
برسی دِل کی دیواروں پر
تیرے نام کی خوشبو لے کر
ہَولے ہَولے، مدّھم، مدّھم
دُکھ اگنی میں جیا، جلا ہے ساری رات
پیا نام کا دِیا، جلا ہے ساری رات
کر کے روشن تارے ماند
تنہائی کے مارُوتھل میں
سپنے بو کر نینن جل میں
ڈوبا دُور گگن میں چاند
سُکھ کا سپنا پیا، جلا ہے ساری رات
پیا نام کا دِیا جلا ہے ساری رات

کیسی فرقت، کیسا ساتھ،
خوابوں کے اس رُوپ نگر میں
دل ہے کھلی ہَوا کا پنچھی
اس زخمی پنچھی کا ہاتھ
جس نے تھام لیا، جلا ہے ساری رات
پیا نام کا دیا، جلا ہے ساری رات

مَیں تارا تارا جاگوں تیرے نام

مَیں تارا تارا جاگوں تیرے نام
تیرے نام
سُن، بولے کوئل کالی
مَیں پی کی ہُوں متوالی
اُسے ڈھونڈوں ڈالی ڈالی
میں پتہ پتہ دیکھوں صُبح و شام
مَیں تارا تارا جاگوں تیرے نام

سُن، بیچ سمندر آیا
کیا دُوری رنگ دکھایا
تجھے بھایا، دیس پرایا
مَیں ساحل ساحل بھیجوں اک پیغام
مَیں تارا تارا جاگوں تیرے نام

سُن، کلیوں نے ہے پہنا
ست رنگوں کا پھر گہنا
آ، دیکھ لے آ کر، ہے نا!
مَیں شبنم شبنم بھر دوں دل کا جام
مَیں تارا تارا جاگوں تیرے نام

جو بھی کُچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

جو بھی کُچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے
تیرے میرے ابد کا کنارا ہے یہ
استعارا ہے یہ

رُوپ کا داؤ ہے
پیار کا گھاؤ ہے
جو بھی کُچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

صُبح دَم جس گھڑی، پُھول کی پنکھڑی
اوس کا آئنہ جگمگانے لگا
ایک بھنورا وہیں، دیکھ کر ہر کہیں
شاخ کی اوٹ سے سر اُٹھانے لگا
پُھول، بھنورا، تلاطم ہے، ٹھہراؤ ہے
جو بھی کُچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

خواب کیا کیا چُنے، جال کیا کیا بُنے
موج تھمتی نہیں، رنگ رُکتے نہیں
وقت کے فرش پر، خاک کے رقص پر
نقش جمتے نہیں، ابر جُھکتے نہیں
ہر مسافت کی دُوری کا سمٹاؤ ہے
جو بھی کُچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

تُن تُن تُن تُن تارا

تُن تُن تُن تُن تارا
بجے رات کے بارہ

چھت پر بلّی بھاگی ہے
نیند سے گڑیا جاگی ہے
بلّی نے اِک چوہا مارا
تُن تُن تُن تُن تارا
بجے رات کے بارہ

گلی میں بولا چوکیدار
چوروں سے رہنا ہُشیار
اِتنے میں گھڑیال پُکارا
تُن تُن تُن تُن تارا
بجے رات کے بارہ

کہتی ہے یہ رات کی رانی
بادل کے اندر ہے پانی

مارا بجلی نے لشکارا
تُن تُن تُن تُن تارا
بجے رات کے بارہ

گلزار بنا دیں گے

گلزار بنا دیں گے
اس چاند زمیں کو ہم
تاروں سے سجا دیں گے

پہچان ہماری ہے
یہ پاک زمیں یارو
جند جان ہماری ہے

کرنوں کے اشارے ہیں
یہ چاند ہمارا ہے
ہم اس کے ستارے ہیں

اک چاند اک تارا ہے
لہراتا ہُوا پرچم
اعلان ہمارا ہے

تعمیر کی صُورت ہے
اس دیس کا ہر بچّہ
تعبیر کی صُورت ہے

ماہیے

خوشبو سے بھری راتیں
تم ایک نظر دیکھو
پتھر بھی کریں باتیں

دن رات کی گردش میں
کچھ بھی تو نہیں قائم
ہر چیز ہے لرزش میں

تدبیر نہیں بنتی
رنگ ایک بھی کم ہو تو
تصویر نہیں بنتی

کیا بخت نکھرتا ہے
جس دم کسی شاعر پر
اک شعر اُترتا ہے

خوش باش رہو تم بھی
وہ بات جو دل میں ہے
ایک بار کہو تم بھی

ہر صبح یہ کہتی ہے
عزّت کے لیے سوچو
شہرت نہیں رہتی ہے

بے تاب چلے آئے
مٹی میں ملانے کو
احباب چلے آئے

مجبور نہیں رہنا
آمد ہے بہاروں کی
اب دُور نہیں رہنا

کیوں پھول نہیں کھلتے
وہ مل بھی اگر جائے
الفاظ نہیں ملتے

محبوب جو ربّ کا ہے
ہر چیز یہ کہتی ہے
محبوب وہ سب کا ہے

خوش بخت وہ بندہ ہے
ہر عمر میں اِک بچہ
جس شخص میں زندہ ہے

رحمت کے فرشتے ہیں
ان جیسا نہیں کچھ بھی
جو پیار کے رشتے ہیں

بے نام ہوئے آخر
قسطوں میں جو زندہ تھے
نیلام ہوئے آخر

ہے یادِ زمانہ وہ
کیا اُس سے گِلہ کرتے
تھا دوست پرانا وہ

اِک خاک کی ڈھیری ہے
مٹی کا بھروسہ کیا
تیری ہے نہ میری ہے

جگنو کہ ستارا تھا
ترے بام پہ جو چمکا
وہی نام ہمارا تھا

پھولوں کی کیاری ہے
ترے دل کی خوشی سجنا
ہمیں جان سے پیاری ہے

دُنیا مرے ساتھ چلے
ہر چیز ٹھہر جائے
جب تم سے بات چلے

ازلوں سے ماندی ہوں
جو مرضی صاحب کی
میں اُس کی باندی ہوں

اِک بھُول نہ ہو جائیں
تری ڈاچی کے مُڑنے تک
ہم دُھول نہ ہو جائیں

پھر بات نہیں چلتی
جو پیڑ سے کٹ جائے
وہ شاخ نہیں پھلتی

اب فرض حفاظت ہے
یہ پاک وطن ساتھی
اللہ کی امانت ہے

باغوں میں کھلیں کلیاں
رہیں روزِ قیامت تک
آباد تری گلیاں!

گلزار بنا دیں گے
اس چاند زمیں کو ہم
تاروں سے سجا دیں گے

اِک چاند، اِک تارا ہے
لہراتا ہوا پرچم
اعلان ہمارا ہے

اجازت ہو اگر مجھ کو

(عرب شاعر نزار ارقبانی کی نظم کا منظوم ترجمہ)

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں بھی پرورش بچّوں کی اپنے
اس طرح کر لوں
کہ اُن کی زندگی پُرنور ہو ایسے حوالوں سے
کہ جو پہچان ہیں اُن کی
کہ جن سے ہے مری تہذیب اور تاریخ کا ہر آئنہ روشن
(تمہارے حکم اور خواہش کے سائے میں
تو ایسا ہو نہیں سکتا!)

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں بتلاؤں بچّوں کو
کہ مذہب کا تعلق بس خدائے لم یزل سے ہے

نہیں اس کا کوئی رشتہ کسی بے علم ''عالم'' سے
نہ اُس جیسے بزعمِ خویش پیروں اور شیخوں سے
اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں سکھلاؤں آنگن میں ہمکتے نونہالوں کو
کہ مذہب کا تشخص ہے
دیانت اور سچائی، بھلے آداب، حُسنِ خُلق
اور احسن روّیوں سے
انہیں یہ بھی بتاؤں میں
کہ یہ باتیں مقدم ہیں سبھی ایسے سلیقوں سے
''کہ وہ کس ہاتھ سے کھائیں
جو جائیں غسل خانے میں
تو رکھیں فرش پر اُس کے وہ پہلے کون سا پاؤں؟''

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں بتلاؤں بیٹی کو ''خدا تو بس محبت ہے''
اُسے پوری اجازت ہے
وہ جب چاہے کرے اُس سے، وہ سب باتیں جو رہتی ہیں
سوالوں کی طرح اُس کے الجھتے سے خیالوں میں
(کسی بھی خوف سے ہٹ کر)
جو اُس کے دل کی باتیں ہیں

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں اُن کو عذاب قبر کی تفصیل سے
محفوظ ہی رکھوں
کہ یہ معصوم بچے تو مری دانست میں شاید
نہیں آگاہ اس سے بھی
کہ مرنا کس کو کہتے ہیں!

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو قبل اس کے
کہ میں مجبور کر دوں اپنی اس چھوٹی سی بیٹی کو
کہ وہ گل سے حجاب اوڑھے!
میں یہ بتلا سکوں اُس کو کہ رُوحِ بندگی کیا ہے!
اور اپنی اصل میں
آداب اور تہذیبِ مذہب کس کو کہتے ہیں!

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں اپنے جواں ہوتے ہوئے بیٹے کو اتنی بات بتلا دوں
کہ انسانوں کو دُکھ دینا
انہیں تکلیف میں رکھنا
عقیدے، قوم، یا رنگت
کسی بھی فرق کے باعث

انہیں کمتر سمجھنا، لائقِ تضحیک ٹھہرانا
سب ایسے جرم ہیں جن کی معافی ہو نہیں سکتی

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں بتلاؤں مکتب سے
پلٹ کر آنے والی اپنی اُس معصوم بچی کو
کہ ربِّ دو جہاں کو کس قدر محبوب ہے اُس کا
توجہ سے سبق پڑھنا، اُسے مکتب سے واپس لوٹ کر
پھر گھر میں دُہرانا
کہوں اُس سے
کہ وہ اس سے کہیں بہتر سمجھتا ہے
ہنا مفہوم اور مطلب سمجھنے کے
اگر اُس کے کلامِ پاک کو یوں ہی رٹا جائے۔

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں اس راز کو اپنے جگر گوشے کی آنکھوں پر
کروں تفصیل سے روشن
کہ تقلیدِ محمد مصطفیٰ ﷺ کا وہ سنہرا راستہ کیا ہے!
اُسے یہ بات سمجھاؤں
کہ اُن کے پاک اُسوہ سے
وفاداری، دیانت اور سچائی کو رختِ جاں بنانا ہی

حقیقت میں ہے درس اُن کا
نہ یہ اُلجھن
کہ اُن کی ریش کا انداز کیسا تھا؟
نہ یہ چنتا
کہ اُن کے ثوب کی لمبائی کتنی تھی؟
اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں اب اپنی بیٹی سے ذرا اس بات کی تشریح بھی کر دُوں
کہ جو اُس کی وہ عیسائی سہیلی ہے
ہے وہ بھی صاحبِ ایماں،
وہ اُس کے آتشِ دوزخ میں جلنے کے تصوّر سے نہ یوں ہی آبدیدہ ہو!
کہ اُس پر بھی خدائے پاک کی
رحمت کا عالم گیر سایہ ہے
زمیں پر سانس لیتی جس قدر خلقت ہے وہ ساری
اُسی کا ہی تو کنبہ ہے!

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں یہ اک دلیلِ بے بدل بھی سامنے رکھ دوں
کہ اُس کے آخری پیغام بَر تھے رحمتِ عالم
محمد مصطفیٰ ﷺ، سو اب
نہیں روزِ ابد تک یہ کسی انساں کی قسمت میں
کہ وہ اُس کی طرف سے خلق کو جاری کرے آ کر
کسی بخشش کا پروانہ
کوئی طرزِ جداگانہ

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں کہہ دوں
کہ قتلِ رُوحِ انسانی ہے ممنوعات میں شامل

خدا کا صاف فرماں ہے
''بغیر جُرم دھرتی پر
اگر اک شخص بھی مارا گیا تو پھر
سمجھ لو اے زمیں والو
ہلاکت ہے، حقیقت میں یہ پوری نوعِ انسان کی''
ابد تک ہم پہ اب اس حکم کی تعمیل واجب ہے
کسی مومن کا مومن کو ستانا، بھی روا کب ہے!

اجازت ہو اگر مجھ کو
تو میں بچّوں کو ربِّ دو جہاں کی
عظمتِ بے مثل سمجھاؤں
کہوں اُن سے
کہ اُس کی بخشش و انصاف کے آگے
اگر رُوئے زمیں پر سانس لیتے
سب کے سب یہ مذہبی عالم
اکٹھے بھی کیے جائیں تو اک نقشِ خیالی ہیں
عنایاتِ خداوندی کا ثانی ہی نہیں کوئی
یہ سارے دِین کے تاجر
اگر تم غور سے دیکھو، پیالے ہیں جو خالی ہیں

نہیں ان کی صفوں میں دُور تک اہلِ صفا کوئی
خبر کیا، روزِ محشر پھر بھی ہو چشمِ کرم ان پر
کہ اُس دریائے رحمت کی نہیں ہے انتہا کوئی

كم يبدوا جميلاً

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا عربی ترجمہ)

مترجم: یاسمین جابر

كم يبدوا جميلاً
أن يُبتلى القلب فجأة هكذا،
أن يعرف الحب،
لكن حينما أرى
كم مضى الزمن
كيف ثبت على
الرؤوس والأقدام و غبار الطرق
وكلانا
في دوائر حياتنا
في مشاغلنا
حائرين بهذه الطريقة
مثلما يسرى معاً في صحراء الفلك،
نجمان
يبدوان مرتبطين في الظاير في دائرة
لكن فى صحبتهما
يكون بينهما نهر الوحدة لمئات آلاف الأميال كذالك

كيف عبور هذا النهر

فلا أنت على ذاك الشاطئ،

ولا أنا على هذا الشاطئ"

فالأفضل

أن نتجول في فراغ دوائرنا

كالنجوم

نتلألأ و نومض معاً

لكننا نعترف بالنهر الأحمر الفاصل بيننا

فلتعترف يا هذا!

بأن هذا النهر بلا جسر

فأنت لا تقدر على العوم و أنا لا أقدر على العوم!

يبدوا جميلاً

أن يعرف القلب فجأة الحب

و أن يُبتلى ثانيةً

البيت وساكنوه

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا عربی ترجمہ)

مترجم: یاسمین جابر

في هذه العوالم الكبيرة
كم من أحجار الالآم تجمعونها
لبناء عمارة عليها لافتة باسمكم

و قد جمعت أنا أيضًا أحجارًا
و بنيت بيتًا
زينته بالألوان والورود والصور
دونت اسمي على لافتة الباب

و لكنك تعيش في كل حجرة به!

كلام قليل

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا عربی ترجمہ)

مترجم: یاسمین جابر

ماذا أقول لک حبيبي، في رحلة الحياة
في أمواج الأمانى، في جدال بهذا القدر
مضي الزمن، بَهتان الحظ
وحشة الغربة، قسوة الشريد
في بحر الهجر
قصة عرش، و مقصلةٍ كذلک
ما أسمِعک إيّاه
هو أقل الكلام
ولكنه حديث العمر كله
(كيف يكون حديث العمر كله في ساعتين!
فى بحر الألم
جزرٌ لا تعد، ولألئ كُثر)
و ما كنت قد زينته في محراب العين
حديث ذلک المصباح
حديث ذلک الحضن
أن ما يأتي في خلوت الدماء كمثل اللص
لحطم على أسوار الكلمة
حديث الليل أطول من الحياة
كيف ممكن في الطريق!
حديث الخلوة
في أحاديث الخلوة كلام إضافي
طرة واحدة كافية اللمحبين
نتبه فمن الممكن أن تكون وحيداً ذات يوم
ماذا أقول لک حبيبي، في هذا الكم من الجدال

الحب

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا عربی ترجمہ)

مترجم: یاسمین جابر

الحب صورة الندى
يروي شفاة وريقة البرعم العطشى
يضفي ألوانًا بديعةً على الزهور
يتلألأ و يبتسم و يترنم بسرعة برق السحر
تشعر الصحراء كذلك في أيام الحب
الحب صورت الفردوس
الحب صورت الندى
الحب صورت السحاب
تأتي على أرض القلوب و تمطر
تهُزُ كل ذرةٍ في الحديقة، و تبتسم
و تجعل العشب رأسه في الطين و ينمو
فالحب يمنحهم الخلود والنضرة
فالقلوب التي مثل صورت القبر
الحب فيها صورة النار!

الحب صورت النار
حينما يحترق في الصدور المطفأة، تستيقظ القلوب
تكمن بعض الأسرار العجيبة في حرارة الحب
و بالقدر الذى تتأجج به هذه الحرارة، تفوح رائحة عروس الروح
تجتمع على شواطئ القلوب ثم تفترق
الحب صورة الزيد

الحب صورة النار!
الحب صورة الحلم،
يسقط في الفظرات كقمر
يتلألأ فيها كنجوم الأماني
حتى لا تذهب المعرفة كالقلب المطفأ!
حينما ينزل بدر الأحلام على شجرة الحب
تستيقظ الأغصان
و حين تتجدث النجوم المتعبة مع لأرض
فمتى تنهض الشموع في عيون المنتظرين
يشتعل فيهم الحب كسراج الماء
الحب، صورت الحُلم!

الحب صورة الأم!
يبقى استعارة للفصول الماضية
يبقى نجمًا مضيئًا في ليالي الهجر
عندما تهتز مشاعل المصابيح على الحوائط
تفزع الهواء اليائس في القرية
عندما ينقطع أي دبيب في القرية، أي ظلٍ
حينما لا يبقى أي خداع كذلك للألآم القلب
حينما يرتبط التحطيم بثقل الأحزان على الأكتاف
فنضع هذه الأيدي عليهم
كموّازر، كمواسٍ
عندما تمر جميع القوافل بقرية القلب
فترقص في الفضاء لفترة
هذه صورة الغبار
الحب، صورة الألم!

WAKING EYES

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا انگریزی ترجمہ)

مترجم: ڈاکٹر بیدار بخت

The markets are full of faces,
And houses with voices.
Even so a nameless fear
Runs through one's blood.
There are many rooftops of silence,
Many doorways of hush.
Desire is a dark journey,
Nothing but stones.

Rise from the spell of the scene,
Be lost in dreams.
People of the waking city,
You should sleep now.

THE LAMENT OF NEW GENERATIONS

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا انگریزی ترجمہ)

مترجم: ڈاکٹر بیدار بخت

I often wonder:
Why did I spend my time
On all that learning?
Who should I ask?
They gave me visions of belief as light,
The glamour of shining values as life.
I was taught tricks
Which would confound even the teachers.
How can I see new scenes?
With old, frozen eyes?
Where can I show my tricks,
Where can I embellish new thoughts?
How can I leap towards the stars
When there's no earth beneath my feet?
Should I cherish old values,
Or reach for heights of new beliefs?

All those beliefs, all those values
Were given to me as coins,
More reliable than my senses.
When I went out to use them as my guide,
I found my hands empty.
I stand in a market place
Where the currency has been changed.

THE CHAIN

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا انگریزی ترجمہ)

مترجم: ڈاکٹر بیدار بخت

Like a river drawn on a sheet of sand,
It is the companion of every pathway:
What wall is this?

From the beginning until the end,
The sword of running time
Hangs between dreams and their realization:
What sword is this?

Like a road halting at every turn,
It becomes a chain of faltering feet.
What speed is this?

Across the pathway of words and meaning,
Lies hang like the curtain of stage,
Hiding what truth?
We don't know.
Who's the audience here
And who's the show?

Like a river drawn on a sheet of sand,
The wall of doubt,
Stretches from horizon to horizon.
Let someone tell me;
Let someone show me
The faces of words,
And what lies within.

SHAIL

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا تُرکی ترجمہ)

مترجم: جلیل طوقار

Senin adinin harfflerinden daha güzel harfler
Bulunmaz ebcet alfabesinde,
Kim bilir ne zamandir bu mevsim
Yildizlar misali parildiyor topragin sinesinde,
Fakat onlarin gozleri de
Seninle bulusma anlarindan daha güzelini
Ne gordü, ne gormek istedi bu alemde,
Ruzgarin daglara taslara isledigi
Senin adin sadece,
Catinin ustundedn gecerken gokte kayan yildizlar
Durmak icin can atiyor hevesle,
Felege ulasip buse alan tutkular,
Senin gozunden dusunce
Duserler dipsiz bir kuyunun icine,
Senin ruyalarinla aydinlanan minareler kaybolmaz
Zamanin sonsuz irmagin icinde,
Senin adinin harflerinden daha guzel harfler
Bulunmaz ebcet alfabesinde!

KARA BUYU

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا تُرکی ترجمہ)

مترجم: جلیل طوقار

Benim tum sanatim, benim ugrasim, benim cabam
Yarim kalmis bir sarkinin misralaridir,
Bu misralarda
Ne anlam bagi bulunur, ne de kafiye istegi
Sanki sonu belli olmayan bir cocuk oyunu gibi!

Benim metaim su ask buyusudur sadece
Ony ogrendim ben bin bir guclukle
Fakat bu ask buyusu gercekten garip bir hediye
Anlasilamiyor asla neyin nesidir hakikatte
Kaderin odulu mu, cezasi mi?
Dusurdu bu, beni hayrete

Ey sevgili! Kime anlatyim bu garip hikayeyi
Gorunuste ask buyusune sahibim degil mi?
Ama benim gonlumde onun yuku o kadar agir ki
Yigilmis sineme hafiflemez ayni bir dag misali
bunun aksine onun etkisi oylesine hafif ki
Buyulemek istesem de buyuleyemiyorum seni!

heading

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا اطالوی ترجمہ)

مترجم: وینوسالی رنو

SAHİL

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا تُرکی ترجمہ)

مترجم: جلیل طوقار

Senin adının harflerinden daha güzel harfler
Bulunmaz ebcet alfabesinde,
Kim bilir ne zamandır bu mevsim
Yıldızlar misali parıldıyor toprağın sinesinde,
Fakat onların gözleri de
Seninle buluşma anlarından daha güzelini
Ne gördü, ne görmek istedi bu âlemde,
Rûzgârın dağlara taşlara işlediği
Senin adın sadece,
Çatının üstünden geçerken gökte kayan yıldızlar
Durmak için can atıyor hevesle,
Feleğe ulaşıp buse alan tutkular,
Senin gözünden düşünce
Düşerler dipsiz bir kuyunun içine,
Senin rüyalarınla aydınlanan minareler kaybolmaz
Zamanın sonsuz ırmağın içinde,
Senin adının harflerinden daha güzel harfler
Bulunmaz ebcet alfabesinde!

KARA BÜYÜ

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا ٹرکی ترجمہ)

مترجم: جلیل طوقار

Benim tüm sanatım, benim uğraşım, benim çabam
Yarım kalmış bir şarkının mısralarıdır,
Bu mısralarda
Ne anlam bağı bulunur, ne de kafiye isteği
Sanki sonu belli olmayan bir çocuk oyunu gibi!

Benim metaım şu aşk büyüsüdür sadece
Onu öğrendim ben bin bir güçlükle
Fakat bu aşk büyüsü gerçekten garip bir hediye
Anlaşılamıyor asla neyin nesidir hakikatte
Kaderin ödülü mü, cezası mı?
Düşürdü bu, beni hayrete

Ey sevgili! Kime anlatayım bu garip hikâyeyi
Görünüşte aşk büyüsüne sahibim değil mi?
Ama benim gönlümde onun yükü o kadar ağır ki
Yığılmış sineme hafiflemez aynı bir dağ misali
Bunun aksine onun etkisi öylesine hafif ki
Büyülemek istesem de büyüleyemiyorum seni!

UNA POESIA D'AMORE
(MAHABBAT KĪ EK NAZM)

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا اطالوی ترجمہ)

مترجم: ویٹو سالی رنو

Se mai talvolta tu pensi a me,
nella luce soffusa delle notti lunari
volgi lo sguardo ad una stella.
Se dall'albero della notte cade ai tuoi piedi,
saprai che è una metafora del mio amore.
E se non lo fa ...
Ma è anche possibile che tu guardi altrove;
la vita di quelle pareti non si frammenterà
e lui non dimenticherà la sua esistenza!

Se mai talvolta tu pensi a me,
metti le tue mani sulle onde della brezza.

Mi troverai nella tua fragranza;
mi cercherai tra i petali delle rose,
mi troverai negli specchi delle gocce di rugiada.
Se non sarò nelle stelle, nella rugiada o fragranza,
guarda allora sotto i tuoi piedi.
Mi troverai nei viaggi diventati polvere.

Se vedi una lampada accesa, potrai pensare
che io mi sia confuso con le falene.
Tu porterai al fiume la polvere di quelle falene.
Io viaggerò per i mari come quella polvere,
mi fermerò ad un'isola sconosciuta per chiamarti.
Se mai farai un viaggio, fermati a quell'isola.

DOVE TERRÒ QUESTI SOGNI?
(ITNE KHVĀB KAHĀN RAKHŪNGĀ?)

(امجد اسلام امجد کی اُردو نظم کا اطالوی ترجمہ)

مترجم: ویٹو سالی رنو

Dove terrò questi sogni?
Nel bazar degli occhi non c'è più posto.
Dove terrò questi sogni?
Sulla soglia delle mie ciglia
stanno lì scene e forme.
Volti di così tante speranze!
Forme di così tante possibilità!
Ghirlande di fiori nelle mani,
cavigliere profumate ai piedi.
Nei fili delle parole promesse variegate,
nodi che si sciolgono ad un tuo sguardo
e ricordi che si affollano uno dopo l'altro:
strade coperte della loro polvere e
pulite da una notizia.
La vita è una bilancia in cui il sogno di
unione con te sovrasta i piaceri del mondo.
La sera è arrivata,
le stelle brillano di sogni infranti.
La sera è arrivata di nuovo.
Sulla prima pagina di ogni sogno
con le tue proprie mani
hai scritto le lettere del mio nome
e la città dei miei occhi,
la destinazione dei miei occhi,
ma, mia adorata,
hai dimenticato di riempire la casella
della realizzazione dei sogni!

نثری انتخاب امجد اسلام امجد

(13 تخلیقی شہ پارے)

فہرست

ڈرامہ:	وارث	امجد اسلام امجد	425
	سمندر کے نیچے	کہانی: توفیق الحکیم (مصر) تحریر: امجد اسلام امجد	435
سفرنامہ:	لندن	امجد اسلام امجد	450
	ہانگ چو	امجد اسلام امجد	468
	چلو جاپان چلتے ہیں	امجد اسلام امجد	490
	آگرہ	امجد اسلام امجد	497
کالم:	عام آدمی	امجد اسلام امجد	514
	آوازوں کا خزانچی ۔ لطف اللہ خان	امجد اسلام امجد	518
	نصابِ تعلیم اور تعلیم	امجد اسلام امجد	522
	کرکٹ کی باتیں	امجد اسلام امجد	526
تعزیتی کالم:	صائمہ عمار	امجد اسلام امجد	530
	شفیق صاحب	امجد اسلام امجد	533
مضمون:	مصحفی	امجد اسلام امجد	536

وارث

(ڈرامہ)

قسط نمبر 1

سین نمبر 1

(متوسط طبقے کا صاف ستھرا گھر، فرخ زماں بیسن کے ساتھ کھڑا شیو بنا رہا ہے۔ شلوار قمیض میں ملبوس ہے ملحقہ کمرے میں ماں جی ایک چھوٹی میز پر ناشتے کا سامان رکھ رہی ہے فرخ تنقیدی نظروں سے آئینے میں اپنا جازہ لیتا ہے شیو کے بچے کھچے بال صاف کرتا ہے، کچھ گنگنا رہا ہے۔ ماں جی کی آواز آتی ہے)

ماں جی: ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے بیٹے۔

فرخ زمان: آ رہا ہوں امی۔ (جلدی جلدی منہ پر دو چھینٹے مارتا ہے تولئے سے منہ صاف کرتا ہوا آتا ہے) ایک تو یہ جو آپ صبح صبح اٹھا دیتی ہیں نا اس سے میری بڑی جان جاتی ہے۔ ابھی سات بھی نہیں بجے اور میری کلاس نو بجے شروع ہوتی ہے۔

ماں جی: صبح اٹھنے میں بڑی برکت ہوتی ہے بیٹا۔ آدمی دن بھر تروتازہ رہتا ہے رات کو نیند اچھی طرح آتی ہے۔

فرخ زمان: خاک اچھی آتی ہے ادھر آنکھ لگتی ہے ادھر آپ جگانا شروع کر دیتی ہیں اٹھو اٹھو صبح ہو گئی ہے۔

(لاڈ بھرے انداز میں ہنستا ہے ماں بھی ہنستی ہے اسے کندھوں سے پکڑ کر کرسی پر بٹھاتی ہے۔)

ماں: اچھا چلو اب ناشتہ کرو پھر کہو گے یہ چیز ٹھنڈی ہے وہ چیز ٹھنڈی ہے۔

فرخ زماں: (جلدی سے چائے کا ایک گھونٹ لے کر بُرا سا منہ بنایا ہے) اوہو امی یہ تو ایک دم برف ہو رہی ہے۔

ماں جی: (ماں چائے دانی اٹھا کر جانے لگتی ہے) اسی لئے تو کہہ رہی ہوں جلدی جلدی کرو۔

فرخ: (ماں کے ہاتھ سے چینک لے کر رکھتا ہے ہنستا ہے) ارے ارے میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ٹھیک ٹھاک گرم ہے۔

ماں جی: اللہ بخشے تمہارے ابا جی بھی بہت گرم چائے پیا کرتے تھے۔ ساری ان کی عادتیں ہیں تم میں۔

(دروازے پر دستک کی آواز جس کے ساتھ چوہدری یعقوب کی آواز آتی ہے۔ جو بولتا ہوا اندر آتا ہے)

چچا: اسلام علیکم بھابھی۔

ماں۔ وعلیکم اسلام۔

فرخ: سلام علیکم انکل (اٹھنے کی کوشش کرتا ہے) آپ پھر دستک دے کر آئے ہیں۔

چچا: (شفقت سے کندھا تھپتھپاتے ہوئے) جیتے رہو بیٹھو بیٹھو بھئی کیا کروں تمہاری عمر جتنی پرانی عادت ہے۔

ماں جی: (پلیٹ آگے رکھتے ہوئے) آیئے بیٹھیں ناشتہ کریں۔

چچا: نہ بھابی ناشتہ تو میں کر کے آیا ہوں۔ آپ کو تو پتہ ہے۔ میں صبح نماز کے بعد سب سے پہلا کام یہی کرتا ہوں۔

فرخ: چلیے چائے ہی پی لیں ایک کپ۔

چچا: نہ بھئی ہم ٹھہرے لسی پینے والے۔ یہ چائے۔ اچھا تم کہتے ہو تو پی لیتے ہیں سناؤ پڑھائی وڑھائی کیسی جا رہی ہے۔

ماں جی: (محبت کے انداز میں) مجھے تو یہ پاس ہوتا نظر نہیں آتا۔ سارا سارا دن پتا نہیں کہاں کہاں پھرتا رہتا ہے۔ گیارہ بجے تک ٹی وی دیکھتا ہے پھر سو جاتا ہے۔

چچا: (ماں کے شرارت بھرے انداز کو سمجھتے ہوئے) کیوں بھئی برخوردار یہ کیا چکر ہے۔

فرخ: بات دراصل یہ ہے انکل کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ امی ذرا پرانے خیالات کی ہیں نا اس ٹائپ کی کہ کھمبے کے نیچے بیٹھ کر پڑھو تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ کوشش کی تھی ایک تو لائٹ اتنی کم تھی اوپر سے مچھر اتنے تھے کہ خدا کی پناہ۔ ویسے امی آج کل لائبریریوں میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں (پڑھنے کا انداز بتاتا ہے)

(تینوں ہنستے ہیں)

چچا: اچھا یہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں اتنی صبح صبح کیوں آیا ہوں۔

فرخ: یہ آپ کا اپنا گھر ہے انکل اینی ٹائم از یور ٹائم۔

چچا: وہ تو ٹھیک ہے مگر اس وقت آنے کی ایک خاص وجہ بھی ہے۔ ذرا۔۔۔ اچھا میں تمہیں ایک اشارہ دیتا ہوں۔ اس کا تعلق۔ اس کا تعلق دو پہیوں والی ایک چیز سے ہے۔

فرخ: دو پہیوں والی چیز سے (سوچتے ہوئے) کیا ہو سکتی ہے (ایک دم چہرے پر خوشی) سچ انکل کہاں ہے۔

چچا: (ایک چابی نکال کر میز پر رکھتا ہے۔ فرخ جلدی سے چابی اٹھاتا ہے) اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت تمہارے دروازے پر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ پھر

فرخ: (محبت سے اس کا ہاتھ دبا کر) اوہ انکل آپ کتنے سویٹ ہیں (چابی لے کر دوڑتا ہوا جاتا ہے) میں ابھی آیا۔

ماں جی: (چچا محبت سے مسکراتے ہوئے اسے جاتے دیکھتا ہے) آپ کیوں اس کی عادتیں بگاڑ رہے ہیں یعقوب بھائی۔

چچا: یہ میرا خون ہے بھابی۔ خدا کی قسم اگر مجھے ابا جان کا ڈر نہ ہوتا تو میں کبھی اسے ان حالوں میں نہ رہنے دیتا۔
ماں جی: آپ ہم لوگوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں یہ کیا کم ہے۔
چچا: یہ تو میرا فرض ہے بھابی۔ اور پھر یہ آپ کا حق ہے۔
فرخ: (خوش خوش اندر آتا ہے) ایکسیلنٹ انکل بہت اچھی ہے۔
چچا: پسند آئی ہے۔
فرخ: بہت زیادہ اور کلر بھی آپ نے بالکل میری پسند کا لیا ہے۔ تھینک یو ویری مچ۔
ماں جی: اب برائے مہربانی ذرا احتیاط سے چلانا۔ پندرہ بیس میل سے زیادہ تیز نہ ہو۔
فرخ: امی! یہ موٹر سائیکل ہے۔۔۔ بیل گاڑی نہیں۔

سین نمبر 2

(فرخ اپنی نئی موٹر سائیکل پر تیزی سے جا رہا ہے دو تین سڑکیں گزر کر یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں آتا ہے لڑکیاں لڑکے آ جا رہے ہیں آہستہ آہستہ موٹر سائیکل چلا رہا ہے ایک لڑکا آواز دیتا ہے۔ رکتا ہے۔ لڑکا قریب آ کر موٹر سائیکل کو دیکھتے ہوئے)
لڑکا: کس کی ہے یہ۔۔۔؟
فرخ: (فخر سے) ابے اپنی ہے اور کس کی ہے۔
لڑکا: کب لی۔
فرخ: آج ہی سمجھو۔
لڑکا: چائے کب پلا رہے ہو اس کی۔
فرخ: جب کہو۔
لڑکا: کیا بات ہے آج بڑے موڈ میں ہو۔
فرخ: (نیم مزاحیہ انداز میں) تم جیسے غریب غربا کی پرورش تو ہم پہلے بھی کرتے رہتے ہیں۔
لڑکا: (ہنستے ہوئے) کیوں نہیں مائی باپ آپ کے سموسوں کبابوں، پیٹیز، پیسٹریوں اور آملیٹوں کے سہارے ہی تو ہم زندہ ہیں۔
فرخ: اب زیادہ بکواس نہیں کرو۔ ایک کپ چائے اور ایک سموسہ، بس، اور کچھ نہیں ملے گا۔
لڑکا: لگتا ہے آپ کی حکومت کسی مالی بحران کا شکار ہے عالی جاہ! اکنامک کرائیسز آئی مین۔۔۔
(دونوں ہنستے ہیں۔ لڑکا موٹر سائیکل کو تعریفی نظروں سے دیکھتا ہے)
لڑکا: ویسے یار چیز عمدہ ہے۔

فرخ: ہاں (ایک دم چونک کر دیکھتا ہے) اچھا اب تم کھسکو گیارہ بجے کیفے ٹیریا میں ملاقات ہوگی۔

لڑکا: ابھی چلتے ہیں۔

فرخ: ابھی مجھے کچھ کام ہے۔

(دوبارہ لڑکے کے پیچھے دور سے آتی ہوئی سیمیں کو دیکھتا ہے لڑکا بھی مڑ کر دیکھتا ہے)

لڑکا: اوہ آئی سی۔ ظاہر ہے بھئی اب ہماری گنجائش کیسے نکل سکتی ہے۔ او۔ کے۔ پھر گیارہ بجے ملاقات ہوگی۔ بیسٹ آف لک۔

(لڑکا جاتا ہے سیمیں آتی ہے فرخ سٹائل سے دونوں پاؤں موٹر سائیکل پر لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے سیمیں اس کے قریب آ کر رکتی ہے فرخ جان بوجھ کر انجان بن جاتا ہے موٹر سائیکل پر ہاتھ پھیرتا ہے یاسمین اسے کچھ لمحے مسکراتے ہوئے دیکھتی ہے)

سیمیں: کیوں بھئی رکشے والے رکشہ خالی ہے؟

فرخ: (مصنوعی غصے میں) یہ تمہیں رکشہ نظر آ رہا ہے (موٹر سائیکل سٹارٹ کرتا ہے۔ موڑتا ہے۔ ہنستا ہے سیمیں بھی ہنستی ہے) چلو جلدی سے بیٹھو۔

سیمیں: (پیچھے ہٹتے ہوئے) مگر۔۔۔ کہاں بھئی۔ ایسے ہی چلو۔

فرخ: کہیں بھی۔ آج سیر کریں گے (بازو سے پکڑتا ہے) موٹر سائیکل کی خوشی میں۔

سیمیں: ارے بابا میری کلاس ہے۔

فرخ: کلاس کو گولی مارو۔ ساری عمر پڑی ہے پڑھنے کے لیے۔

سیمیں: اپنی طرح نالائق سمجھ رکھا ہے مجھے بھی۔

فرخ: بیٹھ جاؤ۔ نہیں تو میں کسی اور کو بٹھا لوں گا۔ پھر نہ کہنا۔

سیمیں: (بیٹھتے ہوئے) اوہو ارے بھئی کیا مصیبت ہے۔ کلاس کے بعد سہی۔۔۔ دیکھو وہ روبینہ ہمیں کیسے گھور رہی ہے۔

فرخ: اللہ نے چاہا تو اس کی آنکھوں میں کنکرے پڑیں گے۔

(دونوں ہنستے ہیں۔ فرخ موٹر سائیکل چلاتا ہوا جاتا ہے روبینہ انہیں حیرت اور غصے سے دیکھتی ہے)

سین نمبر 3

(چوہدری یعقوب کی کوٹھی کے گیٹ میں ایک جیپ داخل ہوتی ہے اس کے پیچھے ایک بڑی سی کار ہے جس کی کھڑکیوں پر پردے پڑے ہیں پیچھے ایک اور جیپ ہے جیپوں سے پانچ چھ دیہاتی جلدی جلدی اترتے ہیں۔ بخشو اور مہنگے کے ہاتھ میں ڈانگیں ہیں رب نواز اور عمر الٰہی رائفلوں سے مسلح ہیں سید گل نے ریوالور لگا رکھا ہے۔ مہنگا اور بخشو بڑھ کر کار کا دروازہ کھولتے ہیں چوہدری

حشمت خان ستر سالہ صحت مند بوڑھا ہے۔ مگر جوانوں والے طمطراق کے ساتھ گاڑی سے نکلتا ہے۔ اس کے بعد سید گل باہر آتا ہے۔ رب نواز اور عمر الٰہی کے ہاتھوں میں کتوں کی زنجیریں ہیں، جن سے کتے بندھے ہوئے ہیں کوٹھی کی طرف سے فرخ زمان کا چچا چوہدری یعقوب تیز تیز چلتا ہوا آتا ہے)

چچا: ابا جی آپ۔ اتنی صبح صبح۔ خیر تو ہے۔ آؤ اندر آؤ۔

سید گل: (ایک مُڑا تُڑا اخبار دیتے ہوئے) چوہدری جی۔

(حشمت خان اخبار کے صفحے الٹ کر ایک تصویر نکالتا ہے)

حشمت خان: یہ دیکھو۔

(یعقوب تصویر دیکھنے لگتا ہے۔ بخشو اور مہنگا اپنی ڈانگیں جوڑ کر یعقوب کی کار ناپ رہے ہیں کچھ دیر حساب کرتے ہیں پھر یعقوب کی طرف آتے ہیں جو اخبار پڑھ رہا ہے)۔

چچا: یہ نمائش تو ہو چکی ہے ابا جی۔

حشمت: تیرے خیال میں مجھ کر پڑھنا نہیں آتا۔ یہ تصویر دیکھی ہے اول آنے والے کتے کی۔ یہ کرسٹل کی۔ واہ مولا کیا نام رکھا ہے رکھنے والے نے۔ کرسٹل۔ میں کہتا ہوں یہ تمیز انگریز کے علاوہ کسی کو نہیں۔ کتے کا نام ایسا چُن کر رکھتے ہیں کہ روح خوش ہو جاتی ہے۔

بخشو: ہمارے یہاں تو اولاد کے نام بھی اچھے نہیں رکھتے جی! اب دیکھو میرا کوئی نام ہے۔

چچا: (حشمت اور یعقوب دونوں ہنستے ہیں) تو بڑی بکواس کرتا ہے بخشو۔

بخشو: آپ کے چاکر ہیں مائی باپ! چوہدری صاحب ایک بات تو بتاؤ۔ یہ آپ کی گڈی تو پہلی والی سے نکڑی ہے۔

چچا: ہاں یہ میں نے نئی لی ہے۔

بخشو: تو لمبی لینی تھی نا۔ چوہدری صاحب۔ ادھر چک 42 میں گیلانیوں نے چار ڈانگوں سے بھی لمبی موٹر لی ہے کیوں مہنگے ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں (مہنگا اثبات میں سر ہلاتا ہے)

یعقوب: (حشمت سے) تو آپ گاڑی خریدنے آئے ہیں۔

حشمت: گاڑی نہیں پتر میں اس کرسٹل کا سودا کرنے آیا ہوں۔

سین نمبر 4

(یعقوب کا ڈرائینگ رُوم۔ حشمت اور یعقوب بیٹھے ہیں۔ باقی لوگ کمرے میں ادھر ادھر کھڑے ہیں۔ ایک طرف دلاور بھی شلوار قمیض میں ملبوس بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ خاموش کھڑا ہے۔ حشمت اپنے بیٹے پر ناراض ہو رہا ہے)

حشمت: پتہ نہیں شہر میں آ کر لوگوں کو کیا ہو جاتا ہے۔ تم میرے پتر ہو۔ میرے گھر کے چشم و چراغ ہو۔ اپنے باپ کے لیے ایک کتا نہیں حاصل کر سکتے تم۔

چچا: ابا جی آپ کے سامنے میں نے اتنی کوشش کی ہے۔ اب جس کی چیز ہے وہ بیچنا ہی نہیں چاہتا تو میں کیا کروں۔

حشمت: تم چوڑیاں ڈال کر گھر میں بیٹھو اور کیا کرنا ہے تم نے۔ چوہدری حشمت خان کا بیٹا شہر کا بڑا کھڑ پینچ بنا پھرتا ہے پر ایک کتا نہیں لا سکتا لعنت ہے چوہدری حشمت خان تم پر۔ یہ اولاد پیدا کی ہے۔

چچا: ابا جی۔ آپ میری بات تو سنیں یہ شہر ہے یہاں معاملات کچھ اور طرح کے ہیں اپنا علاقہ ہو تو اور بات ہے۔ میں پھر کوشش کرتا ہوں۔ کوئی واقف ڈھونڈتا ہوں صولت مرزا کا۔

(ٹیلی فون ڈائری اٹھا کر کھولتا ہے)

حشمت: جو مرضی کرو۔ مجھے کرسٹل چاہیے۔ ہر قیمت پر، ہر حالت میں

(دلاور سے)

اوئے کیا نام ہے تیرا۔

چچا: یہ دلاور ہے۔

حشمت: نیا رکھا ہے۔

چچا: جی

حشمت: ادھر آ۔۔۔

(دلاور بغیر کسی تاثر کے آہستہ آہستہ چلتا ہوا حشمت کے قریب آتا ہے۔ حشمت اسے سر سے پاؤں تک دیکھتا ہے۔ دلاور اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر آنکھیں نیچی کر لیتا ہے)

حشمت: پانی پلا مجھے۔

(دلاور خاموشی سے پیچھے ہٹتا ہے اور کمرے سے نکلتا ہے)

حشمت: غیر آدمی پر زیادہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے یعقوب۔ آدمی کے سو سجن سو دشمن ہوتے ہیں۔

چچا: یہ بڑا مسکین سا آدمی ہے ابا جی۔

(دلاور ایک ٹرے میں جگ اور پانی لاتا ہے۔ حشمت اسے دیکھ کر بات کرتا ہے جیسے اسی کو سنا رہا ہو)

حشمت: شکل سے تو سانپ بھی بڑا مسکین لگتا ہے کیا نام بتایا تھا اس کا۔

چچا: دلاور

حشمت: اوئے دلاور۔۔۔ ادھر آ۔۔۔

(پاؤں آگے کرتا ہے)

ٹانگیں دبا۔

(دلاور خاموشی سے بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگتا ہے حشمت کے ملازم کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر

مسکراتے ہیں دلاور کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں حشمت چند لمحے یعقوب کو دیکھتا ہے جو ڈائریکٹری کے صفحات الٹ پلٹ رہا ہے)

حشمت: یہ تم ڈائریکٹری سے کیا نکال رہے ہو؟

چچا: (شرمندہ سا ہو کر) نہیں ابا جی۔ وہ میں کوئی Important آدمی ڈھونڈ رہا تھا جو صولت مرزا سے بات کر سکے۔

(حشمت چادر کے نیچے ڈب میں لگے ہوئے نوٹ دکھاتا ہے)

حشمت: بات کرنے کے لیے میں یہ جو لایا ہوں لاؤڈ سپیکر۔

چچا: آپ سمجھنے کی۔۔۔

(حشمت کی نظروں سے گھبرا کر بات بدل جاتا ہے)

میرا مطلب ہے صولت مرزا خود بہت امیر آدمی ہے اور میں نے سنا ہے وہ ضدی بھی بہت ہے۔

حشمت: تم مجھے ایک بار اس سے ملوا دو۔ باقی بات میں خود کر لوں گا۔

چچا: مگر ابا جی۔

حشمت: (غصے سے اٹھتے ہوئے) تو میرا پتر کہلانے کے لائق نہیں ہے یعقوب اگر آج تیرا بھائی زندہ ہوتا تو کرسٹل اس وقت یہاں ہوتا اس کمرے میں۔ اوئے بخشو۔ ڈرائیور کو کہہ گاڑی سٹارٹ کرے۔ مجھ سے اب یہاں نہیں ٹھہرا جاتا۔

چچا: ابا جی۔۔۔ خدا کے لیے آپ۔۔۔

سین نمبر 5

(صولت مرزا کا ڈرائینگ روم۔ کیمرہ ایک شاندار ڈرائینگ روم میں میز پر پڑی ہوئی نوٹوں کی گڈیوں پر اوپن ہوتا ہے۔ جس پر صولت مرزا کی آواز O/L ہوتی ہے۔ ایک طرف سیدگل اور دلاور خاموش کھڑے ہیں)

صولت: میں نے آپ کو بتایا ہے چوہدری صاحب کرسٹل از ناٹ فار سیل۔ کرسٹل بیچنے کے لیے نہیں ہے میں نے تین سال لگائے ہیں اس کی تلاش میں۔

حشمت: میں پچھلے چالیس سال سے اس کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ دوسری عالمگیر جنگ میں اس نسل کا ایک شہزادہ میرے کمپنی کمانڈر کرنل بروس کے پاس تھا۔ اب دوسرا یہ نظر آیا ہے۔

(نوٹوں کی دو اور گڈیاں نکال کر رکھتا ہے)

یہ لو اب ساٹھ ہزار ہو گئے ہیں۔

صولت: (غصے سے) ساٹھ لاکھ بھی ہوں تو نہیں لوں گا۔ سمجھے آپ۔ یعقوب صاحب آپ سمجھاتے کیوں نہیں اپنے والد صاحب کو۔

چچا: دراصل مرزا صاحب میں وہ۔۔۔

صولت: (اٹھتے ہوئے) پلیز یہ Rubbish اٹھائیں یہاں سے I am sorry میری ایک Appointment ہے دس بجے کی۔ میں اجازت چاہوں گا آپ سے۔

چچا: جی بہتر۔ آیئے ابا جان۔

حشمت: میں نے جب بھی بولی لگائی ہے۔ سودا لے کر ہی اٹھا ہوں پُتر۔ ان سے پوچھو۔۔۔ یہ کیا مانگتے ہیں۔

چچا: (آواز دبا کر) وہ کہتے ہیں میں نے کسی قیمت پر نہیں بیچنا۔

حشمت: کیسی باتیں کرتے ہو پُتر۔ کرسٹل تو پھر کتا ہے قیمت معقول ہو تو بڑے بڑے آدمیوں کا سودا ہو جاتا ہے۔

صولت: (بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے) I think that is enough

سین نمبر 6

(یعقوب کا ڈرائینگ روم)

حشمت: یہ داغ میں سینے میں لے کر مروں گا یعقوب۔ اس کو ٹیلی فون کر۔ اگر وہ پیسے نہیں لیتا تو میں ایک کرسٹل کے بدلے اسے ستر کتے دینے کو تیار ہوں۔ اسے بتا میرے پاس کس کس ذات کا کتا ہے۔

چچا: میں کوشش کروں گا ابا جی۔ اس وقت اسے کہنا ٹھک نہیں۔ وہ ضد میں آیا ہوا ہے۔

حشمت: میں مر گیا تو پھر میرے کس کام کا۔ اب میں حویلی کس منہ سے جاؤں گا۔

بخشو: (ایک خوبصورت زنجیر دکھاتے ہوئے) میں تو زنجیر بھی بنوالایا ہوں جی۔ اصلی چاندی کی۔

حشمت: (اخبار پر انگلی رکھ کر) دیکھ کتنا ظلم ہے یہ شاہی نسل کا کتا اور کس گھر میں پڑا ہے۔ کان دیکھ اس کے ذرا پورا شہزادہ لگتا ہے کہ نہیں۔

(دروازے سے تیز تیز چلتا ہوا دلاور اندر آتا ہے۔ یعقوب اسے دیکھ کر کہتا ہے)

چچا: تم کہاں تھے۔

(دلاور بغیر جواب دیے آگے آتا ہے حشمت کے قریب دو زانو ہو کر چادر کی بکل کھولتا ہے جس میں ایک چھوٹا بہت خوب صورت کتا ہے۔ حشمت کو ایک دم سکتہ ہو جاتا ہے۔ سب کتے کو حیرت سے دیکھتے ہیں)

حشمت: یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کرسٹل ہے نا۔

دلاور: اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ (حشمت ایک دم جھپٹ کر کتے کو گود میں لیتا ہے۔ اسے سینے سے لگاتا ہے)

حشمت: کہاں سے لائے ہو اسے۔

دلاور: آپ کو پسند تھا نہ جی یہ۔ میں لے آیا ہوں۔

حشمت: شاباش جوان۔ دیکھ یعقوب۔ اس کو کہتے ہیں مرد۔ کیا نام بتایا تھا تو نے اپنا۔

دلاور: دلاور۔

حشمت: تو واقعی دلاور ہے۔ جی دار کی یہی شان ہے جو چیز ہاتھ نہ آئے اسے بڑھ کر چھین لے اسی کا نام زندگی ہے۔

چچا: (حیرت پر قابو پاتے ہوئے) تم اسے اٹھا کر لائے ہو۔

دلاور: جی

چچا: مگر۔۔۔

حشمت: اب کر دو شروع اپنی تقریر پڑھاؤ اسے قانون کے سبق تجھے شہر نے مار دیا ہے یعقوب تو حشمت خان کا نہیں اس شہر کا بیٹا ہے۔ بزدل ڈراکل۔

(دلاور سے)

مانگ جوان کیا مانگتا ہے۔

دلاور: کچھ نہیں چوہدری صاحب آپ کے خاندان کا نمک کھاتا ہوں آپ کی خوشی ہی میرا انعام ہے۔

حشمت: نہیں جوان اس کارنامے پر تو میں تجھے منہ مانگا انعام دوں گا۔ بول کیا چاہیے۔

(دلاور چند لمحے خاموش رہتا ہے پھر سید گل کے گلے میں لٹکی ہوئی پستول کی طرف دیکھتا ہے۔ ایک دم اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں)۔

دلاور: میں۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے یہ پستول دے دیں چوہدری صاحب۔

حشمت: یہ پستول۔ یہ تو کوئی انعام نہ ہوا جوان۔ میں تو اس شہزادے کے لیے اسے ساٹھ ہزار دے رہا تھا یہ پستول تو زیادہ سے زیادہ ہزار بارہ سو کا ہوگا۔

دلاور: مجھے یہی چاہیے چوہدری صاحب۔

(سب حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ حشمت چند لمحے سوچتا ہے پھر آنکھ سے سید گل کی طرف اشارہ کرتا ہے سید گل خاموشی سے پستول کھولنے لگتا ہے)

دلاور: یہ پیٹی بھی دے دو۔

(سید گل حشمت کی طرف دیکھتا ہے جو اشارہ کرتا ہے کہ دے دو۔ سید گل پستول اور پیٹی حشمت کے پاس رکھتا ہے جو اسے اٹھا کر دلاور کو دیتا ہے۔ دلاور اس طرح پستول کو پکڑتا ہے جیسے اسے کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ اسے گلے سے لگاتا ہے)

حشمت: کبھی چلائی بھی ہے پستول۔ ادھر دکھا مجھے۔

(پستول ہاتھ میں تولتا ہے)

یہ کیا ہتھیار ہیں آج کل کے۔۔۔ بچوں کے کھلونے لگتے ہیں۔ اوئے سید گل۔

(بخشو ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا ہے)

اس کو خالی کیوں رکھا ہوا ہے بے وقوف کے پتر۔ تیرا خیال ہے دشمن تجھے دو دن کا ٹائم دے کر آئے گا۔ لائسنس ہے نا اس کا۔

(سید گل اثبات میں سر ہلاتا ہے)

وہ بھی دے دے اسے۔

دلاور: اس کی کوئی ضرورت نہیں چوہدری صاحب۔

حشمت: پڑ جاتی ہے ضرورت جوان۔ رکھ لے۔ وقت پڑے تو سید گل بن جانا۔

(مہنگا گھبرایا ہوا اندر آتا ہے اور سرگوشی کے انداز میں بولتا ہے)

مہنگا: باہر پولیس آئی ہے چوہدری صاحب۔

چچا: اوہ۔ اب کیا ہوگا۔

حشمت: کیا ہوگا۔

(کتا دلاور کو دیتے ہوئے)

اس کو اسی طرح بکل مار لے اور سید گل کے ساتھ گاؤں کو نکل جا۔ ادھر سے جانا۔ پچھلی طرف سے۔ اوئے رب نواز تو اپنی جیپ لے کر ان کے ساتھ جا۔۔۔ چلو بھاگو۔

(تینوں تیزی سے جاتے ہیں)

تیری پلس کو مدعا چاہیے نا۔ وہ تو غائب ہو گیا۔ جا اب انہیں اندر لے آ۔

(مکاری سے ہنستا ہے۔)

سین نمبر 7

(جیپ میں رب نواز۔ سید گل اور دلاور جا رہے ہیں۔ دلاور کا کلوز جو گہری سوچ میں ہے۔ اس کی انگلیاں بے خیالی میں ریوالور سے کھیل رہی ہیں۔ رخساروں کی ہڈیاں کسی اندرونی جذبے سے تنی ہوئی ہیں۔ پستول کو زور سے مسلتا ہے)

سمندر کے نیچے

کہانی: توفیق الحکیم (مصر)
تحریر: امجد اسلام امجد

کردار: ایجنٹ، شوہر، بیوی، لڑکی

(ایک درمیانے درجے کے فلیٹ کا ڈرائینگ روم جس میں ایک شادی شدہ جوڑا تنہا رہتا ہے۔ اس کمرے کی ترتیب سے گھر کی سادگی خوش سلیقگی اور خوشحالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیمرہ ڈرائینگ روم کے درمیان میں پڑے ہوئے میز پر Open ہوتا ہے۔ جہاں ایک بریف کیس پڑا ہے۔ بیمہ ایجنٹ اس بریف کیس سے کچھ کاغذات نکالتا ہے۔ پھر ایک قلم نکال کر شوہر کو دیتا ہے۔ قلم کو عقیدت سے چومتا ہے۔)

ایجنٹ: آپ میرے اس قلم سے یہاں دستخط فرما دیں۔ یہ بڑا خوش قسمت قلم ہے۔ (کاغذات اور قلم کو دیکھتا ہے۔) اتفاق سے یہ ایک ہزار دیں پالیسی ہے جس پر اس قلم سے دستخط ہو رہے ہیں۔

شوہر: تو گویا میرے مرنے پر میری بیوی کو پچاس ہزار روپے مل جائیں گے؟

ایجنٹ: (چٹکی بجاتے ہوئے) فوراً۔۔۔

شوہر: (پین سے لکھنے کی کوشش کرتا ہے، پھر ایسے انداز میں ہلاتا ہے جیسے اس میں روشنائی نہ ہو) سیاہی نہیں ہے۔

ایجنٹ: کیسے نہیں ہے۔ ذرا زور سے ہلائیے، ویسے بائی دی وے اسے سیاہی نہیں روشنائی کہتے ہیں۔

(شوہر ایجنٹ کی طرف رخ کر کے ہلاتا ہے۔ ایک دم بہت سی روشنائی ایجنٹ کے کپڑوں پر گرتی ہے)۔

ایجنٹ: دیکھا، دیکھا میں نہ کہتا تھا بھرا ہوا ہے۔

شوہر: مجھے افسوس ہے کہ۔۔۔

(رومال نکال کر پونچھتے ہوئے)

ایجنٹ: Never Mind آپ دستخط کیجیے۔

(شوہر دستخط کر کے کاغذات ایجنٹ کی طرف بڑھاتا ہے۔ ایجنٹ کچھ کاغذات اسے واپس کرتا ہے)۔

ایجنٹ: آپ کے ریکارڈ کے لیے۔۔۔

(شوہر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، پھر کاغذات موڑ کر جیب میں ڈال لیتا ہے)۔

ایجنٹ: مبارک ہو۔

شوہر: آپ مجھے میری موت کی مبارکباد دے رہے ہیں۔

ایجنٹ: جی نہیں، یہ بیمہ پالیسی پر دستخط کرنے کی مبارک باد ہے۔

شوہر: (پین کو بے چینی سے گھماتا ہے۔ پین رکھتا ہے۔ اٹھ کر بے قراری سے کمرے میں ٹہلتا ہے۔)

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میری بیوی کو اس پالیسی کا علم میری زندگی میں نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ وہ میری موت کا ذکر بھی نہیں سن سکتی۔ دیوانگی کی حد تک چاہتی ہے مجھے۔

ایجنٹ: (مسکراہٹ کے ساتھ) واہ، واہ کیا محبت ہے آپ دونوں میں، مجھے تو رشک آتا ہے (میز پر ہاتھ مار کر) ویسے مطمئن رہیے۔ ہم انہیں کچھ نہیں بتائیں گے۔ رازداری ہمارا پہلا اور آخری اصول ہے۔

شوہر: وہ اس وقت اوپر ہمسایوں کی لڑکی سے گفتگو کر رہی ہے، اگر وہ نیچے آ جائے تو اُسے یہ مت بتانا کہ تم ایک بیمہ ایجنٹ ہو۔

(سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتا ہے۔)

ایجنٹ: آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

شوہر: مجھے تم پر اور تمہاری کمپنی پر بھروسہ ہے کہ میری بیوی میرے مرنے کے بعد عزت آرام اور دولت سے محروم نہیں ہوگی۔

ایجنٹ: (ایک کاغذ دکھاتے ہوئے)

اس معاہدے میں ایک شرط ہے جس کی رو سے آپ اپنی ادا کی ہوئی تمام قسطوں سے محروم ہو جائیں گے اگر آپ کی بیوہ آپ سے پہلے مر گئی۔

شوہر: (خوفزدہ ہو کر جذباتی انداز میں بولتا ہے)

نہیں، نہیں، وہ مجھ سے پہلے نہیں مر سکتی، اس کے بعد یہ زندگی، یہ دولت میرے کس کام کی ہے۔ میں کیوں رقم طلب کروں گا کیوں؟ کس کام آئے گی، میرے یہ دولت!

ایجنٹ: میں معافی چاہتا ہوں، میرا مطلب صرف یہ تھا کہ میں معاہدے کی شرط سے آپ کو آگاہ کر دوں۔

شوہر: بس، بس میں اس کی موت کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتا۔

ایجنٹ: (دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا ہے)

اللہ آپ کی بیگم کو لمبی زندگی دے۔

شوہر: یہ بھی دعا کرو کہ میں اس سے پہلے مر جاؤں۔

ایجنٹ: (دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دعا کے انداز میں)

اللہ کرے آپ ان سے پہلے مریں، اور آپ کی مسز بیمے کی رقم پر ہنسی خوشی زندگی بسر کریں۔ (آمین)

(ایجنٹ بریف کیس اٹھا کر چلنے لگتا ہے۔)

شوہر: چلیے، Thank You، مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو ایک کپ چائے بھی پیش نہیں کر سکا۔ دراصل آج ہمارا ملازم چھٹی پر ہے اور میری بیوی اوپر ہمسایوں کے ہاں گئی ہوئی ہے۔

ایجنٹ: کوئی بات نہیں، چائے پھر کبھی سہی۔

شوہر: بھولنا نہیں، میری بیوی کو اس بات کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔

ایجنٹ: فکر ہی نہ کریں۔

(کیمرہ فلیٹ کے اندرونی دروازے پر جاتا ہے، بیوی اندر آتی ہے۔ ایجنٹ بیرونی دروازے پر ہے۔ بریف کیس ہاتھ میں ہے۔)

بیوی: ڈاکٹر، آپ ڈاکٹر صاحب ہیں۔

ایجنٹ: میں!

شوہر: (گھوم کر تیزی سے ایجنٹ کی طرف بڑھتا ہے۔ کمرے کے درمیان آتے ہوئے۔)

یہ میری بیوی ہے۔

ایجنٹ: اوہ۔ آپ کی بیگم، کیسے مزاج ہیں۔

بیوی: اور آپ یقیناً۔۔۔

(شوہر گھبرا کر دونوں کے درمیان آتا ہے۔)

شوہر: ہاں یہ یقیناً۔۔۔

بیوی: ڈاکٹر ہیں۔

(ایجنٹ گھبرا کر اپنے بریف کیس کی طرف دیکھتا ہے۔)

ایجنٹ: ڈاکٹر۔۔۔

(ایجنٹ کو گھبرا کر آنکھ مارتے ہوئے)

شوہر: ہاں (بیوی سے) لیکن گھبراؤ نہیں میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، کیوں ڈاکٹر؟

(جلدی سے سر ہلاتے ہوئے)

ایجنٹ: بالکل۔۔۔

بیوی: میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب غلط فلیٹ میں آ گئے ہیں۔ بیمار لڑکی ہمارے اوپر والے فلیٹ میں رہتی ہے۔ کوئی

آدھ گھنٹہ ہوا انہوں نے آپ کو فون کیا تھا۔ آپ کو آنے میں دیر ہوئی تو میں نے ڈاکٹر رضا کو بلوالیا۔ وہ اسی بلڈنگ میں رہتے ہیں اور اس وقت مریض کو دیکھ رہے ہیں۔ بہرحال اب آپ آ گئے ہیں تو آپ بھی چلے جائیے۔

شوہر: (بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔)

اوپر جائیے، اوپر۔

ایجنٹ: (دروازے کے قریب جا کر رستہ نہ سمجھ سکنے کے انداز میں رکتا ہے۔)

میں ابھی جاتا ہوں۔

(ایجنٹ اس کی طرف مڑتا ہے۔)

بیوی: ٹھہریئے صاحب، لڑکی کو یہ مت بتایئے گا کہ آپ ڈاکٹر ہیں، وہ خود کو بیمار تسلیم نہیں کرتی۔ اگر یہ اسے پتہ چلا کہ آپ ڈاکٹر ہیں تو شاید کرسی ورسی دے مارے آپ کو۔ (سوچتی ہے) بہتر یہ ہے کہ آپ اسے اپنے بارے میں کچھ اور بتائیں۔ مثلاً یہ کہ آپ۔ آپ

ایجنٹ: مثلاً یہ کہ میں ایک بیمہ ایجنٹ ہوں اور۔۔۔

شوہر: (بات کاٹتے ہوئے)

کیا تم کوئی اور پیشہ اختیار نہیں کر سکتے۔

بیوی: نہیں، ٹھیک ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے جو کچھ یہ بننا چاہتے ہیں، انہیں بننے دیجیے۔ بس لڑکی کو ان کے ڈاکٹر ہونے کا پتہ نہ چلے۔

(ایجنٹ تیزی سے باہر جاتے ہوئے۔)

ایجنٹ: مطمئن رہیے، اُسے پتہ نہیں چلے گا۔

بیوی: (آواز دے کر روکتی ہے۔)

ڈاکٹر صاحب سنیے، وہ آپ کو کمرے میں اکیلی سوچوں میں گم ملے گی، پچھلے کچھ دنوں سے وہ لڑکی بہت خطرناک ہو چکی ہے۔ جب کبھی باورچی خانے میں تنہا ہوتی ہے تو ایک چاقو اس کے ہاتھ میں ضرور ہوتا ہے اور اُس کی آنکھیں عجیب طرح سے چمکنے لگتی ہیں۔ ایسے میں اگر نوکر اُسے نظر آ جائے تو وہ اُس پر جھپٹ پڑتی ہے۔ کوئی نوکر ایک ہفتہ سے زیادہ اُن کے ہاں نہیں ٹھہرتا۔

(ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے۔)

ایجنٹ: Oh God

بیوی: ڈاکٹر صاحب۔ آپ لوگ اس بیماری کو کیا نام دیتے ہیں۔

ایجنٹ: (بے حد پریشان ہو کر)

اسے۔ اسے۔۔۔ اسے کہتے ہیں۔

شوہر: (سہارا دیتے ہوئے)۔

میرا خیال ہے اسے نیوراتی مالیاخولیا کہتے ہیں۔

بیوی: ڈاکٹر کو بتانے دو۔ وہ اپنا پیشہ تم سے زیادہ سمجھتا ہے، ہاں تو ڈاکٹر کیا کہتے ہیں اس حالت کو۔

ایجنٹ: (پریشانی کے انداز میں)

اس حالت کو افسوسناک حالت کہتے ہیں۔

بیوی: (قریب آتے ہوئے)

No I mean میڈیکل سائنس اس سلسلے میں کیا کہتی ہے۔ اس کا کچھ علاج وغیرہ ہوسکتا ہے؟

ایجنٹ: (بے حد پریشان ہوکر)

ہاں جی آج کل ہر مرض کی دوا مل جاتی ہے۔ نئی نئی دوائیوں نے انسان کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ انسانی زندگی کی معیاد تقریباً دوگنی ہوگئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ زندگی کا بیمہ کرتے وقت ہر بیمہ کمپنی یہ بات مدنظر رکھتی ہے کہ۔۔۔

شوہر: (بیوی سے بچ کر سرگوشی کے انداز میں ایجنٹ سے)

بے وقوف بیمے کا یہاں کیا تعلق ہے۔

ایجنٹ: (دروازے کی طرف مڑتا ہے)

دیکھیے نا۔ مریض کو دیکھے بغیر میں کیا بتا سکتا ہوں۔

بیوی: (ایجنٹ کو روک کر)

تو پھر فوراً اوپر جایئے لیکن ذرا احتیاط کیجیے۔ اس کی ماں نے ابھی مجھے بتایا تھا کہ اس نے اپنی لڑکی کے کمرے میں پستول قسم کی کوئی چیز دیکھی ہے۔

ایجنٹ: (گھبرا کر جانے کے لیے مڑتا ہے۔)

پستول۔۔۔ اوئے ہوئے، اچھا جی خدا حافظ۔۔۔

شوہر: خدا ہی حافظ۔

بیوی: آپ کو فلیٹ کا پتہ ہے نا، بالکل ہمارے اوپر ہے دروازہ، بائیں ہاتھ ہے۔ (جاتا ہے)۔

ایجنٹ: جی جی۔۔۔ اللہ بیلی، رب راکھا۔

بیوی: دنیا میں کتنے دکھ ہیں، کتنے غم ہیں، لیکن ہمارا گھر، یہ چھوٹی سی جنت، ہر طرح کے رنج والم سے آزاد ہے۔

شوہر: (محبت سے اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے۔)

تم ٹھیک کہتی ہو: ہم ایک روح دو جسم ہیں۔

بیوی: ہا، ہماری سوچیں کتنی یکساں ہیں۔

شوہر: میں ہمیشہ ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھ پر کوئی مصیبت پڑ کر تمہیں تکلیف نہ دے یا تم پر کوئی دکھ آ کر میری جان نہ لے لے۔

بیوی: (محبت بھرے انداز میں)
اگر کسی مصیبت نے ہماری زندگی میں آنا ہی ہے تو میں خود کو تم پر قربان کر دوں گی۔
شوہر: ایسا کر کے تم اچھا نہیں کرو گی۔ میری جان۔ تمہیں پتہ ہے تمہارے بغیر میری زندگی بے معنی ہے۔
بیوی: میں جانتی ہوں ہمارے دو جسموں میں ایک روح ہے۔
شوہر: اگر ہمارے بچے ہوتے تو یہ روح کئی جسموں میں ہوتی۔
بیوی: مجھے اُن کے نہ ہونے کا کوئی افسوس نہیں۔
شوہر: (تیزی سے)
اور نہ مجھے ہے۔
بیوی: ہم دونوں کے لیے ہی ایک روح بہت ہے، اگر یہ ایک جسم سے نکلے گی تو۔۔۔
شوہر: اُسی لمحے دوسرے جسم سے بھی نکل جائے گی۔
بیوی: بس کرو فواد۔۔۔ میری دعا ہے تم زندہ رہو، میرے بعد بھی۔
شوہر: خدا نہ کرے۔
بیوی: ایسا مت کہو، مت کہو ایسا۔۔۔
شوہر: میری دعا ہے تم زندہ رہو، میں رہوں نہ رہوں۔
بیوی: خدا نہ کرے۔
(فلیٹ کا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی داخل ہوتی ہے۔)
لڑکی: خدا تم دونوں کی دعائیں سنے گا۔
بیوی: (شدید حیرت سے) Dolly
شوہر: (بیوی سے) کون ہے یہ؟
بیوی: ہمسایوں کی لڑکی۔۔۔
شوہر: (خوفزدہ سرگوشی میں) پاگل والی
(لڑکی جیب سے پستول نکالتی ہے)
لڑکی: براہِ کرم آپ دونوں یہاں میرے سامنے بیٹھ جائیں اور جو کچھ میں کہتی ہوں غور سے سنیں۔
(لڑکی پستول گھما کر ان کا نشانہ لیتی ہے۔ دونوں میاں بیوی خوف اور حیرت سے گنگ بیٹھے ہیں۔ ایک کرسی گھسیٹ کر اُن کے سامنے بیٹھتے ہوئے۔)
لڑکی: مجھے اپنی قسمت پر خوش ہونے دیجیے کہ مجھے گھر سے نکلتے ہی پہلا دروازہ کھلا ہوا مل گیا۔ میرا مطلب آپ کے دروازے سے ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ دونوں آج اپنے فلیٹ میں تنہا ہیں۔ یہ بھی میرے لیے بہت بہتر ہے۔ میرے خیال میں آپ لوگ میری آمد کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔

(میاں بیوی کچھ بولنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر آواز نہیں نکلتی۔)

لڑکی: ارے بھئی سیدھی سی بات ہے (پستول گھماتی ہے) میں یہاں قتل کرنے آئی ہوں۔تم دونوں میں سے کسی ایک کو۔کسی ایک کو۔

بیوی: (کانپتی ہوئی آواز میں)

ڈولی۔۔۔

لڑکی: مجھے بہت افسوس ہے، واقعی بہت افسوس ہے، لیکن میں مجبور ہوں۔

بیوی: (تیز آواز میں)

ڈولی۔۔۔

لڑکی: مجھے یہ کام کرنا ہے۔ میں قتل کی اس خواہش کو دبا نہیں سکتی۔

بیوی: (کانپتی ہوئی آواز میں)

ہم تمہارے ہمسائے ہیں ڈولی۔تم میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہو۔

لڑکی: میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ (خوفزدہ کرنے کے انداز میں) مجھے اس عمل کے نتائج کا کچھ اندازہ نہیں، لیکن میرے اندر سے ایک آواز آ رہی ہے۔ مسلسل اور تیز آواز۔۔۔قتل، قتل اور یہ آواز مجھے پاگل کئے دے رہی ہے اور جب تک میں کسی کو قتل نہیں کرلوں گی، یہ آواز مجھے عذاب میں رکھے گی۔

(Music کا تیز Bang یہاں سے پس منظر میں موت کی موسیقی شروع ہوتی ہے جو آخر تک بجتی ہے۔)

بیوی: (گڑگڑاتے ہوئے) ڈولی ذرا سوچو۔۔۔

لڑکی: میں نے اچھی طرح اور بار بار سوچا ہے۔

بیوی: اگر تم نے سوچا ہوتا تو اتنا ہولناک جرم کبھی نہ کرتیں۔

لڑکی: مجھے معلوم ہے یہ جرم ہولناک ہے لیکن میں کیا کروں۔ میں نے خود کو اس سے باز رکھنے کی بے انتہا کوشش کی ہے۔ میں نے شدید جدوجہد کی ہے۔لیکن میں اب ہار گئی ہوں۔کوئی کوشش مجھے اس بہالے جانے والی خواہش سے باز نہیں رکھ سکی جو مجھے قتل پر اُکسا رہی ہے۔ مجھے کسی نہ کسی کو قتل کرنا ہے۔ میں مجبور ہوں۔

شوہر: (کانپتی ہوئی آواز میں) معاف کرنا خاتون میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

لڑکی: کہیے!

شوہر: تم ایک سمجھ دار لڑکی ہو۔ میری تمہاری سیڑھیوں میں کئی دفعہ ملاقات ہوئی ہے۔تم ہمیشہ بڑے اخلاق سے پیش آتی رہی ہو۔کیا تمہیں کچھ بھی یاد نہیں۔

لڑکی: میں اب بھی تمہاری عزت کرتی ہوں۔

شوہر: اور مارنا بھی چاہتی ہو؟

لڑکی: میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں، میرے پاس دوسرا راستہ نہیں ہے۔ مجھے آج کسی نہ کسی کو ضرور قتل کرنا ہے ورنہ

میں پاگل ہو جاؤں گی۔ میرے اس مرض کا ایک ہی علاج ہے قتل (لفظ قتل پر میوزک کا Bang تیزی سے) صرف ایک قتل۔

شوہر: تم قتل کرنا چاہتی ہو۔ کسی کو بھی۔

لڑکی: ہاں۔

شوہر: تو پھر تم نیچے سڑک پر جا کر کسی کو قتل کیوں نہیں کرتیں۔

لڑکی: میں نے بھی یہی سوچا تھا، اس ارادے سے نیچے اتر رہی تھی کہ مجھے تمہارا دروازہ کھلا ہوا مل گیا۔

بیوی: (افسوس کے انداز میں) بدقسمتی ہماری۔

لڑکی: لیکن میرے لیے عین خوش قسمتی ہے۔ اگر میں سڑک پر کسی کو قتل کرنا چاہتی تو شاید وہ بھاگ نکلتا یا شور مچا دیتا اور پبلک اکٹھی ہو جاتی اور میرا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ بہرحال مجھے خوشی ہے میں اس ہنگامہ آرائی سے بچ گئی اور اسی عمارت میں مجھے میرا شکار مل گیا۔ مجھے امید ہے کہ تم اُسے میری مجبوری سمجھ کر مجھے معاف کر دو گے۔ اب مہربانی کر کے موت کے لیے تیار ہو جاؤ (پستول ان کی طرف کرتی ہے۔ میاں بیوی محبت سے ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں اور ہاتھ چہروں کے سامنے کرتے ہیں۔)

بیوی: ڈولی۔۔۔

شوہر: خدا کے لیے ڈولی۔

لڑکی: میں تم دونوں کو قتل نہیں کرنا چاہتی۔ میرے علاج کے لیے ایک جان کی قربانی کافی ہے۔

بیوی: ڈولی۔ میری پیاری ڈولی۔۔۔ میں نے تمہیں کبھی کوئی دکھ نہیں دیا۔ تم مجھے میرے کئی رشتہ داروں سے زیادہ عزیز ہو، تم اپنی امی سے پوچھ لو۔ ہم نے آج تک تم لوگوں سے کوئی زیادتی کی ہے؟

لڑکی: یہ سب ٹھیک ہے مگر میں کیا کروں؟

شوہر: ہم بالکل بے گناہ ہیں اور تم جیسی اچھی لڑکی بے گناہ ہمسایوں کا خون کیسے کر سکتی ہے۔

لڑکی: بے شک تم بے گناہ ہو، مگر میں تمہیں کسی انتقامی جذبے کے تحت قتل نہیں کر رہی۔ تم واقعی بہت اچھے اور عمدہ لوگ ہو۔ میرے پاس تمہیں قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں، سوائے اس کے کہ میں قتل کرنا چاہتی ہوں۔ قتل برائے قتل۔

بیوی: تم اتنی ظالم نہیں ہو سکتیں۔

لڑکی: (اطمینان سے) ظالم اور میں۔ تمہیں معلوم ہے میں ایک بلی کا رونا نہیں سن سکتی۔

بیوی: (جلدی سے) یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔ میں نے خود تمہیں دوسروں کی تکلیف پر روتے دیکھا ہے۔

شوہر: (بیوی کا ہاتھ پکڑتا ہے) کیا تمہاری ماں نے تمہیں کبھی نہیں بتایا کہ ہم ایک دوسرے سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ (ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے ہیں۔)

لڑکی: مجھے معلوم ہے۔

شوہر: پھر بھی تم ہماری اس چھوٹی سی جنت کو تباہ کرنا چاہتی ہو؟

لڑکی: (جھنجھلا کر) آخر تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں، میرے اندر کی خواہش نے میری منطق کو شل کر دیا ہے۔ مجھے اس

وقت دنیا، اس کے باشندوں یا ان کی محبتوں کی پروانہیں (ہذیانی انداز میں بولتی ہے، نہ مجھے رحم، ظلم، نیکی، بدی کا علم ہے۔ مجھے صرف ایک چیز کا علم ہے اور وہ ہے اندر سے اٹھنے والی وہ آواز جو مجھے مسلسل قتل کرنے کا حکم دے رہی ہے قتل، قتل، قتل، یہ تیز اور تیکھی آواز برمے کی طرح میرے دماغ میں سوراخ کر رہی ہے اور جب تک میں قتل نہیں کرلوں گی، آواز کے عذاب سے چھٹکارا حاصل نہ کرسکوں گی۔

شوہر: (خوف آمیز غصے سے) یہ آواز تمہیں اس منحوس کام کی وجہ نہیں بتاتی۔

لڑکی: نہیں، یہ صرف حکم دیتی ہے اور مجھے اس کا حکم ماننا پڑے گا۔ اپنے سکون کے لیے، اپنی زندگی کے لیے، میں اپنے مسئلے کی بہت وضاحت کرچکی ہوں۔ اب مجھے فائر کرنے کی اجازت دو۔

(خطرے کی موسیقی، میاں بیوی گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہیں، بیوی روتی ہے۔)

بیوی: تو تم باز نہیں آؤ گی۔

لڑکی: (نشانہ لیتے ہوئے) میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔

شوہر: (کانپتے اور روکتے ہوئے انگلی سے) ایک منٹ خاتون۔ ایک منٹ۔ ایک منٹ۔۔۔

لڑکی: نہ بحث کرنے کا فائدہ ہوگا، نہ منت خوشامد کا۔ مجھے بہرحال ایک گولی چلانی ہے۔ کس پر چلاؤں، بولو۔۔۔ کس پر۔۔۔

(Echo میں آواز بار بار آتی ہے۔)

بیوی: (سہم کر) کس پر؟

لڑکی: ہاں بتاؤ کس پر۔۔۔ تم میں سے کس پر گولی چلاؤں۔۔۔ تم؟ یا تم۔۔۔ تم؟

شوہر: (کانپتے ہوئے) کیا تم سچ مچ ہم میں سے ایک کا انتخاب کرو گی؟

لڑکی: (دونوں کو سنجیدگی سے گھورتے ہوئے، ہاں مجھے تم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے اور یہ کوئی آسان بات نہیں۔ میں کیسے ایک کا انتخاب کرسکتی ہوں۔ جبکہ تم دونوں ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہو، تم میں سے کوئی بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کرتا کہ میں اسے گولی مار کر اس مصیبت سے خلاصی پاؤں (سوچتے ہوئے دونوں کی طرف باری باری پستول کرتی ہے۔) بہرحال میں فیصلہ تم پر چھوڑتی ہوں۔

بیوی: (سسکیاں بھرتے ہوئے) کیا ہم سچ مچ مرنے والے ہیں۔ رحم کرو ڈالی، رحم کرو پلیز۔

شوہر: تو کیا واقعی تم ہمارے لیے موت کا پیغام لے کر آئی ہو۔

لڑکی: (جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتی ہے۔) جب بھی تم موت کا ذکر کرتے ہو میری قتل کی خواہش تیز تر ہو جاتی ہے۔ سنو۔ اس آواز کو سنو۔ یہ مجھے قتل کا حکم دے رہی ہے، بولو کس کو۔۔۔ کس کو قتل کروں۔ (ایک دم زور سے چیختی ہے۔ خطرناک انداز میں دونوں کو گھورتی ہے)۔

بیوی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔) جلدی فیصلہ کرو۔ اچھا تو پھر میرا فیصلہ سنو۔۔۔ تم۔۔۔ خاتون۔۔۔ تم۔۔۔ آگے آؤ۔ اِدھر۔

بیوی: (گرتے ہوئے) نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔نہیں۔

لڑکی: تم مرنا نہیں چاہتیں۔

بیوی: (جذباتی انداز میں) نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔میں مرنا نہیں چاہتی۔

لڑکی: ٹھیک ہے پھر تمہارے شوہر کو مرنا ہوگا۔ آگے آؤ مسٹر۔۔۔

شوہر: (لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں) نہیں۔نہیں۔ خاتون مجھے مت مارو۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

لڑکی: تم بھی مرنا نہیں چاہتے۔

شوہر: نہیں۔قطعاً نہیں۔

لڑکی: تم بھی مرنا نہیں چاہتے اور تم بھی نہیں چاہتیں۔لیکن ایک نہ ایک کو تو مرنا ہے۔ٹھیک ہے میں یونہی گولی چلاتی ہوں (پستول سیدھا کرتے ہوئے) جسے لگ جائے، لگ جائے۔

(خوفزدہ ہو کر چیختے ہوئے)

Bang Music

بیوی: نہیں ڈولی نہیں۔ مجھے مت مارو، یہ ایک دوہرا قتل ہوگا۔ کیونکہ میں ماں بننے والی ہوں۔

لڑکی: (پستول کا رُخ ایک دم نیچے کرتی ہے) اوہ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ خدا کا شکر ہے۔ اُس نے تمہیں آخری لمحے میں بچا لیا۔ یقیناً تمہیں زندہ رہنا چاہیے، اپنے بچے کے لیے اوہ خدایا۔ میں کتنا بڑا ظلم کرنے والی تھی۔تم اور تمہارا ہونے والا بچہ دونوں زندہ رہیں گے۔تمہارا خاوند آگے آئے۔ چلو مسٹر۔

شوہر: (خوف سے کانپتے ہوئے) مت مارو خاتون، مجھے مت مارو۔

لڑکی: (پستول اُس کی طرف تانتے ہوئے) اب میرے پاس کوئی گنجائش نہیں۔تمہاری بیوی جیت گئی، کیونکہ وہ ماں بننے والی ہے۔

(پستول تانتی ہے۔)

شوہر: (خوف سے چیختے ہوئے) یہ جھوٹ بول رہی ہے، خدا کی قسم یہ جھوٹ بول رہی ہے۔

لڑکی: تمہیں یقین ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو؟

شوہر: میں قسم کھاتا ہوں۔ ڈاکٹروں نے صاف جواب دیا ہے کہ یہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ میں بڑے سے بڑے سپیشلسٹ کو دکھا چکا ہوں۔

لڑکی: (نفرت سے) اتنا بڑا جھوٹ۔

بیوی: (خاوند کی طرف اشارہ کر کے) جھوٹ میں نہیں، یہ بول رہا ہے۔ بکواس کر رہا ہے بالکل۔

شوہر: بکواس میں کر رہا ہوں یا تم کر رہی ہو؟

لڑکی: خاموش (چونکہ کوئی بھی اپنے ساتھی کے لیے گولی کھانے کو تیار نہیں ہے، اس لیے مجھے دو گولیاں چلانی پڑیں گی۔ اگرچہ میرا مسئلہ صرف ایک گولی میں حل ہو سکتا تھا۔

(دونوں خاموش رہتے ہیں۔ ذرا سے وقفے کے بعد)

شوہر: کیوں نہ ٹاس کر لیا جائے، اگر ہیڈ آ گیا تو اسے گولی مار دیں۔ ٹیل آ گئی تو مجھے۔

(شوہر سکہ اچھالنے لگتا ہے، بیوی اس کے ہاتھ سے سکہ چھینتی ہے۔)

بیوی: نہیں، ہیڈ آئے تو اُسے گولی مارنا ورنہ۔۔۔

شوہر: مجھے یہ بھی منظور ہے۔

بیوی: مجھے تم پر اعتبار نہیں، سکہ مجھے دو۔

(دستک کی آواز کیمرہ کٹ کر کے دروازے پر جاتا ہے۔ بیمہ ایجنٹ اندر آتا ہے۔)

ایجنٹ: معاف کیجیے، میں اپنا قلم یہاں بھول گیا تھا۔ میرے لیے یہ بڑی جذباتی اہمیت رکھتا ہے، زحمت کی معافی چاہتا ہوں۔

(کیمرہ کٹ کر کے میز پر پڑے قلم کے کلوز اَپ لیتا ہے۔ ایجنٹ قلم اٹھاتا ہے۔ بیوی چیختے ہوئے)

بیوی: ڈاکٹر۔ ہمیں بچاؤ ڈاکٹر۔۔۔

ایجنٹ: (بات بناتے ہوئے) اوپر والی بیمار لڑکی، وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔

(بیوی آنکھ کے اشارے سے لڑکی کی طرف اشارہ کرتی ہے اور سرگوشی میں کہتی ہے)

بیوی: وہ یہ کھڑی ہے۔

(ایجنٹ کی نظر لڑکی پر پڑتی ہے۔ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر لڑکی ایک دم پستول اُس کی طرف کرتی ہے۔ ایجنٹ گھبرا کر پیچھے ہٹتا ہے۔ لڑکی مسکراتی ہے۔

ایجنٹ: گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے) اوہ آپ یہاں ہیں؟

لڑکی: خوب، تو تم ڈاکٹر ہو، آ جاؤ تم بھی۔

ایجنٹ: خواہ مخواہ، یعنی کس سلسلے میں؟

لڑکی: اب تم دو کی جگہ تین ہو گئے ہو اور آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہو۔

ایجنٹ: کیسا فیصلہ؟

لڑکی: تم میں سے ایک کو مرنا ہے، ابھی اسی وقت۔

ایجنٹ: (گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے) اوہ خدایا۔

لڑکی: میرا خیال ہے، تم میں سے جو بھاگنے کی کوشش کرے، اُس پر گولی چلا دوں گی۔

ایجنٹ: (بت کی طرح بیٹھتے ہوئے) میں بھاگوں گا تو نہیں، لیکن مجھے ذرا قصہ تو سمجھا دیں۔

لڑکی: زیادہ باتیں نہ کرو، میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ جلدی سے فیصلہ کرو۔

بیوی: (بیوی ہلے جلے بغیر ایجنٹ سے سرگوشی کرتی ہے۔)

ڈاکٹر۔ پلیز کوئی طریقہ سوچو۔

ایجنٹ: (اُسی انداز میں) کیسا طریقہ؟ مرنے کا طریقہ؟ میں تو آج تک نہیں مرا۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔

بیوی: (اسی انداز میں) اس طرح تو ہم سب مارے جائیں گے۔ کچھ سوچو۔

شوہر: (بلند آواز میں) یہ ڈاکٹر نہیں ہے، بیمہ ایجنٹ ہے۔

بیوی: (حیرت سے) کیا یہ ڈاکٹر نہیں ہے۔

ایجنٹ: (شوہر سے سرگوشی کرتے ہوئے) تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری بیوی کو اس کا پتہ نہ چلے وہ تم سے اور تم اس سے بہت محبت کرتے ہو۔

بیوی: اب وہ میری موت سے خوفزدہ نہیں بلکہ شاید خوش ہی ہو۔ تم شوق سے بتا دو۔

(لڑکی چند لمحے اُنہیں سختی سے گھورتی ہے۔ پھر چیختی ہے۔)

لڑکی: خاموش! کیا تم چاہتے ہو کہ میں جھلا کر تم سب کو قتل کر دوں۔ میں نے کہا ہے میں صرف ایک کو قتل کرنا چاہتی ہوں۔ مقتول کون ہوگا اس کا فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔ اب تم تین ہو، میں چاہتی ہوں اکثریت کی بنا پر فیصلہ کرو، جیسا کہ انصاف کا طریقہ ہے۔ تم میں جو اکثریت فیصلہ کرے گی، میں اسے تسلیم کر لوں گی۔

(میاں بیوی آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔)

شوہر: یہ ٹھیک ہے۔

بیوی: یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم دونوں متفقہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس تیسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

لڑکی: تو ٹھیک ہے۔ میں اکثریت کا فیصلہ تسلیم کرتی ہوں۔

ایجنٹ: ٹھہریئے، اگر میں اپنا قلم واپس لینے نہ آتا تو تم کیا کرتیں؟

لڑکی: (شوہر اور بیوی کی طرف اشارہ کر کے) میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو قتل کرتی۔

ایجنٹ: تو پھر سمجھ لو کہ میں موجود نہیں ہوں اور تم وہی کرو جو تم نے پہلے سوچا تھا۔

لڑکی: یہ تو سراسر حماقت ہے کیونکہ تم موجود ہو اور اکثریت کا فیصلہ تمہارے خلاف ہے۔

ایجنٹ: (بیوی کی طرف اشارہ کر کے)

اکثریت۔ اس عورت کو علم نہیں کہ اس کے لیے کیا بات بہتر ہے۔ اگر اسے پتہ ہوتا تو یہ میرے ساتھ مل کر اپنے شوہر کے خلاف فیصلہ دیتی کیونکہ جونہی یہ مرا، پچاس ہزار روپے کی۔۔۔

شوہر: بکواس بند کرو۔۔۔

لڑکی: ریڈی، مسٹر بیمہ ایجنٹ عرف ڈاکٹر

ایجنٹ: رحم۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے اتنی جلدی مت مارو۔ میرے بیوی بچوں پر رحم کرو۔ میری بیوی میری موت کی خبر سن کر زندہ درگور ہو جائے گی۔ اسے مجھ سے بہت ہے۔ محبت جو میں نے اپنی بیوی کو پہلی دفعہ دیکھ کر محسوس کی تھی۔ محبت جو زندگی تخلیق کرتی ہے۔

لڑکی: کیا محبت محبت لگا رکھی ہے۔ سب فضول باتیں ہیں۔ (میاں بیوی کی طرف اشارہ کرتی ہے) ان کو دیکھو، دونوں

محبت کی انتہا بنے بیٹھے تھے۔ ان کے خلوص اور وفاداری کے قصے سب کی زبان پر تھے۔ تم نے دیکھا نہیں کیسے ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو رہے تھے ابھی۔

بیوی: میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا خاوند اس طرح مجھے دھوکہ دے گا۔

شوہر: دھوکا تم نے دیا ہے یا میں نے؟

لڑکی: کسی نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ تم دونوں ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے، کیونکہ تم میں سے کسی نے اپنی روح کے سمندر میں دور تک جھانک کر نہیں دیکھا تھا کہ اس میں کیا ہے۔ اس کی چمکدار سطح کے نیچے کیسے گدلے پتھر، ریت، جھاڑیاں، پودے، چٹانیں اور Octopus سوئے ہوئے ہیں۔ یہ سب مجھے آج ڈاکٹر نے بتایا ہے۔ ڈاکٹر عینکو نے۔۔۔ وہ جو گراؤنڈ فلور پر رہتا ہے۔

بیوی: (چیخ کر) ڈاکٹر رضا نے۔۔۔ او مائی گاڈ

شوہر: اور کرو خدمتِ خلق

لڑکی: ہاں۔ وہ ایک بہت بڑا ماہرِ نفسیات ہے۔ میں نے اُس سے اس آواز کے بارے میں پوچھا جو مجھے قتل پر اُکساتی ہے۔

بیوی: پھر کیا بتایا اُس نے؟

لڑکی: اس نے مجھے آواز کا حکم ماننے کو کہا، اُس نے کہا، مجھے اس خواہش کو دبانا نہیں چاہیے۔

ایجنٹ: (سرگوشی میں حیرت سے چیختے ہوئے)

اس نے تمہیں قتل کرنے کو کہا، ناممکن۔

لڑکی: اس نے کہا اگر میں نے قتل کر دیا تو میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ اسی نے مجھے یہ پستول بھی دیا ہے۔

ایجنٹ: (سخت حیرت سے)

ڈاکٹر نے تمہیں یہ پستول دیا قتل کرنے کے لیے، حیرت ہے۔

لڑکی: اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ یہی میرا علاج ہے۔ مجھے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے۔ تمہیں۔ اس سلسلے میں میری مدد کرنی چاہیے۔ چلو شاباش، میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔

(پستول تانتی ہے۔)

ایجنٹ: شکر گزار، کب۔ میرے مرنے کے بعد۔ کیا کہہ رہی ہو (دونوں ہاتھ اٹھا کر روکتے ہوئے) تم ٹھہرو۔ پلیز میری بات سنو۔ ٹھہرو۔

لڑکی: میں بہت ٹھہر چکی ہوں۔ اب مجھے اپنا علاج کرنے دو Ready ہو جاؤ۔

ایجنٹ: (شوہر کو مضبوطی سے پکڑتا ہے)۔

میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ ہم اکٹھے مریں گے۔ میرا کیا قصور ہے۔ میں یہاں تمہاری زندگی کا بیمہ کرنے آیا تھا اور اب مر رہا ہوں۔ بغیر اپنی زندگی کا بیمہ کرائے۔ نہیں، ہم تینوں ساتھ مریں گے۔

شوہر: (بیوی سے)

خدا کے لیے مجھے اس سے چھڑاؤ۔

بیوی: میں کیسے چھڑاؤں۔ اس نے بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔

(تینوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)۔

شوہر: کچھ کرو، یوں بت بنی کیا دیکھ رہی ہو۔

(لڑکی چند لمحے پریشانی میں تینوں کو دیکھتی ہے۔)

لڑکی: میں تم لوگوں پر گولی چلاؤں گی۔ اب جس کو بھی لگے۔ اس کی قسمت! یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ One Two Three (فائر کرتی ہے) (تینوں چیخ مار کر گر جاتے ہیں۔ لڑکی سکون کا سانس لیتی ہے، جیسے بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔)

لڑکی: گولی کسے لگی ہے؟

بیوی: مجھے، میں مر رہی ہوں۔

شوہر: میں مر چکا ہوں۔

ایجنٹ: میں ختم ہو چکا ہوں۔

لڑکی: ناممکن۔ قطعاً ناممکن ہے یہ ایک گولی تم تینوں کو قتل نہیں کر سکتی۔ تم میں سے دو یقیناً زندہ ہوں گے۔ پھر چیک کرو۔

(تینوں اٹھ کر اپنے جسموں کو ٹٹولتے ہیں۔)

لڑکی: یہ تمہارے کپڑوں اور چہروں پر کالا کالا کیا ہے۔

ایجنٹ: شاید بارود ہے۔

لڑکی: اور گولی، گولی کہاں گئی۔ کس کے جسم میں ہے وہ۔

شوہر: (اپنے جسم اور کپڑوں کی تلاشی لے کر) اب تم ہمیں اپنی گولی ڈھونڈنے پر بھی مجبور کرو گی۔

بیوی: (پسینہ پونچھتے ہوئے) کہیں خون کا ایک قطرہ نہیں۔

ایجنٹ: (میز سے پستول اٹھا کر اسے غور سے دیکھتا ہے) پستول میں بارود کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

لڑکی: کیا تمہیں یقین ہے۔

ایجنٹ: (پستول اسے دیتا ہے) لو خود دیکھ لو۔

لڑکی: اس کا مطلب ہے کہ یہ سب ڈاکٹر کی سکیم تھی۔ بہرحال اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ایجنٹ: میرا خیال ہے میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ خاتون۔ اب میں اُس وقت تک کسی کے گھر نہیں جاؤں گا جب تک اپنا بیمہ نہیں کر لیتا۔

(چلا جاتا ہے۔)

لڑکی: مجھے افسوس ہے میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی بہرحال میں آپ لوگوں کی بے حد شکر گزار ہوں۔ مجھے

یوں لگتا ہے جیسے گولی چلانے کے بعد میں بالکل ٹھیک ہوگئی ہوں۔ وہ آواز بھی بند ہوگئی ہے۔ سارا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے۔ I am Normal Now خدا حافظ، بہت بہت شکریہ۔

شوہر: یہ سب کیا تھا؟

بیوی: شاید کوئی ڈراؤنا خواب تھا؟

شوہر: ہاں ہاں یقیناً خواب ہی ہوگا۔ ہمیں دنیا کی کوئی طاقت ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔

لڑکی: اوہ معاف کیجیے۔ ایک بات میں بھول گئی۔ آج میری صحت یابی کی خوشی میں آپ ڈنر میرے گھر کھایے اور وہاں اجازت ہو تو اس خوشی کے موقع پر باقی پٹاخے بھی چلا لوں۔

(پستول چلاتی ہے)

لڑکی: مجھے خوشی ہے کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

شوہر/ بیوی: (ایک دوسرے کی طرف شرمندہ نظروں سے دیکھتے ہوئے) افسوس، تمہیں اندازہ نہیں کہ تم نے کتنا بڑا نقصان کر دیا ہے۔

لندن

بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک زمانے میں ''لندن پلٹ'' ہونا ایک ایسی خصوصیت تھی جسے اعلیٰ ڈگری کا درجہ دیا جاتا تھا۔ بہت سے لوگوں کی زندگی میں تو یہ سفر ایک مرکزی نقطے کی حیثیت اختیار کر جاتا تھا، مثلاً

یہ میرے لندن جانے سے چار سال پہلے کی بات ہے!

جن دنوں میں لندن جانے کا پروگرام بنا رہا تھا!

لندن سے آتے ہی میری شادی ہوگئی!

لندن سے آئے ہوئے دس برس ہو چکے تھے مگر.....؟

میں نے لندن میں دیکھا کہ.....وغیرہ.....وغیرہ.....وغیرہ!!

قیامِ پاکستان سے پہلے برِصغیر سے لندن کی طرف یہاں کی دولت کے علاوہ عام طور پر کچھ طالب علم اور امرا کا ایک محدود طبقہ ہی جایا کرتا تھا، مزدور پیشہ اور تاجر حضرات کی تعداد ان سے بھی کم تھی مگر آزادی کے بعد صورتحال انتہائی تیزی سے بدلنے لگی۔ لندن پر سب سے پہلا ہلّا اپنے میر پوری بھائیوں نے بولا اور پھر اس کے بعد چل سو چل۔ ڈاکٹر انجینئر، تاجر، بینکر، اہلِ علم و ہنر، سیاستدان، فنکار.....غرضیکہ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے نمایندے وہاں موجود نہ ہوں۔

مشتاق احمد یوسفی، عبداللہ حسین، ضیاءمحی الدین، ناہید نیازی، افتخار عارف، ساقی فاروقی، بدیع الزماں، شاہد محمود ندیم، غلام مصطفیٰ کھر، جاوید حکیم قریشی، فارغ بخاری، غلام قادر آزاد، آغا حسن عابدی، سلیم شاہد، جسٹس صمدانی، عظمت نواز باجوہ، ڈاکٹر سعید اختر درانی، ڈاکٹر صفی حسن، الطاف گوہر، شاہد حسین اور بے شمار دوسرے معروف پاکستانی وہاں عارضی یا مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔ کچھ لوگ لندن میں ہیں اور کچھ اس کے نواح میں۔ مزدور پیشہ لوگ زیادہ تر انگلستان کے صنعتی شہروں میں رہتے ہیں لیکن لندن کا ایک علاقہ جو ہیتھرو ایئرپورٹ کے قریب ہے اور ساؤتھ آل کہلاتا ہے، تقریباً سارے کا سارا ایشیائی اور بالخصوص برصغیر کے لوگوں کے قبضے میں ہے۔ کسی شاعر کا مصرعہ ہے۔

ہم جہاں بیٹھ کر پی لیں وہیں مے خانہ بنے

تو یوں سمجھئے کہ ساؤتھ آل کو ہمارے بھائیوں نے وطنِ عزیز کا ماحول دینے کی پوری پوری اور کامیاب کوشش کی ہے۔

کہتے ہیں کوئی بوڑھا انگریز اپنے کسی پرانے دوست کا گھر ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا۔ عمارت اور فلیٹ نمبر تلاش کرنے کے بعد اطلاعی گھنٹی بجائی۔ اندر سے ایک سردار دھوتی کرتے میں ملبوس، مونچھوں سے مکھن صاف کرتے ہوئے نکلے۔ انگریز نے اپنے دوست کے بارے میں استفسار کیا۔ سردار جی نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"No, no, this is my house. no Mr. Barrington lives here"

بوڑھے صاحب نے اپنی ڈائری سے دوبارہ پتا چیک کیا اور سردار جی سے پوچھا کہ

''یہ فلاں بلڈنگ کا فلیٹ نمبر فلاں فلاں نہیں ہے؟''

سردار جی بولے:

"Yes, address is allright, but i told you no foreigner lives here."

اب لندن میں کسی انگریز کے لیے فارنر کا خطاب سن کر اس بابے پر کیا گزری ہوگی؟ اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بابا ایشیائی باشندوں کے زبردست ترین مخالف اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر اینک پاول کا رشتے دار تھا۔

اتنے بڑے لندن شہر میں اگرچہ ہمارے جاننے والوں کی تعداد خاصی معقول تھی مگر میرا پروگرام اپنے بچپن کے دوست مکرم جاوید سید کی طرف رہنے کا تھا جو گزشتہ دس برس سے یہاں ٹریڈنگ کا بزنس کر رہا تھا اور اس میں بہت کامیاب بھی تھا۔ مشاعروں کے پروگرام میں تبدیلی کے باعث صورت حال کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ ہماری آمد سے دو دن قبل اسے اپنی اطالوی بیوی لاریا سمیت لاطینی امریکہ کے مختلف ممالک جانا تھا جہاں سے اس کی واپسی دو ہفتے بعد متوقع تھی یعنی ہماری روانگی کے تین دن بعد۔ اس صورت حال میں قصور سراسر ہمارا تھا مگر مکرم اس قدر شرمندہ ہو رہا تھا کہ میرے بے حد سمجھانے کے باوجود وہ اپنے حقِ میزبانی سے دست بردار نہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ ہمارے استقبال، خبر گیری، رہائش، نقل و حرکت کے انتظامات اور خاطر خدمت کے لیے نہ صرف اس کے لندن آفس کا عملہ موجود ہوگا بلکہ اس نے اپنے نائجیریا آفس سے ہمارے مشترکہ اور پیارے دوست افتخار بٹ کو بھی بلوا لیا ہے تاکہ ہم اور زیادہ ایٹ ہوم محسوس کر سکیں۔

پروین نے اپنے کلکٹر کسٹمز جہاں گیر خاں صاحب کو ہماری آمد کی اطلاع دے رکھی تھی جو وہاں پاکستانی سفارتخانے کے کمرشل اتاشی تھے۔ ان کی وجہ سے امیگریشن اور کسٹم کا مرحلہ تو دس منٹ میں طے ہو گیا مگر اب جو ہم سامان کی ٹرالیاں لے کر چلے تو چلتے ہی چلے گئے۔ تقریباً آدھ میل چلنے کے بعد جب ہم ایک ایسے کاریڈور میں داخل ہوئے جس کا دوسرا سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا تو پروین نے ایک لمبا سانس چھوڑتے ہوئے کہا:

''یہ راستہ تو برٹش راج سے بھی لمبا ہو گیا ہے۔''

لندن ایئرپورٹ پر اگرچہ امریکی ہوائی اڈوں جیسی چمک دمک نہیں تھی مگر اس میں ایک ریٹائرڈ جرنیلوں والی تمکنت اور رکھ رکھاؤ ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ ایئرپورٹ کی عمارت کے اندر کی اس طویل جیری پریڈ کے دوران ہم نے جہاں گیر خاں صاحب سے لندن یاترا کی تمام ضروری اور غیر ضروری تفصیلات حاصل کرنے کے علاوہ اپنا تقریباً سارا پروگرام بھی ڈسکس کر لیا تھا جس میں ان کے یہاں قیام کی پرخلوص دعوت سے معذرت بھی شامل تھی۔

قرائن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم ہوائی اڈے کے بیرونی دروازے کے نواح میں ہیں مگر ہمارے میزبانوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ جہاں گیر خاں کی آنکھوں میں بہت سے سوالیہ نشان تیر رہے تھے مگر ایک شریف اور باوقار انسان کی طرح ہمیں پریشانی سے بچانے کے لیے وہ جان بوجھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ پروین کی شرمندہ کن نگاہیں بار بار میری طرف اٹھ رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پورا ہیتھرو ایئرپورٹ ایک بڑے سے سوالیہ نشان کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ میں نے بے چارگی کے انداز میں اجنبی چہروں کے ہجوم پر ایک اور نگاہ ڈالی۔ آؤٹ آف فوکس انسانی نقوش کے ہجوم میں ایک آشنا چہرہ ریگزار میں نخلستان کی طرح طلوع ہوا۔ افتخار بٹ اپنے مخصوص ڈھیلے ڈھالے انداز میں مسکراتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ قدِ آدم سے کچھ نکلتے ہوئے قد والا ایک اور شخص تھا جس کے ہونٹوں پر اس کے قد سے بھی بڑی مُسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ افتخار نے تعارف کرایا کہ یہ اقبال حسین ساہی ہیں جو مکرم کے دفتر کے چیف اکاؤنٹنٹ ہیں اور ہمارے لندن میں قیام کا انتظام و انصرام ان کے ذمے ہے۔ اقبال اور افتخار کے ساتھ میری کھوئی ہوئی خود اعتمادی، بشاشت اور ہیتھرو ایئرپورٹ کی روشنی بھی واپس آ گئی تھی۔ میں نے افتخار سے تاخیر کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ وہ تو اپنے حساب سے وقت سے خاصا پہلے آئے ہیں کیوں کہ انٹرنیشنل فلائٹ کے سب سے پہلے آنے والے مسافر کو بھی کسٹم اور امیگریشن سے نکلنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ ضرور لگتا ہے۔ جہانگیر خان نے ان کی تائید کرتے ہوئے بتایا کہ

''ایں ہمہ آمدہ من است!''

اب پتا چلا کہ ہنگامی حالات میں وی آئی پی بننے کے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔

سامان کو موٹروں کی ڈکیوں میں رکھنے کی ناکام کوشش کے بعد ٹیکسی منگوائی گئی۔ لارڈ کلائیو کی سی شکل وصورت والے گورے ڈرائیور نے بڑی مستعدی سے سامان لوڈ کرنا شروع کیا۔ میں نے اس کی مدد کرنا چاہی تو افتخار نے مجھے روک دیا۔ بولا:

''اٹھانے دو اسے..... ہم نے بھی ڈیڑھ سو سال ان کا بہت سامان ڈھویا ہے!''

اقبال ساہی نے اسے ہماری منزل سے آگاہ کیا اور تاکید کی کہ ہمارے پیچھے پیچھے آئے۔ ایئرپورٹ سے ریجنٹ پارک تک کے تقریباً بیس منٹ کے سفر میں ایک لمحے کے لیے بھی وہ سیاہ رنگ کی ٹیکسی ہماری نظر سے اوجھل نہیں ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہے۔ تاریخ کے بہت سے نظریات آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ جو تھا، نہیں ہے، جو ہے، نہ ہوگا.....

افتخار گزشتہ برس دل کے بائی پاس آپریشن سے گزر چکا تھا۔ میں نے اس کے دل کی صحت اور حالت کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور پنجابی محاورے کے مطابق گھوڑے کی طرف فٹ ہے۔ نائیجیریا کا ذکر چھڑا تو اس نے کہا کہ وہاں کے حالات ایسے ہیں کہ انہیں ہرگز حالات نہیں کہا جا سکتا کیونکہ افریقی لوگ سسٹم نام کی کسی چیز کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ جس طرح بنکاک کی امتیازی خصوصیت وہاں کی عورت ہے اسی طرح نائیجیریا کی پہچان رشوت ہے جو وہاں اس قدر کھلے بندوں چلتی ہے کہ اس پر تعجب کا اظہار کرنا آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

ریجنٹ پارک کے قریب اسلامک سنٹر کے مرکزی دروازے کے تقریباً سامنے ایک تین منزلہ بلڈنگ کی دوسری منزل پر ۱۷ نمبر کا اپارٹمنٹ میرے لیے بک کروایا گیا تھا جو کہ دو بیڈروم، ایک لونگ روم، باتھ اور کچن پر مشتمل تھا۔ اپارٹمنٹ میں

ضرورت کی ہر چیز موجود تھی بلکہ بہت سی ایسی چیزیں بھی تھیں جن کی مجھے قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ پروین کی رہائش کا انتظام صابر چوہدری کی فیملی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ صابر کا خوب صورت فلیٹ میرے اپارٹمنٹ سے پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ صابر بھی مکرم کی طرح لندن سے باہر تھا۔ اس کی بیوی اور سالی نصرت، جو اقبال ساہی کی بھانجیاں بھی تھیں، پروین کو مل کر بہت خوش ہوئیں۔ وہ لوگ سرائے عالمگیر (جہلم) کے رہنے والے تھے۔ سیدھے سادے، مخلص اور محبت کرنے والے لوگ جو مہمان کو دل سے باعثِ رحمت خیال کرتے ہیں۔ ان کی اس مہمان نوازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے اپارٹمنٹ کا کچن استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور یوں دنیا یہ جاننے سے بھی محروم رہ گئی کہ انڈہ آملیٹ بننے کے دوران مزید کیا کیا کچھ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے!

لندن میں اپنے جاننے والوں کی فہرست پر نظر دوڑائی تو آنکھوں پسینہ آ گیا۔ ہمارے پاس کل آٹھ دن تھے جن میں احباب سے ملاقات کے علاوہ لندن کو بھی اچھی طرح دیکھنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دن کے لیے برمنگھم بھی جانا تھا جہاں برادرم ڈاکٹر صفی حسن، ڈاکٹر سعید اختر درانی اور بھائی غلام قادر آزاد سے ملاقات طے تھی۔ عاشور کاظمی، شاہدہ احمد اور سحاب قزلباش کو بھی اطلاع ہو گئی تھی اور ان کے بھی بار بار فون آ رہے تھے۔ بہت غور و فکر کرنے کے بعد جو پروگرام بنا وہ کچھ یوں تھا کہ زیادہ تر ایسی تقریبات میں شرکت کی جائے جہاں زیادہ سے زیادہ احباب سے ملاقات ہو سکے مگر یہاں اب یہ قباحت آن پڑی کہ پروین بیگم کسی ایسی تقریب میں شرکت پر آمادہ نہیں تھی جس کی ترتیب سے برادرم افتخار عارف کا ذرا سا بھی تعلق ہو یعنی وہی پرانی ناراضگی ابھی تک چل رہی تھی۔ بھائی بندی، اخلاق اور ہم سفری..... تینوں کا تقاضا یہی تھا کہ میں پروین کا ساتھ دوں، سو میں نے یہی کیا۔ میرے اس روّیے سے افتخار کو ملال ہونا تھا سو ہوا مگر اس نے ایک سمجھدار انسان اور اچھے دوست کی طرح اسے لفظ نہیں دیے اور یوں اس بدمزگی کا اندیشہ ٹل گیا جس نے بہت دنوں سے اندر ہی اندر مجھے پریشان کر رکھا تھا۔

افتخار، مکرم اینڈ کمپنی کے زیرِ انتظام چلنے والے ہوٹل اولیور میں مقیم تھا۔ تھوڑے سے کمرے تھے مگر اتنی مختلف قومیتوں کے مسافر وہاں رہ رہے تھے جیسے وہاں یو این او کا کوئی اجلاس ہونے والا ہو۔ معلوم ہوا کہ لندن میں (کم از کم ہوٹل کی حد تک) رنگ و نسل سے زیادہ استطاعت پر دھیان دیا جاتا ہے۔ اولیور ایک غریب نواز ہوٹل ہے، یہ بات دوسری ہے کہ وہاں کی غریبی ہمارے یہاں سفید پوشی کہلاتی ہے! کاؤنٹر کے سامنے ایک لابی نما کمرہ نشست تھا جہاں ہر وقت ٹی وی آن رہتا تھا لیکن وہاں بیٹھنے والے مرد و زن عام طور پر اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے تک نہیں تھے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کی وجہ ٹی وی پروگرام تھے یا ان کے اپنے زیرِ بحث آئندہ پروگرام۔

دیارِ فرنگ میں برسرِ عام دو مردوں کا آپس میں گلے ملنا اتنا ہی معیوب سمجھا جاتا ہے جتنا ہمارے یہاں مرد کا عورت سے بغل گیر ہونا۔ اس بات کا علم مجھے پہلے سے تھا مگر کرسمس کی رات ہوٹل میں مقیم کیرن اور کیرل نامی دو نیم مدہوش سہیلیوں نے مجھے اور افتخار کو اس موضوع پر جو سیر حاصل لیکچر دیا اور جس جس انداز میں اس مسئلے کے مختلف علمی اور عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی وہ اپنی جگہ پر ایک سبق آموز داستان ہے۔ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ ہر علاقے کی تہذیب و تمدن کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں مگر ان کی سمجھ میں آخر تک یہ بات نہیں آئی کہ تہذیب و تمدن کا عورت اور مرد کے باہمی معاملات سے کیا تعلق ہے!

رات اور نشے کے فروغ کے ساتھ ساتھ ان کی دلیلوں کی جارحیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ براہِ راست برصغیر سے آنے والوں کے ''خواتین'' سے متعلق رویوں کا مذاق اڑانے پر اتر آئی تھیں۔ ان کے خیال میں ہم ایشیائی لوگوں کا

عورت کی طرف جھکاؤ اور اس سے گریز دونوں ہی غیر حقیقی اور انتہا پسندانہ تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنے ذاتی تجربات سے جو مثالیں دیں وہ ایسی زوردار تھیں کہ ہمارا دفاعی محاذ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ میں نے افتخار کی طرف دیکھا مگر وہ کسی اور طرف دیکھ رہا تھا!!

کیرن اور کیرل دونوں نسبتاً کم تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ خواتین تھیں اور ایک آزاد اور خود مختار زندگی گزار رہی تھیں۔ جنس پر گفتگو ان کے نزدیک تضیعِ اوقات کے زمرے میں آتی تھی کیوں کہ ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ کھانا کھانے کے لیے ہوتا ہے بحث کرنے کے لیے نہیں۔ ان کی باتیں سن کر ایک بار پھر میرے ذہن میں ایک پُرانی الجھن نے سر اٹھایا کہ اتنا کھلا ڈلا ہونے کے باوجود اس معاشرے میں جسم فروشی، جنسی جرائم اور ہم جنس پرستی وغیرہ کی اتنی فراوانی کیوں اور کیسے ہے!

مغرب اور مشرق کے مزاجوں کا فرق ان کے تہواروں اور رسم و رواج میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم عید پر بازاروں کو سجاتے ہیں، انگریز کرسمس پر اپنا گھر سجاتا ہے۔ ہم بن پیے مست ہو جاتے ہیں اور وہ گلے گلے شراب میں ڈوب کر بھی اپنے آپ میں رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھیڑ اور دکانداروں کے تجاوزات کی وجہ سے رستہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے اور ویران کی سڑکیں بھاں بھاں کرتی ہیں۔ کرسمس کی صبح ہم نے اقبال ساہی کے ساتھ تقریباً آدھا لندن گھوم ڈالا، ہائیڈ پارک میں کھڑے ہو کر تصویریں اتروائیں کہ یہ بھی لندن یاترا کے آداب میں شامل ہے۔ سپیکرز کارنر میں بہت دیر کھڑے رہے کہ کہیں سے کچھ سامعین ملیں تو ایک عدد تقریر بھی جھاڑ ڈالیں مگر سوائے ایک پولیس والے کے کوئی ادھر سے نہیں گزرا۔ اب ایک تو ہم ایشیائی ملکوں کے لوگوں کو ویسے ہی پولیس کے سامنے بولنے کی عادت نہیں ہوتی اس پر یہ گورا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی برف میں لگا ہوا تھا۔ وہ ہمارے پاس سے یوں گزرا جیسے کوئی درختوں یا پتھروں کے قریب سے گزرتا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس وقت داغ کا یہ شعر بہت یاد آیا۔

زمیں پر پاؤں نخوت سے نہیں رکھتے پری پیکر
یہ گویا اس مکاں کی دُوسری منزل میں رہتے ہیں

دریائے ٹیمز کو دو تین مختلف پلوں اور کناروں سے دیکھا مگر ہر بار ایک جیسا پایا۔ انگریز قوم کے مزاج کی طرح! ایک پُل سے کچھ ہی فاصلے پر ٹاور آف لندن واقع تھا۔ اس عمارت سے پرانے وقتوں میں بادشاہ لوگ عقوبت خانے کا کام بھی لیتے رہے ہیں۔ پتا نہیں تخت اور زندان میں کیسا ربطِ خفی ہے کہ اکثر شاہی محلات اپنے مکینوں کے لیے بندی خانے بن جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا ہے کہ لوگ بظاہر تخت پر متمکن ہوتے ہیں مگر ان کی رُوحیں سُولیوں پر ٹنگی رہتی ہیں!

میرا دھیان لاہور کے شاہی قلعے کی طرف چلا گیا۔ جہاں دیوانِ خاص کے پہلو بہ پہلو وہ عقوبت خانے واقع ہیں جہاں اذیت رسانی کا عمدہ ترین انتظام موجود ہے اور یہ اذیت ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جن کے جرم کی نوعیت اخلاقی نہیں ہوتی۔ اردو کے بہت عمدہ نظم نگار اور میرے بہت پیارے بزرگ ہمعصر ظہور نظر مرحوم نے ایک خاص پس منظر میں ایک شعر کہا تھا، ٹاور آف لندن دیکھا تو یوں لگا جیسے وہ شعر صدیوں پر محیط ہو گیا ہو۔

کیا ہے قید مجھے اس جگہ پہ ظالم نے
جہاں سے صاف مرا گھر دکھائی دیتا ہے

دوپہر کو ''لاہور کباب ہاؤس'' میں تکے، کباب اور تندوری روٹیاں کھا کر اپنے شہر اور شہر والوں کو یاد کیا۔ یاد بھی کیڑے

کے رزق کی طرح ہوتی ہے جو پتھر میں بھی سیندھ لگا کر اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

ویسٹ منسٹر ایبے کہنے کو تو ایک گرجا ہے مگر آپ بلاتکلف اسے انگلینڈ کی تاریخ کا سب سے بھرپور استعارہ کہہ سکتے ہیں۔ حالی نے دلی کے بارے میں کہا تھا:

''دفن ہوگا کہیں ایسا نہ خزانہ ہرگز!''

میرا خیال ہے کہ یہی بات اس عمارت کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ عبادت گاہ بھی ہے، شاہی خاندان کی شادیوں کا مخصوص گرجا بھی اور مشاہیر کا قبرستان بھی۔ انگریز کی تہذیب اور تمدن کے مختلف شعبوں کے جتنے نامور تزئین کار ہو گزرے ہیں ان سب کا ایک عمدہ انتخاب اس عمارت کے در و بام میں سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمارے یہاں روحانیت کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اللہ والوں کی قبریں جیتی ہیں۔ یعنی ان کی موت کے بعد بھی ان کا فیض جاری رہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بات ان لوگوں پر زیادہ صادق آتی ہے جنھوں نے انسانیت کی بقا اور فروغ کے لیے اپنی پوری زندگیاں وقف کر دیں اور دنیا کو اپنے علم و ہنر اور کارناموں سے ایسے سدا بہار تحفے دیے جن کی چمک اور حسن کی چھوٹ مستقبل کی روش روش پر جلوہ نما ہے۔

ہم نے مختلف مشاہیر کے ناموں کی تختیوں پر نظر ڈالی تو یوں لگا جیسے ویسٹ منسٹر ایبے کے قبرستان میں داخل ہونے کے لیے پہلی شرط تاریخ کے اوراق میں زندہ ہونا ہے۔ انگلستان کی بادشاہت، جمہوریت کی آندھی اور سوشلزم کے طوفان دونوں کو جھیل چکی ہے اس لیے اس کے افراد کی قبریں ان کے ذاتی میرٹ کی وجہ سے نہ بھی ہوں تو بھی انہیں یہاں دفن ہونے کا حق پہنچتا ہے البتہ ان کے علاوہ جتنی قبریں ہیں ان میں ہر کوئی اپنی جگہ یگانہ اور یکتا ہے۔ صرف شاعروں میں دیکھا تو شیکسپیئر، ورڈزورتھ، کیٹس، شیلے اور ٹی ایس ایلیٹ نظر آئے۔ بہت سے ہوں گے جن کی الواحِ مزار پر یا تو ہماری نظر نہیں پڑی یا ہم وقت کی کمی اور تھکن کی زیادتی کی وجہ سے ان تک پہنچ نہ سکے۔ پروین انگریزوں کی تاریخ کے بارے میں میری معلومات سے باقاعدہ طور پر مرعوب ہو رہی تھی اس لیے میں نے اسے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ بی اے میں برٹش ہسٹری میرا اختیاری مضمون تھا۔

ایک بہت وسیع و عریض اور بے حد بلند چھت والے ہال میں پہنچے تو معلوم ہوا وہیں ڈیانہ اور چارلس کی شادی ہوئی تھی اور اس روز جتنے آدمیوں کو وہاں کرسی ملی انکے وی وی آئی پی ہونے میں کسی شک و شُبے کی گنجائش نہیں۔ گزشتہ دنوں کسی نے وی وی آئی پی کی امریکن تعریف بتائی تھی، اچھی لگی سو اس موقع کی مناسبت سے اس کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وی وی آئی پی وہ ہوتا ہے جو امریکی صدر کی رہائش گاہ وائٹ ہاؤس میں مدعو ہوا اور مائیکروفون پر اعلان کیا جائے کہ اس کے لیے کوئی فون کال ہے۔

کسی نے اعتراض کیا کہ اس کے لیے صرف وی آئی پی ہونا ہی کافی ہے، اضافی وی صرف ایسے شخص کے نام کے ساتھ لگنی چاہیے جو وائٹ ہاؤس اس میں امریکی صدر کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہو، ٹیلی فون کی گھنٹی بجے، صدر سنے اور پھر ریسیور اس شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے کہے:

''یہ آپ کے لیے ہے۔''

ساقی فاروقی کا نام اور کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ گزشتہ پچیس تیس برسوں سے بڑی عمدہ، سچی اور انوکھی شاعری کر رہا ہے، مگر اسے دیکھنا، اس سے باتیں کرنا اور اس کے ساتھ گھومنا بھی اپنی جگہ ایک عجیب و غریب تجربہ ہے۔ ایک ایسا تجربہ

جس کے بارے میں فارسی والے ''شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ'' بولتے ہیں۔ چند برس قبل جب وہ پاکستان آیا اور اس سے پہلی بار بالمشافہ ملاقات ہوئی تو اس نے مغربی لباس پر گلے میں موٹے موٹے منکوں والی ایک مالا پہن رکھی تھی اور گفتگو کے دوران شیکسپیئرین تھیٹر کے اداکاروں کی طرح ہاتھوں، آنکھوں، چہرے کی موومنٹ اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے اتنا زیادہ کام لے رہا تھا کہ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت ن۔م۔راشد، افتخار جالب، مظفر علی سید اور صلاح الدین محمود سے پہلی ملاقات پر بھی ہوئی تھی، یہ اور بات ہے کہ ان سب حضرات سے دو چار بار ملنے کے بعد آپ نہ صرف ان کے ''انداز'' کے عادی ہو جاتے ہیں بلکہ ایک آدھ استثنا سے قطع نظر اس سے لطف اندوز بھی ہونا شروع کر دیتے ہیں، سو ساقی کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہوا۔

ساقی ان چند شاعروں میں سے ہے جن کی گفتگو اور نظموں کے موضوعات میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت اور شاعری دونوں میں ایک مخصوص قسم کا جذباتی ''وفور'' ہے مروّجہ اصطلاحات میں اس کیفیت کو سیمابیت، جوش، قوت اور جذباتیت کہا جاتا ہے لیکن پتا نہیں کیوں ساقی کے حوالے سے مجھے ''وفور'' کے علاوہ کوئی لفظ موزوں نہیں لگتا۔ ساقی جب لندن گیا تھا تو اس وقت وہ اینگری ینگ مین بلکہ اینگری ینگ بوائے تھا مگر اب اس کی کنپٹیوں پر کپاس ڈیرا ڈال چکی ہے۔ (اگرچہ اس کا چہرہ اب بھی اس کی عمر کے مقابلے میں بہت جوان ہے اور اس کی آواز کی کھنک بھی قائم و دائم ہے!) اس کی آسٹرین نژاد بیوی، جسے وہ گنڈی کہہ کر پکارتا ہے، گزشتہ انیس سال سے اس کی بیوی چلی آ رہی ہے، سو اس خاتون کے باکمال ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے جس نے پارے کو مٹھی میں بند کر رکھا ہے۔ اپنے چھوٹے سے خوب صورت گھر کی ڈائننگ ٹیبل پر لندن کی اس بہت سرد شام میں ساقی نے ہمیں اپنی اور گنڈی کی اوّلین ملاقاتوں کی داستان بہت مزے لے لے کر سنائی۔ اس کی بیٹی انگا غالباً یہ باتیں بہت دفعہ سن چکی تھی اس لیے وہ کھانا کھاتے ہی میز سے اٹھ گئی البتہ گنڈی نے بیچ بیچ میں جو جملے کسے ان سے اندازہ ہوا کہ لوہا لوہے کو اگر کاٹتا ہے تو کیسے کاٹتا ہے۔

گنڈی نے بتایا کہ جب وہ ساقی سے پہلی بار ملی تو اسے انگریزی بہت کم آتی تھی اور اس کی والدہ یعنی ساقی کی ساس تو انگریزی سے بالکل ہی نابلد تھیں چنانچہ جب ساقی ان کی فیملی سے ملا تو وہ سب اس کی ''حرکتوں'' سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کی سیماب طبعی، شوریدہ مزاجی، تیز تیز بولنے کا مخصوص انداز اور گندمی رنگ انہیں ایسے بھائے کہ انہوں نے فوراً نہ صرف اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا بلکہ آج تک بیٹی کی بجائے داماد کا ووٹ بنے ہوئے ہیں!!

ساقی نے کریڈٹ لیتے ہوئے کہا کہ ان کے اسی سلوک کی وجہ سے اتنے برس انگلستان میں رہنے کے باوجود اس نے اپنی ساس کے بارے میں کبھی کوئی مذاق نہیں کیا حالاں کہ اس معاشرے میں mother in law jokes شرفا کی نشستوں کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا:

''تمہارا دین ایمان تمہارے ساتھ، البتہ مجھے اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے، کہو تو عرض کروں؟''

پروین بولی:

''سنائے بغیر آپ نے رہنا تو ہے نہیں، تکلف چھوڑیے، ارشاد کیجیے۔''

میں نے گنڈی اور ساقی سے اخلاقی مدد لیتے ہوئے کہا:

''دیکھو بھئی! میرا ایمان ہے کہ لطیفہ پوری نسلِ آدم کی میراث ہوتا ہے اس لیے جہاں تک ہو سکے اسے خلقِ خدا کا پہنچانا چاہیے۔ اتنی tense اور پریشان زندگی میں کچھ تو اپنے ہونے کا احساس ہو، سو عرض کیا ہے:

''کسی نے کہا کہ agony اور ecstasy کسی ایک لمحے میں یک جا نہیں ہو سکتے۔ دوسرے نے اختلاف کیا اور ایسی مثال دی کہ پوری محفل قائل ہوگئی بولا:

''اگر آپ یہ دیکھیں کہ آپ کی نئی اور بہت قیمتی کار ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک ایسے زاویے پر پہنچ چکی ہے جہاں سے اس کا گرنا ناگزیر ہے تو اسے agony کہیں گے لیکن اس میں آپ کی mother in law سوار ہو تو یہی agony فوراً ecstasy میں تبدیل ہو جائے گی۔''

ساقی نے گنڈی کو چھیڑتے ہوئے بتایا کہ پہلی ملاقات میں جب میں نے اسے فلم دیکھنے کی دعوت دی تو اس نے صاف انکار کر دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی پوچھا:

''بائی دی وے اس فلم میں ہے کون کون؟''

گنڈی نے مسکراتے ہوئے کہا:

''بس یہی ایک غلطی ہوگئی۔''

میاں بیوی کی اس پُرلطف گفتگو کے دوران ساقی کے اپنے ہم عصروں پر تبصرے بھی جاری رہے۔ بقول اس کے جہاں چار ادبی شاعر جمع ہوں وہاں ''غیبت کا شامیانہ'' خود بخود تن جاتا ہے۔ راشد اور فیض صاحب سے لے کر افتخار عارف اور گوپی چند نارنگ تک بے شمار لوگ اس کے اڑتے ہوئے تیروں کی زد میں آئے۔ خوفِ فسادِ خلق سے میں اس میدانِ کارزار سے صرفِ نظر کرتا ہوں کیوں کہ احباب کے دل تو ذرا سی ٹھیس نہیں سہہ پاتے اور یہاں تو..... مگر ایک جملہ ایسا ہے کہ چھپائے نہ بنے۔

کیٹس کا گھر ساقی کے ہمسائے میں ہے۔ اس کی زیارت تازہ واردانِ ہوائے لندن کو کروانا وہ اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہے۔ برادرم پروفیسر نظیر صدیقی چند برس پہلے ایک مطالعاتی دورے پر لندن پہنچے تو ایک شام وہ انہیں بھی وہاں لے گیا۔ کیٹس کا گھر دکھایا اور پھر بڑے رومانٹک انداز میں اردگرد پھیلے ہوئے باغ نما جنگل کی طرف اشارہ کر کے بولا:

''اور یہ ہے وہ باغ جس کے درختوں سے اڑنے والی بلبلوں کے لیے اس نے ایسی بے پناہ نظمیں لکھی ہیں۔''

نظیر صدیقی نے (دروغ بر گردنِ ساقی) بڑے غور سے باغ کا جائزہ لیا پھر پوری سنجیدگی سے پوچھا:

''کس درخت سے اڑی تھی وہ بلبل؟''

یہ واقعہ سنانے کے بعد ساقی نے نظیر صدیقی کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا اور تقریباً اپنے بال نوچتے ہوئے کہا:

''..... ذرا..... اس..... کی بات پر غور کرو..... اس..... کو کیٹس کی نظم سے زیادہ اس..... درخت کی فکر تھی۔ خدا ان محققوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

ساقی کے گھر سے عبداللہ حسین کو فون کیا گیا کہ وہ بھی کھانے پر مدعو تھے۔ معلوم ہوا جس بھانجے یا بھتیجے کو انہوں نے اپنے سٹور پر کھڑا کر کے آنا تھا وہ کسی وجہ سے نہیں پہنچ سکا اور اب اس کے لیے ''اُم الخبائث'' کے ذخیرے کو نامحرموں کی تحویل میں چھوڑ کے آنا ممکن نہ تھا۔ اُن کا ''اُداس نسلیں'' میں نے اپنے کالج کے ابتدائی برسوں میں پڑھا تھا اور تب سے میرے دل و دماغ میں اس کے مصنف کے لیے اچھے خیالات موجود تھے مگر عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ بیس برسوں میں عبداللہ حسین سے ٹاکرا نہ ہو سکا تھا۔ ہم نے فون پر ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی، آئندہ ملاقات کے امکانات کا جائزہ لیا اور ایک دوسرے کی تحریروں کے بارے میں اچھی اچھی باتیں کیں۔

ساقی نے کہا:

''چلو سحاب کی طرف چلتے ہیں۔ اس نے فیض صاحب پر کوئی مضمون لکھا ہے جسے سنانے کے لیے آج اس نے اپنے گھر پر کچھ سامعین جمع کیے ہیں۔ تم لوگوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گی۔''

پروین نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بتایا کہ سحاب قزلباش نے اس کے ذریعے ہم دونوں سے بھی آنے کی فرمائش کی تھی لیکن ہم ساقی سے وعدہ کر چکے تھے اس لیے سحاب سے معذرت کرنی پڑی۔ اب جب کہ وقت ہے تو کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کیے جائیں۔

محاورے کے اس برمحل استعمال پر ساقی، جو کہ عام حالات میں بھی تھوڑا بہت پھڑکتا رہتا ہے، بالکل ہی پھڑک اٹھا اور پھر سحاب کے گھر تک گفتگو کا موضوع محاورات کا ''تخلیقی'' استعمال ہی رہا۔ میں نے بتایا کہ ایک بار انٹرمیڈیٹ کے پرچے دیکھتے ہوئے میں نے ''کلنک کا ٹیکہ لگنا'' کا یہ استعمال بچشمِ خود پڑھا ہے

''میرے محلے میں کل سب نے کلنک کے ٹیکے لگوائے۔ میں گھر پر نہیں تھی اس لیے نہیں لگوا سکی۔''

پروین نے فقرہ چست کیا:

''یہ تو آپ ہی کے کسی شاگرد کا لگتا ہے۔''

''یہ بیان کسی خاتون کا ہے اور میں لڑکوں کو پڑھاتا ہوں۔''

ساقی نے حیرت سے ہم نے دونوں کی طرف دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا:

''بھائی مجھے یقین نہیں آتا کہ تم جیسے بدلحاظ لوگ ڈیڑھ مہینے سے ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں اور ان میں ایک بار بھی لڑائی نہ ہوئی ہو، ہم سالے تو اتنی دیر میں دس بار لڑ چکے ہوتے۔''

''اسی چیز کو جنریشن گیپ کہتے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ساقی نے میرے غریبانہ سر اور امیرانہ پیٹ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر خلافِ عادت جملہ روک لیا حالاں کہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔

سحاب ہمیں دیکھ کر واقعی بہت خوش ہوئیں۔ اپنی بزرگ نسل سے ہم نے ان کی خوش شکلی اور خوش آوازی کی جو داستانیں سنی تھیں ان پر تیس چالیس برسوں کی گرد جم چکی تھی اور اس برسے ہوئے بادل میں اب کوئی بجلی بھی پوشیدہ نہیں تھی مگر یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ اپنے وقت میں یہ گھٹا کتنی گھنگھور ہو گی۔

جب ہم وہاں پہنچے تو مضمون شروع ہو چکا تھا مگر کچھ اس طرح کہ نفسِ مضمون بار بار جھکائی دے جاتا تھا۔ ہوا یوں کہ سحاب کی نظر کی عینک کہیں ادھر ادھر ہو گئی اور باوجود تلاشِ بسیار کے نہیں ملی چنانچہ اب وہ نورِ بصارت کی کمی نورِ بصیرت سے پورا کرنے کی کوشش میں اٹک اٹک کر مضمون سے گتھم گتھا ہو رہی تھیں۔ حاضرین میں محسنہ جیلانی کے علاوہ چار پانچ اور لوگ بھی تھے جن کے نام میرے ذہن سے اتر گئے ہیں۔ مضمون کے بعد شعر و شاعری ہوئی اور اس قدر شدت سے کہ واپسی میں رات کے دو بج گئے۔

صبح صبح برادرم غلام قادر آزاد کا فون آیا۔ جو سکاٹ لینڈ کی شدید سردی کے باوجود محبت کی حرارت سے لبریز تھا۔ موصوف ضد کر رہے تھے:

''میں آپ لوگوں کو لندن سے لیتا ہوا برمنگھم آ جاتا ہوں جہاں آج شام برادرِ عزیز ڈاکٹر صفی حسن نے ایک محفل کا اہتمام کر رکھا ہے۔''

میرا جغرافیے کا علم ویسے بھی کمزور ہے اور انگلستان کے ضمن میں تو یہ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا مگر اس کے باوجود مجھے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ آزاد صاحب جو روٹ بنا رہے ہیں وہ سر سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے والا ہے۔ تھوڑی سی تفتیش پر معلوم ہوا کہ ہمارا شبہ صحیح تھا۔ آزاد صاحب برمنگھم سے کوئی سو میل اوپر کی طرف تھے اور ہم سوا سو میل نیچے کی طرف۔ گویا وہ برمنگھم سے ہوتے ہوئے لندن آتے اور پھر ہمیں لے کر واپس برمنگھم پہنچتے۔ بڑی مشکلوں سے ان کو یقین دلایا کہ ہمارے پاس ٹرانسپورٹ کا معقول سے بھی کچھ بہتر انتظام ہے کہ زندگی میں پہلی بار رولس رائس میں سفر کر رہے ہیں جس میں ٹیلی فون بھی فٹ ہے۔ یہ اطلاع ہم نے ان کو بالکل ویسے دی جیسے دیہاتی آدمی پہلی بار شہر دیکھ کر اس پر تبصرہ کرتا ہے۔

اقبال ساہی کی ناخدائی میں سوا سو میل کا یہ فاصلہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہو گیا۔ راستے میں ہم نے انگلستان کی ہریالی دیکھی جس سے طبیعت ہری بھری ہو گئی چناں چہ جب ڈاکٹر صفی حسن کے گھر پہنچے تو یوں محسوس ہوا جیسے ایک کمرے سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئے ہیں۔ غلام قادر آزاد اور صفی ہمارے منتظر تھے۔ دونوں بہت پرخلوص اور محبت والے انسان ہیں۔ مشترکہ دوستوں اور جاننے والوں کے ذکر کا سلسلہ چھڑا اور پھر چھڑتا ہی چلا گیا۔ احمد حسن حامد کے حوالے سے بات عطا الحق قاسمی تک پہنچی اور ظاہر ہے جب کوئی بات عطا تک پہنچ جائے تو وہاں سے آگے ذرا رک کر ہی چلتی ہے۔ میں نے انہیں عطا کا ایک تازہ جملہ سنایا جس کی تفصیل یہ ہے۔

کالج میں ہمارے ایک ساتھی استاد ہیں۔ پروفیسر غلام یٰسین افغانی، بڑے مرنجاں مرنج اور دلچسپ آدمی ہیں۔ ایک دن عطا نے انہیں بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا:

''افغانی صاحب، آپ زندگی میں اور جو کچھ چاہے کیجیے گا..... مگر افغانستان نہ جائیے گا!''

افغانی صاحب نے حیران ہو کر وجہ پوچھی۔ عطا نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا:

''اس لیے کہ وہاں تو پہلے ہی ایک روپے کے اسّی افغانی ملتے ہیں۔''

ڈاکٹر سعید اختر درانی کے بارے میں معلوم ہوا کہ کہیں قاہرہ وغیرہ کی طرف لیکچر دینے نکلے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کے بارے میں یہ بات بتاتا چلوں کہ امریکی خلائی مشن اپالو چاند سے جو نمونے لایا تھا ان پر تحقیق کرنے والے سائنسدانوں میں

صرف ایک شخص ایشیائی تھا اور وہ ہمارے ڈاکٹر سعید اختر درانی تھے۔

''غربت میں جا کے چمکا، گمنام تھا وطن میں۔''

ہمارا کمال یہ ہے کہ غربت میں جا کے چمکنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب ابھی تک وطن میں گمنام ہیں۔ ڈاکٹر درانی کا اضافی کمال یہ ہے کہ اتنے نامور سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادب اور شاعری سے بھی باقاعدہ تعلق استوار رکھا ہے۔ کلاسیکل انداز کی صاف ستھری goody goody شاعری کرتے ہیں اور علامہ محمد اقبال ؒ کے قیامِ جرمنی کے بارے میں بے حد اہم تحقیقی مواد بھی گاہے گاہے سامنے لاتے رہتے ہیں۔

غلام قادر آزاد پیشے کے اعتبار سے بینکر ہیں لیکن ان کا خوبصورت دل بھی ادب کے تیر نیم کش کا گھائل ہے۔ اپنے اور ہمارے مشترکہ دوست احمد حسن حامد کی طرح بھاری بھرکم، گول مٹول، کھلے ڈلے اور سراپا اخلاص آزاد سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ان کے نام کی رعایت سے شعروں کا ذکر چلا تو عجیب عجیب شعر سامنے آئے مگر میدان پھر بھی اسی کے ہاتھ رہا جس کا دیوان کھولنے سے پہلے چومنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا زندہ رہنے والا شعر ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

نشست کے لیے جس گھر کا انتخاب کیا گیا اس کے بارے میں مجھے سوائے اس کے کچھ یاد نہیں کہ واپسی پر میرا ایک بہت پسندیدہ مفلر وہیں رہ گیا تھا اور جو سالن میں نے پلیٹ میں ڈالا تھا اس میں انتہائی دیندار قسم کی مرچیں تھیں کیوں کہ میں نے زندگی میں ''توبہ توبہ'' کا اس قدر ورد ایک ہی نشست میں کبھی نہیں کیا۔

مرچوں کی اس واردات سے قطع نظر میزبان انتہائی میٹھے اور ملنسار تھے۔ اس محفل میں سوشیالوجی کے ایک استاد محمد حسن عسکری (تنقید والے نہیں) سے ملاقات ہوئی جو وہیں کہیں پڑھاتے تھے مگر سخن فہموں کی انتہائی اعلیٰ قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ اچھے شعر کو سن کر ان کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک ابھرتی تھی۔ ان کے چہرے کا تاثر بالکل نہیں بدلتا تھا اور نہ ہی وہ منہ سے کوئی تحسینی کلمہ ادا کرتے تھے مگر آپ کو معلوم ہو جاتا تھا کہ شعر کہیں پہنچا، رکا اور گونجا ہے۔

چند برس پہلے ''کالا دھندہ گورے لوگ'' نامی ایک فلم ریلیز ہوئی تھی۔ اس محفل میں اس کے پروڈیوسر کفایت حسین سے بھی ملاقات ہوئی جو پیشے کے اعتبار سے کمرشل آرٹسٹ اور ڈیزائنر ہیں۔ ان سے آئندہ صبح شیکسپیئر کے آبائی گاؤں کی سیر کا پروگرام بنا۔ معلوم ہوا گلوکارہ ناہید نیازی اور اپنے ضیا محی الدین بھی برمنگھم میں ہی پائے جاتے ہیں۔ ضیا سے فون پر بات ہوئی۔ انہوں نے ناشتے کی دعوت دی مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے میزبانِ اول یعنی ڈاکٹر صفی حسن اپنے ''استحقاق'' سے دستبردار ہونے کے موڈ میں نہیں تھے اور ان کی بات میں وزن بھی تھا کہ میزبان کے گھر سے کم از کم ایک وقت تو کچھ کھا پی لیں سو میں نے ضیا سے معذرت کی اور ''یار زندہ صحبت باقی'' قسم کی گفتگو سے کام چلایا کہ بزرگوں نے یہ چیزیں آخر کس مقصد کے لیے اختراع کی تھیں؟

شیکسپیئر کا آبائی گاؤں Strat-Ford-upon-Avon کہلاتا ہے جسے عرف عام میں On-Avon بھی کہتے ہیں مجھے افسوس ہے کہ سکہ بند سفر نامہ نگاروں کی طرح میں عمارتوں اور شہروں وغیرہ کے بارے میں تاریخی معلومات اور اعداد و شمار جمع نہیں کر سکا ورنہ اس موقع پر دو تین صفحے با آسانی کالے ہو سکتے تھے!

غلام قادر آزاد صبح صبح چلے گئے کہ انہیں جا کر بنک کا کام دیکھنا تھا اور ان کی جگہ، کفایت ان کی بیگم اور دو ننھی منی پیاری پیاری بچیاں ہمارے ساتھ شامل ہو گئیں۔ کہرا اور بارش کے درمیان دونوں کاریں آگے پیچھے رواں تھیں۔ ہوا میں نمی اور ٹھنڈک کے ساتھ ایک عجیب سی خاموشی جیسے رینگتے ہوئے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ یہ ایک مخصوص ''انگریز'' ماحول تھا..... سنجیدہ، باوقار، سرد مہر اور برخود غلط۔

اون ایوان ماضی میں جو کچھ بھی رہا ہو اب اس کا تشخص اول تا آخر شیکسپیئر ہے۔ وہ خود تو دل برداشتہ ہو کر بہتر مستقبل اور اظہار کی تلاش میں لندن کی طرف نکل گیا تھا مگر اب دنیا بھر سے سیاح اس کی جنم بھومی دیکھنے آتے ہیں اور یوں وہ علاقہ جو ایک فرد کو معاشی تحفظ نہیں دے سکا تھا اب اُسی شخص کی وجہ سے اس پورے قصبے کی معیشت بہتر ہو گئی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ زندے مردوں کا رزق کھاتے ہیں۔

شیکسپیئر میوزیم سے ملحق اس کا چھوٹا سا گھر ایک قومی اور ثقافتی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے اور اس میں شیکسپیئر کے عہد، اس سے متعلق اشیا، دستاویزات، خبروں اور یادگاروں کو بڑے سلیقے سے جمع کر دیا گیا ہے۔ ان میں ایسی ایسی تفصیلات بھی ہیں جنہیں ہم اپنے مشاہیر کی زندگیوں سے اس لیے نکال یا چھپا دیتے ہیں کہ کسی کو ان کے انسان ہونے کا یقین نہ آ سکے۔ بڑے انسان کو ''انسان'' سمجھ کر اس سے استفادہ کرنے کا یہی گُر ہے جس نے مغرب کو بہت سے میدانوں میں اس قدر آگے پہنچا دیا ہے مگر اس ذکر سے حاصل! ہم لوگ فرشتے اور شیطان کے دو کناروں کے درمیان جھولنے والے وہ آدم زاد ہیں جنہیں ''انسان'' بننے یا کہلوانے سے شرم آتی ہے۔

چار بجے شام اردو مرکز، لندن میں افتخار عارف نے ہمارے ساتھ ایک نشست رکھی تھی جو پروین کے بائیکاٹ کی وجہ سے اب صرف ''میرے'' ساتھ منعقد ہو رہی تھی۔ خیال تھا وطنِ عزیز کی طرح وہاں بھی لوگ آدھ پون گھنٹہ تاخیر سے جمع ہوں گے مگر جب پونے پانچ بجے وہاں پہنچا تو معلوم ہوا تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد افتخار عارف نے لوگوں کی بے چینی اور ہال کی تمام نشستیں پُر دیکھ کر مشاعرہ شروع کروا دیا ہے۔ اوسلو (ناروے) سے اردو ماہنامہ ''کارواں'' کے نوجوان مدیر مجاہد صاحب آئے ہوئے تھے۔ انہیں عارضی طور پر مہمانِ خصوصی بنا دیا گیا تھا اور مشہور ماہرِ قانون، پنجاب ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور قانون کے سابق وفاقی سیکرٹری جسٹس اے کے ایم صمدانی صدارت کر رہے تھے۔ حاضرین میں اتنے بہت سے شناسا چہرے نظر آئے کہ میری معذرت کے کلمات معانقوں اور مصافحوں کے ہجوم میں کہیں کھو گئے۔ ایک نیام میں دو تلواریں بے شک نہ رہتی ہوں مگر ایک مشاعرے میں دو بلکہ بعض اوقات تین چار مہمانِ خصوصی بھی بھگت جاتے ہیں سو سٹیج پر ایک کرسی بڑھا دی گئی اور مشاعرہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے پھر شروع ہو گیا۔ افتخار عارف نے میرے کان میں بتایا کہ یہ مشاعرہ بھی منیر نیازی کے اس مصرعے کی طرح ہے:

''اک واری جد شروع ہو جائے گل فیر ایویں مکدی نئیں!''

مشاعرے میں لندن میں مقیم یا موجود بیشتر اردو شاعر موجود تھے چنانچہ یہ نشست خوب جمی۔ ایک شاعر، جن کا تخلص غالباً شمسی تھا، کسی حادثے میں بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔ چناں چہ جب وہ شعر سنانے کے لیے آئے تو ان کی بیگم بطور پرامپٹر ان کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ میں نے دیکھا انہوں نے شمسی صاحب کی غزل ہندی رسم الخط میں لکھی ہوئی تھی۔ ایک اور نابینا شاعر

شوقین بدایونی صاحب تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو لاہور کے بچھڑے ہوئے دوست جمع ہو گئے۔ شاہد محمود ندیم (جو کبھی ٹی وی میں پرڈیوسر تھا)، ہمراز احسن (سابق صحافی)، بدیع الزماں (ٹی وی کا مشہور اداکار)، رابعہ سنبل (شاہد کی بیگم)، فارغ بخاری (ہمارے بزرگ ترقی پسند دوست اور شاعر) ان کے علاوہ عاشور کاظمی، شاہدہ احمد اور بہت سے دوسرے احباب۔

اگلے دن دوپہر کو یوسفی صاحب نے لنچ پر بلا رکھا تھا۔ یوسفی صاحب سے محبت کا رشتہ تو ان کی تحریروں جتنا پرانا ہے کہ میں انہیں اور شفیق الرحمٰن کو اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار مانتا ہوں لیکن ان سے ملاقات بہت کم رہی ہے جس کی واحد وجہ مکانی فاصلہ ہے کہ جب ان سے تعارف ہوا تو وہ کراچی میں تھے اور جب کچھ تعلقِ خاطر (ان کی طرف سے بھی) پیدا ہوا تو انہیں آغا حسن عابدی اچک کر لندن لے گئے۔ میرے پاس یوسفی صاحب کا دس بارہ برس پہلے کا ایک خط محفوظ ہے جو انہوں نے میرے کسی خط کے جواب میں بزبانِ انگریزی لکھا بلکہ ٹائپ کروایا تھا اور جس میں مجھے خط کی رسید کے ساتھ یہ اطلاع دی گئی تھی کہ وہ بینکنگ کونسل کے صدر کی حیثیت سے دو ہفتے کے لیے ملک سے باہر جا رہے ہیں اور واپس آ کر مجھے تفصیلی جواب لکھیں گے۔ یہ تفصیل پانچ چھ سطروں میں تھی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خط کے اوپر، نیچے اور اردگرد خالی جگہ پر انہوں نے اردو میں کوئی بیس پچیس سطروں کا ایک علاحدہ خط لکھا تھا جس میں بتایا تھا کہ مصروفیت کی وجہ سے انہیں انگریزی میں خط لکھنا پڑا ہے جس کے لیے وہ معذرت خواہ ہیں!

لنچ سے پہلے ان سے بی سی سی آئی کے دفتر میں ملاقات طے تھی۔ ان تک پہنچنے میں بڑے ادب آداب سے گزرنا پڑا۔ بہت سے گوروں اور گوریوں نے ہماری رہنمائی کی، کئی بار نام، کام اور پتا پوچھا، دو تین مختلف کمروں اور لفٹوں میں اٹھایا، بٹھایا اور چڑھایا۔ خدا خدا کر کے کوئی دس منٹ بعد ہم ایک چھوٹے سے ریٹائرنگ روم میں پہنچائے گئے جہاں یوسفی صاحب ہمارے منتظر تھے۔ میں نے ان سے چھوٹتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ ایک مزاح نگار ہونے کے ناطے وہ ایسی تھری پیس اور ٹائی کالر والی زندگی کیسے گزار لیتے ہیں کہ مزاح نگار کا رزق تو بے ترتیبی میں ہوتا ہے۔ انہوں نے میری بات ایک ایسی مسکراہٹ میں لپیٹ دی جو ان سے پہلے میں نے صرف فیض صاحب کے چہرے پر دیکھی تھی اور میں ان کا منہ تکتا رہ گیا۔

یوسفی صاحب، صاحب کمال ہونے کے ساتھ ساتھ انتہا درجے کے ''کمال پرست'' (Perfectionist) بھی واقع ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں لفظوں اور جملوں کو مانجھنے اور ان کی تراش خراش میں مختار مسعود ان کے ہم سر ہوں تو ہوں تیسرا کوئی نہیں ہے۔ بتانے لگے کہ انہوں نے پچھلے دنوں کوئی تیرہ سو صفحات پر مشتمل اپنے مسودے ضائع کیے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک وہ درجۂ کمال کو نہیں پہنچتے تھے۔ میں نے کہا کہ

> ''یہ تو آپ نے بہت ظلم کیا، بلکہ کمایا ہے، اس لیے کہ آپ کا معیار ان ہزاروں، لاکھوں قارئین کے معیار سے بہت اونچا ہے جو آپ کی تحریروں کے بے چینی سے منتظر رہتے ہیں، آپ اپنے ذوق کی بلندی پر ان بے چاروں کو کیوں لٹکا رہے ہیں؟''

میری بات سن کر وہ پھر فیض صاحب بن گئے۔ میں نے ٹی ایس ایلیٹ کی مثال دی کہ وہ کسی ادب پارے کو خیال کی سطح پر رد کرنے کے خلاف تھا اور کہتا تھا جو بات ذہن میں آئے اسے لکھ کر محفوظ کر لینا چاہیے، کچھ وقت گزرنے کے بعد اسے پھر پڑھیں اور اس وقت فیصلہ کریں کہ وہ چیز قابلِ اشاعت ہے یا نہیں؟

یوسفی صاحب اپنی اسی بھلی مانس مسکراہٹ کے درمیان ہولے سے بولے:

''یہی تو میں نے کیا ہے!''

لنچ پر جاتے ہوئے راستے میں میں نے یوسفی صاحب کو بتایا کہ میں نے اس سفر کے دوران میں ڈائری لکھی ہے اور اب میرا ارادہ ان یادداشتوں کو سفرنامے کی صورت میں لکھنے کا ہے۔ بولے:

''ایسا نہ کیجیے گا۔''

میری حیرت اور پریشانی دیکھ کر کہنے لگے:

''مجھے خدانخواستہ آپ کے لکھنے کی اہلیت پر شک نہیں ہے، دراصل مجھے سفرناموں کی کثرت نے حیران اور ان کی سطح، انداز اور داستان طرازی نے پریشان کر دیا ہے۔ میں نے ایسی ایسی بوگس، من گھڑت اور افسانوی باتیں پڑھی ہیں کہ اس صنفِ ادب سے میرا ایمان ہی اُٹھ گیا ہے۔''

میرا جی چاہا کہ میں بھی جواب میں ان کی سی فیض صاحب مار کہ مسکراہٹ پیش کروں مگر کسی نے کہا ہے کہ

''ایں سعادت بزورِ بازو نیست''

تو اب پتا چلا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے ابن انشا، مستنصر حسین تارڑ، عطاالحق قاسمی، محمد خالد اختر، اشفاق احمد، جمیل الدین عالی اور محمد کاظم کی مثالیں دیں کہ دیکھئے ان لوگوں نے کیسے مزیدار سفرنامے لکھے ہیں۔ قرۃ العین حیدر اور شفیق الرحمٰن کے رپورتاژوں کا حوالہ دیا مگر ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہ لا سکا کہنے لگے:

''آپ شاعر، ڈراما نگار، نقاد اور مترجم ہیں اور خیر سے خاصے مشہور بھی ہیں، اگر سفرنامہ نہیں لکھیں گے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟''

میں نے انہیں سفرنامے کے متوقع محاسن سے آگاہ کیا اور بتایا کہ میں ان تمام برائیوں سے احتراز اور گریز کا ارادہ رکھتا ہوں جن کی وجہ سے وہ سفرنامے سے بدظن ہو چکے ہیں۔ اتنے میں ہوٹل آ گیا اور بات درمیان میں رہ گئی۔

اگلے دن صبح آکسفورڈ سٹریٹ میں واقع مکرم کا دفتر دیکھا۔ صمدانی صاحب بھی اسی دفتر کے ساتھ وابستہ تھے اور اس دن کے لیے انہوں نے ہمیں لندن دکھانے اور گھمانے کی پیش کش کر رکھی تھی۔ افتخار نے پیپرمنٹ والی چائے بنائی جسے اجتماعی طور پر رد کر دیا گیا۔ وہ دوبارہ چائے بنانے لگ گیا۔ اس دوران میں اقبال ساہی نے لندن میں اپنے تعلقاتِ عامہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے واپسی کے ایئرفرانس کے بڑے مشکل ٹکٹ کو پی آئی اے کی فلائٹ پر اس قدر آسانی سے منتقل کرایا کہ جملہ حاضرین عش عش کر اٹھے۔

صمدانی صاحب کے ساتھ جب ہم ''لندن کا ایک دن'' ٹائپ مشن پر نکلے تو طے پایا کہ لندن کو اس طرح سے دیکھا جائے جو سیاحوں کا وطیرہ ہے یعنی پیدل چل کر یا سب وے میں بیٹھ کر۔ لندن کی سب وے، ٹیوب ٹرین یا زیرِ زمین ریل ٹیکنالوجی کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ چاروں طرف سمندر سے گھرے ہوئے اس جزیرے میں، جہاں اوپر سے بھی سارا سال پانی پڑتا رہتا ہے، سطحِ زمین سے ڈیڑھ دو سو فٹ گہرائی میں، لندن کی سڑکوں کے نیچے ایک عجیب و غریب نظام جاری و ساری ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بغیر تیز رفتار ٹرینیں آتی ہیں، مسافروں کو اٹھاتی اور اتارتی ہیں اور پھر اگلے سٹیشن کی طرف چل سو

چل۔ ارضیات کے بارے میں ہمارے علم کی ابتدا سیالکوٹ میں ننھیال کے گھر کے دروازے پر واقع کنواں تھا جس کی گہرائی کوئی چالیس پچاس فٹ تھی اور انتہا بھی کم وبیش یہی تھی کہ زمین کے نیچے تقریباً اسی فاصلے پر پانی کی ایک سطح ہوتی ہے جہاں تک سوراخ کر کے پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات یہ سطح اس قدر بلند ہوتی ہے کہ پانی سیم وغیرہ کی شکل میں اوپر تک آ جاتا ہے مگر یہاں یار لوگوں نے سطح زمین سے دو سو فٹ نیچے تک گاڑیاں چلا رکھی ہیں اور پانی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

خیر یہ تو اس طرح کی خبر ہے جس میں سے خبر کا عنصر غائب ہوئے مدتیں بیت چکی ہیں سو ہم اس قصے کو یہیں چھوڑتے ہوئے صدانی صاحب کے ساتھ چلتے ہیں۔ ہمارا پہلا پڑاؤ پاکستانی سفارت خانہ تھا جہاں کچھ دیر کمرشل اتاشی اور پروین کے افسر جہانگیر خاں صاحب سے گپ شپ ہوئی۔ اس کے بعد فرسٹ سیکرٹری منصور عالم صاحب کے پاس کچھ دیر بیٹھے۔ انہوں نے فون پر علی ارشد صاحب سفیرِ پاکستان کو ہمارے آنے کی اطلاع دی۔ انہوں نے فوراً اپنے کمرے میں بلوا لیا اور کافی پلوائی۔ انگلستان میں مقیم پاکستانیوں کے مسائل اور شکایات کے تذکرے سے گفتگو کا رخ دیارِ غیر میں قومی تشخص کی تعمیر اور بقا کی طرف مڑ گیا اور بات پاکستان ٹیلی ویژن تک پہنچ گئی کہ وہ لوگ اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ کوئی مدد نہیں کرتے بلکہ بی بی سی یا آئی ٹی وی پر دکھانے کے لیے پروگراموں کے اتنے زیادہ پیسے مانگتے ہیں کہ کوئی اس بھاری پتھر کو اٹھانے کے لیے آگے نہیں بڑھتا۔ ٹی وی سے میرے تعلق کی وجہ سے شاید وہ مجھے بھی ٹی وی کا آدمی سمجھ رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے انہیں بتایا کہ ٹی وی بہت انصاف پسند ہے، جس آنکھ سے انہیں دیکھتا ہے اسی سے مجھے بھی دیکھتا ہے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ٹی وی کسی دوسرے نیٹ ورک یا ویڈیو کمپنی کو ہمارے ڈرامے بیچنے پر اوریجنل فیس کا دس فیصد ادا کر کے ہم سے دائمی حقوق حاصل کر لیتا ہے تو ان کے ہاتھ سے کافی کی پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ میں نے ان کے پیالی کے میز پر رکھنے کا انتظار کرنے کے بعد بتایا کہ یہ رائلٹی عام طور پر ایک سو روپے سے بھی کم ہوتی ہے!!!

علی ارشد اور منصور عالم چند لمحے ہکے بکے میری طرف دیکھتے رہے۔ پروین نے انہیں بتایا کہ

''پندرہ بیس برس کی ریاضت اور محنت کے بعد جب کوئی شاعر ٹی وی کے آل پاکستان مشاعرے میں پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اسے اس کارنامے پر مبلغ تین سو روپے پیش کیے جاتے ہیں نصف جن کے ایک سو پچاس سے بھی کم ہوتے ہیں، کیونکہ ٹی وی والے محکمہ انکم ٹیکس کی ہدایت پر ہر چیک سے کچھ فیصدی وضع کر لیتے ہیں۔''

میں نے کہا:

''نظیر اکبر آبادی نے کیا اچھا شعر کہا ہے:

حکمِ حاکم ہے کہ اس محکمۂ عدل کے بیچ
دستِ فریاد کو اونچا نہ کرے فریادی''

پروین بولی:

''آپ کو شاید علم نہ ہو ایک بار کراچی ٹی وی پر نظیر اکبر آبادی کے نام کا چیک کئی مہینے اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ میں پڑا رہا تھا اور ایک بہت سینئر افسر نے اس پر جواب طلبی بھی کی تھی کہ ٹیلنٹ کو اس کا چیک کیوں نہیں

پہنچایا گیا؟''

علی ارشد اور منصور عالم کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے انہیں ایک اور واقعہ سنایا۔

''غالب کی صد سالہ برسی کے دنوں میں پاکستان نیشنل سنٹر کے صدر دفتر سے تمام نیشنل سنٹروں کو ہدایت دی گئی کہ دیگر تقریبات کے ساتھ ساتھ غالب کی زمینوں میں ایک عدد مشاعرے کا بھی اہتمام کریں۔ اس پر ایک ریذیڈنٹ ڈائریکٹر نے جواب لکھا تھا کہ جناب میں نے شاعر تو سارے بک کر لیے ہیں مگر بتایا جائے کہ غالب کی وہ زمینیں کہاں ہیں جن پر مشاعرہ کروانا ہے کیونکہ مجھے تلاش کے باوجود ان کا سراغ نہیں مل رہا۔''

علی ارشد نے ہنستے ہوئے کہا:

''چلیئے اسی بات پر اب یہ بتایئے کہ آپ لوگوں کے اعزاز میں ہم کس دن مشاعرہ کریں؟''

طے پایا کہ ۳۱ دسمبر کی شام موزوں رہے گی تاکہ ہم لوگ لندن میں سال کی آخری رات کی تقریب بھی دیکھ سکیں۔ وہاں سے نکل کر پھر سب وے میں سوار ہوئے اور مادام تساؤ کے موم گھر کے قریبی سٹیشن پر اترے۔ سب وے میں اور سٹیشن پر بہت رش تھا اس لیے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پروین کے بڑے بیگ میں سے اس کا چھوٹا پرس کب اور کہاں گر گیا یا نکالا گیا۔ پرس میں ۱۵۰ ڈالر اور اس کے محکمے کا شناختی کارڈ بھی تھا۔ کچھ دیر نقصان پر افسوس اور پھر اس حُسنِ اتفاق پر شکر ادا کیا گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک ٹکٹ اور پاسپورٹ بھی اسی پرس میں تھے، اگر اقبال ساہی نے وہ لے لیے ہوتے تو اس وقت بہت لمبی مصیبت پڑ جاتی۔ پنجابی میں ایک محاورہ ہے آدمی موت کو دیکھ کر بخار پر راضی ہو جاتا ہے..... غالباً یہ ایسے ہی موقعوں کے لیے وضع کیا گیا ہے!!

مادام تساؤ کے اس موی گھر کا معاملہ کچھ کچھ لاہور کے شاہی قلعے جیسا ہے یعنی ہر آنے والے کے لیے اسے دیکھے بغیر جانا معیوب سی حرکت سمجھی جاتی ہے اور سچ پوچھئے تو یہ تاثر کچھ اتنا غلط بھی نہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب موی مجسمے ہیں، نظر بار بار دھوکا کھا جاتی ہے۔ گئے ہوؤں کے ساتھ ساتھ یہاں کچھ ایسے لوگوں کے مجسمے بھی ہیں جو اپنے اپنے میدان میں تاریخ ساز تو ہیں مگر ابھی خود تاریخ کا حصہ نہیں بنے یعنی ہمارے آپ کے درمیان سانس لے رہے ہیں۔ ان میں کرکٹ کا انگریز کھلاڑی جیف بائیکاٹ، فٹ بال کا برازیلین ہیرو پیلے اور امریکن ٹینس سٹار جان میکنرو بھی شامل ہیں۔ وقت بھی کیسا ظالم ہے کہ آج یہی میکنرو، جو ابھی تیس برس کا بھی نہیں ہوا، اپنی بہارِ جانفزا دکھا چکنے کے بعد اب ٹینس کے بڑے مقابلوں میں چھوٹے چھوٹے کھلاڑیوں سے شکست کھاتا نظر آتا ہے۔ یہاں ہم نے ایک انتہائی بدمزہ سینڈوچ کھایا اور اس خیال سے مسرت حاصل کی کہ ہم یہاں مستقل قیام کے لیے نہیں آئے۔

پروین نے برانٹے سسٹرز کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر بنوائی اور ان کی تحریروں کی تعریف میں انگریزی لٹریچر کی ایک اچھی طالبہ ہونے کے حوالے سے خاصا علمی قسم کا لیکچر جھاڑا۔ میں نے کہا:

''مجھے تو یہ جگہ محمد حسین آزاد کے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار کی سی لگ رہی ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ سفید فاموں کا نسلی غرور یہاں بھی انصاف پر حاوی نظر آ رہا ہے۔ تیسری دنیا کے بہت

سے مشاہیر یہاں موجود شخصیات سے بڑے ہیں لیکن انہیں یہاں جگہ نہیں دی گئی۔''

صمدانی صاحب اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کے نیچے دھیرے سے مسکرائے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے:

''بات یہ ہے امجد صاحب کہ غریب قوموں کا بڑا آدمی بھی امیر قوموں کے بڑے آدمی سے ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔ یہاں بھی وہی some are more equal والا معاملہ چلتا ہے۔''

میں نے کہا:

''چھوڑیے اسے، آیئے برٹش میوزیم چلتے ہیں، سنا ہے وہاں اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں دیکھ کر اقبال چلا اٹھے تھے:

''جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا!''

برٹش میوزیم پہنچتے پہنچتے چار بج گئے۔ معلوم ہوا پونے پانچ بجے دروازے بند اور کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ پورے سفر کے دوران یہ واحد مقام تھا جہاں داخلے کے لیے ٹکٹ نہیں خریدنا پڑا۔ صمدانی صاحب کے تجربے سے فائدہ اٹھایا گیا۔ معلوم ہوا پہلی منزل پر اسلامی دنیا کے نوادرات اور دوسری منزل پر آرٹ کے نمونے ہیں جن کے جاپانی، چینی اور مصری حصے خاصے کی چیزیں ہیں۔ ہم نے جلدی جلدی دو تین بڑے ہالوں کا چکر لگایا، پٹیوں میں لپٹی ہوئی مصریوں کی ممیاں دیکھیں جن کے قد غیر معمولی طور پر چھوٹے تھے۔ شاید چالیس پچاس صدیوں کے فاصلے نے ان کی یہ حالت کر دی ہے۔

پروین نے کہا:

''ان کی تو یہ حالت پانچ ہزار سال میں ہوئی ہے، یہاں تو لوگ اپنی زندگیوں میں ہی دیو سے بونے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔''

اسی کمرے میں دو ہزار سال قبل مسیح کے سنگِ مرمر اور دوسرے پتھروں کے خوبصورت تراشے ہوئے برتن الماریوں میں رکھے تھے۔ بعض میں تو اس قدر نفاست تھی کہ شفیق الرحمٰن کا مضمون ''نیکسلا سے پہلے اور نیکسلا کے بعد'' یاد آ گیا۔ جی چاہا ان الماریوں کو کھول کر ان برتنوں کے نیچے مہریں چیک کی جائیں کہیں یہ بھی تو میڈ ان جاپان، کوریا یا تائیوان تو نہیں ہیں!

ابھی میں اسی سوچ میں گم تھا کہ نظیر اکبر آبادی کا ایک زندہ جاوید مصرعہ میوزیم کے در و بام پر لہرانے لگا:

''اب کوچ نقارہ باج چلا، چلنے کی فکر کرو بابا!''

لندن کی سردی کینیڈا کے برف زاروں سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اوپر سے اس روز تھکن بھی اس کے ساتھ ساتھ ہڈیوں میں گھر بناتی جا رہی تھی۔ ہم نے صمدانی صاحب کی طرف دیکھا جو یقیناً ہم سے زیادہ تھکے ہوئے تھے مگر ان کے چہرے پر مسکراہٹ اس قدر تر و تازہ تھی جیسے ابھی ابھی گھر سے طلوع ہوئے ہوں۔

اگلے روز ان کے گھر ناشتے کی دعوت تھی جو وقت اور کھانے کی نوعیت کے اعتبار سے کسی صورت لنچ سے کم نہیں تھی۔ بیگم صمدانی نے بیوٹی کورس کر رکھے تھے چنانچہ انہوں نے پروین پر اپنے کمال فن کو آزما کر دکھایا۔ پروین کا چہرہ کسی ایسی لڑکی جیسا ہو گیا جس نے ابھی ابھی میٹرک کے امتحان میں اپنی کامیابی کی خبر سنی ہو۔

دوپہر کو شاہدہ احمد کے گھر کھانے کی دعوت تھی۔ ہم سے ان کا پتا اور فون نمبر کھو گئے چنانچہ ہم ان کے گھر اس وقت پہنچے

جب سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ وہاں دیگر احباب کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی اور عاشور کاظمی صاحب سے ایک بار پھر ملاقات ہوئی اور خوب گپ شپ رہی۔ ہماری میزبان شاہدہ احمد بہت سی اچھی اور خوش اخلاق خاتون ہیں اور ہمیں یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ وہ ٹانگوں کے کسی انتہائی موذی مرض میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے ان کے پٹھے سوکھتے جا رہے ہیں اور خدشہ ہے کہ آئندہ دو تین برسوں میں وہ ٹانگوں کی حد تک بالکل معذور ہو جائیں گی۔ دھیان ایک بار پھر ان سوالوں کی طرف گیا جنہیں زبان پر لانے کا فوری نتیجہ دائرہ اسلام سے خروج کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

رات کا کھانا افتخار عارف کے گھر پر تھا جہاں شہرت بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی جو اسلامیہ کالج کے میرے استاد اور ہمارے سینئر شاعر ہیں۔ بہت دل زدہ اور غمگین تھے کہ اس عمر میں انہیں جلاوطنی کا دکھ سہنا پڑ رہا ہے مگر مجبوری یہ تھی کہ ان کی بیگم فرخندہ بخاری سیاسی وجوہات کی بنا پر پاکستان میں نہیں رہ سکتی تھیں۔ بی بی سی اردو سروس کے رضا علی عابدی ملے۔ انہوں نے بتایا کہ اردو سروس کے انچارج ڈیوڈ پیج کو ہمارے آنے کی اطلاع ہو گئی ہے اور کل صبح ہمیں انٹرویوز کے لیے تکلیف کرنا ہو گی۔

بی بی سی کے ''بش ہاؤس'' کی اردو سروس کا ماحول بھی کم و بیش وی او اے اور اپنے ریڈیو پاکستان جیسا تھا۔ وہاں راولپنڈی کے نوجوان شاعر شاہد ملک سے ملاقات ہوئی جو تازہ تازہ وہاں آیا تھا۔ انٹرویوز مجیب صدیقی نے کیے جو سراسر سرسری نوعیت کے تھے۔

پاکستانی سفارتخانے میں مشاعرے کی محفل خاصی دلچسپ تھی۔ سامعین میں خواجہ شاہد حسین بھی نظر آئے۔ نشست فرشی تھی اور سننے والے شوقین، خوب لطف رہا۔ سامعین میں چوڑی دار پاجامے سے لے کر ولایتی پائپ تک ہر طرح کے لوگ موجود تھے اس لیے واہ واہ سبحان اللہ کے ساتھ ساتھ ویل سیڈ اور ویری گڈ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

۳ جنوری کی صبح لندن میں ہمارے قیام کی آخری صبح تھی۔ ایک مہینہ بائیس دن بعد ہمارا رخ واپس اپنے وطن کی طرف ہو رہا تھا۔ لندن کی کہر، سردی اور سفر کی تھکن کے اس پار مجھے لاہور کی چمکتی صبحیں اور جنوری کا خوب صورت موسم دکھائی دے رہا تھا اور اس پر سپر امپوز ہوتے ہوئے میرے اپنوں اور پیاروں کے چہرے۔

صابر چوہدری کے گھر کی کھڑکی سے میں نے بارش میں بھیگتے ہوئے لندن کو دیکھا۔ زمان و مکان کے مختلف تصورات میرے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔ ایک نظم کی لائنیں جیسے کھڑکی کے شیشے پر اپنے آپ رقم ہونے لگیں۔ ایک ایسی نظم کی لائنیں جسے بہت دن بعد کسی اور شہر، کسی اور موسم میں مکمل ہونا تھا۔

دن رات کے آنے جانے میں
دُنیا کے عجائب خانے میں

کبھی شیشے دھندلے ہوتے ہیں، کبھی منظر صاف نہیں ہوتے۔

یہ دھندلے شیشے اور یہی نیم روشن اور ناصاف منظر..... زندگی کے سکّے کے دونوں طرف شاید یہی کچھ ہے..... یا ..... کچھ اور ہے۔

ہانگ چُو

ہانگ چُو جانے کے لیے جب ہم ایئرپورٹ پہنچے تو معلوم ہوا کہ فلائٹ پورے دو گھنٹے لیٹ ہے اور اگرچہ اس تاخیر کا باضابطہ اعلان گزشتہ روز ہی کیا جا چکا تھا لیکن چھن اپنی طبیعت کی خرابی کے باعث اسے چیک نہ کر سکا تھا سو اس نے تھانگ کی وساطت سے صدرِ وفد اجمل خٹک سے معذرت کی خٹک صاحب بڑے ملنگ فطرت آدمی ہیں، انہوں نے جواباً ایک فارسی شعر پڑھا جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ دوستوں میں معذرت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تھانگ کے چہرے پر عدم فہمی کا ایک سایہ سا لہرا گیا اس نے پریشان سی نظروں کے ساتھ چاروں طرف دیکھا اور پھر پتا نہیں چینی میں چھن سے کیا کہا کہ اس کا بخار سے سرخ چہرہ اور بھی تمتما اُٹھا۔

غالب کا ایک بہت مشہور شعر ہے جس میں غضب کی ڈرامائی کیفیت ہے:

میں نے کہا کہ بزمِ ناز ''چاہیے غیر سے تہی''
سُن کر ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ ''یُوں''

مشہور مزاح گو شاعر اور ہمارے پیارے دوست انور مسعود نے اس شعر کی بڑی خوبصورت پیروڈی کی ہے اور اس کے مکالمے کے انداز کو عجیب چابکدستی سے استعمال کیا ہے:

میں نے کہا کہ ''بزمِ ناز'' اُس نے کہا کہ ''کیا کہا؟''
میں نے کہا کہ ''کچھ نہیں'' اُس نے کہا کہ ''ٹھیک ہے''

اب اگر آپ ''بزمِ ناز'' کی ادائیگی میں ''لجاجت'' ''کیا کہا'' میں ''غصہ''، ''کچھ نہیں'' میں ''خوف'' اور ''ٹھیک ہے'' میں ''بے نیازی'' ڈال کر پڑھیں تو کچھ اور ہی لطف آئے گا۔

بروہی کے ''بیوٹی فُل'' اور نیازی کے ''بالکل ٹھیک ہے'' کے درمیان سب لوگ کچھ ایسے زور سے ہنسے کہ ایئرپورٹ ہال کے دُور دراز کونوں سے لوگ ہمیں دیکھنے کے لیے آنے لگے۔

ہانگ چو، کی فلائٹ نمبر 5146 کی روانگی میں ابھی کل ملا کر تقریباً تین گھنٹے رہتے تھے لیکن مجلس کا رنگ کچھ ایسا تھا کہ

وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا ہنسی مذاق کی بات چلتی تو ایسے لگتا جیسے کھلنڈرے لڑکوں کا کوئی قافلہ پکنک پر آیا ہوا ہے اور کوئی سنجیدہ مسئلہ رستے میں آ جاتا تو ایک دم منظر سلامتی کونسل کے اجلاس میں بدل جاتا۔ ڈیپارچر لاؤنج میں ایک طرف چائے کا سٹال لگا تھا جہاں سے پاکستانی کرنسی کے مطابق 15 پیسے میں گرما گرم چائے کا کپ دستیاب تھا۔ چینی لوگ چائے میں چینی استعمال نہیں کرتے سو یہاں بھی چائے بالکل ''خالص'' تھی۔ بروہی صاحب نے کینڈرل کی ڈبیا کچھ اس انداز سے میز کے وسط میں سجا کر رکھ دی جیسے کہہ رہے ہوں کہ۔۔۔" صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لے۔" کینڈرل دیکھ کر مجھے اپنا عزیز دوست شمیم اختر سیفی بہت یاد آیا کیونکہ وہ بھی ہر وقت اس طرح کی ڈبیا جیب میں رکھتا ہے یہ اور بات ہے کہ کھانے کے ساتھ جب تک سویٹ ڈش میں بے نظیر قلفہ، گوالمنڈی کی کھیر، یا موچی دروازے کی برفی اور پیٹھے کا حلوہ نہ ہو اس کا کھانا مکمل نہیں ہوتا۔

ہوائی جہاز بہت خوبصورت اور جدید ڈیزائن کا تھا۔ اس کے پَر جہاز کی باڈی کے اگلے کے بجائے پچھلے حصے میں لگائے گئے تھے اور مال بردار جہازوں C130 وغیرہ کی طرح اس کا ایک دروازہ بالکل عقب میں بھی واقع تھا جہاں سے مسافر داخل ہو رہے تھے۔ جہاز کے اندر ایک طرح کی پکنک کا سماں تھا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ محدود آمدنی کے باعث عام چینی لوگ جہاز کا سفر افورڈ نہیں کر سکتے اور اگر وہ رقم جوڑ کر ایسی عیاشی کر ہی لیں تو یہ ان کے لیے ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہوتا ہے جس سے وہ مکمل طور پر لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ بقیہ لوگوں میں سے ٹورسٹ وغیرہ نکال کر جو لوگ بچتے تھے ان کا تعلق اس خوش حال طبقے سے تھا جو تعداد میں بہت کم ہے لیکن محدود سطح پر کاروبار اور نجی جائیداد رکھ سکنے کی اجازت کے بعد سے آہستہ آہستہ منظرِ عام پر آ رہا ہے لوگ ناچ گا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ہنس کھیل رہے تھے اور دھڑا دھڑ تصویریں اتار رہے تھے جہاز کا سٹاف بھی غیر معمولی طور پر خوش شکل اور خوش مزاج تھا۔ اتفاق سے منیر نیازی کو جو سیٹ ملی اس کے دائیں بائیں دونوں طرف خواتین تھیں جو اگرچہ تقریباً نوجوان تھیں مگر انہیں دیکھ کر یہ بات مشکوک ہو جاتی تھی کہ جوانی عمر کا وہ حصہ ہے جس میں بدصورتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن منیر صاحب اپنی صحبت سے خاصے خوش اور مطمئن نظر آتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ والی کو جو نسبتاً بہتر تھی انگریزی اور اشاروں کی مخلوط زبان میں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں جس پر وہ زور زور سے سر ہلا تو رہی ہے مگر صاف پتا چل رہا ہے کہ اس کی سمجھ میں سرے سے کچھ نہیں آ رہا۔ تھوڑی دیر بعد پہلی سیٹ سے عزیز بگٹی نے ایک کاغذ مجھے دیا جس پر کچھ شعر درج تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ پچھلی صف والوں کی مشترکہ کاوش ہے۔ موضوع منیر صاحب کو درپیش صورتِ حال تھی۔ قافیے چہار زبانی تھے یعنی انگریزی، اُردو، پشتو اور پنجابی چاروں زبانوں کو حسبِ ضرورت استعمال کیا گیا تھا اور اس کی تشکیل میں زیادہ حصہ عزیز بگٹی اور اجمل خٹک نے لیا تھا یعنی وفد کے ہیڈ اور ٹیل (Head & Tale) دونوں اس میں شامل تھے۔ نظم دست بدست چلتی ہوئی ہر ممبر تک پہنچی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاز اترنے تک منیر صاحب سب کی توجہ کا مرکز رہے جبکہ خود ان کی توجہ کہیں اور تھی۔

زندگی میں پہلی بار یہ منظر دیکھا کہ نیازی صاحب کسی دوسرے کا سامان اٹھانے کے سلسلے میں اس کی مدد کر رہے ہیں متعلقہ لڑکی کے پاس کم و بیش اس کے اپنے وزن کا بیگ تھا جسے نیازی صاحب نے بڑی توجہ اور کوشش سے اس پر لادا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اسے سنبھال پاتی اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا وہ سامان سمیت لڑکھڑائی اور پھر کسی کی طرف دیکھے بغیر باہر کی طرف چل پڑی بعد میں خاصی دیر تک منیر نیازی اس کی سخن فہمی کی تعریف کرتے رہے اور بتایا کہ وہ ہانگ کانگ سے آئی تھی۔

استقبالیہ کمیٹی تین افراد پر مشتمل تھی۔منگول نقوش والا نوجوان ادیب جو دو برس پہلے چینی ادیبوں کے وفد کے ساتھ پاکستان آیا تھا اور دو خواتین جو ادیبوں کی مقامی انجمن کی عہدیدار تھیں۔نوجوان کا نام منیر نیازی نے چنگیز خاں جونیئر تجویز کیا جسے فوراً ہی قبولیتِ عام کی سند مل گئی۔مصافحوں اور معانقوں کے بعد وہ لوگ ہمیں ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر ایک کھلی جگہ پر لے آئے جہاں حسبِ معمول ایک کوسٹر ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔معلوم ہوا کہ سامان سامنے والی عمارت سے ملے گا مختلف ہوائی اڈوں پر سامان کے حصول کے لیے خاصے طویل فاصلے طے کرنے کا اتفاق تو ہوا تھا مگر یہ پہلا موقع تھا کہ سامان اور مسافر دو الگ الگ عمارتوں میں اتارے گئے۔درد کا کیا اچھا شعر ہے:

مے خانۂ عالم ہے وہ بے ربط کہ جس میں
ہووے جو صراحی کہیں تو جام کہیں ہو!

سامان آنے پر چنگیز خان جونیئر کی مستعدی تو سمجھ میں آتی تھی کہ ایک تندرست جوان ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارا میزبان بھی تھا لیکن حیرت اور پریشانی اس وقت ہوئی جب دونوں خواتین بھی سامان اٹھانے میں جت گئیں اور ہمارے بے حد اصرار کے باوجود ان لوگوں نے ہمیں سامان کو ہاتھ نہیں لگانے دیا اور ایسی پھرتی سے بھاری بھاری بکسے کوسٹر میں اٹھا اٹھا کے رکھے کہ ہم دیکھتے ہی رہ گئے،چینی عورتیں حسین ضرور ہیں لیکن انہیں صنفِ نازک کہنا ان کی توہین ہوگی۔

ہانگ چو ایئرپورٹ کی ایک اور غیر معمولی بات یہ دیکھنے میں آئی کہ ہوائی اڈے کی عمارت سے نکلتے ہی شہر کی آبادی شروع ہو جاتی ہے جگہ جگہ ٹولیوں کی صورت میں باتیں کرتے ہوئے لوگ، کچھ کچھ کھلی دکانیں اور ڈھیر سارے تربوز جو جگہ جگہ ریڑھیوں پر یا زمین پر ڈھیریوں کی شکل میں پڑے تھے۔تھانگ نے بتایا کہ چین میں آپ جہاں بھی جائیں گے تربوز کو سائے کی طرح ساتھ پائیں گے اس پر ایک پرانا لطیفہ یاد آ گیا:

''ایک آدمی کو نہاتے ہوئے نہر میں ایک تربوز مل گیا تربوز کو کاٹا تو اندر سے ایک جن نکل آیا اور گویا ہوا کہ آپ نے مجھے اس قید سے رہائی دلوائی ہے آج سے آپ میرے آقا اور میں آپ کا غلام۔حکم کیجیے غلام کیا پیش کرے!

آقا نے خوش ہو کر کہا اگر ایسا ہے تو مجھے اسلام آباد میں ایک پلاٹ لے دو۔

جن نے ہاتھ باندھ کر کہا یہ ممکن نہیں کوئی اور حکم کریں۔

آقا نے کہا اور کیا حکم کروں،تم کیسے جن ہو جو ایک پلاٹ نہیں لے کر دے سکتے۔جن نے کہا آپ خود ہی سوچیں میرے آقا اگر میں آپ کو پلاٹ مہیا کر سکتا تو خود اس تربوز میں کیوں رہتا۔''

بروہی صاحب جو میرے برابر والی سیٹ پر تقریباً غنودگی کے عالم میں تھے،بڑبڑائے۔"بڑی بیوٹی فل بات ہے۔"

ہوٹل WANG HU خاصا بڑا ہوٹل تھا لیکن پورے شہر کی طرح اس کے ماحول میں بھی ایک قصباتی حسن تھا ایک اپنائیت کا سا احساس تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا آسان نہیں۔ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر ایک بہت بڑی جھیل تھی۔چاروں طرف درختوں اور سبزے کی افراط تھی اور شام رات سے گلے مل رہی تھی۔

حسن اکیلے کمرے میں سونے سے بہت گھبراتا ہے چنانچہ اس کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ یا تو وہ کسی ہم سفر کو اپنے کمرے میں سونے پر آمادہ کرے یا خود اس کے کمرے میں سو جائے۔سو یہاں بھی یہی ہوا،رات دیر تک ہم باتیں کرتے اور ٹی

وی دیکھتے رہے کوئی گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے کمرے میں گیا مگر پندرہ بیس منٹ بعد پھر آ گیا کہ اسے اکیلے کمرے سے وحشت ہو رہی ہے اس لیے وہ رات یہیں سوئے گا۔ ایک بار پھر مجھے خیال آیا کہ قدرت نے مختلف انسانوں کی طبائع میں کیسے کیسے انوکھے گوشے رکھ چھوڑے ہیں کہ کوئی تنہائی سے گھبراتا ہے اور کوئی ہجوم سے، کسی کو بلندی سے وحشت ہوتی ہے اور کسی کو پستی سے، کوئی بند جگہ سے گھبرا جاتا ہے اور کسی کو پھولوں کے موسم سے الرجی ہو جاتی ہے:

ہے ہر اک شخص یہاں ایک ورق ناخواندہ

میرا اپنا یہ مسئلہ ہے کہ شدید ترین تھکن اور جگراتے کے باوجود مجھے کچھ پڑھے بغیر نیند نہیں آتی چاہے یہ ''پڑھائی'' چند سطروں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو، سو میں نے سرہانے پڑی کرسٹینا لیمب کی کتاب اٹھالی اور یونہی ایک صفحہ کھول لیا جس پہلے جملے پر نظر پڑی وہ کچھ یوں تھا:

''اگر جناح کو معلوم ہوتا کہ پاکستان کیسا ہوگا تو شاید وہ اس کے لیے جدوجہد ہی نہ کرتے۔''

انتشار زدہ قوموں کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ انہیں اپنے آپ کو ایذا دینے میں لطف آنے لگتا ہے گزشتہ چند برسوں میں ہمارے یہاں جو سیاسی کتابیں مقبول ہوئی ہیں ان کے موضوعات پر ایک نظر ڈالیے تو پتا چلے گا کہ ایک دو کو چھوڑ کر سب کی سب تصویر کا تاریک رُخ دکھاتی ہیں جو سیاسی طالع آزما مشہور ہونا چاہتا ہے وہ یا تو پاکستان کی بنیاد پر حملہ کرتا ہے یا مستقبل میں اس کے (خدانخواستہ) خاتمے کی اطلاع دیتا نظر آتا ہے۔ ہمارے سیاستدان ہوں یا سیاسی تبصرہ نگار یہ انہی نوالوں کو اگلتے رہتے ہیں جو مغربی ذرائع ابلاغ نے گھی اور شکر میں تل کر انہیں کھلائے ہوتے ہیں حد یہ ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے واقعات کی تصدیق کے لیے بھی بی بی سی، وی او اے، نیوز ویک اور ٹائم کی طرف دیکھتے رہتے ہیں، عدم اعتماد کی یہ فضا پاکستان سمیت تیسری دنیا کے سارے ممالک میں پھیلائی جا رہی ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اندرونی سسٹم کی مدافعت بڑھنے کی بجائے روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے جس کی ایک مثال یہی کتاب ''خدا کا انتظار'' ہے جس کا بیشتر مواد من گھڑت، ضعیف، متعصب اور افترا پر مشتمل ہے لیکن ہمارے دانشور اس کا اس طرح سے ذکر کرتے ہیں جیسے یہ کوئی بہت اہم اور مستند دستاویز ہو۔ مصنفہ کے لہجے میں طنز اور استہزا کی ایک ایسی کیفیت ہے جس کا اسے قطعاً کوئی حق نہیں پہنچتا بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو سے اس کے بہت قریبی تعلقات ہیں اور وہ ان کی بہت طرفدار ہیں لیکن غور سے پڑھیے تو بین السطور میں ان سے بھی وہی سلوک روا رکھا گیا ہے جس کا نشانہ مرحوم ضیاء الحق بنے ہیں۔

میں کشادہ قلبی اور وسیع النظر فی کا بہت قائل ہوں لیکن یہ دونوں باتیں غیر مشروط نہیں ہیں۔ تنقید اور اختلاف رائے کو سننا اور برداشت کرنا اور بات ہے لیکن جھوٹ اور منفی پراپیگنڈے کی پذیرائی ایک بالکل دوسری بات ہے اگر ہمیں بطور ایک زندہ قوم کے آگے بڑھنا ہے تو ان سب باتوں کو دھیان میں رکھ کر آگے چلنا ہوگا۔

حسن گہری نیند سو رہا تھا لیکن میری نیند اس کتاب نے خراب کر دی تھی۔ میں نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور ٹی وی آن کر دیا تو کیو گیمز کی سومیٹر کی دوڑ کی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ کارل لیوس پھر پہلے نمبر پر تھا اور پہلی تینوں پوزیشنیں بھی امریکنوں نے جیتی تھیں۔ میرا دھیان پھر وطن عزیز کی طرف پلٹ گیا قدرت نے ہماری زمین اور لوگوں کو کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا ہے لیکن ہم ہیں کہ ایک جرمِ ضعیفی کی سزا میں مسلسل مرگِ مفاجات کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں کیوں ہم لوگ مل کر اس ''نم'' کو تلاش

اور تخلیق نہیں کرتے جو اس مٹی کی زرخیزی کو ہمارے چاروں طرف پھیلا دے گا۔ آخر کیوں؟

فون کی گھنٹی بجی میں نے گھڑی دیکھی سوا بارہ ہو رہے تھے، پریشان سا ہو کر فون اٹھایا دوسری طرف سے منیر نیازی کی آواز آئی:

''میرے کمرے میں پانی نہیں آ رہا اور میرے بستر میں چیونٹیاں ہیں۔''

میں نے کہا، "میرے کمرے میں اُلٹ چکر ہے پانی بے حساب آ رہا ہے لیکن باتھ رُوم کے ٹب کا سٹاپر کام نہیں کرتا اور چیونٹیوں کی جگہ حسن رضوی لیٹا ہوا ہے۔''

دوسری طرف سے منیر صاحب کا ایک ایسا بے ساختہ اور خوشدلی سے بھرا ہوا قہقہہ سنائی دیا جو اس سفر کے دوران اپنی نوعیت کا پہلا قہقہہ تھا اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ اس کے بعد سے دورے کے اختتام تک اُن کا موڈ بتدریج بہتر ہوتا چلا گیا جس کے خوشگوار اثر کے باعث وہ ہلکا سا کھنچاؤ ختم ہو گیا جو اب تک ماحول پر طاری تھا اور ہمارا وفد صحیح معنوں میں بے تکلف اور مخلص دوستوں کا ایک خوبصورت مجموعہ بن گیا۔

غالب کا ایک قصیدہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے:

صبحدم دروازۂ خاور کھلا
مہر عالمتاب کا منظر کھلا

لیکن اس دن ہانگ چُو شہر میں اس کے بعد بھی بہت سے منظر کھلے، جیسے ہر حسین عورت کے چہرے کا ایک ایسا حصہ ہوتا ہے جسے مرکزِ حُسن کہا جا سکتا ہے اسی طرح ہانگ چو کے حسن کا مرکز بھی وہ جھیل ہے جس کے کنارے ہمارا ہوٹل واقع تھا۔ بدھ کے مندر کی طرف جاتے ہوئے ہمارا اس کے حسن سے پہلا تعارف ہوا ہمارا کوسٹر خاصی دور تک جھیل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا دُور تک پھیلے ہوئے پانیوں کے اس قدرتی حُسن کو مجروح کیے بغیر ہانگ چو والوں نے اسے ایک خوبصورت تفریح گاہ میں ڈھال دیا ہے۔ جھیل کے اندر مختلف جگہوں سے کاٹ کر سڑکیں بنا دی گئی ہیں جن کے نیچے کہیں کہیں ایک کشتی کی گزرگاہ جتنے خوبصورت رستے ہیں اور جھیل کے کنارے پر دُور دُور تک کنول کے بڑے بڑے پھولوں کے تختے سے پانی پر ڈولتے رہتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ پھولوں اور پتوں کے نیچے کا پانی تک نظر نہیں آتا۔ یہ ایک ایسا روح پرور منظر تھا جو ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتا ہے اور جس کے حُسن کا تاثر قیدِ زمان و مکاں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

کوسٹر کی کھڑکی کے شیشے سے چہرہ لگائے میں دیر تک اس منظر کو دیکھتا رہا، ذہن میں ایک مانوس سی خوشبو پھیلی اور مجھے پتا چل گیا کہ یہ تجربہ کسی نظم میں ڈھلنے والا ہے لفظ اور خیال ایک دوسرے پر O/L ہونے لگے اور نظم کی لائنیں غیب سے شہود میں آنے لگیں جن کی آخری شکل کچھ یوں بنی:

ہے پہاڑوں کے درمیاں یہ نگر
جیسے محبوب کا حسیں چہرہ
اپنے عاشق کے گرم ہاتھوں کے
پُرطلب، مضطرب حصار میں ہو

ایک بوسے کے انتظار میں ہو!
یوں فضا ہو رہی ہے سر تا سر
رنگ جیسے ہوا میں مل جائے
آنکھ میں ڈولتے ہیں یوں منظر
ڈھیر ریشم کا جس طرح کوئی
انگلیوں سے پھسل پھسل جائے
جھیل میں تیرتے ہوئے یہ کنول
بے حد و بے شمار ایسے ہیں
آسماں پر ہوں جس طرح انجم
جیسے حلقہ کیے ہوئے موسم
اک گلِ نوبہار کی خاطر
خواہشِ وصل میں نہائے ہوئے
جیسے آغازِ عاشقی کے خواب
کہکشاں راہ میں بچھائے ہوئے
شاعرِ چین کا کہا سچ ہے
''جھیل یہ ہانگ چو کے دامن کی
جیسے کوئی حسین عورت ہے
ایک جنت ہے آسمانوں پر
ہانگ چُو اس زمیں پہ جنت ہے۔''

ہانگ چُو کی اس خوبصورت صبح میں ہماری پہلی منزل ''بدھ کا مندر'' تھا۔ لاہور کے عجائب گھر اور ٹیکسلا میوزیم میں گوتم بدھ کے جو مجسمے اور مختلف اخبارات و رسائل میں ان کی جو تصویریں دیکھی تھیں ان کے حوالے سے یہ مندر خاصا مختلف اور حیران کن تھا کیونکہ یہاں Starving Buddah اور Laughing Buddah کے علاوہ بھی بدھ کے کئی رُوپ تھے۔ یہ تو معلوم تھا کہ مختلف علاقوں میں بدھ کے جو مجسمے بنائے گئے ہیں ان میں مقامی نقوش کا خیال اور التزام رکھا گیا ہے لیکن ایک ہی علاقے اور مندر میں اس کی اتنی شکلیں ہو سکتی ہیں یہ ایک بہت ہی غیر متوقع منظر تھا۔ دوسری عجیب بات یہ تھی کہ بدھ کے ساتھیوں اور پیروکاروں کے جو بہت بڑے بڑے اور ہیبت ناک مجسمے بنائے گئے تھے ان کے چہروں پر زیادہ تر غصہ، خشونت، انتقام اور نفرت کے تاثرات تھے اور ان کے ہاتھوں میں مختلف طرح کے ہتھیار بھی تھے جبکہ ہمارے تصور کے مطابق بدھ مذہب انتہائی امن پسند، دھیما، صلح کل اور روحانی تسکین کا علمبردار تھا۔ ان جیالوں کے پاؤں میں جدید زمانے کے واہیات جاگرز جیسے بھاری بھاری جوتے تھے اور ان کی آنکھوں میں رحم اور درگزر کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہاں بھی بروہی صاحب آڑے آئے انہوں نے بدھ مذہب کے

بارے میں عمومی طور پر اور اس مندر کے مجسموں پر بالخصوص ایک سیر حاصل لیکچر دیا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ بہت سارے مجسمے جو بدھ کے سمجھے جاتے ہیں وہ اصل میں گوتم بدھ کے نہیں بلکہ اس کے بعد آنے والے اس کے بہت سے پیروکاروں کے ہیں۔ گوتم کے مجسمے کی پہچان یہ ہے کہ اس کے جسم پر سوائے ایک چادر کے کچھ نہیں ہوتا، سر ننگا ہوتا ہے اور اس کے ماتھے پر تیسری آنکھ کا ایک سمبل ہوتا ہے، جنگجو مجسموں کی وضاحت انہوں نے یہ کی کہ اصل میں ان کے ذریعے زندگی کی ہمہ جہتی اور انسانی معاشروں میں بزم کے ساتھ رزم کی اہمیت اور موجودگی کا احساس بھی ہے اور یہ کہ اگر ہم لوگ غور سے دیکھیں تو یہ سارے کے سارے لڑاکے سُور ما نہیں ہیں۔ ان میں فنکار، دین دار اور زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی ہیں یہ اور بات ہے کہ مجسمہ سازوں کی کم ہنری کی وجہ سے دھیان ان کے ایک جیسے چہروں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور وہ علامتیں واضح نہیں ہو پاتیں جو انہیں ایک دوسرے سے مختلف کرتی ہیں۔

گفتگو کا رخ ایک بار پھر خالق و مخلوق کے رشتوں کی نیرنگیوں کی طرف پھر گیا۔ بحث کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ انسانی تاریخ میں خدا کے تصور میں جو ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے اس کا ذہنِ انسانی کے ارتقاء سے کیا رشتہ ہے؟ اور وہ جو اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ:

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولا، بُوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اس میں اور پیر و مرشد مرزا غالبؔ کے اس استنباط میں معیاری فرق کیا ہے؟

دیر و حرم آئنہ تکرارِ تمنا!
واماندگیٔ شوق، تراشے ہے پناہیں!

ایک طرح سے صنم کدے میں خدا کی تلاش کا یہ عمل بہت دلچسپ بھی تھا اور خیال افروز بھی، اس ساری گفتگو میں جو سب سے پیچیدہ نکتہ سامنے آیا وہ یہ تھا کہ کیا خدا کا وجود ایک مکمل اور جامد قوت ہے یا انسان اور کائنات کے حوالے سے اس کا کچھ حصہ خود بھی ارتقا پذیر ہے اور اس ''ارتقا'' کی ماہیت کیا ہے؟ کیا اسے ''وقت'' کے تصور کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ خود فرماتا ہے کہ زمانے کو بُرا مت کہو زمانہ میں خود ہوں۔ اور پھر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں ظاہر ہو جاؤں سو میں نے انسان کو پیدا کیا۔ بقول ولی دکنی:

حُسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ

یا پھر نبی آخر الزماں ﷺ کے حوالے سے غالب کی یہ بات کی کہ

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

لیکن شاعری کے حوالے سے سب سے زیادہ گہری اور معنی خیز بات اقبالؔ نے کی ہے اور اصل میں ساری بحث کا آغاز بھی انہی کے اس شعر سے ہوا تھا:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

اگر کائنات سوائے ذات الٰہی کے ایک مظہر کے اور کچھ نہیں تو پھر اس کی یہ ''ناتمامی'' کیا ہے؟؟؟

عبادت گاہوں اور قبرستانوں میں انسانی ذہن ان سوالات پر غور کرنے میں بہت فعال ہو جاتا ہے شاید اپنی عبودیت اور فنا پذیری کا احساس ہے جو ان جگہوں کے ماحول سے مل کر ایک طرح کی شدت اختیار کر جاتا ہے یا پھر یہ ہمارے اجتماعی لاشعور کی کوئی پراسرار گتھی ہے جس کے دھاگے یہاں آ کر گنجھل کی شکل میں ڈھل گئے ہیں:

پہلا لفظ تھا اسم خدا کا، دوسرا لفظ جدائی
بعد کی گنجھل دار عبارت کچھ نہ سمجھ میں آئی

ایک طرف لوگ بغیر خوشبودار اگربتی نما کچھ چیزیں جلا رہے تھے، موم بتیاں بھی روشن تھیں اور ایک کھلے سے صحن میں لوہے اور تانبے کے بنے ہوئے ایک آٹھ دس فٹ اونچے سٹرکچر کی طرف لوگ سکّے اُچھال اُچھال کے پھینک رہے تھے جس کا سکہ سٹرکچر کے اوپر والے حصے میں بنے ہوئے سوراخوں میں سے کسی ایک میں چلا جاتا وہ ایک دم خوش ہو جاتا معلوم ہوا کہ یہ ایک طرح کی دعا اور منت ماننے کا طریقہ ہے۔ خالد احمد نے کیا نازک شعر کہا ہے:

جب بھی نظر اٹھی تو فلک کی طرف اٹھی
برگشتہ آسمان سے، گویا نہ تُو نہ میں!

بروہی صاحب نے بتایا کہ یہ تصویریں ''پرتی استھوا'' کی مختلف صورتیں ہیں۔ پُرش کے وہ مختلف کشٹ ہیں جو وہ گیان کی تلاش میں کاٹتا ہے۔ جگہ جگہ ''فوٹو گرافی منع ہے'' کے بورڈ لگے تھے لیکن عمارت کے دونوں دروازوں پر بنے ہوئے سٹالوں پر مندر کی ہر چیز کی تصویروں والے پکچر کارڈ دھڑا دھڑ فروخت ہو رہے تھے۔ یہاں چین کا دوسرا فقیر ملا، ایک ہاتھ سے محروم۔ لیکن چہرے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کوئی پکا نشئی ہے ہاتھ کے اشاروں اور زبان سے کئی بار اسے ''بابا معاف کرو'' کہا گیا لیکن جب اس کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی تو مجبوراً اس کی خدمت میں دو یوان پیش کیے گئے متوقع ردِعمل یہی تھا کہ اب وہ ہمارے ہاں کے فقیروں کی طرح کچھ دعائیں وغیرہ دیتا ہوا جائے گا لیکن اس نے جواب میں ایک ایسی فتح مندانہ مسکراہٹ پیش کی جس کے ماتھے پر جلی حروف سے لکھا تھا۔ ''دیکھی ہماری کاریگری!''

اس سے پہلے بھی ایک دو مواقع پر میں نے محسوس کیا تھا کہ اجمل خٹک کو چھوٹے بچوں سے بہت پیار ہے لیکن اب یقین ہو گیا کہ یہ ان کی ایک بہت خوبصورت عادت ہے، جہاں بچے نظر آتے ہیں ان کو گود میں اٹھا لیتے ہیں ان کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہیں اور محبت سے تھپک تھپک کر دعائیں دیتے جاتے ہیں۔ ان کے اجنبی چہرے اور طویل قد و قامت کے باعث شروع میں تو بچے اور ان کے والدین گھبرا جاتے تھے مگر ان کی محبت اور شفقت دیکھ کر فوراً ہی Relax اور خوش ہو جاتے مجھے ان کا یہ رویہ بہت ہی اچھا لگا۔

بدھ کے مندر کے بعد ہماری اگلی منزل ''بانگ چُو کا مغربی پہاڑ'' تھا چھ سواریوں والی پرانی طرز کی تین لفٹ ٹرالیاں سطح زمین سے تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی پر بنے ہوئے ریستوران تک آ جا رہی تھیں، خودرو جھاڑیوں اور پودوں سے ٹکراتی ہوئی ہماری ٹرالی کچھوے کی رفتار سے اوپر کی طرف رینگ رہی تھی۔ ایک دم یاد کے افق پر سات آٹھ سال پہلے کا ایک ایسا ہی ٹرالی کا سفر جگمگا اُٹھا۔ کینیڈا کے ایک تفریحی مقام بینف (Banff) پر گنڈولا لفٹ کے ذریعے علی سردار جعفری اور میں خاصی بلندی پر بنے ہوئے ایک ایسے ریستوران کی طرف جا رہے تھے جو متمدن دنیا کا آخری کنارا تھا اور جس کے آگے تا حدِ نظر برف ہی برف تھی جو قطبین کی وسعتوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ شاید اونچائی کی دہشت سے دھیان ہٹانے کے لیے ہم نے اس وقت زمان و مکاں کے حوالے سے کچھ دانشورانہ ٹائپ باتیں کرنے کی کوشش کی تھی جن کا سلسلہ ریستوران کی محفوظ اور ہموار زمین کو چھوتے ہی منقطع ہو گیا تھا اور پھر واپسی کے سفر پر بالکل اسی طرح دوبارہ شروع ہو گیا تھا جیسے ٹی وی کا کوئی پروگرام کہ ''جہاں سے رابطہ ٹوٹا تھا وہیں سے پھر ملاحظہ کیجیے۔''

کائنات کی اس ساری دہشت کا منبع کہیں ہمارے اندر ہی تو نہیں ہے!

ریستوران کی ٹیرس پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی تو سبزے سے بھرا ہوا بانگ چُو شہر اور بھی خوبصورت دکھائی دیا مغربی شہروں کے طنطنے کی جگہ اس کے ماحول میں ایک مخصوص ملائمت تھی جو آہستہ آہستہ انسان کے وجود میں اترتی چلی جاتی ہے۔ میزبان کافی کے ساتھ پیپر منٹ ٹائپ کسی سفیدی سی چیز میں بھنے ہوئے کدو کے بیج لے آئے اس کھانے اور پینے کے دوران انہوں نے ہمیں بلندی سے شہر کے قابلِ ذکر حصوں اور عمارتوں کے بارے میں بتایا جس میں ان کی رائٹرز یونین کا دفتر بھی تھا۔ اجمل خٹک، فرمان فتح پوری اور بروہی کو اس منظر میں مرحوم مشرقی پاکستان کے مناظر کی جھلک نظر آ رہی تھی مجھے چونکہ آج تک ادھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا اس لیے میں ''شنیدن'' سے ''دیدن'' تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اجمل خٹک بتا رہے تھے کہ مشہور بنگالی شاعر کوی جسیم الدین بڑے حسن پرست واقع ہوئے تھے اور ہماری آج کی سینئر فلم سٹار شبنم تیس برس پہلے ایک دبلی پتلی نوعمر لڑکی ہوا کرتی تھی اس وقت اس کا نام جھرنا تھا اور ان دنوں وہ ایک بے مثل رقاصہ کے طور پر اپنا نام اور مقام پیدا کر رہی تھی خٹک صاحب کے بیان کے مطابق مغربی پاکستان سے جانے والے ادیبوں کے اس وفد کے بیشتر ارکان اس پر لوٹ تھے لیکن ابن انشاء مرحوم تو باقاعدہ عاشق ہو گئے تھے اور کچھ روایات کے مطابق انہوں نے شادی کارڈ بھی چھپوا لیے تھے، انہوں نے کاکس بازار کا ایک واقعہ بھی سنایا کہ چاندنی راتوں میں وہاں بعض اوقات بہت زیادہ پانی چڑھ آتا تھا جس کے ساتھ بہت سے جنگلی جانور بھی بہتے ہوئے آبادیوں تک آ جاتے تھے ایسی ہی ایک رات میں ہوٹل میں جھرنا یعنی شبنم کے کمروں والی سمت پانی کے ساتھ ایک خوفناک ریچھ بھی آ گیا چنانچہ وہ رات اس نے اپنے ساتھیوں سمیت خٹک صاحب کے کمرے میں گزاری جو

کہ نسبتاً بلندی پر واقع تھا۔ اس پر گفتگو کا رخ مشاہیر کی حسن پرستی کے واقعات کی طرف مڑ گیا اور ایسے ایسے قصے سننے کو ملے کہ اپنی ساری زندگی ایک صاف سلیٹ کی طرح دکھائی دینے لگی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بتایا کہ اورتو اور اپنے مولانا حسرت موہانی جب روم گئے تو وہ بھی اپنے ساتھیوں کو باقاعدہ اطلاع دے کر حسینانِ اٹلی سے مکالمہ کیا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ باقی ساتھی بھی ہماری میز کے گرد جمع ہو چکے ہیں اور ہمہ تن گوش ہیں۔ واپسی پر لفٹ ٹرالی میں نواز طائر ہمارے ساتھ تھے اور جھوم جھوم کر کہہ رہے تھے۔

''یہ نہ دیکھتے تو بہت زیادتی تھی''

''اس کو دیکھنا تو بہت ضروری تھا''

''یہاں نہ آتے تو محروم رہ جاتے''

اور ان کے ہر جملہ تحسین کے آخر میں بروہی صاحب کا ''بیوٹی فل'' عین سم پر آ رہا تھا۔

ہوٹل کے T.V پر ایک چینی ویڈیو گانا Burning Love انگریزی سب ٹائیٹلز کے ساتھ چل رہا تھا گانے کے بولوں سے لے کر موسیقی اور ''حرکات وسکنات'' تک ہر چیز میں امریکہ کی جھلک نمایاں تھی۔ میں سوچنے لگا کیا چینی شہروں کی نوجوان نسل بھی تیسری دنیا کے مختلف ملکوں میں بسنے والے شہری نوجوانوں کی طرح تقلید مغرب کے راستے پر چل پڑی ہے؟ اور اس سوال کا جواب ''ہاں'' میں پا کر طبیعت کچھ بوجھل سی ہوگئی، ہنس کی چال چلنے والے کوؤں کی بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ ہنس تو انہوں نے بننا ہی نہیں ہوتا اس چکر میں پوری طرح کوّے بھی نہیں رہتے۔

تھوڑی دیر میں ایک انگریزی سکھانے کا پروگرام شروع ہوگیا۔ یہ پروگرام امریکہ میں تیار کیا گیا تھا اور بظاہر اس کا مقصد قطعاً علمی تھا یعنی انگریزی نہ جاننے والے غیر ملکیوں کو انگریزی سکھائی جائے لیکن جس ہنرمندی اور چالاکی سے اس تعلیمی پروگرام میں انہوں نے اپنے کلچر اور نظریۂ حیات کو سمویا تھا اور جتنے Subtle انداز میں وہ اپنی تہذیبی برتری کا نقش اپنے ناظرین کے دلوں میں بٹھا رہے تھے وہ شیشہ بازانِ فرنگ ہی کا حصہ ہے۔

تین افراد کی باہمی بول چال کے ذریعے جو لفظ سکھائے جا رہے تھے ان کے Visuals اور دیگر متعلقات ایسے گلیمرس تھے کہ ایک ایک بدیسی لفظ کی چکا چوند اور تیرگی سے درجنوں مقامی تہذیبی استعارے پٹے ہوئے پہلوانوں کی طرح رنگ سے باہر گرتے جا رہے تھے۔ موضوع گفتگو یہ تھا کہ تین انگریزی فلموں Casablanca, Cramer vs Cramer اور Empire Strikes Back میں سے کون سی فلم دیکھی جائے، وہ کس سینما میں لگی ہے، وہ سینما کس سڑک پر ہے، ہمفری بوگارٹ اور انگرڈ برگمین کس فلم میں ہیں اور ان کی اس کے علاوہ کون کون سی فلمیں ہیں نیز کہ اس پروگرام کو عملی جامہ کیسے پہنایا جائے۔

اس پروگرام کو دیکھ کر میرا ذہن بے اختیار اپنی نصابی کتابوں کی طرف مڑ گیا جن میں آزادی کے 45 برس بعد بھی وہی نرسری رائمز رائج ہیں جو انگریز نے اپنے بچوں کے لیے اپنے ماحول کے حساب سے بنائے تھے، سو ہم آج تک ہمپٹی ڈمپٹی، بابا بلیک شیپ اور جیک اینڈ جل سے باہر نہیں نکل سکے۔ میرا بیٹا علی ذی شان سو تک انگریزی کتنی فر فر پڑھتا چلا جاتا ہے لیکن اردو میں اس کی سوئی چونتیس پر اٹک جاتی ہے اور یہاں تک بھی وہ اپنی کوشش سے پہنچا ہے کیونکہ سکول میں اسے پینتیس کی نہیں تھرٹی فائیو کی ضرورت ہے۔ غور کیا جائے تو جدید نسل کی مغرب زدگی سے متعلق ہماری 90% شکایات ایسی ہیں جن کے اصل ذمہ دار ہم

خود ہیں۔ ہم وہ لوگ ہیں جو کریلوں کے بیج بوتے ہیں لیکن اگنے والے پھل کو سیب کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں اور اس سارے عمل میں ہمارے پاس کرنے کے لیے صرف خواہشیں، دُعائیں اور التجائیں ہوتی ہیں۔

انسانی ذات کا حصار ایسا ہے کہ بعض اوقات پوری کائنات اس کی لپیٹ میں آ جاتی ہے لیکن اگر اس سے کچھ اوپر اُٹھ کر ایک فاصلے سے زمین کے اس گولے اور اس پر برپا کشمکش کو دیکھا جائے تو ایک حیرت انگیز یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ازل سے اب تک اور اب سے ابد تک ایک ایسی پیکار جاری ہے جس میں کشتوں کے پشتے تو لگتے چلے جا رہے ہیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سارے ہنگامے کا مقصد کیا ہے؟ اور کوئی ہے بھی یا نہیں۔

کاسہ ہے گدائی کا، درویش کا پیالہ بھی!
مانگے کی ضیا لے کر یہ چاند ہوا روشن،
یہ چاند ہوا روشن اور چاند کا ہالہ بھی
امروز کا پردا ہو!
ماضی ہو کہ فردا ہو!
اک بھید انوکھا ہے، اک راز یہ گہرا ہے!
اس برف کی گھاٹی پہ کچھ دیر کو ٹھہرا ہے
خوابوں کا اجالا بھی! دن رات کا جالا بھی!
یہ بجھتا ہوا منظر اور دیکھنے والا بھی!

جب بصارتیں محبوس ہو جائیں تو بصیرتوں پر بھی دھند لکے چھانے لگتے ہیں اور یہی اصل منشا ہے ان بالا دستوں کا، جن کے بنائے ہوئے منظر ناموں میں ہم سانس لے رہے ہیں یوں کہنے کو تو تیسری دنیا میں ہر طرف آزادی اور بیداری کا شعور ہے اور دنیا کا نقشہ دم بہ دم بدل رہا ہے لیکن دوسری طرف ''خواجگی'' والے بھی چن چن کر نئے مسکرات بناتے جا رہے ہیں اور وہ جو خواب سے جاگنے کی تگ و دو میں ہیں ان کے اردگرد کچھ ایسے جال بُن دیتے ہیں کہ خواب اور حقیقت آپس ہی میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں اور چاروں طرف ایک بے معنویت کا غبار سا پھیل جاتا ہے۔

ڈپریشن کا یہ وقفہ شاید اور طویل ہو جاتا اگر فون کی گھنٹی نہ بجتی اور دوسری طرف سے بروہی صاحب کی مسکراتی ہوئی آواز نہ سنائی دیتی جو ایک کپ ''بیوٹی فُل'' چائے کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ بروہی صاحب میں بلوچوں کی نسلی خصوصیات اور سندھی تہذیب کی مخصوص مٹھاس اور درویشی تو ہیں ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی ستر سالہ زندگی میں انہوں نے دنیا اور اہلِ دنیا کو جس طرح برتا اور دیکھا ہے اس نے ان کی اپروچ اور گفتگو میں ایک ایسی آزاد خیالی اور وسیع المشربی پیدا کر دی ہے جو آج کل بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس روز بھی انہوں نے اپنی کتاب زندگی سے کچھ ایسے واقعات سنائے جنہیں سن کر زندگی پر اعتماد قائم سا ہونے لگتا ہے۔ ان کی اسی صلاحیت کو دیکھ کر میں نے اپنے دل میں انہیں A man for all seasons کا خطاب دے دیا۔

آج کی شام ہانگ چُو کی جھیل کی سیر کے لیے مخصوص تھی۔ چار چار سواریوں والی تین چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر جب

ہم روانہ ہوئے تو مجھے شبہ سا ہوا کہ سب سے اگلی کشتی کو کوئی عورت چلا رہی ہے لیکن کچھ فاصلے کی وجہ سے اور کچھ اس خاتون کے لباس، حلیے اور احوال کے باعث فوری طور پر اس کی تصدیق ممکن نہ ہو سکی۔ میں نے اپنے کشتی بھائیوں بروہی، فرمان اور نواز طائر صاحبان سے رائے طلب کی ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ یقیناً عورت ہے کیونکہ حسن رضوی اس کی تصویریں اتار رہا ہے۔ جب کوئی تین چار کلومیٹر سفر کے بعد ہم لوگ ایک ایسے گھاٹ پر اُترے جس کے ساتھ ایک بہت بڑا باغ ملحق تھا تو معلوم ہوا کہ ہمارا شبہ درست تھا وہ تھی تو عورت ہی لیکن اسے صنف نازک کہنا اس کی توہین تھی اس کے صحت مند اور جفاکش جسم، پسینے کے قطروں سے چمکتے ہوئے ماتھے اور کشتی کو کھلونے کی طرح چلاتے ہوئے مضبوط ہاتھ پاؤں، اس بات کے گواہ تھے کہ چینی عورت کسی طرح سے بھی اپنے مردوں سے پیچھے یا کم نہیں۔

بادل کا ایک ٹکڑا بہت دیر سے ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا اب جو اس نے ہمیں کھلے آسمان تلے سے نکل کر باغ کی عمارت کی طرف جاتے دیکھا تو شاید اسے ہماری یہ بات پسند نہیں آئی اور وہ یکدم کچھ ایسے زور سے برسا کہ پندرہ بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے دوران ہی ہم سر سے پاؤں تک بھیگ گئے جس جگہ ہم نے پناہ لی وہاں پہلے سے کافی لوگ موجود تھے۔ ہمارے سامنے والے بنچ پر دو تین لمبے تڑنگے امریکی اور انہی جیسے کپڑوں میں ملبوس ایک قدرے موٹا اور پستہ قد چینی بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ موصوف گزشتہ چالیس برس سے امریکہ میں مقیم ہیں وہاں کے شہری بن چکے ہیں اور اب اپنے امریکی دوستوں کے ساتھ اپنے وطن مالوف کی سیر کرنے آئے ہیں اس نے بتایا کہ وہ چین کی ترقی کو دیکھ کر بے حد خوش ہوا ہے کیونکہ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو حالات بہت مختلف اور تکلیف دہ تھے۔ اس کے چہرے، لہجے اور باتوں میں ایک ایسی سرخوشی تھی جس کا لفظوں میں اظہار بہت مشکل ہے۔

تھوڑی دیر میں بارش رک گئی ہم نے اپنے کشتی بانوں کو خدا حافظ کہا کیونکہ اب ہمیں ایک باغ کی سیر کرتے ہوئے اس کے دوسرے کنارے تک پہنچنا تھا جہاں ہمارا کوسٹر پہلے سے موجود ہوگا باغ کو دیکھتے ہی منیر نیازی کی آنکھوں میں طراوت سی آ گئی تھوڑے فاصلے پر چلتے ہوئے ایک گول مٹول شخص کو دیکھ کر انہوں نے مسکراتے ہوئے اعلان کیا۔

''اگرچہ اس شخص کی Body Language صحیح نہیں ہے مگر اس باغ کی فضا اور موسم کے صدقے میں اس غلطی کو معاف کر رہا ہوں۔

Body Language یعنی جسم کی زبان کی یہ اصطلاح بھی منیر نیازی کے مخصوص ذخیرۂ الفاظ کا حصہ ہے۔ ان لفظوں کا اصلی مزا تو ان کے منہ سے ہی سن کر آتا ہے کیونکہ وہ کسی مانوس لفظ کو ایسے انوکھے تناظر میں استعمال کرتے ہیں کہ وہ بالکل نیا محسوس ہونے لگتا ہے ایک بہت چرب زبان اور تیز گفتار آدمی کی تعریف انہوں نے کچھ اس طرح سے کی۔

''وہ ایک ایسا سکوٹر ہے جس پر ٹرک کا ہارن لگا دیا گیا ہے۔''

شروع شروع میں انہیں پروفیسر نواز طائر کی باڈی لینگوئج سے بھی اختلاف تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جاننے کے بعد ان کی رائے بدل گئی اور آخری دو تین دنوں میں تو وہ باقاعدہ ایک دوسرے کے ساتھ چہلیں کرتے پائے گئے۔

اس باغ میں چین کے مقامی پودوں اور درختوں کے ساتھ ساتھ صنوبر کے بھی بے شمار درخت تھے سو ان کے حوالے

سے اردو شاعری میں صنوبر کے استعمال کا ذکر چھڑا اور بات مختلف شعروں سے ہوتی ہوئی وہیں رُکی جہاں اسے رُکنا چاہیے تھا، یہ مرزا غالب بھی کیا کمال کا شاعر تھا ہر موقعے کے لیے اس کے پاس کوئی نہ کوئی بے مثال شعر ضرور مل جاتا ہے:

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

ابھی ہم اس مسئلے پر بحث کا آغاز ہی کر رہے تھے کہ مناظرِ فطرت سے متعلق بہت سے استعارے ہماری شاعری سے کیوں غائب ہوتے جا رہے ہیں کہ ایک موڑ پر اچانک ایک خوبصورت فرنگی جوڑا ظاہر ہوا مرد کا نام رافائل (رافیل) اور عورت کا تریلی نیدا تھا وہ دونوں سپین سے آئے تھے اور ان کا گھر قرطبہ کے ایک نواحی قصبے میں تھا، انگریزی ان کی ہم سے بھی زیادہ واجبی تھی جس کی سب سے زیادہ خوشی حسن کو ہوئی کیونکہ تری نیدا ایک جملہ تین حصوں میں مکمل کرتی تھی، (1) چند گرامر کے قواعد سے آزاد انگریزی نما لفظ (2) خوبصورت مسکراہٹیں اور چھوٹے چھوٹے قہقہے (جنہیں انگریزی میں Giggle کرنا کہتے ہیں)، (3) بار بار زور سے ہاتھ ملانا۔

شاید یہ سپین کے ساتھ صدیوں کے گم گشتہ رشتوں کی یاد کا اثر تھا کہ باغ کے اس مختصر سے سفر میں ہر خورد و کلاں نے اس حسینہ اندلس سے اس قدر گرم جوشی سے مصافحے کیے کہ معانقوں کی کمی پوری ہو گئی مگر آفرین ہے اس بی بی پر بھی کہ اس نے حسن رضوی سے علی احمد بروہی تک سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھا، علامہ اقبال بہت یاد آئے:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

دن بھر کا خوشگوار سفر شام کے سایوں کی درازی کے ہم قدم اب آہستہ آہستہ تھکاوٹ کی شکل میں رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے یعنی چین کے حساب سے ہمارا ڈنر ٹائم شروع ہو چکا تھا طے پایا کہ تھوڑی دیر لابی میں ہی ستا لیں اور پھر کھانا کھا کر ایک ہی بار کمروں کا رخ کریں۔

سامنے کے صوفے پر دو معقول صورت میمیں اور ایک ضرورت سے زیادہ صحت مند دس بارہ سال کا لڑکا بیٹھے تھے معلوم ہوا کہ لڑکے والی بی بی کسی فرانسیسی سفارت کار کی بیوی ہے اور تھوڑی بہت کام چلاؤ انگریزی بول لیتی ہے جبکہ اس کی ساتھی ایتھنز یونان کی رہنے والی ہے جسے یس اور نو کے علاوہ صرف مسکرانا آتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ آدھی دنیا کی سیاحت کر چکی ہے اور اس وقت بھی وہ لوگ سیر کے لیے گھروں سے نکلے ہوئے تھے۔ فرنچ بی بی یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ ہم لوگ ادیبوں کا گروپ ہیں کیونکہ اس کے خیال میں اتنی زور زور سے اور اتنا زیادہ ہنسنے والے لوگ اور کچھ بھی ہوں ادیب اور شاعر نہیں ہو سکتے۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے اسے یقین دلایا، ادب اور خوشی کی آپس میں کوئی خاندانی دشمنی نہیں ہے اور یہ کہ الجزائر سے چین تک، تیسری دنیا کے افتادگانِ خاک اپنے اپنے حصے کے تمام آنسو رو چکے ہیں اور ہمارے یہ قہقہے اسی عالمی تبدیلی کے نقیب اور نمائندہ ہیں کہ:

افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

اور یہ کہ" گیا دورِ سرمایہ داری گیا، تماشہ دکھا کر مداری گیا"

ابھی یہ انتقامی + انقلابی گفتگو جاری ہی تھی کہ ان لوگوں کی موٹر آ گئی، عزیز بیگی کا خیال تھا کہ حسینۂ یونان ہماری گفتگو سے واضح طور پر متاثر نظر آ رہی تھی البتہ یہ پتا نہیں چل سکا کہ اس کی وجہ اس کی انگریزی تھی یا ہماری؟

28 اگست کا دن چینی دیہات کی سیر کے لیے وقف تھا۔ پہلے ہمیں فویانگ Fu-Yang جانا تھا جو ہانگ چُو کا ایک نواحی قصبہ ہے، انگریزی اصطلاح میں اسے کاؤنٹی بھی کہا جا سکتا ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے دوران سڑک کے دونوں طرف دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں اکا دُکا لوگ سپرے کرتے پھر رہے تھے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پختہ مکانوں والی چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں جن میں پتھروں پر کپڑے دھوتی اور سبزی اور مچھلی بیچتی ہوئی عورتیں دکھائی دیں لیکن یوں لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ نیند میں ہو رہا ہے کہیں بھی شور شرابا سنائی نہیں دیا۔ ایک مکان کے باہر ایک بوڑھی عورت بڑے انہماک سے اپنے جوتے کی مرمت کر رہی تھی۔ اجنبی چہروں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر اپنے جوتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

فویانگ کے میزبانوں نے بڑا اہتمام کر رکھا تھا ایک کھلی پک اپ ٹائپ موٹر میں ویڈیو فلم بنانے والا عملہ سوار تھا معلوم ہوا کہ ہماری یہ وزٹ ٹیلی ویژن کے لیے بھی ریکارڈ کی جا رہی ہے البتہ یہ اطلاع تشویش ناک تھی کہ اسے ثقافتی کے بجائے زراعتی پروگرام میں ٹیلی کاسٹ کیا جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک ایسی جھیل کے کنارے پہنچے جسے آسانی سے سمندر بھی کہا جا سکتا تھا ایک پرانا شور مچاتا ہوا سٹیمر ہمارا انتظار کر رہا تھا جس میں جگہ جگہ بانس کی بنی ہوئی کرسیاں، سٹول اور بنچ پڑے تھے سٹیمر خاصا بڑا تھا اس لیے لوگ ٹولیوں کی شکل میں اس کے مختلف حصوں میں بکھر گئے ہمارے گروہ میں مقامی میزبان لی اور اس کی چھ سات سالہ بچی شانگ بھی تھی جو مہمانوں کی خصوصی توجہ کی وجہ سے پریشان سی ہو کر بار بار اپنی ماں کے پیچھے چھپ رہی تھی اس کی اس معصوم حرکت کا سب سے زیادہ لطف اجمل خٹک لے رہے تھے۔ چھوٹے بچوں سے ان کی یہ غیر معمولی محبت ان کی شخصیت کا فطری حصہ تھی اس کی وجہ طویل قید کی تنہائی اور اپنی اولاد سے دوری تھی یا ابتدائی دنوں کی سکول ٹیچری، اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے میرا خیال ہے کہ یہ تینوں ہی عناصر ان کے اس رویے میں شامل ہیں۔ ہم نے لی سے پوچھا کہ چینیوں میں اتنے زیادہ ''لی'' کیوں ہوتے ہیں کیا آپ کے یہاں ناموں کی کمی ہے تو اس نے بتایا کہ لی نام نہیں بلکہ ایک طرح کا خاندانی نام اور ذات ہے جیسے ہمارے یہاں سید، چودھری، مرزا وغیرہ ہوتے ہیں۔

مقامی ادیبوں کا سربراہ چیانگ سنگ نو بھی میری طرح فارغ البال تھا۔ حسن نے اس کی طرف دیکھ کر شرارتاً کہا۔

''یہ تو تمہارا ہم زلف لگتا ہے۔''

میں نے کہا ''اس کا اور میرا سر اوپر سے خالی ہے افسوس کہ یہاں تمہارا ہم سر نہیں مل سکے گا کیونکہ چینیوں میں اندر سے خالی سر والے لوگ نہیں ہوا کرتے۔''

اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا، اور شانگ نے گھبرا کر اپنی ماں کا بازو اتنے زور سے کھینچا کہ وہ گرتے گرتے بچی۔

ہمارا سٹیمر کنارے سے لگا تو ایک دبلا پتلا لیکن پھرتیلا چینی نوجوان لکڑی کے تختوں پر جمناسٹک سی کرتا ہوا ہماری طرف آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ چین کے لوک ورثے اور ثقافت کے محکمے کا ایک زیر تربیت افسر ہے اور ''شانگ ساتو'' گاؤں کے اس دورے میں ہمارے رہبر اور ترجمان کا کام کرے گا اس نے اپنی گرامر کی پابندیوں سے آزاد انگریزی میں بتایا کہ سب سے

پہلے ہمیں گاؤں کی مخصوص سواری یعنی بیل گاڑی کی سیر کرائی جائے گی اس کے بعد گاؤں کا ایک راؤنڈ ہوگا اور آخر میں بھیڑوں (نر بھیڑوں) کی لڑائی دکھائی جائے گی منیر نیازی نے لمبی سی جمائی لے کر کہا ''یار یہ بھیڑوں کی لڑائی تو رہنے ہی دو اسے دیکھ دیکھ کر تو ہم تھک چکے ہیں بلکہ اب تو بھیڑو بھی اس فضول کام سے تھک چکے ہوں گے؟

بیل گاڑی کی سیر کا مطلب گڈے کا سفر تھا جو تین چار فرلانگ کے ایک کچے رستے پر مشتمل تھا البتہ بیل غیر معمولی طور پر توانا تھے ہمارے میلہ مویشیاں میں حصہ لیتے تو یقیناً انعام پاتے۔

''شانگ ساتو'' ویسا ہی گاؤں تھا جیسے گاؤں ہوا کرتے ہیں، ایک بڑے سے کمرے میں کاشت کاری کے پرانے اوزار چرخہ، چکی وغیرہ رکھے تھے اس کے ساتھ ہی پاؤں سے چلانے والی پن چکی تھی لیکن اصل دلچسپی کی چیز کاغذ بنانے کا عملی مظاہرہ تھا کہتے ہیں کہ چین نے انسانی تہذیب کو جو چار عظیم تحفے دیے ہیں ان میں سے ایک کاغذ ہے جس کے بغیر انسانی علم و شعور کی ترقی شاید ممکن ہی نہ ہوتی۔

جانوروں کو پانی پلانے جیسی ایک ہودی نما جگہ میں تنکوں، گھاس اور چاولوں کے گودے کو جمع کر کے ایک لمبی سی جالی نما چیز سے چھانتے ہیں اور اس کے سانچے بنا بنا کر دھوپ میں رکھتے جاتے ہیں جس سے بالآخر ایک گتہ نما کاغذ حاصل ہوتا ہے یہ گویا اس صنعت کا ابتدائی نمونہ تھا، دنیا بھر کے اہلِ قلم چین کی اس بے مثال ایجاد کے لیے رہتی دنیا تک احسان مند رہیں گے۔

کاغذ سازی کے مظاہرے کے بعد ہمیں دریا کے راستے اگلی منزل تک جانا تھا لیکن اس کے لیے ٹرانسپورٹ بڑی عجیب وغریب اور خطرناک تھی یہ بانسوں سے بنی ہوئی ایک پندرہ فٹ لمبی ایسی کشتی تھی جس کی کل چوڑائی تین چار فٹ سے زیادہ نہیں تھی دائیں بائیں سہارے کے لیے بھی کوئی چیز نہیں تھی یوں سمجھیے کہ بانسوں سے بنا ہوا ایک پتلا سا تختہ تھا جسے غالباً ہمارے یہاں نو کا کہا جاتا ہے۔ ایک نوعمر لڑکا لمبے سے بانس کے ذریعے اسے چلا رہا تھا اور ٹی وی والے بھاگ بھاگ کر ہمارے اس سفر کو عکس بند کر رہے تھے جو پہلی نظر میں آخری سفر معلوم ہو رہا تھا، مختلف انسانی احساسات فرد پر جس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس طرح گروہ پر نہیں ہوتے یعنی فرد کی نفسیات اور گروہ کی نفسیات میں ایک فرق ہوتا ہے۔ مثلاً عین ممکن ہے کہ دریائے فوتھین کے اس چوڑے پاٹ میں اگر انفرادی طور پر ہم کو اس کشتی میں بیٹھنے کو کہا جاتا تو شاید کوئی بھی تیار نہ ہوتا لیکن یہاں سوال عزت اور ہمت کا آن پڑا تھا سو ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سب ڈولتے ہوئے قدموں کے ساتھ ایک دوسرے کے آگے پیچھے کشتیوں میں سوار ہو گئے اور ہمارے نوعمر مانجھی نے بانس کو چپو کی طرح استعمال کرنا شروع کیا۔ کشتی اگرچہ کنارے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی مگر یہ احساس کہ ہمارے دائیں بائیں محض چند انچ کے فاصلے پر گہرا اور مٹیالا پانی ہے بہر حال اتنا خوشگوار نہیں تھا۔

گھاس پھوس کی بنی ہوئی ایک اٹھارویں صدی کی انگریزی فلموں والی Hut/Pub میں جسے جھونپڑی کہنا یقیناً زیادتی ہو گی ہمیں تازہ دم کرنے کے لیے ہلکے مشروبات (Soft Drinks) کا اہتمام کیا گیا تھا، ہٹ (Hut) کا سارا فرنیچر بانس کی لکڑی کا تھا اور یہ سٹرکچر سطح زمین سے آٹھ دس فٹ بلند ایک چبوترے پر بنایا گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ جگہ گاؤں کا کمیونٹی سنٹر ہے جہاں مختلف وقتوں میں علاقے کے خورد وکلاں جمع ہوتے ہیں اور اجتماعی نوعیت کے مسائل کا فیصلہ بھی اسی جگہ کیا جاتا ہے۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا تو ایک طرف کچی سڑک کے موڑ پر کچھ لوگ جمع تھے جن کے درمیان دو سینگوں والی بکریاں سر جھکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر کھڑی تھیں۔

جونہی ہم چبوترے کی سیڑھیاں اتر کر کچی سڑک پر آئے یکدم دفیں اور نفیریاں بجنا شروع ہوگئیں۔ سڑک کے دونوں طرف چار چار نوجوانوں کی دو ٹولیاں خصوصی ملبوس پہنے ہمارے استقبال کے لیے نغمہ سرا تھیں۔ ابھی ہم اس عزت افزائی سے سنبھلے بھی نہیں تھے کہ بکریوں کے قریب کھڑے لوگوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ ترجمان نے بتایا کہ یہ سب لوگ آپ کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں، میں نے سوچا کہ یہ V.I.P ہونے کا احساس بھی کیسا ظالم اور گمراہ کن ہے انسان یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے استقبال کنندگان کرائے پر منگائے ہوئے فنکار اور سکولوں سے زبردستی لائے ہوئے بچے ہیں، اپنے نفس کو کیا کیا دھوکے دیتا ہے۔ (یا شاید کھاتا ہے)

کھانے کے بعد مقامی ادیبوں سے ملاقات تھی اور یہ سب لوگ سچ مچ مقامی ادیب تھے یعنی انہیں ابھی تک قومی سطح تک رسائی حاصل نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ان میں سے کسی کو چین سے باہر جانے کا موقع ملا تھا۔ سب سے پہلے جس شاعر نے نظم سنائی وہ نیکر اور بوشرٹ میں ملبوس تھا، چین میں ہماری طرح فارمل لباس کی اتنی زیادہ پروا نہیں کی جاتی نوجوان نسل تو عام طور پر بغیر بازو کی بنیان اور نیکر میں نظر آئی البتہ کسی شاعر کے ساتھ یہ تصور بہت اوپرا تھا کہ وہ نیکر پہنے مطلع عرض کر رہا ہو۔

میں نے اس نظم کا ترجمہ نوٹ کرنے کی کوشش کی جو کچھ یوں تھا۔

میرا دل یہ سوچ سوچ کر ڈرتا ہے
کہ جب تم نے مجھے دیکھا تھا
تو میں تمہیں کیسا لگا تھا!
میں یہاں پردیس میں تمہارے لیے دن رات محنت کر رہا ہوں
اور روزانہ سٹیشن پر آ کر اس گاڑی کا انتظار کرتا ہوں
جس پر تمہیں آنا ہے
میرا دل یہ سوچ سوچ کر ڈرتا ہے
کہیں تم غلط گاڑی میں نہ بیٹھ جاؤ!

چینیوں کو بات بات پر ہنسنے کی عادت ہے سو اس نظم کے اختتام پر بھی شاعر نے ایک بھرپور اور لمبا قہقہہ لگایا جو ہماری داد کی وجہ سے طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے کسی نے آہستہ سے کہا:

''اگر یہ اسی حلیے میں سٹیشن پر جاتا ہے تو پھر وہ مت آئی۔''

نواز طائر کی مرنجاں مرنج اور خوش خورا کی بالآخر رنگ لائی دوپہر کے کھانے میں انہوں نے ازراہِ مروّت اپنے میزبانوں کی بتائی ہوئی ہر چیز سے انصاف کیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ان کی طبیعت خراب ہوئی اور پھر قے آنی شروع ہوگئی ان کے لیے ڈاکٹر کا انتظام کیا گیا اور کوئی آدھ گھنٹے کے تعطل کے بعد محفل دوبارہ شروع ہوئی۔

ایک دبلی پتلی خوش قامت اور خوش اندام لڑکی جدید انداز کا فیشن ایبل لباس پہنے اور مناسب میک اپ کیے ایک کونے میں بیٹھی تھی مگر شاید وہی کونا سب سے زیادہ روشن تھا کیونکہ زیادہ تر نظروں کا رخ اسی طرف تھا اب اعلان ہوا کہ اب وہی

بت طناز سخن سرا ہوگا کہ نام جس کا ''لوسو'' ہے لوسو نے اپنے کھلے بالوں کو جھٹک کر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے کے ساتھ نظم شروع کی جس کا عنوان تھا:

''موسم بہار کا ایک دن''

ترجمے کی چکی میں پس کر عام طور پر نظم کا ملیدہ بن جاتا ہے مگر تھانگ کے اچھے ترجمے، ہماری یکسوئی اور ''لوسو'' کی مترنم اور خوبصورت آواز نے عجیب سا سماں باندھ دیا اور یوں لگا جیسے اگر یہ نظم ترجمہ نہ ہوتی پھر بھی سمجھ میں آ جاتی۔

چڑیا کی آواز سے جاگنے والا یہ موسم
موسم بہار ہے
اس موسم میں بے شمار پھول کھلتے ہیں
اور بہت سے مسافر آتے اور جاتے ہیں
وقت کے ساتھ جانے والوں کے نشان مٹ جاتے ہیں
اور سب چیزیں پرانی ہو جاتی ہیں
بہار کے موسم میں بہت رونق ہوتی ہے
مگر دل کو آرام نہیں ہوتا
کیونکہ اس موسم میں بچھڑنے والے دوست واپس نہیں آتے
ہم باہر کا یہ موسم دیکھتے ہیں
اور پھر واپس اپنی روزمرہ زندگی میں آ جاتے ہیں۔

سب نے نظم کی دل کھول کر داد دی اور میں نے دیکھا کہ لوسو کا چہرہ اس مخصوص شرم سے گلنار ہو گیا جس کے دامن میں ایک حقیقی اور سچی مسرت چھپی ہوتی ہے۔

بروہی صاحب نے اٹلی کے کبڑے شاعر (Leo Pardi) لیو پارڈی کی ایک بہت مختصر مگر بہت شاندار نظم سنائی جس کا انگریزی ترجمہ کچھ یوں ہے۔

I am alone and afraid.

In a world,

which I never made.

چنگیز خاں جونیئر نے محفل میں موجود باقی ادیبوں اور شاعروں کا تعارف کرایا دو طرفہ شعر و شاعری کے بعد کچھ ادبی مسائل پر گفتگو ہوئی جس میں سرفہرست یہ مسئلہ تھا کہ چینی ادب پر یورپی ادب کے اثرات کس طرح سے پڑے ہیں! کونسی نئی ہیئتیں ان کے یہاں آئی ہیں! ان کے روایتی ادب میں جدید نظریات کے باعث کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں! بزرگ اور جدید نسل میں جنریشن گیپ اگر ہے تو کتنا ہے اور نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے! اور یہ کہ کیا ان کا ادب بھی ان کے لباس کی طرح مغرب کے سانچے میں ڈھل گیا ہے یا نہیں! ظاہر ہے کہ یہی ساری گفتگو ترجمان کے ذریعے ہی ممکن تھی، تھانگ اگرچہ بہت اچھا ترجمان

تھا لیکن جب ایک ہی وقت میں زیادہ آدمی بولنے لگیں تو کسی کو کسی کی بات سمجھ نہیں آتی چنانچہ اس فری فار آل (Free for all) گفتگو میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مولانا حالی کی ایک نظم مجسم ہو کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے چپکے سے بروہی صاحب کو اس کے پہلے دو شعر سنائے:

اے بزمِ سفیرانِ دول کے سخن آرا
ہر خورد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
کُھلتا نہیں کچھ اس کے سوا، تیرے بیاں سے
اک مُرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

بروہی صاحب نے پہلے تو حسبِ معمول ''بیوٹی فُل'' کہا پھر زیرِ لب مسکراتے ہوئے کچھ کچھ گنگنانے کے انداز میں بولے۔

''آپ کا رُوئے سخن غالباً لُوسو کی طرف ہے''

میں نے فوراً جوابی حملہ کیا۔۔۔

''ماشاءاللہ، آپ کو تو نام بھی یاد ہے۔''

بولے، ''بندۂ خدا! اب کم از کم ہمیں نام تو یاد رکھنے کی اجازت دے دو۔''

گفتگو کے اختتام پر باہر ایک کھلی اور پرفضا جگہ پر تصویروں کا سیشن شروع ہوا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لوسو ہر تصویر میں شامل تھی۔

اجمل خٹک طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے اس محفل میں شریک نہیں ہوئے تھے اور نواز طائر کو بھی بیماری کے باعث درمیان میں سے جانا پڑا تھا مگر سپورٹس مین سپرٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں بھی کمروں سے بلوایا گیا تا کہ وہ بھی اتنے ''اچھے موسم'' سے لطف اندوز ہو سکیں۔

لوسو کو انگریزی کے آٹھ دس لفظ آتے تھے چنانچہ زیادہ تر علمی مکالمے اسی کے ساتھ ہوئے اور تو اور ہم نے منیر نیازی کو بھی ایک علیحدہ تصویر بنوانے کے دوران اس سے مصروفِ گفتگو پایا، بہت مشکلوں سے لُوسو نے منیر نیازی کی توجہ اس کیمرہ مین کی طرف کروائی جو ان کی تصویر لینے کے لیے گزشتہ کئی منٹ سے تیار کھڑا تھا۔

بعد میں جب ہم نے نیازی صاحب کو اس مسئلے پر گھیرنے کی کوشش کی تو انہوں نے ایک بہت مزیدار لطیفہ سنا کر جان بچالی جس کا موضوع بھی ''زبان'' ہی تھا:

ایک طوطے کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ انگریزی اردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں بول سکتا ہے ایک صاحب نے اس کا امتحان لینے کی غرض سے کہا:

How, do you do?

طوطا بولا..... I am fine, how are you?

کیا حال ہے تمہارا؟ اس بار وہ صاحب اردو میں بولے۔

میں ٹھیک ٹھاک ہوں، آپ کیسے ہیں! طوطے نے ترنت جواب دیا۔

کیہ حال اے تیرا؟ اب کے پنجابی میں سوال کیا گیا۔

اس پر طوطے نے گھور کر ان صاحب کو دیکھا اور بولا۔

''اوئے اُلو دے پٹھے کجھ ہور گل وی کر کہ حال ای پچھی جائیں گا۔''

(ابے اُلو کے پٹھے کچھ اور بات بھی کرو یا حال ہی پوچھے جاؤ گے۔)

فویانگ کے ادیبوں کے ساتھ یہ پُرلطف اور دلچسپ محفل ابھی اور بھی چلتی لیکن چینی میزبانوں کا ڈسپلن درمیان میں آ گیا اور ہمیں بتایا گیا کہ:

اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

راستے میں گفتگو کا سلسلہ چینیوں کی اسی تنظیم، مساوات اور خود اعتمادی کی طرف مڑ گیا کہ سارے وقت میں ہمیں عمر، مرتبے اور شہرت وغیرہ کے حوالے سے میزبانوں کے درمیان کسی قسم کے فرق کا پتا نہ چل سکا اس پر بروہی صاحب نے ایک بہت دلچسپ واقعہ سنایا۔

''مشرقی پاکستان کے مشہور عوامی لیڈر مولانا بھاشانی چین کے دورے پر تھے کہ بیمار ہو گئے۔ اس وقت کے وزیراعظم اور عظیم چینی رہنما چواین لائی نے ہسپتال میں ان کی دیکھ بھال کے لیے اپنا خصوصی گارڈ بھجوا دیا، ایک دن وہ خود بھی ان کی عیادت کے لیے آیا اس کے جانے کے بعد بھاشانی صاحب نے گارڈ سے پوچھا کہ تم وزیراعظم کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑے کیوں نہیں ہوئے اور اس کو سیلوٹ کیوں نہیں مارا!

گارڈ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا، میں ایسا کیوں کرتا اگر آج کامریڈ چواین لائی وزیراعظم ہے تو کل کو میں بھی ہو سکتا ہوں، ہم دونوں دل سے ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں اور یہ بہت کافی ہے۔''

فویانگ کے اس سفر کی ایک اور یاد رہ جانے والی بات وہ مُسلم کھانا تھا جس کا ہمارے لیے خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا یہ ایغور زبان بولنے والوں کا ایک ہوٹل تھا جو صوبہ سنکیانگ میں بولی جاتی ہے اور اپنی ساخت میں ترکی زبان سے بہت قریب ہے یہ سنکیانگ وہی ہے جسے ہم کاشغر کے نام سے جانتے ہیں، وہی نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر، والا۔

اس کھانے میں ترکی اور افغانی ٹچ نمایاں تھا کیشونٹ، کوفتے اور تکے بہت مزیدار تھے۔

ہر جگہ کی طرح چھلی یہاں بھی موجود تھی بابا عبیر ابوزری کی نظم بہت یاد آئی جس کا پہلا مصرعہ ہے:

میں روٹی نیوں پکانی وے توں چھلی چب لے

(آج میں کھانا نہیں پکاؤں گی بہتر ہے کہ چھلی (بھٹہ) کھا کر گزارا کر لو)

اچھے کھانے کے ساتھ یہ تسلی کہ یہ باقاعدہ ذبیحہ ہے کام و دہن کے لیے ایک اضافی کشش تھی چنانچہ ہم نے پہلی بار سیر ہو کر کھانا کھایا خٹک صاحب نے ازراہِ بزرگی ولیڈری کھانا پکانے اور کھلانے والی لڑکیوں کے ماتھوں پر بوسے دیے، البتہ منیر نیازی کو بعد میں لوسو پر ان کی اس شفقت کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی ان کا کہنا تھا کہ اس کی تو نظم بھی خٹک صاحب نے نہیں سنی!

بروہی صاحب نے کہا، بھئی یہ آپ پٹھانوں کا داخلی معاملہ ہے، اسے آپس ہی میں سلجھایئے ہم بولیں گے تو بات سیاسی

ہو جائے گی۔

منیر نیازی کی Fantasy world ان کے اردگرد کی حقیقی دنیا سے زیادہ بامعنی ہے چنانچہ ان کی اکثر باتیں حقیقت اور گمان کے درمیان سفر کرتی ہیں۔ واپسی کے سفر میں انہوں نے گزشتہ شام سڑک پر ملنے والی ''چینی خواتین سے ملاقات کا واقعہ کچھ اس طرح سے سنایا کہ صورتِ حال ''بنکاک کی راتیں'' جیسی ہوگئی جبکہ ان کے ہم سفر فرمان فتح پوری کا کہنا تھا کہ اس سارے واقعے کا دورانیہ کل تین چار منٹ تھا اور موضوع گفتگو کسی ایسی دکان کی تلاش تھی جہاں سے ماچس خریدی جا سکے اس وضاحت پر نیازی صاحب نے ڈاکٹر فرمان کے بارے میں کچھ ایسے کمنٹس دیے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ تمام محقق بنیادی طور پر غبی ہوتے ہیں اب یہ فرمان صاحب کی وضعداری ہے کہ انہوں نے سارے حملے ایک مسکراہٹ میں سمیٹ لیے نیازی صاحب کو بھی شاید اپنے ردعمل کی تیزی کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ انہوں نے بات بدل کر گزشتہ شام کا ایک اور دلچسپ واقعہ سنایا کہ کس طرح انہیں پیشاب کرنے کے لیے ہر دفعہ ایک یوان خرچ کرنا پڑا اور یوں صرف پیشاب پر ان کے تین یوان یعنی پندرہ روپے خرچ ہو گئے۔''

اپنے ہوٹل واپس پہنچے تو لابی میں لطیف پٹنی سے پھر ملاقات ہوئی جو ایک چینی سے بڑی روانی کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا اس کی زباندانی اور روانی پر منیر نیازی کا تبصرہ اس شام کا حاصل تھا۔ بولے ''بھئی یہ شخص جس طرح فرفر چینی بولتا ہے اس طرح تو ہماری شاعرہ۔۔۔ بھی فرفر جھوٹ نہیں بولتی۔''

اخبار چائنا ڈیلی میں آج اسلام آباد کا موسم درج تھا پتا نہیں کیوں اچھا لگا۔ ٹی وی کے پروگراموں میں ایک پانچ پارٹ کے ڈرامے کا خصوصی ذکر تھا نام تھا۔

Life of the young man of financial bureau.

ساتھ ہی کہانی کا مختصر خلاصہ بھی دیا ہوا تھا جو کچھ یوں تھا۔

''کہانی کا ہیرو لی ین حکومت کے محکمہ انکم ٹیکس کا افسر ہے اس کا بھائی اور بھابی پرائیویٹ بزنس کرتے ہیں اور اس کے عہدے کی آڑ لے کر ٹیکس بچانے کی کوشش کرتے ہیں مگر لی ین ایک ذمہ دار شخص ہونے کے ناتے انہیں پورا ٹیکس دینے پر مجبور کرتا ہے اور اس سلسلے میں کسی قسم کی رشتہ داری یا رعایت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔''

اس کہانی کو پڑھ کر مجھے ماؤزے تنگ ہی کا ایک جملہ بہت یاد آیا کہ

''سارا ادب پراپیگنڈہ ہوتا ہے مگر سارا پراپیگنڈہ ادب نہیں ہوتا۔''

جب سے چین کے پروگرام کا پتا چلا تھا ریشم کا ذکر بار بار آ رہا تھا شاہراہِ ریشم (Silk Route) کے حوالے سے یہ بات بار بار دُہرائی گئی کہ چین سے بہتر ریشم دنیا میں کہیں نہیں ملتا اور یہ کہ چین سے بلا ریشم خریدے آنا گناہ کبیرہ سے کم نہیں۔ وفد کے سارے ارکان بھی اس موضوع پر ہم خیال تھے، اب جو پتا چلا کہ ہانگ چُو اور سوچُو ریشم کی صنعت کے گڑھ ہیں تو اس بات پر اجماع امت ہو گیا کہ ریشم کی خریداری یہیں سے کی جائے گی۔ میزبانوں نے ہماری فرمائش پر پروگرام میں کچھ ردو بدل کیا اور بتایا کہ ہم صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک ریشم سے حتی المقدور الجھ سکتے ہیں۔ شوق ریشم میں ہم سب ٹھیک نو بجے ایک بہت بڑے سلک سٹور پر پہنچ گئے ابھی دروازے بند تھے اور لوگ آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے تھوڑی ہی دیر میں دروازے کھلنے لگے مگر مجال ہے جو کسی نے بھی جلدی دکھائی ہو سارا ہجوم اتنی خاموشی اور تنظیم کے ساتھ سٹور میں داخل ہو گیا جیسے وہ شاپنگ نہیں ڈرل

کرنے آئے ہوں۔

یہاں بھی وہی زبان کا مسئلہ درپیش تھا سلک کے کاؤنٹرز پر بیس پچیس لڑکیاں موجود تھیں لیکن کسی کی بھی انگریزی یس اور نو سے زیادہ نہیں تھی تاؤ نامی ایک لڑکی وہاں کی واحد انگریزی بولنے والی تھی جو پھرکی کی طرح چاروں طرف گھوم رہی تھی اور غالباً بلحاظ عہدہ ان لڑکیوں سے سینئر بھی تھی کیونکہ وہ بار بار ان کو مختلف باتوں پر سرزنش بھی کرتی جا رہی تھی۔ حساب کتاب اور ناپ تول میں بھی یہ لڑکیاں خاصی پیدل تھیں کیونکہ ہر بار ان کے ٹوٹل میں کوئی نہ کوئی غلطی نکل آتی تھی اور کپڑے کے ناپ کے بارے میں بھی انہیں بار بار بتانا پڑتا تھا۔

شاپنگ کے سلسلے میں میری ایک عجیب عادت ہے جس کی وجہ سے میری بیوی اکثر مجھ سے نالاں رہتی ہے اور وہ یہ کہ میں زیادہ پھرنے اور مول تول کرنے کا عادی نہیں جو چیز پسند آ جائے اور خریدی جا سکے فوراً خرید لیتا ہوں کیونکہ زیادہ چیزیں دیکھنے سے سوائے آدمی کا ارادہ کمزور اور متزلزل ہونے کے اور کچھ نہیں ہوتا سو یہاں بھی میں نے جلدی جلدی تین سوٹوں کا کپڑا خریدا اور تاؤ کو ساتھ لے کر سٹور کے بچوں والے حصے کی طرف چل دیا تاؤ کے حالات ایسے نہیں تھے کہ اس کی کمی زیادہ محسوس کی جاتی مگر بطور ترجمان اس کی یقیناً سب کو ضرورت تھی سو میں نے کوشش کی کہ اسے جلد سے جلد فارغ کر دوں لیکن یہ کام کوئی اتنا آسان نہیں تھا بچوں والے حصے میں چیزیں معمولی اور قیمتیں غیر معمولی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ سٹور زیادہ تر غیر ملکی لوگوں کے لیے ہے اس لیے قیمتیں سامراج دشمن جذبے کے ساتھ رکھی گئی ہیں اب ان کو یہ کیسے بتایا جاتا کہ ہم لوگ بھی انہی کے بھائی بند ہیں اور انہی کی طرح مغربی سامراج کے ڈسے ہوئے ہیں۔

تاؤ نے بڑی گرمجوشی سے مجھے مختلف کپڑے پہن پہن کر دکھائے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ بچوں کے لیے یہاں سے شاپنگ کرنا مناسب نہیں ہوگا ہم لوگ واپس نچلے ہال میں آئے تو معلوم ہوا کہ ہماری ڈھنڈیا پڑی ہے۔ ادائیگی کے کاؤنٹر پر اشاروں کی زبان کے ذریعے بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری تھا جبکہ حسن رضوی ایک لڑکی کے جسم پر کوئی پچاس قسم کے تھان کھلوا کھلوا کر یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ بھابی کے لیے کون سا کپڑا خریدا جائے اور بروہی صاحب اس کے ہر استفسار کے جواب میں پوری سنجیدگی سے کہتے جا رہے تھے۔۔۔ ''بیوٹی فُل''

رات کو ہوٹل کی بالائی منزل پر واقع ایک بہت خوبصورت ریستوران میں ادیبوں کی مقامی انجمن کے سربراہ چیانگ شینگ یو کی طرف سے دعوت تھی چیانگ نے ہمیں اپنی ادارت میں نکلنے والا دو ماہی ادبی رسالہ بھی دیا جس کی طباعت وغیرہ بہت ہی اعلیٰ درجے کی تھی۔ ایک بڑی سی گول میز کے گرد بیٹھ کر حسبِ معمول سب سے پہلے رسمی باتوں کا دور چلا۔ دونوں ملکوں کی دوستی، باہمی بھائی چارے اور خیر سگالی کی باتیں کی گئیں۔ اس کے بعد ریستوران کے شیشوں سے نظر آتے ہوئے جھیل کے خوبصورت منظر کا ذکر چھڑ گیا معلوم ہوا کہ یہ جھیل پورے چین میں ہانگ چُو کا نشانِ افتخار سمجھی جاتی ہے۔ اس کے سلسلے میں مختلف روایتیں ہیں اور بہت سے شاعروں نے اس کی خوبصورتی پر نظمیں لکھی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جھیل ایک داستانوی عورت کے حسن کے حوالے سے بھی مشہور ہے جو اس جھیل کی صورت میں مجسّم ہو گئی ہے۔

کھانے میں ایک بہت مزیدار ڈش تھی جس کا نام ''فقیر کی مرغی'' تھا جس کی وجہ تسمیہ آخر تک معلوم نہ ہو سکی۔ ناریل کا رس پیتے اور کیشونٹ کھاتے ہوئے میرے ذہن میں ایک نظم کی لائنیں انگڑائیاں لینے لگیں میں نے سب سے نظر بچا کر کاغذ کے

ایک ٹکڑے پر ان لائنوں کو منتقل کرنا شروع کیا تقریباً آدھے گھنٹے میں نظم مکمل ہوگئی۔ یہ اور بات ہے کہ اس دوران کھانے کے بہت سے کورسز کے آنے جانے کا مجھے علم نہ ہو سکا۔ نظم ابھی نیم پختہ حالت میں تھی پھر بھی احباب نے پسند کی، رات بہت دیر تک میں اس پر کام کرتا رہا۔

ایک بند کا اضافہ کیا اور لائنوں کی نوک پلک درست کر کے اگلی صبح مکمل نظم چینی ترجمے کے لیے تھانگ کے حوالے کی اور اس کے بعد دوستوں کی فرمائش پر سب کو اس کی ایک ایک کاپی دی بعد میں یہ نظم اور اس کا ترجمہ کئی موقعوں پر پڑھا گیا۔

چلو جاپان چلتے ہیں

چند دن قبل جب نوجوان شاعر عامر بن علی کا ٹوکیو سے فون آیا کہ وہاں کی تین یونیورسٹیاں (جن میں اُردو پڑھائی جاتی ہے) اور پاکستان جاپان حلقۂ ادب وثقافت مل کر کچھ تقریبات کا اہتمام کر رہے ہیں جن میں مجھے بھی آنا ہوگا تو میرا پہلا ردِعمل سراسر حیرت پر مبنی تھا کیوں کہ دو چار کو چھوڑ کر میرے سارے غیر ملکی سفر مشاعروں کے حوالے سے ہی ہوئے ہیں اور اگرچہ جاپانی حضرات بات بات پر فرشی سلام کے انداز میں بار بار جھکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان سے ''مطلع عرض ہے'' اور ''مکرر ارشاد'' سننے کی دُور دُور تک توقع نہیں تھی۔

یوں بھی فی الوقت میں امریکا، انگلینڈ، ناروے اور بھارت کی مختلف دعوتوں سے معذرت کی کارروائیوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ تدریس سے انتظامی عہدوں پر آنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ موسمِ گرما کی چھٹیاں ختم ہوگئی ہیں جن میں طویل مدت کے لیے بیرونِ ملک سفر کرنے کی گنجائش نکل آتی تھی۔ میں نے عامر بن علی کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو اس نے یہ کہہ کر بات ہنسی میں ٹال دی کہ آنے جانے کے وقت سمیت سارا پروگرام سات دن پر مشتمل ہے اور جاپان یقیناً اس سے زیادہ کا مستحق ہے۔

گزشتہ برسوں میں ہمارے تین نزدیکی احباب جاپان کی مختلف یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دے چکے ہیں۔ یعنی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں اور تینوں ہی کی زبان سے میں نے جاپان کے بارے میں ہمیشہ کلمۂ خیر ہی سنا تھا۔ یوں بھی دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان کی صنعتی ترقی کی رفتار، اس کا والیوم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اس کی جادوگریاں ایسی ہیں کہ بے اختیار دل اس ملک اور اس کے لوگوں کو ان کے گھر میں دیکھنے کو چاہتا ہے کہ یہ قوم آج کی دنیا میں ایک زندہ معجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔

معلوم ہوا کہ شروع میں صرف مجھے اور عطاالحق قاسمی کو بلانے کا پروگرام تھا مگر اب محمود شام اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بھی ہمارے ہم سفر ہوں گے تاکہ شاعری، طنز ومزاح، صحافت اور اقبالیات چاروں شعبوں کا احاطہ کیا جا سکے۔ فارن آفس کے

جاپان ڈیسک سے متعلق افسران اسد گیلانی اور آفتاب احمد کی خصوصی دلچسپی اور کوشش سے ویزوں کے حصول کا مسئلہ بھی آسانی سے حل ہو گیا اور طے پایا کہ 9 جون کو ہم سب ٹوکیو کے لیے براستہ بنکاک روانہ ہوں گے لیکن اس دوران میں ایک واقعہ یہاں اور ایک وہاں رُونما ہوا یعنی ہمارے گروپ میں سے رفیع الدین ہاشمی علالت کی وجہ سے ڈراپ ہو گئے اور دوسری طرف جاپان کی وزارتِ خارجہ نے ہم لوگوں کو مزید ایک ہفتے کے لیے اپنا مہمان بنانے کا پُرجوش ارادہ ظاہر کیا۔ ایسی اچھی دعوت سے انکار یقیناً کفرانِ نعمت سے کم نہیں لیکن صورتِ حال کچھ ایسی ہے کہ ہم تینوں ہی اپنی اپنی مختلف وجوہات کے باعث اتنا عرصہ وہاں نہیں رُک سکتے، سو تادمِ تحریر اس بات پر سوچ بچار ہو رہا ہے کہ کس طرح اس معاملے کو سات سے چودہ دن تک بڑھانے کے بجائے نو یا دس دن میں اس طرح سمیٹا جائے کہ طے شدہ پروگرام کے بعد کچھ دن وزارتِ خارجہ کے لیے بھی نکل آئیں بہرحال جو بھی فیصلہ ہوا آپ کو اس کی اطلاع آئندہ کسی کالم میں مل جائے گی کہ میرا ارادہ اس سفر کے تاثرات کو ساتھ ساتھ قلم بند کرنے کا ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ سفرناموں کے اس جمعہ بازاری دور میں بھی جاپان کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے جو تحریریں حافظے میں موجود ہیں ان میں قابلِ ذکر نام ابنِ انشا، اختر ریاض الدین، حکیم محمد سعید اور ہمارے گریز پا مجوزہ ہم سفر رفیع الدین ہاشمی کے ہی ہیں۔ جاپانیوں کی عقل مندی اور دُور اندیشی کی داد دینی چاہیے کہ انہوں نے اپنی صنعتی ترقی کے ابتدائی زمانے میں ہی اپنی یونیورسٹیوں میں اُن زبانوں کی تعلیم کے شعبے قائم کر دیے تھے جو آئندہ چل کر ان کی مصنوعات کی منڈیاں بننے والے تھے۔ تین یونیورسٹیوں میں اُردو کی تدریس کا اہتمام بھی اسی پروگرام کا حصہ ہے۔

چینیوں کی طرح جاپانیوں کے نام بھی آپس میں اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ زیر زبر پیش یا کسی حرف پر زور دینے سے بظاہر ایک جیسے نظر آنے والے نام کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں سو ہوا یوں کہ میں نے عامر بن علی کے ہاتھ غلام عباس پر پی ایچ ڈی کرنے والے جاپانی دوست سویمانے کو اپنی ایک کتاب بھجوائی اور سنگِ میل پبلی کیشنز کے برادرم افضال احمد سے اس کا موجودہ ٹیلی فون نمبر حاصل کیا تا کہ عامر بن علی اس سے فون پر رابطہ کر کے اس کا وہ پتا حاصل کرے جس پر کتاب اسے مل جائے سب کچھ اسی طرح ہوا مگر وہ کتاب کسی اور سویمانے کو پہنچ گئی جو اُردو کی شدبد تو رکھتا ہے لیکن اس کا شعبہ عمرانیات ہے جس کے سلسلے میں وہ پاکستان آتا رہتا ہے اور غالباً افضال نے غلطی سے مجھے اس کا فون نمبر دے دیا تھا۔ جاپان کی مہنگائی، خوب صورتی اور ترقی کے قصے وہ لوگ بھی انتہائی اعتماد سے سناتے ہیں جنہوں نے آج تک جاپان کی سرزمین پر قدم بھی نہیں رکھا اب یہ کام ٹی وی، انٹرنیٹ یا دنیا کے گلوبل ولیج کی شکل میں سکڑنے، نے دکھایا ہے یا اُس سُنی سنائی کا شاخسانہ ہے جس سے ہم افواہ کو حقیقت کا روپ دے دیتے ہیں اس کا جواب تو میں آپ کو ''سفید گھوڑا'' دیکھ کر ہی دے سکوں گا۔

جن قارئین کو سفید گھوڑے کے پس منظر سے آگاہی نہیں ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک بزرگوار اپنے پوتے کے ساتھ ایک سینما کے سامنے سے گزر رہے تھے جہاں تماشائیوں کا ہجوم تھا اور ٹکٹیں بلیک ہو رہی تھیں۔ دادا کے استفسار پر پوتے نے جھجکتے اور شرماتے ہوئے بتایا کہ

> ''اس فلم میں ہیروئین بغیر کوئی کپڑا پہنے ایک سفید گھوڑے پر سواری کرتی دکھائی گئی ہے اور اسی سین کی وجہ سے یہ فلم اتنا رش لے رہی ہے۔''

بزرگوار نے چند لمحے تفکر کیا پھر بولے:

''آؤ ہم بھی یہ فلم دیکھتے ہیں کیوں کہ میں نے بھی بہت دنوں سے کوئی سفید گھوڑا نہیں دیکھا۔''

سو ہم بھی جاپان چلتے ہیں کیوں کہ ایک دوست کے بقول ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ جاپان میں گھوڑے ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔

ٹوکیو براستہ بنکاک عطاری

9 اور 10 جون کی درمیانی رات کو تھائی لینڈ کی فلائٹ نمبر T.G506 میں سوار ہوتے وقت مجھے اپنا شاعر دوست فیصل عجمی بہت یاد آیا کہ تقریباً چودہ برس قبل میں نے بنکاک کا پہلا سفر اسی کی دعوت پر کیا تھا۔ فیصل گزشتہ دو سال سے نامعلوم وجوہات کی بنا پر سین سے غائب ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کی عمدہ شاعری، رسالہ ''آثار'' اور ادب اور ادیبوں کے سلسلے میں کیے گئے بہت سے اچھے کاموں کو بھول کر اس کے سین سے غائب ہونے کی ایسی ایسی تاویلیں کرتے رہتے ہیں جن کی بنیاد صرف اور صرف افواہوں پر ہے میں اس کے کاروباری معاملات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ادب اور ادیبوں کی حد تک اس نے کچھ نہ کچھ دیا ہی ہے.....لیا نہیں!

اس بات کا میرے موجودہ دورہ جاپان سے اگرچہ کوئی براہِ راست تعلق نہیں لیکن چوں کہ میں اس کا اظہار کرنا چاہتا تھا سو آج کر دیا کہ کسی کی اچھائی کی تعریف نہ کرنا اور بُہتان تراشی ہمارے معاشرے کا عمومی مزاج بنتی جا رہی ہے جو یقیناً کوئی مثبت رویہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں آپ کو گزشتہ کالم میں بتا چکا ہوں یہ تین رُکنی ادبی دورہ پاکستان جاپان دوستی کی تنظیم کے شعبہ ادب و ثقافت کی طرف سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں مشاعروں کے ساتھ جاپان کی تین ایسی یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور طلبہ سے ملاقاتیں شامل ہیں جہاں اُردو زبان بطور مضمون پڑھائی جاتی ہے۔

لاہور سے بنکاک تقریباً ساڑھے چار گھنٹے کی فلائٹ ہے اس میں ٹائم ڈفرنس کے دو گھنٹے شامل کر کے میں اور عطاالحق قاسمی بنکاک کے وقت کے مطابق صبح ساڑھے چھ وہاں پہنچے ہمارے تیسرے ساتھی مشہور صحافی اور شاعر محمود شام ہیں جو گزشتہ شام ہم سے پہلے کراچی سے بنکاک پہنچ چکے ہیں۔ بارہ اکتوبر 99ء کو جس وقت جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کی حکومت کو ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کیا۔ عطاالحق قاسمی تھائی لینڈ میں پاکستان کے سفیر کے طور پر نیا نیا آیا تھا اس نے ان دنوں پاکستان سے کچھ شاعروں کو مدعو کر کے ایک عدد مشاعرے کا اہتمام کیا تھا اور صورتِ حال یہ تھی کہ مہمان اور میزبان دونوں کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ اُن کا مستقبل کیا ہے؟

بنکاک ایئرپورٹ پر ہمیں تقریباً پانچ گھنٹے رکنا تھا ٹرانزٹ لاؤنج میں اس وقت زیادہ تعداد پاکستانی اور ہندوستانی مسافروں کی تھی شاید اسی وجہ سے ٹرانزٹ لاؤنج جمعہ بازار کا منظر پیش کر رہا تھا اور وہ لوگ بھی ٹرانسفر ڈیسکوں کے سامنے جھمگٹا سا لگائے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے جن کی فلائٹوں میں ابھی کئی گھنٹوں کا وقت تھا۔ عطا نے دو تین لوگوں کو روک کر اس جگہ کا پتا معلوم کیا جہاں سگریٹ پینے کی اجازت تھی معلوم ہوا کہ مقامی انتظامیہ نے اس کے لیے کچھ کیبن سے بنا رکھے ہیں جن میں بیٹھ کر لوگ ایسے خضوع و خشوع سے سگریٹ پیتے ہیں جیسے کوئی عبادت کر رہے ہوں۔

عزیزی عامر بن علی نے فون پر بتایا تھا کہ بنکاک ایئرپورٹ پر آپ کو بہت اچھے مساج پارلرمل جائیں گے جہاں بہت شریفانہ فضا اور ماہرانہ انداز میں مسافروں کی تھکن دور کی جاتی ہے۔ ہمیں گیٹ نمبر گیارہ سے اپنے جہاز پر سوار ہونا تھا اسی کے راستے میں مساج پارلر تھا مختلف مساجوں کی نوعیت اور ان کی فیس انگریزی اور تھائی دونوں زبانوں میں درج تھی کندھوں اور پاؤں کے 45 منٹ کے مساج کا ریٹ 500 مقامی باتھ یعنی 15 امریکی ڈالر تھے جو یقیناً بُرا سودا نہیں تھا کہ رات کے جگراتے اور فلائٹ کی تھکن دونوں کا احساس ختم ہو گیا گزشتہ چند برسوں سے شوگر کی وجہ سے میرے پاؤں کی انگلیاں جزوی طور پر سُن رہتی ہیں، وقتی طور پر ہی سہی، لیکن یوں لگا جیسے پاؤں کی سوئی ہوئی رگوں میں زندگی جاگ پڑی ہو چناں چہ ہم دونوں نے دورانِ مساج ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ واپسی پر پھر اسی تجربے کو دہرائیں گے۔

فلائٹ کا کھانا اس بار پہلے سے بھی بدمزہ تھا میں طبعاً گوشت خور نہیں ہوں اور مچھلی بھی نہیں کھاتا اور سفر میں مجھے اکثر اس باب میں پریشانی رہتی ہے سو میں نے بن اور کافی پر اکتفا کیا اور سونے کی کوشش کی کیوں کہ سامنے سکرین پر چلنے والی فلم بھی انتہائی بور تھی جہاز خاصا بڑا اور نیا نیا سا تھا البتہ ایئر ہوسٹسوں کا انتخاب بقول عطا اس احتیاط کے ساتھ کیا گیا تھا کہ اہلِ ایمان کو کسی امتحان سے نہ گزرنا پڑے۔ جاپانی وقت کے مطابق ہم مقررہ وقت سے پانچ منٹ قبل ٹوکیو پہنچ گئے۔ امیگریشن کے پندرہ بیس کاؤنٹرز میں سے صرف ایک آباد تھا سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے بڑے اور مصروف ہوائی اڈے پر ''کوئی ویرانی سی ویرانی ہے'' کا سیٹ کیوں لگایا گیا تھا اتفاق سے ہم لائن کے ابتدائی حصے میں تھے۔ سو جلد ہی باری آ گئی۔ ہم سے پہلے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی آفیسر نے مسافر کلیئر کرنے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی لیکن ہمارا پاسپورٹ شاید اسے زیادہ پسند آ گیا تھا کیوں کہ وہ بار بار کبھی ہمیں کبھی پاسپورٹ کو اور کبھی کمپیوٹر کی سکرین کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسی اثنا میں اس کے ساتھ والے کاؤنٹر پر ایک پتلا دُبلا سا لڑکا بیٹھ چکا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر جاپانی میں کچھ کہا اور پھر ہمارے بھرے ہوئے امیگریشن فارم کا جائزہ لینے لگی اچانک کسی طرف سے ایک نسبتاً دراز قد اور خوش شکل سی لڑکی نمودار ہوئی۔ دونوں نے ہمارے پاسپورٹ اس کے حوالے کیے اس سارے عمل کے دوران تینوں کے چہروں کی مسکراہٹ میں ذرّہ برابر کمی نہیں آئی۔

نووارد حسینہ نے جو اپنی وردی سے کوئی سینئر افسر لگ رہی تھی ہمیں اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی بائیں طرف واقع ایک کمرے میں داخل ہو گئی اور پہلے سے بھی زیادہ دوستانہ مسکراہٹ سے گویا ہوئی کہ

''آپ لوگ یہاں کس مقصد سے تشریف لائے ہیں اور یہ کہ آپ کے میزبان کون ہیں اور آپ کو کہاں ٹھہرائیں گے۔''

میں نے سُن رکھا تھا کہ جاپانی لوگ اساتذہ اور پروفیسرز کی بہت عزت کرتے ہیں۔ چناں چہ میں نے اسے بتایا کہ

''ہم لوگ پروفیسر ہیں اور تین جاپانی یونیورسٹیوں کی مشترکہ دعوت پر آئے ہیں اور متعلقہ دعوت نامے ہمارے سامان میں موجود ہے۔''

اور پوچھا کہ ''آخر مسئلہ کیا ہے؟''

اس پر اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی اور اس نے کہا:

''کوئی مسئلہ نہیں آپ یہاں تشریف رکھیں میں ابھی آتی ہوں۔''

اور اس کے بعد اس نے دونوں پاسپورٹ ایک مخصوص لفافے میں ڈالے اور ایک تیسرے دروازے سے باہر نکل گئی اس دوران میں چھ سات خواتین وحضرات جو صورت سے لاطینی امریکا کے باشندے لگتے تھے کچھ گھبرائے گھبرائے سے کمرے میں داخل ہوئے اور ہمارے اردگرد بیٹھ گئے۔ ان کی خاموشی اور پریشانی طرح طرح کے اندیشوں کو جنم دے رہی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد (جو اس وقت پانچ گھنٹوں سے بھی طویل لگے) وہ اسی انتہائی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک اور دروازے سے اندر آئی اور انگریزی سے ملتی جلتی ایک زبان میں ہم سے معذرت کی کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا اور پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیے اور ہمیں اس پوائنٹ تک چھوڑنے آئی جہاں سے ہم اپنا سامان لینے کے لیے متعلقہ ہال میں داخل ہو سکتے تھے ایسی Tension بھری صورتِ حال کا یہ انجام سکون بخش ہونے کے باوجود اتنا غیر متوقع تھا کہ کتنی دیر تک ہم یہی سوچتے رہے کہ یہ قوم کیسی انسان دوست اور تہذیب یافتہ ہے۔ باہر نکلے تو عزیزی عامر بن علی اور اس کے بڑے بھائی عابد حسین سراپا انتظار کھڑے تھے ہم نے انہیں تاخیر کی وجہ اور امیگریشن افسران کی خوش اخلاقی کی رُوداد سنائی تو دونوں یک زبان ہو کر بولے کہ

''عاجزی، انکساری اور خوش اخلاقی میں جاپانی قوم کا مقابلہ صرف جاپانی قوم ہی کر سکتی ہے۔''

تویاما..... جاپانی پاکستان عطاری

تویاما میں ہمارا قیام عامر بن علی کے اپارٹمنٹ میں تھا جس میں ہماری آمد عرب کے روایتی اونٹ جیسی تھی کہ ایک ایک بیڈ روم میرے اور محمود شام کے حصے میں آیا اور عطا نے اپنا بستر لونگ روم کے فرش پر جما لیا کہ بوجوہ اسے فرشی بستر سوٹ کرتا تھا مالک مکان کو داخلی دروازے کے بالکل ساتھ دائیں ہاتھ پر واقع اس ڈربے نما دفتر میں جگہ ملی جہاں سونے کے لیے جگہ صرف جاپان ہی میں نکالی جا سکتی ہے۔

عامر نے ہمارے لیے جاپان کے مخصوص شب خوابی کے لبادوں کا اہتمام کر رکھا تھا لیکن ہم تینوں نے ان پر شلوار قمیض کو ترجیح دی کیونکہ بصورتِ دیگر غالب امکان یہی تھا کہ انہیں پہن کر سونے کا نتیجہ ہمارے گاؤں میں استعمال ہونے والی دھوتی سے مختلف نہ ہوگا جسے دیہاتی بھائی کمر پر باندھ کر سوتے ہیں اور صبح وہ ان کے اوپر چادر کی طرح پڑی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات نہیں بھی پڑی ہوتی۔

صبح قریباً آٹھ بجے عطا نے میرا کندھا ہلایا اور کہا:

''تم بہت سو چکے، اُٹھ جاؤ اب میری باری ہے کیوں کہ میں اب تک ایک پل بھی نہیں سو سکا۔''

میں نے کہا:

''میں نے خود تمہارے غیر انسانی قسم کے خراٹے سنے ہیں۔''

بولا:

''وہ میں اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے لے رہا تھا کہ آخر رات تو کسی طور کاٹنی تھی۔''

سو میں اُٹھ کر لونگ روم میں آ گیا کھڑکی سے باہر دیکھا تو خوب دن چڑھا ہوا تھا۔ اب پتا چلا کہ جاپان کو چڑھتے سورج کی سرزمین کیوں کہا جاتا ہے!

ناشتے کا انتظام امتیاز گوندل کے دفتر میں تھا جہاں دیسی پراٹھے ہمارے منتظر تھے لیکن تیار ہوتے اور نکلتے ہوئے دوپہر کے گیارہ بج گئے سو طے ہوا کہ ناشتے سے برنچ کا کام لیا جائے لیکن بات اس سے بھی آگے نکل گئی کیوں کہ ناشتے کے ہر آئٹم کا ''باورچی'' جداگانہ تھا اور ہر ایک کی کوشش تھی کہ اس کی پیش کش پر زیادہ توجہ دی جائے سو اس موقعے پر قتیل شفائی مرحوم بہت یاد آئے جن کا ایک مصرعہ ہے:

بٹ نہ جائے ترا بیمار مسیحاؤں میں

اور پھر اسی رعایت سے مرحوم حسن رضوی بھی یاد آیا کہ وہ ہر مشاعرے میں قتیل صاحب سے شرارتاً اس غزل کی فرمائش کرتا تھا اور پھر اس کے مطلع پر زیرِلب ایسے ایسے دلچسپ تبصرے کرتا تھا کہ پاس بیٹھے ہوئے دوستوں کو ہنسی روکنا مشکل ہو جاتی تھی چلیے ہاتھوں وہ مطلع بھی پڑھ لیجیے:

رقص کرنے کا ملا حکم جو دریاؤں میں
ہم نے خوش ہو کے بھنور باندھ لیے پاؤں میں

امتیاز گوندل کے شوروم (جسے وہاں پارکنگ کہا جاتا ہے) کے اردگرد کئی میل تک وقفے وقفے سے طرح طرح کی کاریں ہزاروں کی تعداد میں کھڑی تھیں جہاں سے انہیں دُنیا کے مختلف ملکوں میں بھجوایا جاتا ہے جن میں سرِفہرست لاطینی امریکا کے ممالک تھے ان کے علاوہ بڑی مارکیٹوں میں روس، دوبئی، پاکستان اور افریقہ کے کچھ ملک شامل تھے طریقہ کار یہ تھا کہ پورے جاپان سے جمع کردہ استعمال شدہ کاریں مقررہ دنوں پر نیلام کے لیے پیش ہوتی تھیں اور خریدنے والے کمپیوٹر کے ذریعے بولی لگاتے اور بڑھاتے تھے اور عام طور پر ایک کار دو منٹ سے کم عرصے میں فروخت ہو جاتی تھی یعنی کمپیوٹر سکرین پر صرف کار کی تصویر اور چند بنیادی معلومات نمودار ہوتی تھیں اور خریدار اپنے اپنے دفتروں میں بیٹھے ''کلک'' کے ذریعے اپنی مطلوبہ یا پسندیدہ کار کی بولی میں حصہ لے کر اسے خرید لیتے تھے اور یہی وہ کاروبار تھا جس میں پاکستانی گزشتہ پندرہ بیس برس سے چھائے ہوئے تھے۔

امتیاز گوندل اور وہاں پر موجود دیگر پاکستانی کار ڈیلر دوستوں کا خیال تھا کہ اگر حکومتِ پاکستان انہیں موقع دے تو وہ پاکستان میں بہترین کاریں انتہائی کم قیمت پر فراہم کر سکتے ہیں۔ جاپانی لوگ عام طور پر تین سال کے بعد کار بدل لیتے ہیں سو بیشتر کاریں ایسی عمدہ حالت میں ہوتی ہیں کہ ان میں اور نئی کار میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور قیمتوں کا یہ عالم ہے کہ 1300 سی سی کی کار اس نیلامی میں پاکستانی کرنسی کے مطابق ڈیڑھ لاکھ میں مل جاتی ہے کرایہ، کاغذات کی تیاری اور تمام ٹیکس شامل کر کے یہ کراچی میں پانچ سوا پانچ لاکھ میں پہنچ جاتی ہے جبکہ یہاں مقامی طور پر تیار کی ہوئی نسبتاً بہت ناقص کار دس سے بارہ لاکھ کے درمیان پڑتی ہے۔ موجودہ بجٹ میں پانچ سال سے زیادہ پرانے ماڈل کی کاروں کی امپورٹ پر پابندی عاید کر دی گئی ہے۔ تویاما کے پاکستانی کار ڈیلرز کا خیال تھا کہ یہ قدم پاکستان میں تیار ہونے والی کاروں کی طلب بڑھانے اور ان کے بزنس میں ملوث صاحبانِ اقتدار کو تحفظ دینے کے لیے اُٹھایا گیا ہے ورنہ اب بھی عام آدمی کو چھوٹی کار بہت اچھی حالت میں انتہائی سستی قیمت پر مل سکتی ہے۔

میں چونکہ اس معاملے کی تفصیلات نہیں جانتا لہٰذا ممکن ہے کہ حکومتِ پاکستان کے پاس اپنی اس پالیسی کا کوئی معقول

جواز ہو لیکن ایک عمومی تاثر یہی ہے کہ اگر ان استعمال شدہ گاڑیوں کی امپورٹ میں آسانیاں پیدا کی جائیں تو پاکستانی عوام کو دو ڈھائی لاکھ میں بہت اچھی اور پائیدار گاڑیاں مل سکتی ہیں۔

امتیاز گوندل کے دفتر سے ہم لوگ تین چار گاڑیوں کے ایک قافلے کی صورت میں چلے اور چند ایسے دفتروں میں رُکے جن کے مالکان کا تعلق مشاعرہ کمیٹی سے تھا یہ گویا ایک خیر سگالی کا دورہ تھا جس کا مقصد پاکستانی کمیونٹی میں اتفاق اور بھائی چارے کے جذبات کو اُبھارنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا تھا کہ یہ مشاعرہ اس شہر میں ہونے والی پہلی باقاعدہ ادبی تقریب تھی امتیاز گوندل نے بتایا کہ ہماری یہ چند منٹ کی وزٹ ان احباب کو مدتوں یاد رہے گی اور وہ آئندہ کمیونٹی کے کاموں میں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے میں نے امتیاز گوندل کو مشورہ دیا کہ اسے آئندہ انتخابات میں اپنے علاقے منڈی بہاؤالدین کی کسی سیٹ سے الیکشن لڑنا چاہیے کیوں کہ ایسی سیاسی سوجھ بوجھ والے لوگ ہماری اسمبلیوں میں کم کم ہیں اس پر ملک ممتاز نے لقمہ دیا کہ

''پاکستان میں سیاست، لیاقت سے نہیں دولت سے کی جاتی ہے اور اگر وہاں ہمارے پاس دولت ہوتی تو ہم یہاں آتے ہی کیوں!''

مشاعرے سے پہلے، ہماری یقین دہانیوں کے باوجود کہ ہم عامر کے اپارٹمنٹ میں بہت آرام سے ہیں، ہمیں کینال پارک ہوٹل میں منتقل کر دیا گیا اور دلیل یہ دی گئی کہ چوں کہ مشاعرہ بھی وہیں ہے اس لیے ہمیں آرام کرنے اور تیار ہونے میں آسانی ہوگی چناں چہ ایک بار پھر سامان سمیٹا اور پھیلایا گیا۔ اس مشاعرے کا ہال بھی نسبتاً بڑا تھا اور سامعین بھی تعداد میں ٹوکیو سے زیادہ تھے۔ البتہ ایک بات مشترک تھی کہ دونوں جگہ کسی مقامی شاعر نے اپنا کلامِ بلاغت نظام پیش نہیں کیا ملک ممتاز نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ

''یہاں لوگ ہندسوں میں اس قدر اُلجھے ہوئے ہیں کہ ان کے پاس لفظوں کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ جب عامر بن علی کوئی نئی غزل کہہ لے تو اسے سامعین کی تلاش میں پاکستان جانا پڑتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اسے ایک شعر بیس ہزار جاپانی ین (دس ہزار پاکستانی روپے) اور ایک غزل دس مان = سوا مریکی ڈالر) میں پڑتی ہے۔''

اس بات کا سب سے زیادہ لطف عامر بن علی نے لیا کہ وہ فطرتاً ایک خوش طبع نوجوان ہے اور اچھا جملہ کہنے اور سہنے کی تاب رکھتا ہے۔ مشاعرے کے بعد کھانا ایک کورین ریستوران میں تھا جس کی انفرادیت یہ تھی کہ ہر میز کے درمیان ایک برقی انگیٹھی نصب تھی بیرے آرڈر کے مطابق کچا لیکن سلیقے سے کٹا ہوا مرغی، مچھلی اور گائے کا گوشت پلیٹوں میں لا کر رکھ دیتے تھے جسے گاہک خود آگ کے اوپر رکھی ہوئی ایک جالی پر سینکتا، پکاتا اور کھاتا تھا۔ میری جھجک دیکھ کر میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک مقامی میزبان نے سبزیوں کے نام پر پتا نہیں کیا کیا الابلا لا کر میرے سامنے رکھ دیا اور ریستوران والوں کو تھرتھلی ڈال دی کہ وہ کوئی ایسی چیز تیار کر دیں جو میں کھا سکوں لیکن سوائے سفید چاول کے چند لقموں کے دل کسی چیز کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ سو میں نے اللہ کا نام لے کر اور بسم اللہ پڑھ کر چکن کے چند قتلے نوش جان کیے کہ مجبوری کی حالت میں تو بہت سہولتیں دی گئی ہیں یہاں تو صرف ذبیحے کا مسئلہ تھا اور بقول ہمارے ایک دوست کے اگر آپ کبھی پاکستان میں مرغیاں ذبح ہوتے دیکھ لیں تو یہ مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جاتا ہے۔

آگرہ

آگرہ کے لیے ڈاکٹر تقی نے ایک پرائیویٹ ٹیکسی کا انتظام کر رکھا تھا جسے رحمٰن ساتھ لے کر آیا تھا ڈرائیور تھا تو جوان عمر مگر غالباً شب بیداری کی وجہ سے پکی عمر کا لگ رہا تھا۔ اُس نے ایک طائرانہ سی نظر اپنی ''سواریوں'' پر ڈالی اور پھر ایک طرف کھڑا ہو کر سگریٹ پینے لگا کہ ہمارے الوداعی جملے ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ گاڑی خاصی آرام دہ تھی اور ٹھنڈی بھی تھی۔ میں نے کہا:

''تقی بھائی آپ کو پتا ہے غالبؔ نے ایئر کنڈیشنگ پر بھی ایک شعر کہہ رکھا ہے۔''

حیران ہو کر بولے:

''وہ کون سا!''

میں نے کہا:

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

تقی پھڑک اُٹھے اور دیر تک پھڑکتے رہے کیونکہ اس کے بعد لطیفوں کا ایک ایسا سلسلہ چل نکلا جو آگرہ کے نواح تک ہمارے ساتھ ساتھ چلا۔ قابلِ تحریر لطیفوں میں ایک یقیناً ایسا ہے کہ اُسے آپ تک پہنچایا جائے۔

ایک بہت بوڑھے میاں بیوی کا مسئلہ تھا کہ اُن کا حافظہ بہت کمزور ہو چکا تھا اور انہیں چہرے، نام اور جگہیں یاد رکھنے میں بڑی دِقت ہوتی تھی، تنگ آ کر انہوں نے ایک ماہرِ نفسیات سے مدد لینے کا فیصلہ کیا اور اُس کے پاس جانے لگے۔ ایک دن کسی دوست نے پوچھا کہ

''اس علاج سے کوئی فائدہ بھی ہو رہا ہے یا نہیں؟''

''بہت فائدہ ہو رہا ہے۔'' بڑے میاں نے جواب دیا۔

''مثلاً'' دوست نے پوچھا وہ تمہاری یادداشت کی بہتری کے لیے کیا کرتا ہے۔''

''وہ ہمیں علامتوں اور نشانیوں کے ذریعے بھولی ہوئی بات تک پہنچنے کا طریقہ سکھا رہا ہے۔ یعنی جو چیز یاد نہ آ رہی ہو اُس سے ملتی جلتی چیزوں کے ذریعے اُس تک پہنچا جائے۔''

''بہت خوب'' دوست نے کہا، ''نام کیا ہے تمہارے ڈاکٹر کا!''

اس پر بزرگ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا:

''وہ کون سا پھول ہوتا ہے جس کا رنگ سرخ اور خوشبو بہت تیز ہوتی ہے؟''

''روز (Rose)''

بوڑھے نے مڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بولا:

''روز ڈارلنگ، ہمارے ڈاکٹر کا کیا نام ہے؟''

راستے میں جلال الدین اکبر کا مقبرہ پڑا جس میں ''جلال'' کے علاوہ سب کچھ تھا ٹکٹ گھر کی کھڑکی بھی سنسان پڑی تھی معلوم ہوا کہ یہاں مقامی لوگوں یعنی بھارتیوں کے لیے تو داخلہ فیس دس روپے ہے مگر غیر ملکی سیاحوں سے 250 روپے لیے جاتے ہیں۔ بھلے ہی یہ اُن کے پانچ ڈالر بنتے ہوں لیکن سیاحت کے فروغ کے حوالے سے اتنا زیادہ فرق سمجھ میں نہیں آیا۔ تقی عابدی کی وجہ سے میں بھی ''مقامی'' شمار ہوا اور یوں بھارتی حکومت کا محکمہ سیاحت 240 روپے سے محروم ہو گیا جبکہ کشمیر کے حالات کی وجہ سے کئی برسوں سے اُسے پہلے ہی بھاری نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی جو پہلا تاثر اُبھرا وہ ویرانی کا تھا داخلے کے بڑے دروازے کے بعد ایک ڈیوڑھی سی تھی جس کے وسط میں ایک شوکیس نما کاؤنٹر تھا جہاں کچھ بروشرز، کتابیں اور غالباً پکچر کارڈ وغیرہ پڑے تھے مگر وہاں کوئی بھی ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ اردگرد دیواروں پر بیل بوٹوں کے درمیان کچھ فارسی اشعار درج تھے جن کو ڈاکٹر تقی نے اپنی فارسی دانی کے باعث فرفر پڑھ لیا جبکہ مجھے خاصی دِقت ہوئی ایک تو خطاطی قدرے غیر مانوس تھی اُس پر اکثر حروف شکستگی کے مختلف مراحل میں تھے۔ اس وقت فارسی کے حوالے سے ایک واقعہ بہت یاد آیا جس کا راوی تو عطاالحق قاسمی ہے مگر دیکھا گیا ہے کہ ایسے موقعوں پر صیغہ واحد متکلم کا استعمال بات کے لطف اور تاثیر کو بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کرتے ہیں۔

''کچھ دوست ایران گئے اُن میں سے ایک کا دعویٰ تھا کہ وہ فارسی کا فاضل ہے۔ چناں چہ انہیں اس کی موجودگی میں ''ابلاغ'' کا مسئلہ پیش نہیں آئے گا پہلے ہی دن انہیں سواری کی ضرورت پڑی تو دوستوں نے کہا:

''اپنی فارسی استعمال کرو اور کسی سے پوچھو کہ ہمیں سواری کہاں سے ملے گی؟''

اس پر جو فارسی اُن صاحب نے بولی وہ کچھ یوں تھی۔

''آغا۔ آغا ازیں جا'' "Any transport available?"

ڈاکٹر تقی مسکرائے اور بولے:

''یہ آپ میری فارسی پر طنز تو نہیں کر رہے؟ یاد رہے کہ فارسی میرے بچوں کی مادری زبان ہے۔''

''اگرچہ میں آپ کی فارسی دانی کا قائل ہوں مگر اس دلیل کا نہیں کیوں کہ میری بیوی کھانا بہت اچھا بناتی

ہیں مگر مجھے انڈا تک فرائی کرنا نہیں آتا۔''

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر تقی اسی جملے کی داد مکمل کر سکتے ایک ہونق سا بوڑھا درمیان میں ٹپک پڑا اور بتانے لگا کہ وہ ''گائیڈ'' ہے اور اگر ہم اس کے ساتھ ''مک مکا'' کر لیں تو وہ ہمیں اس مقبرے کے ساتھ ساتھ قلعے اور تاج محل کے بارے میں ایسی ایسی باتیں بتا سکتا ہے جن کا بہت کم لوگوں کو پتا ہے کیونکہ وہ تیس برس تک ''تاج محل'' کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے طور پر کام کر چکا ہے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد اس کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کے ساتھ ساتھ ''گائیڈ'' کا کام بھی کرتا ہے اور یہ کہ نوجوان مگر ناتجربہ کار لڑکے بدمعاشی کے زور پر اُسے سیاحوں تک پہنچنے نہیں دیتے جس کی وجہ سے اس کا گزارہ بہت مشکل سے ہو رہا ہے۔

رائے زادہ، یہی نام بتایا تھا اُس نے اپنا، کے بہت سے کمال تو آگے چل کر کھلے لیکن پہلی بات یہ پتا چلی کہ موصوف یا تو اونچا سنتے ہیں یا بہت اونچا سنتے ہیں اور جہاں تک سمجھنے کا تعلق ہے یہ تکلف اُس نے سرے سے پالا ہی نہیں وہ اپنی دُھن میں یہ دیکھے بغیر بولے چلا جاتا تھا کہ اُس کے سامعین اس وقت کہاں ہیں اور اُس کی بات سُن بھی رہے ہیں یا نہیں.....!!

تقی نے کہا:

''میرا خیال ہے اسے لے لیتے ہیں اس کی ضرورت تو نہیں لیکن بوڑھا آدمی ہے اس کی دیہاڑی لگ جائے گی اور ممکن ہے کوئی نئی بات بھی اس سے پتا چل جائے۔''

میں نے کہا:

''آپ کی پہلی بات تو مناسب ہے کہ اس کے حالات واقعی اچھے نہیں لگ رہے لیکن جہاں تک اس کی ''گائیڈانہ صلاحیت'' کا تعلق ہے میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ یہ سوائے ہمیں بور کرنے کے کچھ نہیں کرے گا۔ گائیڈ ہو تو فلم گائیڈ کے دیوآنند جیسا کہ جس کی بات سن کر مزا آئے!''

تقی مسکراتے ہوئے بولے:

''اس کے بعد آپ وحیدہ رحمٰن کو بھی دیکھنا چاہیں گے۔''

میں نے کہا:

''ہرگز نہیں، کیوں کہ اس کی وحیدہ رحمٰن بھی اسی جیسی ہو گی اور میرا تجربہ ہے کہ ہونق عورت ہونق مرد سے زیادہ ہونق ہوتی ہے۔''

ہماری اس گفتگو کے دوران رائے زادہ ہمیں دیواروں پر بنے ہوئے مختلف نقوش کے حوالے سے اکبر کے سیکولرازم اور اُس کی مختلف بیویوں کی قومیت کے بارے میں ایک طویل معلوماتی لیکچر دے چکا تھا جس سے اندازہ ہو گیا کہ وہ تاریخ کے بجائے فکشن کا آدمی ہے اور بہت بنیادی معلومات کو بھی طوطا مینا کی کہانیوں کے انداز میں بیان کرتا ہے۔ میں نے اُسے کسی بات پر ٹوکا تو اس نے مسکرا کر سر تو ہلایا مگر اپنی بات کے تسلسل میں فرق نہیں آنے دیا پس ثابت ہوا کہ جہالت کے مزے اور فائدے عقل سے زیادہ ہوتے ہیں۔

اکبر کے مقبرے سے نکلے تو رائے زادہ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور آئندہ پروگرام کی کمانڈ اپنے ہاتھ

میں لیتے ہوئے ڈرائیور کو ہدایات دینے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں ایک ایسی ''جنگِ تخت نشینی'' شروع ہوگئی جس سے مغلوں کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ رائے زادہ کی پوزیشن بے حد کمزور تھی کہ اُس کے پاس سوائے غربت اور بڑھاپے کے کچھ نہیں تھا لیکن وہ آخر دم تک میدان میں ڈٹا رہا کہ سننے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کی کمی کے باعث اسے بہت دیر تک غالباً پتا ہی نہ چل سکا کہ ڈرائیور اُس پر ناراض ہو رہا ہے۔

ہمارا اگلا پڑاؤ آگرے کا قلعہ تھا۔ آگرہ عرف اکبر آباد کو اُردو کے تین بڑے شاعروں میر تقی میرؔ، نظیر اکبر آبادی اور اسد اللہ خان غالبؔ کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ''تاج محل'' سے بھلے ہی ساحر لدھیانوی کو اک شہنشاہ سے، دولت کا سہارا لے کر غریبوں کی محبت کا مذاق اڑانے کا گلہ ہو لیکن آگرے کا یہ شرف بہر حال اپنی جگہ ہے کہ اُسے ان تین نابغوں سے نسبت کا حوالہ حاصل ہے۔ یہ تینوں اس بلا کے فن کار ہیں کہ ان کے دیوان ''کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است'' کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کا صرف ایک ایک شعر درج کروں گا کہ دیگ کا ایک دانہ پوری دیگ کا تعارف ہوتا ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

میرؔ

گل سے کوئی کہے کہ شگفتن سے باز آ
اُس کو تو پھولنا ہے، نہ پھولے تو کیا کرے!

نظیرؔ

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار! تمنا کہیں جسے!

غالبؔ

رائے زادہ کی گفتگو اور عزائم سے ظاہر ہوا کہ ''قلعے کی سیاحت'' کم از کم دو گھنٹے لے گی سو طے پایا کہ کچھ پیٹ پوجا کر لی جائے۔ اس پر ڈرائیور اور رائے زادہ میں اختلاف رائے اور دبی دبی تلخی کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو آگے چل کر مستقل حیثیت اختیار کر گیا کہ نیام ایک تھا اور تلواریں دو۔ رائے زادہ کی پوزیشن اور صحت دونوں کمزور تھیں۔ سو وہ اپنے اختلافی کلمات، ڈرائیور کے بجائے گاڑی کی چھت کی طرف دیکھ کر ادا کرتا تھا اور بغیر ہمیں مخاطب کیے یہ باور کرانے کوشش میں تھا کہ اُس کا واحد مقصد ہم سے وفاداری اور ہمارے نمک کو حلال کرنا تھا۔ اب پتا نہیں یہ معمول تھا یا اُس کا دن ہی برا تھا کہ جو بھی گواہی آئی اس کے خلاف ہی آئی۔ قلعے کے دروازے پر کچھ گائیڈ نما نوجوانوں نے ہمیں گھیرنے کی کوشش جب ہم نے رائے زادہ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ہم پہلے سے ایک عدد گائیڈ کے ساتھ ہیں تو انہوں نے بہت زور دے کر کہا کہ یہ (یعنی رائے زادہ) باقاعدہ اور لائسنس یافتہ گائیڈ نہیں ہے اور ہمیں اس فراڈیے سے بچ کے رہنا چاہیے۔ رائے زادہ نے اس ''رائے'' پر کسی ''خفگی'' یا ''تردید'' کا اظہار نہیں کیا اگر یہ کمال اُس کے بہرے پن کا تھا تو ثقلِ سماعت یقیناً اس کے لیے ایک عطیہ خداوندی تھی۔

غیر ملکی سیاحوں کے لیے ٹکٹ کی شرح یہاں بھی عام ٹکٹ سے کئی گنا زیادہ تھی لیکن چونکہ ''سیاح'' ہونے کا راز صرف رنگ، چہرے کے نقوش اور زبان سے کھل سکتا تھا سو ٹکٹ گھر کے عملے پر فرائض سے غفلت برتنے کا الزام عائد کرنا مناسب نہ ہو گا۔ رائے زادہ نے بڑے تفاخر سے ہمیں اپنا ٹکٹ خریدنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ یہاں کا سارا عملہ ایک طرح سے اُس کی گود کا کھیلا ہوا ہے۔ قلعے کا سائز لاہور کے شاہی قلعے سے چھوٹا ضرور تھا مگر طرزِ تعمیر میں بیشتر چیزیں مشترک تھیں۔ ان محلات کو دیکھ کر آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بادشاہ حضرات یہاں رہتے کس طرح تھے؟ مغربی گھروں میں، بہت پتلی ہی سہی، دیواریں ہوتی تو ہیں۔ یہاں غالباً یہ کام کپڑے کے پردوں سے لیا جاتا ہو گا کہ سب نہیں تو بیشتر کمرے دو اور باقی کے تین طرف سے کھلے تھے ممکن ہے خواجہ سراؤں کو خادم رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو۔

رائے زادہ ہمیں مغلوں کی تاریخ سے ایسے واقعات سنا رہا تھا جو ہمیں پہلے سے ازبر تھے سو ہم نے اس کی طرف دھیان دینا کم کر دیا۔ البتہ ایک دو جگہ جب اُس نے واقعات کو خلط ملط کرنے کی کوشش کی تو ہم نے اُسے ٹوک دیا جس کا اثر صرف اتنا ہوتا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے انگریزی میں بولنا شروع کر دیتا یعنی واقعات کی جگہ زبان سے بے تکلف ہو جاتا۔ اُس کی موجودگی کا واحد فائدہ یہ تھا کہ اُسے قابل دید جگہوں کے شارٹ کٹ معلوم تھے۔ جس سے ہمارے سفر اور اس کی تھکن دونوں میں بچت ہوئی۔ ڈاکٹر تقی کا کیمرہ بہت اچھی نسل کا تھا اور آٹو فوکس ہونے کی وجہ سے تصویر کشی کے سارے مسائل خود ہی طے کرتا تھا۔ تصویر کھینچنے والے کا کام صرف بٹن دبانا ہی رہ جاتا تھا مگر رائے زادہ نے ہماری تصویریں اُتارنے میں اتنی ''مشقت'' کی کہ تقی بھائی کو اپنے کیمرے کی کوالٹی پر باقاعدہ شک ہونا شروع ہو گیا۔

مختلف دالانوں اور باغوں کی روشوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سے کچھ فاصلے پر تاج محل اپنی پوری آب و تاب سے نظر آ رہا تھا قلعے اور محل کے درمیان ایک غیر آباد قطعہ زمین تھا جس کے درمیان میں کہیں جمنا اس طرح بہہ رہی تھی یا شاید بہہ رہا تھا کہ اُسے ڈھونڈنے کے لیے بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت تھی۔ یگانہ کا ایک شعر بے تحاشا یاد آیا.....

پہاڑ کاٹنے والے، زمین سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

ایک کھلی سی جگہ پر سفید اور سیاہ پتھر کے دو بڑے بڑے تخت آمنے سامنے بنائے گئے تھے ان کا مقصد اور استعمال کیا تھا؟ اس کی خبر رائے زادہ کو بھی نہیں تھی۔ سو اُس نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ دیا کہ ان کا مقصد غالباً ''ڈیکوریشن'' تھا۔ جی تو چاہا کہ اس ''ڈیکوریشن'' کے آئیڈیا پر اُسے ایک لطیفہ سناتا مگر اس لیے چپ ہو رہا کہ اول تو اسے سنائی نہیں دے گا اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو اُسے سمجھائے گا کون! اور درج اس لیے نہیں کر رہا کہ ''اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔''

جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے کوئی پندرہ بیس فٹ نیچے ایک جھروکے دار عمارت تھی جس کے بعد قلعہ ختم ہو جاتا تھا یہ اور بات ہے کہ قلعے کی فصیل اور اس عمارت کے درمیان پانی کی نہر اور ایک خاصا بڑا کھلا علاقہ تھا جو اُس زمانے میں بیرونی حملوں سے دفاع کا ایک طریقہ تھا۔ رائے زادہ نے بتایا کہ یہی وہ جھروکا ہے جہاں شاہ جہاں نے اپنی زندگی کے آخری چند سال گزارے اُس سے پہلے یہ حصہ ارجمند بانو عرف ممتاز محل کا رہائشی علاقہ تھا جو اب اس تاج محل میں ابدی نیند سو رہی ہے جو یہاں

سے اپنے پورے جمال کے ساتھ جلوہ نما ہے۔ اس پر پتا نہیں کیوں مجھے ظہور نظر مرحوم کا ایک شعر بہت یاد آیا جو انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی قید کے حوالے سے لکھا تھا واضح رہے کہ بھٹو کو جس جیل میں رکھا گیا تھا وہ پرانے پریذیڈنٹ ہاؤس کے بالکل سامنے واقع تھی۔ اب یہ شعر شاید زیادہ بامعنی ہو جائے.....

کیا ہے قید مجھے اُس جگہ پہ ظالم نے
جہاں سے صاف مرا گھر دکھائی دیتا ہے

یہاں سے بات اسلامی تاریخ کی طرف نکل گئی کہ تخت نشینی کی جنگوں میں جتنی قتل و غارت اور برادر کشی ہم نے کی ہے اس کی مثال انسانی تاریخ میں ملنا بہت مشکل ہے۔ یہاں تک کہ اورنگ عالمگیر جیسے لوگ بھی، جن کی ایمانداری، سادگی اور اسلام پسندی کی مثالیں دی جاتی ہیں، اس صف سے باہر نہیں ہیں بلکہ اُس نے تو بھائیوں کو مروانے کے ساتھ ساتھ سگے باپ کو بھی نہیں بخشا کہ جو کئی سال اس جھروکے میں قید رہنے کے بعد موت کے ہاتھوں آزاد ہوا۔

بات شاید کچھ اور گھمبیر ہو جاتی لیکن رائے زادہ ہم کو مہارانی جودھا بائی کے خصوصی محل کی طرف لے گیا جہاں بقول اُس کے مہارانی کو اپنے مذہبی عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے کی مکمل آزادی تھی جس کی گواہی اس محل سرا کے در و دیوار تھے جو ہندومت کی نشانیوں اور علامتوں سے بھرے پڑے تھے۔ یہ مذہبی رواداری اور جیو اور جینے دو کی روش آگے کیوں نہیں چل پائی؟ بھگت کبیر، بابا گرونانک اور حضرت میاں میر ؒ کے ماننے والے اگر ایک دوسرے کے ساتھ Co-exist کر سکتے تھے تو بعد میں دراڑیں کیسے پڑ گئیں؟ کیا مسلمانوں کا زوال، انگریزوں کی آمد اور ہندوؤں کی قومی بیداری اس کا سبب بنے یا یہ سلسلہ اورنگزیب عالمگیر کی مذہبی انتہا پسندی کے ردعمل میں جاری ہوا؟ تاریخ ہمیں کوئی جواب دینے کے بجائے اور الجھاتی چلی جاتی ہے۔

یورپ کی صنعتی ترقی اور نت نئے ایجادات نے ہماری دستکاری اور ہنرمندی کو بے قیمت کر دیا اور لارڈ کلائیو کے جدید بحری جہازوں پر نصب توپوں نے ہمارے شمشیر زنوں اور نیزہ بازوں کو اس حد تک بے بس کر دیا کہ ان کے ہاتھی گھوڑے انہی کو روندنے لگے اور اسی ہزار کا لشکر کلائیو کے پانچ سو سپاہیوں اور میر جعفر کی غداری کے سامنے پل جھپکتے میں تتر بتر ہو گیا۔ ظہیر الدین بابر سے بہادر شاہ ظفر تک پہنچنے میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی کہ بابر قلعے کی دیوار پر دو آدمیوں کو بغل میں دبا کر دوڑا کرتا تھا اور بہادر شاہ ظفر کو دو آدمی اٹھا کر کھڑا کرتے تھے۔

میرا دماغ اسی طرح کے اُلٹے پلٹے سوالوں اور منظروں میں گھرا ہوا تھا کہ اچانک رائے زادہ کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ بتا رہا تھا کہ شاہ جہاں کے زندانی جھروکے میں داخلہ بند ہے اور ہمیں یہیں رُک کر اُسے دیکھنا ہوگا۔ میں نے سوچا.....

گئی رتوں کا ملال کب تک
چلو کہ شاخیں تو ٹوٹتی ہیں!
چلو کہ قبروں پہ خون رونے سے
اپنی آنکھیں ہی پھوٹتی ہیں!

لیکن اُسی وقت اقبال کی آواز نے کانوں میں سرگوشی سی کی:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اور آج فروری 2004ء کی ایک ڈھلتی ہوئی دوپہر میں دیکھا جائے تو دنیا واقعی کیا سے کیا ہو چکی ہے؟ ایک طرف میں اور تقی عابدی ایک ہی زمین پر قائم دو مختلف ملکوں کے شہری ایک ساتھ کھڑے اپنی مشترکہ تاریخ کے غبار میں گم ہیں اور دوسری طرف دنیا کے نقشے پر 50 سے زیادہ مسلمان ملک اپنی نئی سرحدوں سمیت ظہور کر چکے ہیں۔ ان کی آزادی مختلف طرح کی غلامیوں سے مشروط سہی مگر کیا ان کا موجود ہونا بذات خود کسی معجزے سے کم ہے؟ جہاں تک بھارت اور پاکستان کا تعلق ہے تو کیا چولہا الگ الگ کر لینے سے سارے رشتے ختم ہو جاتے ہیں؟ ایک مشترکہ خاندان سے نکل کر دو بھائی اپنے اپنے گھروں میں منتقل ہونے کے بعد اچھے ہمسایوں کی طرح کیوں نہیں رہ سکتے؟ جھگڑا تو ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے تھا جب وہ وجہ ہی ختم ہو گئی تو جھگڑا کیسا؟ یہ بات میں نے مختلف پلیٹ فارموں سے بار بار کہی ہے۔ اصولی طور پر اسے سب مانتے بھی ہیں لیکن عملی طور پر کوئی اس کے ساتھ کھڑا ہونے کو تیار نہیں۔

56 سال میں ہم تین جنگیں لڑ چکے ہیں، فائدہ کسی کو بھی نہیں ہوا، تو یہ ہمہ جہت نقصان کا کھیل کب تک جاری رہے گا؟ جواب ملتا ہے جب تک وہ لوگ چاہیں گے جن کو اس میں فائدہ ہو رہا ہے۔ کون ہیں وہ لوگ؟ What a silly question? جی نہیں..... یہ سوال احمقانہ نہیں، احمق ہم خود ہیں، ہمارے عوام غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے حصے کے وسائل جنگی ساز و سامان میں ڈھل کر راکھ کر ڈھیر بنتے جا رہے ہیں۔ ہم دوضدی ڈرائیوروں کی طرح ایک دوسرے کا رستہ روکے کھڑے ہیں جبکہ وقت کا ٹریفک ہمارے دائیں بائیں سے گزرتا چلا جا رہا ہے ہم اپنے اپنے دعووں اور جواب دعووں کی بازگشت میں زندہ ہیں اور نہیں جانتے کہ سازِ زندگی کی لَے مسلسل بدلتی جا رہی ہے اور اگر ہم اسی طرح رہے تو اس آرکسٹرا میں ہمارے لیے ''شامل باجہ'' بننے کے علاوہ کوئی جگہ نہیں رہے گی شاہ جہاں کی طرح ہم بھی جھروکے سے اپنی آرزوؤں کے مقبرے کو دیکھتے رہ جائیں گے۔

اب یہ رائے زادہ کے ہاتھوں کی ''برکت'' تھی یا جاپانی ٹیکنالوجی کی کارستانی کہ ڈاکٹر تقی کے نئے کیمرے نے شوخ چشمی کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا یعنی اُس کی Flash اپنی مرضی سے چلنے لگی طے پایا کہ اس کی بیٹری بدل کر دیکھا جائے۔ قلعے کے بیرونی دروازے کے قریب فوٹو گرافی کے سامان سے متعلق ایک پوری مارکیٹ (جسے گشتی مارکیٹ کہنا زیادہ مناسب ہو گا) ریڑھیوں اور ٹھیلوں کی شکل میں موجود تھی۔ بہت سے لوگ بیک وقت آوازیں دے کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ پتا لگانا بہت مشکل تھا کہ ان میں سے اصل دکاندار کون ہے؟ تقی کا کیمرہ یکے بعد دیگرے تین آدمیوں نے چیک کیا۔ تیسرے محقق نے ایک پلاسٹک کے لفافے کو ڈارک روم میں تبدیل کیا اور کیمرہ اس کے اندر ڈال کر کچھ جنتر منتر کرنے لگا چشم زدن میں اس نے فلم نکال کر ہمارے حوالے کی، بیٹری تبدیل کی اور تقی کی دی ہوئی نئی فلم لوڈ کر کے آواز لگائی کہ

''اس ساری جادوگری کا مول صرف ایک سو اسی روپیہ سکہ رائج الوقت ہے۔''

تقی نے اُسے سو سو کے دو نوٹ دیئے تو بقیہ بیس روپے مسئلہ کشمیر بن گئے کہ اردگرد کے کسی دکاندار کے پاس بھی ٹوٹے ہوئے بیس روپے موجود نہیں تھے۔ تقی نے آہستہ سے میرے کان میں کہا:

''یہ سب ڈرامہ کر رہے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ سیاح لوگ جلدی میں ہوتے ہیں اور چھوٹے موٹے نقصان کو انتظار اور وقت کے ضیاع پر ترجیح دیتے ہیں لیکن یہ ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکیں گے۔''

اُن کا اندازہ صحیح تھا کیوں کہ جب ہم وہیں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تو بیٹری والے کے پاس سے ہی بیس روپے نکل آئے۔

رائے زادہ نے بتایا کہ اگر ہم تاج محل کو اچھی طرح سے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں فتح پور سیکری جانے کا خیال ترک کرنا پڑے گا کیوں کہ ہمارے پاس وقت کم ہے لیکن جب ہم نے اس کی بات مان لی تو وہ آخر تک یہی کہتا رہا کہ ہم نے خواہ مخواہ یہ فیصلہ کر لیا۔ ورنہ اتنے وقت میں ہم آسانی سے فتح پور سیکری بھی بھگتا سکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہمیں کار، پارکنگ ایریا میں چھوڑنی ہو گی جہاں سے آگے آٹو رکشہ یا سائیکل رکشہ جا سکتے ہیں۔ سائیکل رکشہ، آٹو رکشہ سے سستا تھا مگر میرا دل نہیں مانا کہ ہم ایسی سواری میں بیٹھیں جسے انسان کھینچ رہا ہو رائے زادہ نے ایک آٹو رکشہ والے سے بات کر لی اس پر سب سائیکل رکشہ والے اُس کے پیچھے پڑ گئے اور ہمیں کہنے لگے کہ

''اس سے بچ کر رہیے گا یہ آپ کو خود بھی لوٹے گا اور دکانداروں سے بھی لٹوائے گا۔''

یہ لڑکے نہ صرف بلند آواز میں بول رہے تھے بلکہ جارحانہ انداز میں رائے زادہ کی طرف اشارے بھی کر رہے تھے مگر اُس مردِ جہاندیدہ کے چہرے پر ایسا سکون تھا جیسے اُسے پتا ہو کہ

''آواز سگاں کم نہ کند رزقِ گدارا''

منیر نیازی اگر اُسے دیکھتے تو یقیناً ''خرِ کہنہ مشق'' کا خطاب دیتے کہ یہ ترکیب انہوں نے اپنے کچھ ایسے ہی سینئر اور ہم عصر شاعروں کے لیے وضع کر رکھی ہے۔ تاج محل کا مقامیوں کے لیے ٹکٹ 20 روپے اور غیر ملکیوں کے لیے 750 روپے تھا لیکن یہاں ڈاکٹر تقی کی حیدر آبادی لہجے والی اُردو کی بھی ضرورت نہ پڑی کیونکہ رائے زادہ کسی عقبی دروازے سے اپنے خصوصی تعلقات استعمال کر کے دو منٹ میں ٹکٹیں لے آیا۔ حالاں کہ ٹورسٹوں کی خاصی لمبی لائن لگی ہوئی تھی پتا نہیں یہ بات ہم لوگوں کی سائیکی میں کیسے داخل ہو گئی ہے کہ قانون کی اہمیت کو جاننے کے باوجود اگر کوئی چور دروازہ مل جائے تو ہم اُسے استعمال کرنے میں ایک عجیب طرح کی لذت محسوس کرتے ہیں؟؟ اگرچہ رائے زادہ کا کسی نے نوٹس نہیں لیا مگر وہ سیکورٹی والوں کے قریب سے کچھ اس ادا سے گزرا کہ ہمیں اُس کی مبینہ سابقہ افسری پر یقین سا آنے لگا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک پُراعتماد مسکراہٹ تھی اور پہلی بار اُس کی گردن کا رعشہ تھمتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے تقی سے کہا:

''رائے زادہ کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر مجھے اپنے پنجاب یونیورسٹی کے اُستاد مرحوم پروفیسر سجاد باقر رضوی کا سنایا ہوا ایک شعر بہت یاد آ رہا ہے کہ

محفل میں میری سمت کوئی دیکھتا نہیں
''وعلیکم السلام'' کیے جا رہا ہوں میں

مگر اس سے پہلے کہ وہ میری بات پر کسی ردعمل کا اظہار کرتے ہمیں چاروں طرف سے فوٹو گرافروں نے گھیر لیا اور اپنی کھینچی ہوئی تصویریں دکھا دکھا کر قائل کرنے لگے کہ وہ اپنی فنکاری کے ذریعے ہمارے اس دورۂ تاج محل کو امر کر دیں گے۔ تقی اس منزل سے کئی بار گزر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی مہارت سے مذاکرات شروع کیے اور جلد ہی تصویروں کے سیٹ کا ریٹ تین سو سے ایک سو اسی تک لے آئے طے ہوا کہ واپسی پر تصویریں معہ نیگیٹوز ہمیں تیار ملیں گی۔ یورپ اور امریکہ میں سیاحوں کی دلچسپی کے بیشتر مقامات پر یہ سہولت حاصل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں خودکار کیمرے آپ کی تصویریں آپ سے پوچھے بغیر بنا کر Exit Point پر کہیں Display کر دیتے ہیں۔ واپسی پر اگر آپ چاہیں تو انہیں خرید سکتے ہیں ورنہ Left over food کی طرح انہیں بھی غالباً کسی ڈسٹ بن میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اکثر سیاح شوق سے اور کچھ غالباً اس بے قدری کے ڈر سے انہیں خرید لیتے ہیں۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ کوئی گوروں سے سیکھے!!

فوٹو گرافر چوں کہ تجربہ کار تھا اس لیے ہمیں Location کے چناؤ کی زحمت نہیں کرنا پڑی اُس نے دس منٹ کے اندر اندر چھ مختلف زاویوں سے ہماری تصویریں اس طرح بنائیں کہ تاج محل کا جمال کیمرے کی حد تک محفوظ ہو گیا جہاں تک انسانی آنکھ سے اس کے جمال اور فنی کمال کو دیکھنے کا تعلق ہے تو وہ ایک بہت مختلف تجربہ ہے اور اجتماعی ہونے کے ساتھ ساتھ انفرادی بھی ہے کہ بقول شیکسپیئر ''اصل حسن تو ناظر کی آنکھ میں ہوتا ہے''، تاج محل کی عمارت، اس کا تناسب، فنِ تعمیر، محلِ وقوع، پس منظر، ترتیب و تقسیم، سطحِ زمین سے اُس پلیٹ فارم کی اونچائی، جس پر یہ عمارت تعمیر ہوئی اور سنگتراشی اور کندہ کاری کی معجز نمائیاں اپنی جگہ مگر جو چیز سب سے زیادہ حیران اور متاثر کرتی ہے وہ اس کا تصور اور وژن ہے۔ وہ ذہن جنہوں نے اسے بننے سے پہلے سوچا اور وہ فنکار جنہوں نے اس کے خاکے میں رنگ بھرا یقیناً بہت ہی صاحب کمال تھے جن دنوں میں ساحر لدھیانوی نے اپنی مشہور نظم ''تاج محل'' لکھی وہ ہندوستان میں کمیونزم کی مقبولیت کا زمانہ تھا۔ عوامی اور انسانی حقوق کا غلغلہ تھا اور ماضی کے بادشاہوں اور اہلِ زر کو سماج دشمن لوگوں کے روپ میں پیش کرنا انقلابی ہونے کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن مولانا چراغ حسن حسرت نے ساحرؔ کو بلا کر پوچھا کہ یہ بتاؤ:

''شاہ جہان'' شہنشاہِ ہندوستان تھا، نا؟''

ساحرؔ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پورے ہندوستان پر اُس کی حکومت تھی؟'' مولانا نے پوچھا۔

''جی!''

''ممتاز محل اُس کی بہت محبوب اور چہیتی بیوی تھی؟''

''جی!''

''تو بھائی یہ بتاؤ کہ وہ اُس کے لیے تاج محل نہ بنواتا تو کیا بدھو کا آوا بنواتا؟''

واضح رہے کہ ''آوا'' اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں عام عمارتی اینٹیں بنائی اور پکائی جاتی ہیں سو اس سے قطع نظر کہ

مری محبوب، انہیں بھی تو محبت ہو گی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل

اُن کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

اور یہ کہ

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

یہ بات اپنی جگہ ہے کہ یہ عمارت ''جمالیات'' کا ایک ایسا تصور پیش کرتی ہے جس کی مثال اس روئے زمین پر فی الوقت تو موجود نہیں ہے۔ کہنے کو یہ ایک مقبرہ ہے مگر اسے دیکھ کر ''عظمت انسان'' اور اُس کے ''اشرف المخلوقات'' ہونے پر یقین سا آنے لگتا ہے کہ ایسی ہی کچھ انسانی تخلیقات ہیں جن کی وجہ سے اقبالؔ خدا سے اس لہجے میں بات کرتے ہیں کہ

تُو شب آفریدی، چراغ آفریدم

فوٹوگرافی کا سیشن ختم ہوتے ہی رائے زادہ چالو ہو گیا وہ غالباً ہمیں بھی عام یورپی سیاحوں جیسا سمجھ رہا تھا کہ جن کی ہماری تاریخ اور اس کے مظاہر کے بارے میں معلومات سرسری سے بھی کچھ کم ہوتی ہیں۔ سو وہ ہمیں Facts اور Fiction کا ایک ایسا ملا جلا اور رٹا رٹایا لیکچر دینے کی کوشش کر رہا تھا جس کی ہمیں قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ ہم نے کئی مقامات پر اُسے ٹوک کر یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ہمیں غیر مستند اور بے سروپا روایتوں سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کرے مگر اُس شیر کے بچے کے کان پر جُوں تک نہ رینگی اُس کا حال قدرے تحریف کے ساتھ غالب کے اُس مصرعے جیسا تھا۔

گر نہیں ہیں مری ''گفتار'' میں معنی، نہ سہی

پہلا مصرعہ یعنی ''نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا'' اس لیے یہاں لاگو نہیں ہوتا کہ انہی دو چیزوں کے لیے تو وہ اپنی جان پر کھیل رہا تھا۔ تقی نے بتایا کہ

> ''کچھ عرصہ قبل صنعتی آلودگی اور موسمی اثرات کی وجہ سے ''تاج محل'' کی سفیدی پیلاہٹ آمیز ہوتی جا رہی تھی مگر اب اس پر قابو پا لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں مختلف حفاظتی اقدامات کے ساتھ ساتھ فتح پور سیکری کی مٹی بھی استعمال کی گئی ہے کہ جس کے لیپ سے پتھر پھر سے صاف ہو گئے ہیں اور اُن کی سفیدی نکھر آئی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بیشتر مقبروں کی طرح یہاں بھی اصل مدفن نیچے تہہ خانے میں ہیں اوپر صرف قبروں کے تعویذ بطور نشانی بنا دیئے گئے ہیں۔''

رائے زادہ نے بتایا کہ ماضی میں تہہ خانے کا راستہ بند تھا ''ہم نے'' یعنی ''اُس نے'' اپنے زمانے یعنی ''اپنے زمانۂ ملازمت/ افسری میں'' اسے کھلوا دیا تھا۔ تقی نے بتایا کہ

> ''اصل میں شاہ جہاں نے اس مقبرے کے بالمقابل ایسا ہی ایک مقبرہ اپنے لیے تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا جس میں سیاہ رنگ کا پتھر استعمال ہونا تھا اس کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا گیا تھا جو یہاں سے نظر بھی آتا ہے

مگر اورنگزیب نے اقتدار میں آ کر اس کی تعمیر رکوا دی اور وفات کے بعد باپ کو اپنی مرحومہ بیگم کے پہلو میں دفن کرا دیا جس سے اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہو۔ اس عمارت کے حسنِ تناسب کو یقیناً نقصان پہنچا ہے کیوں کہ ممتاز محل کی قبر بیرونی دروازے کی بالکل سیدھ میں بنائی گئی تھی اور باقی ہر چیز میں اسی توازن کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔''

میرے محبوب مزاح نگار اور مرحوم سینئر دوست شفیق الرحمٰن نے کہیں لکھا ہے کہ

''ایک ٹورسٹ گائیڈ سیاحوں کو مائیکل اینجلو کا بنایا ہوا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا مجسمہ دکھا رہا تھا۔ اُس نے اس کے فنی حسن پر بھرپور روشنی ڈالی اور پھر کہا کہ مائیکل اینجلو کو اپنے اس شاہکار پر اتنا ناز تھا کہ اسے مکمل کرنے کے بعد اُس نے مجسمے کے گھٹنے پر ہتھوڑی سے ضرب لگائی اور فخریہ انداز میں کہا:

''بتاؤ، کیا تم ہی مکمل ترین موسیٰ (علیہ السلام) نہیں ہو؟''

سیاح کچھ لمحے تو اُس کی ''جادو بیانی'' کے سحر میں رہے پھر اُن میں سے کسی نے (غالباً کسی یہودی نے) آہستہ سے پوچھا:

''پھر کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا'' گائیڈ نے مسکرا کر کہا ''خواہ مخواہ گھٹنے پر ضرب کا نشان پڑ گیا جسے آپ دیکھ سکتے ہیں۔''

اب یہ واقعہ مجھے تاج محل میں کیوں یاد آیا اس کی کوئی منطقی توجیہہ میرے پاس نہیں ہے، ممکن ہے آپ کے پاس ہو.....!!

سنگ مرمر کی جالیاں تو عام سی چیز ہیں لیکن تاج محل میں ان کا سائز اور سنگ تراشی کا ہنر اپنی مثال آپ ہے۔ دیواروں پر کندہ کاری اور بیل بوٹوں کے ایسے لاجواب نمونے ہیں اور سفید پتھر کو ایسی ایسی شکل میں اس قدر مہارت اور خوب صورتی سے تراشا گیا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مزار کی عمارت کے باہر چاروں طرف وسیع کھلے حصے ہیں اور قدرے فاصلے پر دائیں بائیں ایک طرف مسجد اور ایک طرف مدرسے/مسافر خانے کی عمارتیں ہیں جو بالکل ایک ہی انداز میں بنائی گئی ہیں۔ ہم نے رائے زادہ کی اعصاب شکن آواز سے بچنے کے لیے اسے ہوا خوری کا مشورہ دیا اور خود ایک جھروکہ نما جگہ پر بیٹھ کر حیات و کائنات اور انسان کی بلندی اور پستی سے متعلق ایسے مسائل پر گفتگو کرنے لگے جن کی ''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔''

سہ پہر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ میں اُداسی کے سائے اُترنا شروع ہو گئے تھے۔ ہماری گفتگو ابھی شاید کچھ دیر اور چلتی مگر رائے زادہ کی ہوا خوری کا پیمانہ شاید لبریز ہو چکا تھا۔ اُس نے ایسی رونی صورت بنا کر ہمارا اگلا پروگرام پوچھا کہ ہمیں اُٹھتے ہی بنی۔ اُس نے پھر فتح پور سیکری جانے کے بارے میں ایسی گفتگو شروع کر دی جس سے قطعاً پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ اس کے حق میں بول رہا ہے یا خلاف۔ میں اُسے کوئی سخت بات کہنے ہی والا تھا کہ تقی نے غالباً میرا موڈ بھانپ کر میرا کندھا دبایا اور مسکرا کر بولے:

''یہ بے چارہ اپنا کام کر رہا ہے اسے کرنے دیں، ہمارا کام اس کی مدد کرنا تھا سو وہ ہو گئی اب باہر نکل کر اسے فارغ کر دیتے ہیں۔ آیئے یہاں کی سوغات یعنی تاج محل کا ماڈل خریدتے ہیں کہ یہ اس سفر کی یادگار کے طور پر آپ کے ساتھ جائے گا۔''

پُرخلوص آدمی عام طور پر ضابطے اور تنظیم کے پابند نہیں ہوتے لیکن ڈاکٹر تقی عابدی کا شمار ''مستثنیات'' میں ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت ''بے ساختہ'' بھی ہیں اور بے حد ''مرتب'' بھی۔ وہ ہر کام بڑے منظم طریقے سے کرتے ہیں، ہر بات اُن کے ذہن میں پہلے سے طے ہوتی ہے اور سفر سے متعلق ساری معلومات اور متعلقہ معاملات وہ گھر سے گرہ میں باندھ کر نکلتے ہیں۔ شاید اُن کی طبیعت اور مزاج کا یہی پہلو ہے جس نے انہیں میڈیکل ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ ایک محقق اور نقاد کے رُوپ میں بھی کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔

آگرہ عمومی طور پر ایک ایسا شہر ہے جس کے اچھے دن گزر چکے ہیں ''تاج محل'' جیسے بین الاقوامی سطح پر انتہائی مقبول ''سیاحتی مرکز'' کے باوجود شہر گندہ، پرانا اور پسماندہ ہے۔ غربت اُس کے درودیوار اور لوگوں کے رویوں سے صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے جس کا ایک اور مظاہرہ محل سے ملحقہ بازار میں نظر آیا، جہاں تاج محل سے متعلق سوویز بکتے تھے۔ تقی نے بتایا کہ

''یہی چیزیں سرکاری دکانوں پر کئی گنا مہنگی ملتی ہیں۔ وہاں قیمت فکس ہوتی ہے اور یہاں آپ ہزار روپے کی چیز کا بھاؤ پچاس روپے سے بھی طے کرنا شروع کر سکتے ہیں۔''

میں نے کہا:

''تقی بھائی، ہمارے پاکستان میں افغان بھائی قالین اسی طرح بیچتے ہیں وہ بیس ہزار مانگیں اور آپ دو ہزار سے شروع کریں تو عین ممکن ہے سوا دو ہزار پر سودا طے ہو جائے۔''

بازار میں داخل ہوئے تو رائے زادہ نے (جو اصل میں سرکاری دکانوں پر لے جانا چاہتا تھا جہاں اُس کے کچھ ''بہی خواہوں'' کے مطابق غالباً اس کی کمیشن طے تھی) اپنے اختلافی نوٹ آمیز رویے کو شامل رکھتے ہوئے ایک دکان کی طرف قدم بڑھایا مگر تقی میرا ہاتھ پکڑ کر ایک اور دکان میں داخل ہو گئے جو نسبتاً بہتر دکھائی دے رہی تھی اور جس کا نوجوان سیلز مین (جو بعد میں مالک نکلا) ہمیں بآوازِ بلند یقین دلا رہا تھا کہ اُس سے اچھا اور سستا سودا ہمیں کہیں سے نہیں مل سکے گا۔ میں عادتاً مول تول سے بہت گھبراتا ہوں اور اس بات کا قائل ہوں کہ شاپنگ کے لیے نکلو تو جو چیز جہاں سے پسند آ جائے اور وارا کھاتی ہو، لے لو کہ سارا بازار گھومنے کے بعد بھی کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا سوائے اس کے کہ اپنی پسند سے بھی اعتبار اُٹھ جاتا ہے، مگر یہ بات میری بیگم کو کون سمجھائے!!

دکانداروں نے ہمارے سامنے تاج محل کے ماڈل کا ڈھیر لگا دیا اور اُن کے اندر سے بجلی کے بلب کی روشنی گزار کر دکھایا کہ اچھے اور برے ماربل اور رپلاسٹر آف پیرس یا اسی قسم کے کسی اور میٹریل سے بنی ہوئی اشیا میں کیا فرق ہوتا ہے۔ میں نے دبے لفظوں میں تقی بھائی کو بتانے کی کوشش کی کہ وزنی اور زیادہ حجم والی چیز کو لے جانا میرے لیے بہت مشکل ہو گا مگر اُن کا خیال تھا کہ یہاں آ کر محل کا ماڈل لیے بغیر گھر جانا انتہائی نامعقول بات ہے۔ سو بات ایک درمیانہ سائز والے ''تاج محل'' پر ٹھہری جس کا وزن تقریباً چار کلو تھا۔ تقی نے یہاں بھی مول تول کی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کیا جس پر دکاندار سے زیادہ رائے زادہ کو اعتراض تھا کیوں کہ اُس کی ٹپ یا کمیشن کا انحصار دکاندار کے منافع پر تھا جو بظاہر کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا۔

جونہی ہم یہ ماڈل پیک کرا کے نکلے ہمیں کئی دکانداروں اور ان کے گماشتوں نے گھیر لیا اور بتایا کہ ہمیں لُوٹ لیا گیا ہے کیوں کہ یہی چیز وہ ہمیں اس سے نصف قیمت پر دینے کو تیار ہیں اس پر مجھے ایک لطیفہ بہت یاد آیا جو کچھ یوں ہے۔

''ایک گاؤں میں دو دوست رہتے تھے جو ایک جیسے مسائل کا شکار تھے اور انتہائی غربت کے عالم میں زندگی گزار رہے تھے۔ اچانک اُن میں سے ایک یک دم امیر ہونا شروع ہو گیا۔ اُس نے مکان بھی پکا کروالیا، ٹریکٹر بھی خرید لیا، ڈھور ڈنگر بھی اس کے پاس بہت سے ہو گئے اور قیمتی کپڑے پہننے کے ساتھ ساتھ وہ بات بے بات نوٹ بھی خرچ کرنے لگا۔ دوسرے نے اس ''افراطِ زر'' کا راز جاننے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ بالآخر ایک دن اُس نے اپنے ''نو دولتیے'' ساتھی نوردین کو شراب پلا کر نشے میں اُس سے یہ راز اگلوا لیا۔ معلوم ہوا کہ نوردین نے دریا میں چالیس دن ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر ایک وظیفہ کیا تھا جس کے اختتام پر ایک جن آیا جس نے اس کی ایک خواہش پوری کرنے کی خوشخبری دی۔ نوردین نے بتایا کہ اُس نے جن سے ایک ایسی ہانڈی کی فرمائش کی جس میں اُس کی مانگی ہوئی ہر چیز خود بخود آ جایا کرے۔ سو ایسا ہی ہوا اور اب وہ مزے کر رہا ہے۔ دوست نے اُس سے وظیفہ حاصل کیا اور چالیس دن دریا میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر اُس کا ورد کرتا رہا چالیسویں دن سچ مچ ایک جن آ گیا اور کہنے لگا:

''مانگو میرے آقا کیا مانگتے ہو، میں تمہاری کوئی ایک خواہش پوری کرنے کا پابند ہوں۔''

وظیفے والے نے دوسری ٹانگ زمین پر رکھی اور کہا:

''نوردین کی ہانڈی واپس لے لو۔''

اسی ''تاج محل'' والے ساحرؔ نے کیا خُوب کہا ہے:

مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے

طے پایا کہ واپسی کا سفر شروع کرنے سے پہلے ''پیزا ہٹ'' سے ویجی ٹیرین پیزا کھا لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس کے لیے پہلے اپنی گاڑی تک پہنچنا ضروری تھا۔ رائے زادہ نے غالباً سائیکل رکشہ والوں کے گزشتہ ردِعمل کی وجہ سے دوبارہ بے عزتی کرانا مناسب نہ سمجھا اور مشورہ دیا کہ یہ سواری بہتر بھی ہے اور سستی بھی۔ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر تقی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے:

''مجھے بھی آپ کی طرح سائیکل رکشہ پر بیٹھنا اچھا نہیں لگتا کہ اس سے انسان کی تذلیل کا احساس ابھرتا ہے مگر یہ بھی تو دیکھیے کہ یہ اُن لوگوں کا روزگار ہے اور اسی سے ان کے گھروں میں چولہا جلتا ہے سو اس رکشے میں بیٹھنا اور نہ بیٹھنا دونوں اپنی اپنی جگہ پر ''انسان دوستی'' کا اظہار ہے۔ آیئے تشریف رکھیے۔''

میں بندۂ مزدور کے اوقات کی تلخی پر غور کرتے ہوئے بیٹھ تو گیا مگر اس سوال کا کوئی شافی جواب نہ مل سکا کہ اس الجھن سے نکلنے کا صحیح راستہ کیا ہے؟

رائے زادہ نے حسبِ معمول ڈرائیور کو ''پیزا ہٹ'' کا شارٹ کٹ بتانے کی بھی کوشش کی مگر وہ غالباً طویل انتظار سے کافی بور ہو چکا تھا۔ اس لیے اُس نے رائے زادہ کو سختی سے منہ بند رکھنے کا مشورہ نما حکم دیا اور ہماری طرف ایسی احتجاجی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ کس مصیبت کو میرے گلے ڈال دیا ہے!!

پچھلے تقریباً ایک گھنٹے سے رائے زادہ اپنی گفتگو میں بار بار اس بات کا اعادہ کر رہا تھا کہ اس کا مقصدِ حیات مہمانوں کو خوش کرنا اور انہیں بہتر مشورہ دینا ہے۔ آگے وہ مالک ہیں مانیں یا نہ مانیں اور یہ کہ اپنی خدمات کے معاوضے میں وہ بحث نہیں کرتا جو کچھ دیا جائے خوشی سے قبول کر لیتا ہے۔ ویسے اسے ہمارے ساتھ ڈیوٹی دیتے ہوئے چھ گھنٹے ہو چکے ہیں اور چوں کہ گائیڈ کی سرکاری فیس فی گھنٹہ ساٹھ روپے کے حساب سے طے ہے سو اس میں تو کوئی کمی ہو نہیں سکتی البتہ ''بیشی'' کا انحصار آپ لوگوں کی سیر چشمی پر ہے۔

میں نے تقی سے کہا:

''آپ نے مرثیوں پر بڑا کام کیا ہے لیکن یہ شخص جس ''حسن طلب'' کا مظاہرہ کر رہا ہے اُسے سمجھنے کے لیے آپ کو ''قصیدے'' کے اجزائے ترکیبی پر غور کرنا پڑے گا۔''

تقی بولے:

''میں اس کے داؤ پیچ خوب سمجھتا ہوں یہ دیوانہ بکارِ خویش بہت ہوشیار ہے اب یہ واپسی میں فری لفٹ کا طالب ہے اور فی الوقت حساب کتاب سے اس لیے گریزاں ہے کہ وہ اس اضافی وقت کو بھی اپنی ڈیوٹی کا حصہ بنانا چاہتا ہے حالاں کہ میں پہلے ہی اسے اس کے حق سے زیادہ دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

اب پتا نہیں رائے زادہ جان بوجھ کر ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا یا اُس کے پاس کرنے کو کوئی اور کام تھا ہی نہیں کہ جتنا عرصہ ہم پیزاہٹ میں رکے وہ ہمیں ایک سائے کی طرح ساتھ ساتھ نظر آیا۔ داستانوں میں جس ''پیر تسمہ پا'' کے بارے میں پڑھا تھا اس کا کردار پہلی بار سمجھ میں آیا میرؔ کا کیا اچھا شعر ہے:

جن بلاؤں کو میرؔ سُنتے تھے
اُن کو اس روزگار میں دیکھا

احمد ندیم قاسمی راوی ہیں کہ ''امروز'' کی ادارت کے دنوں میں کمیونسٹ تحریک کے ایک پرانے بزرگ رہنما سارا سارا دن اُن کے کمرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ موصوف انتہائی بور شخصیت کے مالک تھے بغیر جانے بوجھے ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتے تھے اور ان کی مسلسل موجودگی کی وجہ سے دفتر کی پرائیویسی اور کام دونوں کا بہت حرج ہوتا تھا۔ ندیم صاحب کہتے ہیں:

''ایک دن تنگ آ کر میں نے اپنے فکاہیہ کالم ''حرف و حکایت'' میں ان کا نام لیے بغیر اُن کا خاکہ لکھا جس میں ان کی بورکن شخصیت کے تمام پہلو اجاگر کیے۔''

اُن کا بیان ہے کہ اگلے دن میں دفتر پہنچا تو موصوف مجھ سے پہلے وہاں موجود تھے مجھے دیکھتے ہی بولے:

''ندیم میاں! میں نے صبح صبح تمہارا کالم پڑھا تو بے اختیار داد دینے چلا آیا، واقعی بعض لوگ بہت ہی بور اور نامعقول ہوتے ہیں، حیرت ہے کہ ان کو پتا بھی نہیں چلتا کہ دوسرے لوگ ان کی وجہ سے کس قدر تنگ ہوتے ہیں، بہت اچھا لکھا ہے تم نے!''

ایک دوست کا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کو ''شیر ببر'' کے وزن پر ''بور ببر'' کہنا چاہیے۔ رائے زادہ کی ایک اور بہت عجیب عادت تھی کہ گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ ''خارش'' میں مصروف ہو جاتا کبھی سر کھجاتا، کبھی کان، کبھی گردن اور کبھی کچھ اُڑاتے اور

مارتے ہوئے کہتا:

''یہ مچھر بہت کاٹتے ہیں موسم ہو نہ ہو مجھے ہمیشہ کاٹتے ہیں، اب دیکھئے اس وقت بھی کاٹ رہے ہیں یہ دیکھئے، میری انگلی پر کاٹا ہے۔''

تقی نے کسی جلدی بیماری کا ایک مشکل سا نام لے کر بتایا کہ یہ اُس کا مریض ہے اسے کوئی مچھر وچھر نہیں کاٹتے بلکہ یہ سارا فساد اس کے خون میں شامل ایک مخصوص بیکٹیریا کا ہے جو اسے چین نہیں لینے دیتا۔ رائے زادہ نے اس دوران میں خیالی مچھروں کو تلف کرنے کے عمل میں اپنے منہ پر دو تین تھپڑ مارے اور ڈرائیور سے بولا:

''تمہاری گاڑی میں مچھر بہت ہیں۔''

وہ پہلے سے جلا بیٹھا تھا بولا.....

''سب سے بڑا مچھر تو تُو خود ہے، تیری وجہ سے گھر جاتے ہی مجھے گاڑی کو دھونا پڑے گا۔''

رائے زادہ نے اُس کا جواب سنے بغیر کہا:

''راستے میں صرف دو منٹ کے لیے گاڑی رکواؤں گا مجھے ایک جگہ سے اپنی اُس کتاب کا مسودہ اٹھانا ہے جو میں نے تاج محل کے متعلق لکھی ہے۔ آپ ڈرائیور سے ہماری سفارش کر دیجیے۔ یہ پتا نہیں کیوں ہم سے ناراض رہتے ہیں۔''

اس پر ڈرائیور نے اُس پر ایک ایسی نظر ڈالی جس میں کئی ننگی گالیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ہمیں تو راستوں کا کچھ علم نہیں تھا لیکن رائے زادہ ڈرائیور کو غالباً کسی ایسے رستے سے لے جا رہا تھا جو اُس کے خیال میں ''آف دی وے'' تھا۔ چناں چہ جب رائے زادہ اپنی کتاب کا مسودہ لینے کے لیے ایک جگہ گاڑی رُکوا کر اُترا تو ڈرائیور کا پیمانہ ضبط لبریز ہو گیا اور اُس نے پہلی بار براہ راست ہم سے گلہ کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ آپ نے یہ کس ''جُوٹھ'' کو پکڑ لیا ہے۔ ''جوٹھ'' ایک ایسا پنجابی ایکسپریشن ہے جس کا صحیح اُردو متبادل کم از کم میرے علم میں نہیں ''منحوس'' کا لفظ کچھ کچھ اس کی وضاحت کر سکتا ہے۔

رائے زادہ واقعی دو منٹ میں واپس آ گیا اور بتایا کہ جس آدمی سے اُس نے مسودہ لینا تھا وہ آج چھٹی پر ہے البتہ اُس کے کمرے میں ''مچھر'' بہت ہیں۔ سو ہمارا کارواں پھر سے ''جادہ پیما'' ہوا، تقریباً دس منٹ کے سفر کے بعد سڑک پر ایک پولیس کا ناکہ دکھائی دیا۔ دو سپاہی سڑک کے تقریباً درمیان میں کھڑے ہو کر اپنی ''پسند'' کی گاڑیوں کو ایک طرف رکنے کا اشارہ کر رہے تھے جہاں چند سپاہی اور ایک موٹر سائیکل والا ٹریفک سارجنٹ ان ''منتخب شدہ'' گاڑیوں کے کاغذات چیک کر رہے تھے۔ ایک سپاہی نے رائے زادہ کی طرف سے کھڑکی کے شیشے پر دستک دی (جو اُس نے اپنے خیالی مچھروں کی وجہ سے چڑھا رکھا تھا) لیکن جب رائے زادہ اس کی طرف دیکھے بغیر خارش میں مصروف رہا تو اُس نے شیشے کے ساتھ ساتھ دروازہ بھی بجانا شروع کر دیا۔ ڈرائیور نے رائے زادہ کو شیشہ اُتارنے کے لیے کہا، لیکن جب اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے کے باوجود اُسے شیشہ نیچے کرنے کا طریقہ سمجھ میں نہ آیا تو ڈرائیور نے اُس پر ایک ایسی ''گالی آلود'' نظر ڈالی جو لفظوں سے بہت آگے کی چیز تھی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا لیکن جاتے جاتے ہمیں یہ کہہ گیا کہ ان کو یہ نہ بتائیے گا کہ یہ کرائے کی گاڑی ہے کہیے گا کسی دوست نے بھجوائی ہے۔ تقی نے بتایا کہ

''یہاں پرائیویٹ ٹیکسیاں صرف اپنے منظور شدہ روٹوں پر چل سکتی ہیں۔ بصورت دیگر انہیں بھاری ٹیکس اور جرمانہ بھرنا پڑتا ہے غالباً اس کا بھی کوئی اسی قسم کا مسئلہ ہے اور چونکہ یہ ٹیکسی واقعی کسی (یعنی تقی کے ناشر رحمن) کے ذریعے منگوائی گئی ہے اس لیے یہ بیان کچھ ایسا غلط بھی نہ ہوگا۔''

ڈرائیور اور پولیس والوں میں کچھ دیر مذاکرات جاری رہے پھر ایک سپاہی نے بتایا کہ

''اس گاڑی کے کاغذات موجود نہیں اور اس کی انشورنس بھی ختم ہو چکی ہے۔ چناں چہ اسے بند کرنا پڑے گا۔''

پھر اُس نے پوچھا کہ

''اس گاڑی کا مالک کون ہے؟''

تقی نے اُسے گول مول سا جواب دیا کہ یہ ان کے دوست کی گاڑی ہے جو ہمیں ''تاج محل'' کی سیر کے لیے بھجوائی گئی ہے سو اس کے کاغذات وغیرہ کے بارے میں اس کا ڈرائیور یا اُس کا مالک ہی بتا سکتے ہیں۔ اس نے گاڑی کے مالک کا فون نمبر دریافت کیا جس پر ڈرائیور اُسے پھر ایک طرف لے گیا کہ وہ P.C.O سے اُس کی مالک سے بات کروا دیتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اکیلا آیا اور بولا:

''تین سو روپے دے دیجیے یہ سالا ایسے جان نہیں چھوڑے گا۔''

تقی سے مطلوبہ رقم لے کر وہ پھر چلا گیا۔ اب مذاکرات کا دوسرا دور شروع ہوا لیکن یہ ٹریک ٹو (Track Two) ڈپلومیسی بھی کامیاب نہ ہوئی اور ایک پولیس والا آ کر اگلی سیٹ پر رائے زادہ کے ساتھ بیٹھنے لگا کہ کچھ دور پیچھے ایک P.C.O سے جہاں سے گاڑی کے مالک کو مذاکرات میں شامل کیا جائے گا۔ رائے زادہ کی صدیوں سے سوئی حسیات ایک دم جاگ اُٹھیں اور اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ معاملہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ اُس نے فٹافٹ اپنی ٹوپی پہنی اور یہ کہتا ہوا گاڑی سے اُتر گیا کہ یہاں سے اُس کا گھر قریب ہی ہے، وہ خود ہی چلا جائے گا اور اس کے بعد ایسی تیزی سے غائب ہوا جیسے اُس نے ''سلیمانی ٹوپی'' پہن لی ہو۔

مذاکرات کا تیسرا دور جو تقریباً پندرہ منٹ پر محیط تھا۔ پی سی او کے اندر ہوا جس کے دوران میں اور تقی بظاہر تو رائے زادہ کی ''بوقلمونی'' پر تبصرہ کرتے رہے مگر دل کو پریشانی سی بھی لگ گئی کہ اگر ان ''قانون کے محافظوں'' نے سچ مچ گاڑی بند کر دی تو خاصی مشکل ہو جائے گی اور ساہتیہ اکیڈیمی والوں کا ڈنر بھی رہ جائے گا جہاں بھارت کی مختلف زبانوں میں لکھنے والے کچھ اہم ادیبوں سے ملاقات متوقع تھی۔

اب کے ڈرائیور آیا تو اُس کی آنکھوں میں اُس اعتماد کی کمی نمایاں تھی جس کا وہ اب تک مظاہرہ کرتا آ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اُس کے مالک نے (جو بقول اس کے بہت بڑا اور بااثر آدمی تھا) ''صلح'' کا فیصلہ کیا ہے سو اب تقی کو پانچ سو مزید دینا ہوں گے کہ پولیس والوں کا افسر بڑی مشکل سے آٹھ سو پر مانا ہے۔

میں نے کہا:

''تقی بھائی! اتنی ''مشترک'' خصوصیات کے بعد اصولاً پاکستان اور بھارت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں

رہنا چاہیے؟''

تقی کچھ کہتے کہتے رک گئے اور پھر سامنے دیکھنے لگے جہاں دور دور تک سناٹا تھا۔ پولیس کا مذاکراتی نمایندہ ہمارے ساتھ نہیں آیا ڈرائیور کا خیال تھا کہ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو ''وصول شدہ'' رقم کے بارے میں غلط اطلاع دے گا اور یوں اس اصول کی خلاف ورزی کرے گا کہ چور ایک دوسرے سے بے ایمانی نہیں کرتے۔ اس بار جب ہم ناکے سے گزرے تو رستے میں کھڑے ہوئے سپاہیوں نے ہمیں روکنے کے بجائے مسکرا کر نکل جانے کا اشارہ کیا اور ٹریفک سارجنٹ نے نظر ملنے پر اس طرح منہ پھیر لیا جیسے اُس نے ہمیں دیکھا ہی نہ ہو۔

میں نے موڈ بدلنے کے لیے تقی کو اسی موضوع سے متعلق ایک لطیفہ سنایا جو ہمارے سٹیج ڈراموں میں اکثر استعمال ہوتا ہے کہ ایک ٹریفک کانسٹیبل نے کسی ڈرائیور کے کاغذات چیک کیے جو مکمل تھے اور کہا کہ تمہارا چالان ہوگا.....؟

''کیوں؟'' ڈرائیور نے کہا۔ جب میرے کاغذات پورے ہیں تو چالان کیوں ہوگا؟''

''تمہارے کاغذات پورے نہیں ہیں؟''

''کیا کم ہے ان میں؟''

''ان میں پچاس کا ایک نوٹ کم ہے۔''

عام آدمی

عادم آدمی وہ ہوتے ہیں جن میں خاص آدمیوں والی کوئی بات نہ پائی جاتی ہو، ان کی ایک پہچان یہ ہے کہ یہ کسی بھی نظام میں ہوں ہمیشہ کثرت سے ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اکثریت نہیں بن پاتے، ان کو طاقت کا سرچشمہ بھی کہا جاتا ہے لیکن دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ ان سرچشموں پر جگہ جگہ خاص آدمی پلانٹ لگا کر بجلی گھر بنا لیتے ہیں، جن سے ان کے بنگلوں میں روشنی، ائرکنڈیشنروں اور فرجوں میں ٹھنڈک اور ہیٹروں میں گرمی رہتی ہے۔ اس سارے عمل سے جو کچھ بچتا ہے وہ لوڈ شیڈنگ کی صورت میں عام آدمی کے حصے میں آتا ہے، عام آدمی کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس کے باوجود بھی خوش رہتا ہے۔ عام آدمی عام طور پر خاصا احمق ہوتا ہے۔

عام آدمی کو تالیاں بجانے کا بہت شوق ہوتا ہے، مداری کے تماشے سے لے کر سیاسی جلسے تک ہر جگہ یہ موجود ہوتا ہے مداری بچے کی زبان کاٹ رہا ہو یا سیاسی لیڈر آزادئ تقریر کا مطالبہ کر رہا ہو یہ دونوں کو تالی بجا کر داد دیتا ہے۔ عام آدمی میں سپورٹس مین سپرٹ ضرورت سے بہت زیادہ ہوتی ہے چنانچہ یہ دوسروں کی لڑائی میں خواہ مخواہ شامل ہو کر پھانسی چڑھ جاتا ہے اور اس کے ساتھ والے اس عمل کو دوستی، غیرت، بھائی بندی اور عزت و آبرو کی پاسداری جیسے ''مہمل'' جذبوں سے تعبیر کر کے خوش ہوتے رہتے ہیں۔

عام آدمی کوئی نئی دریافت یا ایجاد نہیں ہے۔ یہ صدیوں سے اس کرۂ ارض پر پایا جاتا ہے۔ اس میں تاریخ کے شعور اور تاریخ دان سے پی آر کی ہمیشہ کمی رہی ہے اس لیے تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں عام آدمی کا کوئی نام نہیں ہوتا وہاں اسے ہمیشہ ہندسوں میں پیش کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ سکندر اعظم کے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر آیا، دوسری جنگِ عظیم میں چار لاکھ آدمی مارے گئے اور یہ کہ ملکہ کی تاجپوشی کے جلوس میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے۔ عام آدمی کو ٹی وی کیمرہ ہمیشہ لانگ شاٹ میں ہجوم کے حصے کے طور پر دکھاتا ہے۔ عام آدمی کا اپنا کوئی چہرہ نہیں ہوتا اس کی شناخت اس کا ہجوم اور اس کی آواز اس ہجوم کا شور ہوتا ہے۔

عام آدمی کرکٹ کی پچ کی طرح بہت Unpredictable ہوتا ہے جس طرح پچ بعض اوقات بیٹنگ کے لیے بہت موزوں نظر آتی ہے لیکن کھیلنے والی ٹیم کا جلوس نکل جاتا ہے اسی طرح عام آدمی بھی ایک دم روپ بدل لیتا ہے اس روپ بدلنے

سے اسے تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن اس کے کندھوں پر رکھی ہوئی بہت سی کرسیاں گر جاتی ہیں۔ کبھی کبھی عام آدمی ان گری ہوئی کرسیوں پر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ بھی جاتا ہے لیکن اگر وہ اس ترقی کے باوجود عام آدمی رہنے پر اصرار کرے تو اسے کرسی سمیت اُٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے سو ثابت ہوا کہ عام آدمی کرسی نشین نہیں کرسی بدوش ہوتا ہے۔

عام آدمی کی سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آتیں اس لیے وہ سوال بہت پوچھتا ہے عام طور پر اس کے ان سوالات کو اَن سنا کر دیا جاتا ہے زیادہ ڈھیٹ قسم کے عام آدمیوں کے منہ میں ٹافی یا لالی پاپ دے کر اُنہیں خاموش کرا دیا جاتا ہے جو عام آدمی اس کے باوجود بولنے سے باز نہ آئے اس کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں کہ یا وہ آدمی نہیں رہتا یا اس کے نام سے ''عام'' کا تعارف کٹ جاتا ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا:

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دُشمن آسماں اپنا

اب یہ بات طے ہے کہ غالبؔ صاحب عام آدمی نہیں تھے، نسلی، معاشرتی اور ذہنی ہر اعتبار سے وہ عام آدمی کی وردی میں پورے نہیں آتے تھے یوں بھی اس شعر میں ان کا خطاب آسمان سے ہے جبکہ عام آدمی کا حشر نشر اسی زمین پر ہو جاتا ہے۔ عام آدمی کے بارے میں ایک فکری مغالطہ فراقؔ نے بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کہتا ہے:

یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی چاند کا ٹکڑا، نہ کوئی زہرہ جبیں

اب اس شعر میں ''یونہی سا تھا'' کی حد تک تو معاملہ ٹھیک ہے کہ عام آدمی ہمیشہ ''یونہی سا'' ہوتا ہے لیکن ''مٹا ڈالنے'' والی صفت تو عام آدمی میں ہوتی ہی نہیں وہ تو پیدائشی طور پر مٹنے والوں میں سے ہوتا ہے باقی رہی بات چاند کا ٹکڑا اور زہرہ جبیں ہونے کی تو یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، کیوں کہ بقول سوداؔ:

سوداؔ جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

یوں بھی خاص آدمی میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہوتا ہے وہ چاند کا ٹکڑا اور زہرہ جبیں ہوئے بغیر بھی مٹا سکتا ہے جبکہ عام آدمی ان خوبیوں سمیت اس طرح مٹ جاتا ہے کہ

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل

عام آدمی کے بارے میں یہ ساری باتیں دراصل ہمیں بجٹ کے حوالے سے یاد آئی ہیں ہر برس کی طرح اس بار بھی بجٹ کے بارے میں یہ دل خوش کن اطلاع دی گئی ہے کہ اس کا بوجھ عام آدمی پر نہیں پڑے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بجٹ بنانے والوں کے نزدیک عام آدمی کے گھر میں گیس نہیں ہوتی۔ (پیٹ کی گیس کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا اس لیے اسے بدستور قائم رکھا جا سکتا ہے) اپنی سواری رکھنا تو دُور کی بات ہے کرائے کی بھی پٹرول سے چلنے والی گاڑی میں یہ نہیں بیٹھتا اور گرمی میں اپنے یا مہمان کے لیے کوئی ٹھنڈا مشروب بھی اس کی صحت کے لیے خطرناک ہے۔

ہر برس بجٹ کی تقریر سن کر ہم سوچتے ہیں کہ اگر یہ ہزاروں لاکھوں عام آدمی جو پردیس کی زمینوں پر اپنی چربی جلا کر

درہم، ریال، ڈالر اور پاؤنڈ کماتے ہیں اور اسے زرمبادلہ کی شکل میں وطن بھجواتے ہیں، اگر یہ نہ ہوتے تو ہمارا کیا بنتا۔ ہر برس اعداد وشمار کی کثرت میں جو ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہماری زندگی کو مزید مشکل بنانے کی ٹیکنیکل وجوہات کیا ہیں۔ تیل، قدرتی گیس، بجلی، زرعی اجناس، پھل، سبزی، گوشت، کرائے، ٹیکس اور پہننے کے کپڑے سے لے کر کفن کے لٹھے تک ہر چیز کیوں مہنگی کرنی ضروری ہے۔ ایک آدمی جس نے 1968ء میں چار سو روپے سے کم پر ملازمت شروع کی تھی۔ 1984ء میں چار ہزار روپے ماہانہ کمانے کے باوجود زیادہ غریب اور تنگ دل کیوں ہے؟ زمینوں کی قیمتیں آسمان پر اور آسمان گیر جذبے زمین بوس کیوں ہو رہے ہیں؟ ہمارے ماہرین معاشیات ہمیشہ اپنے مسائل کی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ ہمہ وقت قومی ترقی اور خود کفالت کی موہوم منزل کے خواب دکھا دکھا کر قربانیاں مانگتے رہتے ہیں، مگر کوئی ایک بھی مسئلہ حل نہیں کرتے، چند برس پہلے ان کے ہاتھ میں مساوات کا جھنڈا تھا، آج کل ہر بات میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مژدہ سناتے ہیں۔ رہا عام آدمی سو اس کے پاؤں تلے زمین پہلے بھی کھسک رہی تھی۔ اب بھی کھسک رہی ہے۔ عام آدمی کی اسی طرح کی بے یقینی کو مفکرِ پاکستان، شاعرِ مشرق، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار اور تصورِ پاکستان کے خالق علامہ محمد اقبال نے ان لفظوں میں بیان کیا تھا۔

طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

مگر یہ سب تو عام آدمی کے بیکار دماغ کی بے معنی سوچیں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قومی اور ملکی سطح کے اہم اور نازک معاملات میں ایسی بے کار سوچوں کو لفٹ نہیں دینی چاہیے۔

پچھلے دنوں ہم نے ایک ویگن پر کسی عام شاعر کا لکھا ہوا ایک شعر پڑھا تھا، جس سے عام آدمی کے ذہن کی کوتاہی اور فکر کی کمی کا اندازہ ہوتا ہے:

لوگ ہم سے ملتے اور بچھڑتے رہیں گے
اسٹیشن سے ماندہ کلاں ہم چلتے رہیں گے

اب آپ ہی بتایئے اس کولہو کے بیل کی سی سوچ رکھنے والے کی رائے یا شکایت پر آدمی کیسے کان دھرے۔ نہ شعر کا خیال اچھا ہے نہ اس کا وزن ٹھیک ہے۔ اب اگر یہاں اس کی جگہ کوئی خاص آدمی ہوتا تو وہ یہی بات یوں بھی کر سکتا تھا:

ہر روز، روزِ عید ہے، ہر شب، شبِ برات
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کر

آسکر وائلڈ نے ایک جگہ لکھا ہے:

Some People are wise and the other's are otherwise

مغرب کی طرح سوشلسٹ دنیا میں بھی انسانی برابری کے دعووں کے پیچھے یہی تفریق کارفرما ہے، وہاں بھی سب لوگوں کو Equal کہا جاتا ہے، مگر کچھ لوگ More Equal ہوتے ہیں۔ ہم باری باری ان دونوں دنیاؤں کی طرف دیکھتے ہیں، کیوں کہ کھیل کے اس میدان میں جسے دنیا کہتے ہیں ہم بھی ہجوم میں بیٹھے ہوئے عام اور گمنام آدمی سے مختلف نہیں ہیں جس پر سے ٹی وی کیمرہ رکے بغیر گزر جاتا ہے۔

بہت پرانے زمانے کی بات ہے ہمارے پاس بھی ایک نظام ہوتا تھا جسے خدا کے آخری نبی ﷺ اور انسانیت کے

عظیم ترین محسن ﷺ نے ہم تک پہنچایا تھا اور چودہ صدیوں سے جسے ہم تفسیروں اور تعبیروں کی کند چھریوں سے ذبح کرنے میں مصروف ہیں۔ لاہور کی شاہی مسجد میں پچھلے دنوں ہم نے اپنے ملّی نامۂ اعمال میں ایک اور سیاہ دھبے کا اضافہ کیا ہے، ایسا داغوں بھرا چہرہ لے کر ہم اپنے ربّ اور اس کے پیارے نبی ﷺ کو کیا اور کیسے منہ دکھائیں گے۔

ایک معمہ جو گزشتہ کئی برسوں سے حل نہیں ہو پا رہا آج ہم اس کالم کے ذریعے اپنے جیسے عام آدمیوں کے علاوہ ان خاص آدمیوں کی خدمت میں بھی پیش کرتے ہیں جو اسے حل کر سکتے ہیں یا کم از کم اس راز سے پردہ اُٹھا سکتے ہیں۔

The Massage نامی ایک فلم چند برس پیشتر لیبیا کے ایک نوجوان مسلمان فلمساز اور ہدایت کار مصطفیٰ عکاد نے بنائی تھی، ہمیں یہ فلم دیکھنے کا موقع ملا ہے اور ہم پوری ایمان داری سے کہہ سکتے ہیں کہ مولوی حضرات سے ہم نے پوری زندگی میں اسلام کے بارے میں جو کچھ جانا اور سمجھا ہے یہ اکیلی فلم اپنی معلومات، تبلیغ، تفہیم اور اثر آفرینی کے اعتبار سے اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اسلام نے اس زمین اور اس پر بسنے والے انسانوں کی زندگی میں کیا معیاری تبدیلی پیدا کی ہے۔ آدمی اور انسان کے درمیان کا فاصلہ کس طرح ایک جست میں طے کیا ہے؟ انسانی مساوات اور اجتماعی خیر کے تصوّرات کو کیسے عملی صورت دی ہے، غلاموں کو کیسے آقاؤں کا ہم سر کیا ہے اور عفو و درگزر کے سلسلے میں کیسا عظیم اور بے مثال سبق دیا ہے، ان سب باتوں کو اس تین گھنٹے کی فلم میں جس طرح سمویا گیا ہے وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ اس کے باوجود اسلامی ملک پاکستان میں اس فلم پر پابندی ہے؟ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ اسلام نے عام اور خاص آدمی میں جو فرق ختم کیا تھا، اس فلم میں اس کا عملی نمونہ دکھایا گیا ہے۔ ہمارا دل کہتا ہے ایسی بات نہیں ہے مگر دماغ کا کیا کریں کہ یہ کم بخت وجہ جاننا چاہتا ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے اگلے بجٹ میں عام آدمی کی بہتری کے لیے اس کے دماغ پر کوئی ایسا ٹیکس لگا دیا جائے کہ اسے سوال کرنے کا حوصلہ ہی نہ پڑے۔ ہمیں یقین ہے کہ عام آدمیوں کے نمایندے حکومت کے اس بروقت اقدام کی حسبِ سابق بے حد تعریف کریں گے۔ آزمائش شرط ہے۔

(1985ء)

آوازوں کا خزانچی

لطف اللہ خان

''کام'' کیے بغیر یہ تاثر دینا کہ ہم بہت کام کر رہے ہیں۔ پنجابی محاورے میں ''کارروائی ڈالنا'' کہلاتا ہے اور پاکستان کسی اور چیز میں خود کفیل ہو نہ ہو، اس کام میں یقیناً خود کفیل ہے، بلکہ اپنے جیسے کئی اور ملکوں کی بھی کفالت کر سکتا ہے، آپ جس دفتر میں جائیں آپ کو ہر آدمی یہ تاثر دیتا ہوا ملے گا جیسے پورے دفتر کا بوجھ اسی پر لدا ہوا ہے، ایسے لوگ بھی آپ نے اکثر دیکھے ہوں گے جو ہر وقت مستعد مصروف اور وقت کے ساتھ بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن کبھی غور اور دلجمعی سے ان کے کام کا جائزہ لیجیے آپ کو پتا چلے گا کہ ان کی Out put کسی بھی ناکارہ آدمی سے زیادہ نہیں۔

ریڈیو سٹیشن پر ایک صاحب کی مستعدی اور کام میں دلچسپی کی بہت دھوم تھی۔ ہر وقت ان کے ہاتھوں میں پانچ چھ ٹیپیں Tapes ہوتی تھیں اگر کوئی افسر سامنے سے آتا دکھائی دیتا تو یہ ٹیپیں اکثر ان ہاتھوں سے گر جاتیں اور وہ جلدی جلدی انہیں سمیٹ کر ایک مصروفیت بھری مسکراہٹ دیتے ہوئے گزر جایا کرتے تھے۔ متعلقہ افسر اور سب دیکھنے والے اس مظاہرے سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ ان کی بدقسمتی کہ ایک ان سے بھی بڑے کارروائی باز سٹیشن ڈائریکٹر ہو کر آ گئے۔ ہمارے مصروف پروڈیوسر نے پہلے ہی دن ان پر اپنی یہ مخصوص کارروائی ڈال دی مگر اس سے پہلے کہ وہ ٹیپیں سمیٹ کر نکل جاتے، نووارد ڈائریکٹر نے ٹیپیں اُٹھا کر ان پر لگے ہوئے پروگراموں کی تفصیل والے لیبل پڑھنے شروع کر دیے۔ پتا چلا کہ ان میں سے کوئی بھی ٹیپ ان کے پروگرام سے متعلق نہیں تھا۔

کارروائی ڈالنے کا یہ رویہ زندگی کے ہر شعبے میں عام ہے نوکر کو آپ بازار سے کچھ لینے کے لیے بھیجیں وہ راستے میں رُک کر پان کھائے گا سگریٹ پیئے گا۔ دوستوں سے گپیں لڑائے گا۔ سرِ راہے رپچھ، بندر یا مداری کا تماشا دیکھے گا مگر جب آپ کے سامنے پہنچے گا تو اس کا سانس یوں چڑھا ہوگا جیسے وہ ہَوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہو۔ خیر یہ کارروائیاں تو ان کاموں سے متعلق ہیں جن کا تعلق روزمرہ زندگی کے عام واقعات سے ہے کارروائیوں کی ایک اور قسم وہ مختلف قسم کے دعوے ہیں جو ہمیں

اکثر سننے کو ملتے ہیں، ان میں سرِ فہرست وہ دعوے ہیں جن میں اعداد وشمار کی مار دی جاتی ہے ملک تقریباً ہر طرح کی پیداوار میں بار بار خود کفیل ہوتا ہے۔ برآمدات میں کئی فیصد اضافہ ہوتا ہے، چیزوں کی قیمتوں میں نہ صرف استحکام آتا ہے بلکہ ان میں کمی کا رجحان بھی پیدا ہوتا ہے، خسارے کے بجٹ کے باوجود معاشی حالت بہتر ہو جاتی ہے، ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ اب بھی ہم ایشیا کے سستے ترین ملک ہیں۔ اسی طرح ہم جو کام بھی کرتے ہیں وہ اپنی نوعیت میں عظیم ترین ہوتا ہے ہم کار صاف کرنے والا فلولین کا ڈسٹر بھی بنائیں تو وہ بھی ایشیا میں بہترین ہوتا ہے، ہماری درسگاہیں، فیکٹریاں، سڑکیں، عمارتیں، کھلاڑی، خبرنامہ، سماجی بہبود کے ادارے، بلدیاتی نظام، چڑیا گھر، بندرگاہیں غرض یہ کہ ہر چیز ایشیا کی عظیم ترین ہوتی ہے، اگر کوئی فلم کسی وجہ سے کچھ دن چل جائے تو وہ بھی شہرہ آفاق یا عظیم ترین ہو جاتی ہے اور تو اور اگر ایک سال میں کسی کتاب کا ایک ہزار کا ایڈیشن فروخت ہو جائے تو یار لوگ دوسرے ایڈیشن پر Best seller لکھوا لیتے ہیں۔

''کارروائیوں'' کے اس دامِ ہم رنگِ زمیں کے عظیم پھیلاؤ (جو سچ مچ ایشیا میں عظیم ترین ہے) میں اگر سچ مچ کوئی اچھا کام ہوتا ہے تو اس نقارخانے میں اس کی آواز طوطی کی صدا کی طرح عام طور پر ان سنی رہ جاتی ہے۔ پراپیگنڈے کے اس آدم خور نظام میں اہلِ ہنر اپنی ناقدری کے المناک غبار میں آہستہ آہستہ تحلیل ہوتے رہتے ہیں اگر کسی کی قسمت بہت اچھی ہو تو اس کے مرنے پر دنیا کو پتا چلتا ہے کہ ایک روشن ستارہ ہمارے آسمان سے رُخصت ہو گیا ہے سوداؔ نے کیا خوب کہا تھا:

نا قدر شناسی سے خلائق کی جہاں میں
جس کو ہنر آیا اُسے انکارِ ہنر ہے

گزشتہ دنوں کراچی میں ہمیں ایسے ہی ایک اہلِ ہنر سے دوسری بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب ہیں نام ہے ان کا لُطف اللہ خان عمر تقریباً بچپن برس، رنگ گورا، طویل قد، خوش رُو، خوش پوش ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلاتے ہیں اور کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ یہ تو ان کی وہ صفات ہیں۔ جو اس ملک کے بے شمار باشندوں میں معمولی تبدیلی کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ جو چیز انہیں عام لوگ سے مختلف ممتاز اور ممیز کرتی ہے وہ ان کی حیرت انگیز لائبریری ہے، اس لائبریری میں کاغذ کی جگہ ریکارڈنگ ٹیپ استعمال ہوتا ہے اور یہاں لفظ پڑھنے کے بجائے سنے جاتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ آوازوں کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو اپنی مثال آپ ہے، لطف اللہ خان صاحب نے اپنی ذاتی کوشش سے گزشتہ تیس برس میں برصغیر سے متعلق جو نایاب، اہم اور قیمتی آوازیں جمع کی ہیں۔ ان کی تعداد اور مقدار ناقابلِ یقین حد تک حیرت انگیز ہے اور پھر ان بے شمار آوازوں کو جس ترتیب، سلیقے، فنی لگن اور محنت کے ساتھ ریکارڈ اور محفوظ کیا گیا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر ایک الگ داستان ہے۔

لُطف اللہ خان صاحب نے موسیقی، ادب اور مذہب کے تین شعبوں میں پاکستان اور برصغیر کے کچھ اور علاقوں سے تعلق رکھنے والی اہم آوازوں کا جو ذخیرہ جمع کیا ہے اس میں سازوں کی موسیقی ۸۷۶۹ منٹ پر اور مختلف انداز کی گائیکی ۱۱۹۰۶ منٹ پر مشتمل ہے اور یہ اس ذخیرے کا وہ حصہ ہے جس کی باقاعدہ تدوین ہو چکی ہے۔ تقریباً اتنا ہی موسیقی کا حصہ ابھی مدوّن ہونا باقی ہے۔ ادب اور مذہب سے متعلق آوازیں تعداد اور مقدار میں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر ادیب اور مذہبی دانشور ہو، جس کی آواز سے یہ انمول خزانہ محروم ہو، قرآن حکیم کی مختلف آوازوں میں مکمل ریکارڈنگ، اس کا مکمل

انگریزی ترجمہ، مشاہیر کی بے شمار تقریریں، لیکچر، ادیبوں کی گفتگوئیں، انٹرویو اور کلامِ شاعر بزبانِ شاعر کا اندازہ اس سے لگائیں کہ کئی نامور شعرا کا پورا پورا کلام ان کی اپنی آواز میں اس لائبریری میں محفوظ ہے۔

لُطف اللہ خان اپنی اس عظیم لائبریری کے تقریباً حافظ ہیں۔ مندرجہ بالا تین شعبوں سے متعلق آپ کوئی سوال کریں وہ ایک لمحے کا توقف کیے بغیر نفسِ سوال کے جواب کے ساتھ ساتھ بے شمار ملحقہ معلومات بھی دیتے چلے جاتے ہیں اور پھر اپنی باتوں کے ثبوت اور شواہد کے لیے دستاویزی ثبوت بھی ہاتھوں ہاتھ مہیا کر دیتے ہیں، اتنی مکمل بھرپور اور باقاعدہ ساؤنڈ لائبریری کی تکمیل و تشکیل اور نگہداشت کسی بڑے ادارے کے لیے بھی ایک انتہائی دقت طلب کام ہے۔ ہمارے ملک میں ریڈیو پاکستان، ای ایم آئی، ٹی وی اور لوک ورثے کے قومی ادارے میں بھی اس نوع کے شعبے موجود ہیں لیکن معیار اور مقدار دونوں حوالوں سے اکیلے لُطف اللہ خان کی ساؤنڈ لائبریری ان چاروں پر بھاری پڑتی ہے۔ ٹی وی اور ریڈیو کو ہنگامی طور پر جب کبھی کسی آواز کی ضرورت پڑتی ہے وہ لُطف اللہ خان کی طرف بھاگتے ہیں اور ہر بار کامیاب لوٹتے ہیں۔

دُنیا کے مہذب اور متمدن ممالک میں لُطف اللہ خان جیسے لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ ان کی آؤ بھگت اور پذیرائی کی جاتی ہے، مختلف انداز میں ان کی خدمات کو نہ صرف تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ اعترافِ خدمت کے طور پر قومی نوعیت کے انعامات و اعزازات سے نوازا جاتا ہے، اہلِ وطن اور پوری دنیا کو ان کے کارناموں سے آگاہ کیا جاتا ہے، غالبؔ نے کہا تھا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

لیکن یہ بات اس نے قاعدے کلیے کے طور پر نہیں کہی تھی یہ تو ایک عظیم فنکار کی جھنجلاہٹ تھی جسے اس کے ہمعصروں نے ''بیانِ حلفی'' تصور کر لیا تھا جیسے ایک بار ہمارے دوست افتخار عارف نے ازراہِ انکسار کسی محفل میں کہہ دیا کہ

''شعر تو بڑی دُور کی بات ہے انہیں تو ابھی مصرعہ لکھنا نہیں آیا۔''

اس محفل میں شریک ان کے دوست آج تک ان کے بارے میں یہی کہتے ہیں، اور ثبوت کے طور پر خود افتخار عارف کو Quote کرتے ہیں، ابنِ انشاء نے اپنے ایک مضمون میں شاعری کے ایک روایتی اُستاد کے بارے میں لکھا ہے کہ

''استادِ مرحوم اپنے نام کے ساتھ ازراہِ انکسار ''ننگِ اسلاف'' لکھا کرتے تھے ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی ان کے نام کے ساتھ یہی لکھنا شروع کر دیا۔''

سو معلوم ہوا کہ زیادہ انکسار بھی بعض اوقات مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ یہ باتیں ہم نے اس لیے لکھی ہیں کہ لُطف اللہ خان بھی ''افراطِ انکسار'' کے شکار ہیں کچھ فارسی محاوروں اور ضرب المثال نے مسلمانوں کو بحیثیت قوم خاصا نقصان پہنچایا ہے مثلاً یہ کہ ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز'' کا مفہوم ہم نے یہ لے لیا ہے کہ پورا معاشرہ سچ کی حفاظت کے لیے جھوٹ کا علم لیے کھڑا ہے۔ لُطف اللہ خان گزشتہ کئی برسوں سے ''مشک آنست کہ خود بہ بُوید نہ کہ عطار بگوید'' کے مریض چلے آ رہے ہیں انہیں اپنے کام کی دُھن میں یہ دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ اب ''مُشک'' جب تک سو پچاس دفعہ ٹی وی کے اشتہار میں نہ آئے اس کا کسی کو پتا ہی نہیں چلتا، ہم عطار تو نہیں ہیں لیکن اتفاق سے (حسن اتفاق سے) ہم تک اس حیرت انگیز ساؤنڈ لائبریری کی خوشبو پہنچ

گئی ہے۔ اس لیے ہم نے اپنا آج کا کالم اس کے لیے وقف کر دیا ہے اگر یہ خوشبو اہلِ وطن اور ارباب اختیار تک ہمارے وسیلے سے پہنچ جائے تو ہمیں روحانی خوشی ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر لطف اللہ خان اور ان کی اس لائبریری کو دُنیا سے متعارف کرایا جائے، تو اس سے نہ صرف فن و ثقافت کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ ہم اس انفرادی کارنامے کو پاکستانی تہذیب و ثقافت کے ایک مظہر کے طور پر بڑے فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں گے۔ ''کارروائیاں'' ڈالنے کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی یہ چند کرنیں (جو اپنی تخلیقی ذات کے زور پر خودرو پھولوں کی طرح لہرا رہی ہیں) ہم سب کی توجہ چاہتی ہیں، کیوں کہ ثقافتی محاذ پر ہماری پوزیشن تقریباً وہی ہوتی جا رہی ہے جو ہر بار اولمپکس کھیلوں میں ہوتی ہے۔

افسردگیٔ سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

نصابِ تعلیم اور تعلیم

گزشتہ دنوں ہمیں قومی کمیٹی برائے جائزہ نصابی کتب کے اجلاسوں میں شمولیت کا موقع ملا۔ ہمیں اُس کمیٹی میں شامل کیا گیا تھا جس کے ذمے انٹرمیڈیٹ اُردو (لازمی) کی کتاب کا جائزہ لینا اور اس ضمن میں سفارشات مرتب کرنا تھا۔

سب سے پہلا سوال جو ابھر کر سامنے آیا یہ تھا کہ انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کو اُردو لٹریچر کیوں پڑھایا جاتا ہے؟ یہ وہ موڑ ہے جہاں سے طلبا اعلیٰ تعلیم کے لیے راستہ منتخب کرتے ہیں اور اس کے بعد میڈیکل، پری انجینئرنگ کامرس اور آرٹس کے میدانوں کی طرف نکل جاتے ہیں جہاں لٹریچر کی یہ تعلیم ان کے کسی کام نہیں آتی اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادب اور اس کا مطالعہ بے معنی چیزیں ہیں، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ سائنس کی تعلیم حاصل کرنے والوں کو ایک ایسا مضمون پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے جو خصوصی توجہ، افتادِ طبع اور تربیت کا متقاضی ہے اور جس کے لیے ابتدائی جماعتوں میں انہیں بنیاد فراہم نہیں کی جاتی۔ یہ صورتِ حال اور زیادہ گھمبیر اور تکلف دہ اس لیے بھی ہو جاتی ہے کہ اُردو لازمی کا پرچہ دو سو نمبر کا ہوتا ہے اور اس میں حاصل کردہ نمبروں کا بہت گہرا تعلق اس طالب علم کے مستقبل سے ہوتا ہے جس کی آئندہ تعلیم کا اس سے ایک فیصد بھی تعلق نہیں ہوتا۔

اُردو کی ضرورت اور اہمیت کے حق میں بھی خاصے وزنی دلائل ہیں۔ یہ ہماری قومی زبان ہے اور اسے ذریعۂ تعلیم کا درجہ بھی حاصل ہے۔ نیز یہ ہماری تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی آئینہ دار ہے اور قومی یک جہتی کے حوالے سے ایک اہم اور بنیادی ستون!

یہ سب باتیں بجا! مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سب تقاضوں کا اُردو ادب کی تعلیم سے کیا تعلق ہے! اصل مقصد اگر طلبا کو اُردو زبان پڑھانا اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کا استعمال سکھانا ہے تو انہیں ایسی اصناف ادب پڑھانے کا کیا فائدہ ہے جن کو وفات پائے بھی ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو چلا ہے اس کے علاوہ ایسی نثر اور شعر پڑھانا بھی جن کا تعلق ان کی عملی زندگی سے نہیں بنتا ایک بے کار کام ہے اس سے طلبا میں اُردو سے محبت کی بجائے بیزاری بڑھتی ہے اور وہ اُردو کے پرچے کو اپنے مستقبل کے لیے ایک عذاب سمجھنے لگتے ہیں۔

قومی کمیٹی کے ان اجلاسوں میں اس صورتِ حال کا گہرا اور سنجیدہ جائزہ لیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ اُردو کی اہمیت اور انٹرمیڈیٹ تک اس کی لازمی حیثیت کو تو برقرار رکھا جائے لیکن نصاب کا جھکاؤ لٹریچر کی بجائے ''زبان'' کی طرف کر دیا جائے،

کتابوں کی ترتیب کا پرانا انداز بدل دیا جائے جس میں نثر و نظم کی تخلیقات تاریخی اعتبار سے درج کی جاتی تھیں اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ اُردو کے تمام بڑے لکھنے والوں کی تحریریں زمانی ترتیب کے ساتھ درج کی جائیں اور یوں یہ نصاب طلبہ کو زبان سکھانے کے بجائے ادبی مجموعوں کی شکل اختیار کر جاتے تھے اور ادبی مجموعے بھی ایسے جن کے مندرجات زبان کے جدید اور عملی استعمال سے کوسوں دُور ہوتے تھے۔

جدید ٹیکنالوجی کے اس زمانے میں نصابی کتب کے سلسلے میں ہمارے ماہرین تعلیم کا یہ رویہ بے حد مبہم اور نا قابل تشریح ہے زبان کی تعلیم کو عملی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ طلبا میں زبان سے دلچسپی پیدا کی جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انہیں ایسی زبان پڑھائی جائے جو ان کے اردگرد عام زندگی اور ذرائع ابلاغ میں استعمال ہوتی ہے.....

اس وقت کی رائج نصابی کتب کے کچھ مندرجات ملاحظہ کیجیے:

''سب سے پہلے ایک ہاتھی پر علمِ اژدہا پیکر، پیچھے اس کے ہاتھیوں پر ہندوستان کے ماہی مراتب اپنی دلایت کے طوغ و علم برنجی اور فولادی نقارے اور دمامے بعد ان کے ہزاروں ہاتھی ہودج عماری سے سجے..... چاندی سونے کے بھاری بھاری ساز کسی پر جڑاؤ زین دھرا، کسی پر چار جامہ کسا، قجریاں اور پاکھریں، پٹھوں پر پڑیں، جن میں قاقم و سمور کی جھالر، کلابتون کے، پھندے، گلے میں سراگائے کی چوڑیاں لٹکیں، سر پر کلغیاں، طلائی اور نقرئی، ریشمیں باگ ڈوریں سائیسوں کے ہاتھوں میں الیل کرتے چوکڑیاں بھرتے چلے جاتے تھے۔''

(محمد حسین آزاد)

اب محمد حسین آزاد کی انشا پردازی اور ان کا صاحب طرز ادیب ہونا اپنی جگہ لیکن اس قسم کی نثر سے طالب علم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ خصوصاً وہ طلبا جو سائنس اور کامرس کے شعبوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے!

آیئے اب رجب علی بیگ سرور کے فسانہ عجائب کا ایک اقتباس بھی دیکھیے:

''بلبلِ نوا سنج، ہزار داستان، گلشنِ تقریر میں یوں چہکا ہے کہ بعد رسمِ شادی سیر و شکار کی اجازت، سواری کا حکم شاہ ذوی الاقتدار سے حاصل ہوا۔ گاہ گاہ شام و پگاہ جان عالم سوار ہونے لگا۔ ایک روز گزرا اس کا گزری میں ہوا۔ انبوہ کثیر، جمِ غفیر نظر آیا اور غلغلہ تحسین و آفرین بلند پایا..... شہزادے کے دیکھتے ہی طوطا مالک سے بولا:

''اے شخص کوکب تقدیر تیرا افلاس کے برجِ تیرہ سے نکلا، نصیب چمکا دیکھ ایسا شہزادۂ حاتم شعار، ابرِ گوہر بار متوجہ اس مشت پر ذرۂ بے مقدار پر ہوا ہے۔ کارگاہِ بے ثبات میں وہ شے میں ہوں، جس کا طالب نہیں کہیں، بحد یکہ جانور ہوں اور بلی کا کھاجا۔''

(سرور)

اس سے قطع نظر کہ اس نثری ٹکڑے میں مطالب کیا بیان کیے گئے ہیں اس کی جناتی زبان سے دہشت زدہ طالب علم کو

یہ سمجھانا کہ یہ بھی اُردو زبان کا ایک رُوپ ہے۔ اسے زبان سے باغی کرانے کے مترادف ہے اور یہ محض اس لیے ہے کہ نصاب مرتب کرتے وقت اس کی عملی افادیت کی بجائے۔ اُردو ادب کی تعلیم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اس میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن یہ طرزِ فکر ان طلبا کے لیے درست ہے جو اُردو ادب کو بطور ایک مضمون کے پڑھنا چاہتے ہیں۔ اُردو لازمی کا کام بنیادی طور پر زبان اس کی تعلیم اور اس کے استعمال کا شعور پیدا کرنا ہونا چاہیے۔

نصابی کتابوں کی تدوین میں ایک اور بے احتیاطی یہ بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ کسی سبق کو شاملِ نصاب کرتے ہوئے اس کے مندرجات کو لفظاً لفظاً نہیں پڑھا جاتا جس سے بعض اوقات ایسے جملے کتاب میں آ جاتے ہیں جن سے طلبہ کے ذہنوں پر بُرا اثر پڑتا ہے اس کے علاوہ اس بات کا بھی بہت کم خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی مصنف یا شاعر کی بنیادی خوبیوں اور پہلوؤں کی مطابقت سے اس کی تحریر کا انتخاب کیا جائے۔ اس سے طلبہ کے ذہن میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور وہ اس مخمصے میں پڑ جاتے ہیں کہ مصنف یا شاعر پر لکھے ہوئے تنقیدی نوٹ اور اس کی تحریر کے نمونے میں اتنا زیادہ فرق کیوں ہے۔

مثال کے طور پر عبدالحلیم شرر کی شہرت ان کے تاریخی ناولوں کی وجہ سے ہے اور ان کی تحریر میں ایک طرح کا ٹھہراؤ، شائستگی، سادگی اور وضاحت پائی جاتی ہے مگر انٹرمیڈیٹ کی کتاب میں ان کا جو مضمون ''صحبتِ برہم'' شامل کیا گیا ہے وہ ان کی تحریر کی ان تمام بنیادی خوبیوں سے عاری بلکہ ایک حد تک ان کے بالکل اُلٹ ہے اور پھر اس کا موضوع ایسا ہے کہ اسے طلبہ کو پڑھانا، ماتھے پر پسینہ لے آتا ہے ہم نے کچھ خاتون لیکچروں سے معلوم کیا ہے ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ اس سبق کی تشریح میں انہیں بے حد دقت ہوتی ہے کیوں کہ اس میں کئی مقامات پر مصنف نے اپنی جوانی کی حسرتوں کا ذکر کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے۔

کہ اب اس کی جنسی قوت ختم ہوگئی ہے اور وہ ان حسینوں کی توجہ کا خاطر خواہ جواب نہیں دے سکتا جو اس کے اِردگرد اور اس کی دسترس میں موجود ہیں۔

> ''جوش اور اُمنگ کا یہی زمانہ تھا، اسی عہد میں ہم انسانی کمال کو پہنچے تھے جب تمام جذبات پوری قوت پر ہوتے ہیں اور ہر مزید دار جذبہ جوش پر ہوتا ہے۔ آہ شباب کا خیال آتے ہی خدا جانے کون کون سی صحبتیں یاد آ گئیں؟ کبھی پُری وشوں کے جھرمٹ میں تھے ناز آفرینی اور ناز برداری کی صحبت گرم تھی..... وہ بگڑتے تھے اس لیے کہ ہم منائیں اور ہم چھیڑتے تھے تو اس لیے کہ وہ روٹھیں۔ وہ بگڑ کر مارتے تھے تو ڈھیلے ہاتھوں سے اور ہم جوش میں آ کر دست درازی کرتے تھے تو اس لیے کہ ایسے ہی دو چار ہاتھ اور پڑ جائیں..... وہ نازنین پری جمال جن کا کام تھا کہ ظلم و جور کریں اور جن کی ناز برداری ہمارے لیے زندگی کا سب سے بڑا سرمایۂ نشاط تھی۔ اب ہماری ہر بات پر ہاں اور بجا کہتی تھیں۔ اب ان میں بے مہری اور بے وفائی نہ تھی، گویا ہمارے اشاروں پر چلنے کو تیار تھیں مگر افسوس ہمارے جذبات مردہ ہو چکے ہیں۔''

اسی طرح سرسیّد کے بارے میں حالی کی کتاب ''حیاتِ جاوید'' سے جو ٹکڑا انتخاب کیا گیا ہے اس میں مندرجہ ذیل سطریں سرسیّد کی جو تصویر طلبہ کے ذہن میں قائم کرتی ہیں ان کا اندازہ آپ خود کیجیے:

> ''ایک بار میں نے اپنے رشتہ دار بھائی کو جو استنجا کر رہا تھا، چپکے سے اس کے پیچھے جا کر چت کر دیا۔ اس

کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔''

حالی نے تو اپنی کتاب میں سرسیّد کی پوری زندگی کی تصویر کھینچی تھی چناں چہ یہ واقعہ درج کرنا ان کے لیے ضروری تھا مگر طلبہ کو ''استنجے'' کی اس کارروائی میں شامل کرنے کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

اس طرح میر حسن کی مثنوی سے اقتباس لیا گیا ہے۔ اس میں کنیزوں کی مختلف خصوصیات کے حوالے سے چند ایسی خصوصیات بھی بتائی گئی ہیں جن کا موضوع ان کی جنسی اور جسمانی خوبیاں ہیں، کیوں؟

ہمیں خوشی ہے کہ دیر سے ہی سہی تعلیم کے اربابِ بست و کشاد کو اس بات کا احساس تو ہوا ہے کہ وہ کہاں کہاں غلطی پر ہیں اور ان غلطیوں کو کیسے درست کیا جا سکتا ہے یوں تو ہر مضمون کے سلسلے میں اس کی افادیت اور طلبہ کی دلچسپی اور تفہیم کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے مگر اُردو کے سلسلے میں اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے کہ یہ صرف ایک مضمون ہی نہیں ہماری قومی زبان بھی ہے اور طلبہ کی اس میں دلچسپی اور بہتر استعداد آگے چل کر قومی زندگی کے مزاج میں ایک خوشگوار تبدیلی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

کرکٹ کی باتیں

کرکٹ ایک متعدی بیماری ہے اور عام طور پر کامن ویلتھ کے ممالک میں پائی جاتی ہے۔ اس کا رواج اس زمانے میں پڑا جب برطانیہ کی سلطنت کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اب اگرچہ ملکہ کی سلطنت میں سورج بہت کم نکلتا ہے لیکن کرکٹ کا رواج کم نہیں ہوا کرکٹ کے بارے میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک دلچسپ کھیل ہے (یہ اور بات ہے کہ اس میں کھیل کی بنیادی صفت یعنی فتح اور شکست کے علاوہ برابر چھڑوانے کا بھی معقول بلکہ نامعقول حد تک اہتمام رکھا گیا ہے اور صرف اسی پر اکتفا نہیں بلکہ شاید یہ واحد کھیل ہے جو اس یقین کے بعد بھی کہ ہار جیت کا فیصلہ ناممکن ہے جاری رہتا ہے۔ ہمارے ہاں فرضی اور پہلے سے طے شدہ نتائج کے لیے نورا کشتی کی اصطلاح رائج ہے ہمارے خیال میں یہ کرکٹ کے لیے موزوں ترین ہے۔ کرکٹ کے بارے میں انگریزوں کا کہنا ہے (اور واضح رہے کہ یہ اُن دنوں کا کہنا ہے جب اُن کے کہے کی قیمت اور قدر ہوتی تھی) کہ کرکٹ شرفا کا کھیل ہے اگر شرفا سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایک دن کا کام پانچ دن میں مکمل کریں تو ہمیں ان کی رائے سے اتفاق ہے لیکن عرفِ عام میں ایسے لوگوں کو ہڈحرام کہا جاتا ہے۔

جیل کے قیدیوں کو تفریح بہم پہنچانے اور ان کو انسان ہونے کا یقین دلانے کے لیے انگلستان کے جیل حکام نے تجربہ کیا کہ وہ تقریباً سو قیدیوں کو ایک کاؤنٹی کرکٹ میچ دکھانے کے لیے لے گئے شام کو جب قیدیوں سے ان کے تاثرات معلوم کیے گئے تو سب نے یک زبان ہو کر فیصلہ دیا۔

''اچھا..... تو یہ تفریح تھی، ہم تو اسے اپنی سزا کا حصہ سمجھ کر دیکھتے رہے۔''

ہاں تو بات ہو رہی تھی انگریزوں کی اور کرکٹ کے بارے میں ان کے رویے کی۔ سنا ہے دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک انگریز نے اخبار پڑھتے ہوئے دوسرے کو اطلاع دی کہ لندن کے فلاں علاقے میں بمباری کی وجہ سے پانچ سو عمارتیں تباہ ہوگئی ہیں۔ دوسرے نے اطمینان سے سگار کا کونہ چباتے ہوئے جواب دیا کہ

''خیر جنگ میں ایسا ہوتا ہی ہے۔''

پہلے نے دوسری خبر پڑھی کہ

''راشن کی سپلائی میں مزید کمی کر دی گئی ہے۔''

دوسرے نے اس پر بھی کسی تشویش کا اظہار نہ کیا۔ پہلے نے تیسری خبر پڑھی کہ

''جنگ کی وجہ سے لارڈز کی گراؤنڈ پر ہونے والا کرکٹ کا میچ ملتوی کر دیا گیا ہے۔''

اس پر دوسرا تڑپ کر بولا:

''خدا غرق کرے اس جنگ کو کتنی واہیات چیز ہے۔ اس کو فوراً بند ہو جانا چاہیے۔''

جب تک دُنیا پر انگریز کی حکومت رہی تو وہ اپنی مرضی کی کرکٹ کھیلتے رہے اور کوئی ان کو یہ کہنے والا نہ تھا کہ بھائی This is not Cricket? چناں چہ وہ افریقہ سے ایشیا تک اپنی نو آبادیوں میں مسلسل نو بال کرتے رہے لیکن چوں کہ ایمپائر ان کے اپنے تھے اس لیے وہ بغیر کسی دِقت کے مسلسل سکور بناتے رہے اب البتہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے خیر یہ ایک سیاسی معاملہ ہے ہم کو اس سے کیا ہم تو بات کر رہے تھے کرکٹ کی اقبال نے کہا تھا:

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں
انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

کرکٹ کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے اس وقت آسٹریلیا، بھارت، انگلستان، نیوزی لینڈ، پاکستان اور ویسٹ انڈیز ایسے ممالک ہیں جو ٹیسٹ کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ ساؤتھ افریقہ کی ٹیم کا اس کی حکومت کی کرتوتوں کی وجہ سے حقہ پانی بند ہے اور سری لنکا ابھی دودھ پیتی بچی ہے یعنی اس وقت U.N.O کے ڈیڑھ سو ممبران میں صرف آٹھ ایسے ممالک ہیں جہاں اس کھیل کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔ ٹاواں ٹاواں کوئی اور ملک بھی ہو گا مگر اس کا ہونا اور نہ ہونا ایک برابر ہے۔ ترقی یافتہ ممالک ایسے کھیل کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتے کہ یا تو کرکٹ کھیل لو یا ترقی کر لو۔

پاکستان ۱۹۵۲ء سے ٹیسٹ کرکٹ کھیل رہا ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے ہم نے جیتنے کی عادت تقریباً چھوڑ ہی دی ہے کیوں کہ اس سے ایک تو مخالف ٹیم کی دل آزاری کا خدشہ ہوتا ہے اور دوسرے تیز کھیلنا پڑتا ہے اور چوں کہ دونوں باتیں ہمارے کھلاڑیوں اور ان سے زیادہ ہمارے سلیکٹرز کو ناپسند ہیں اس لیے ہماری زیادہ تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ یا تو ہار کر وسیع ظرفی کا مظاہرہ کریں یا میچ برابر کر کے تماشائیوں کے دانت کھٹے کر دیں لیکن اس چکر میں دوسری ٹیمیں عام طور پر زیادتی کر جاتی ہیں۔

تقسیم سے پہلے ایک سردار جی ہاکی کے خاصے اچھے کھلاڑی مشہور تھے۔ ان کے کچھ دوست کرکٹر بھی تھے۔ سردار جی ان کو ہمیشہ چھیڑا کرتے تھے کہ تمہارے بیٹ اتنے چوڑے ہوتے ہیں پھر بھی تم سے گیند مس ہو جاتی ہے۔ ہمیں دیکھو پتلی سی ہاکی سے ہر گیند کو روک لیتے ہیں۔ دوستوں نے بہت سمجھایا کہ ہر کھیل کا اپنا طریقہ ہوتا ہے مگر سردار جی نہ مانے تنگ آ کر دوستوں نے فیصلہ کیا کہ ان کو عملی تجربہ کروانا چاہیے۔ چناں چہ ایک میچ میں ایک بہت ہی تیز باؤلر کے سامنے سردار جی کو پیڈ بندھوا کر Batting کے لیے بھیج دیا گیا۔ باؤلر نے بہت لمبا سٹارٹ لیا اور دانت پیستے ہوئے پوری قوت سے سردار کی طرف گیند پھینکی۔ گیند زمین پر لگی اور شوں کر کے سردار جی کے منہ کے قریب سے نکل گئی۔ وکٹ کیپر نے بال روکا اور واپس باؤلر تک پہنچا دیا۔ اس عرصہ میں سردار جی بڑے اطمینان سے بلّا زمین پر ٹکائے اپنے سٹائل میں کھڑے رہے میدان تالیوں سے گونج اُٹھا کہ بھئی واہ کمال کی جج منٹ ہے باؤلر اس بے عزتی پر جھنجلا گیا اور اس نے اپنا سٹارٹ مزید بڑھا دیا۔ دوسرا بال پھینکا مگر سردار جی ٹس سے مس نہ ہوئے اس بار تو جناب تماشائیوں نے داد و تحسین کے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا کہ کیا غضب کا کھلاڑی ہے گیند کو سرے سے لفٹ

ہی نہیں دی۔ باؤلر کا غصہ سے بُرا حال ہو گیا لہٰذا اس نے اس بار پوری قوت سے دوڑنا شروع کیا اور پوری طاقت لگا کر گیند کروائی۔ گیند تو خیر سردار جی کے سر پر سے گزر گئی مگر ایمپائر نے No Ball کی آواز دے دی۔ سردار جی بڑے اطمینان سے وکٹ کیپر کی طرف مُڑے اور گویا ہوئے:

''ایمپائر کو اب پتا چلا ہے مجھے تو شروع ہی سے پتا تھا کہ اس کے پاس بال نہیں ہے۔''

T.V کے ڈائریکٹر نیوز مصلح الدین سے روایت ہے کہ بھارتی ٹیم کے گزشتہ دورۂ بھارت کے دوران ایک پارٹی میں ہندوستانی کپتان بے تحاشہ شراب پی رہا تھا کسی نے اس کو ٹوکا تو کہنے لگا:

''پی لین دے یار سویرے فیر ظہیر عباس اگے پیشی اے۔''

ظہیر عباس کی بیٹنگ کو ایسا عمدہ خراج ایک سکھ ہی پیش کر سکتا ہے۔ نقی شمسی مرحوم کرکٹ کے حلقوں کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھے، وہ پنجاب کرکٹ کلب لاہور کے بانی، سرپرست، کپتان اور سب کچھ تھے لیکن کھیل کی طرف سے اُن کا ہاتھ بہت تنگ تھا۔ یوں بھی وہ خود کھیلنے کی بجائے ٹیم کو کھیلتا دیکھ کر زیادہ خوش ہوتے تھے۔ چناں چہ کلب کے سارے اخراجات تنِ تنہا برداشت کرتے تھے لڑکوں کو دوپہر کا کھانا کھلاتے اور کچھ کو آنے جانے کا کرایہ بھی ادا کیا کرتے تھے بیحد خوش طبع تھے لہٰذا ان کے کچھ واقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۹۶۷ء میں پنجاب کلب فیصل آباد ڈویژن کی ٹیم سے میچ کھیلنے فیصل آباد گئی۔ میچ غالباً کسی میلے کی تقریب کا حصہ تھا چناں چہ وہاں کے ڈپٹی کمشنر بطورِ مہمانِ خصوصی آئے ہوئے تھے میچ سے قبل نقی شمسی مرحوم نے اپنی ٹیم کی اتنی تعریفیں کیں اور ان کی مہارت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ بیچارہ ڈپٹی کمشنر کھسیانا سا ہو گیا اور معذرت کرنے لگا کہ ہماری ٹیم تو بس یونہی سی ہے بھلا آپ کا کیا مقابلہ کرے گی بہرحال اتنا ہے کہ اچھی ٹیم سے کھیل کر تجربہ ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

تھوڑی دیر بعد میچ شروع ہوا اور فیصل آباد کی ٹیم نے ہمارے باؤلروں کی وہ پٹائی کی کہ خدا کی پناہ۔ ڈپٹی کمشنر نے بڑے طنزیہ انداز میں نقی مرحوم سے پوچھا:

''کیا قصہ ہے آپ تو کہتے تھے میرے باؤلر عنقریب ٹیسٹ کھیلنے والے ہیں۔''

نقی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا:

''کیا عرض کروں جناب باؤلنگ کو لیسپس ہو گئی ہے۔''

مرحوم اپنی ٹیم کا سکور بڑھانے میں چیمپئن تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے جاننے والے اُن کو سکورنگ نہیں کرنے دیتے تھے ایک دفعہ ان کا سامنا اپنے ہی جیسے ایک سکورر سے ہو گیا چناں چہ میچ کے بعد سکور ملائی گئی تو دونوں کے ٹوٹل میں ایک سو چھ رنز کا فرق نکلا۔ ایک دفعہ کلب میں ایک نئے باؤلر آئے پتا چلا کہ موصوف انگلستان میں کھیلتے رہے ہیں اور خود بھی وہ صاحب بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے تھے کہ میں نے فلاں کو دوسرے گیند پر آؤٹ کیا اور فلاں کو چوتھے پر۔ جب کلب کی طرف سے پہلا میچ کھیلے تو ہم سب پر ان کا بے حد رعب تھا کوئی دس منٹ تک فیلڈ سیٹ کرتے رہے لمبا سا سٹارٹ لیا اور ایک نہایت ہی بے ہودہ گیند کروائی جس پر اس قدر زوردار چوکا لگا کہ کسی کو ہلنے کا موقع تک نہ ملا۔ موصوف نے بازو کو دو چار جھٹکے دیئے گریبان کے بٹن کھولے اور ایک فیلڈر کو وہاں کھڑا کر دیا۔ اگلی دو گیندوں پر یہی عمل دُہرایا گیا جب پانچویں مرتبہ فیلڈر تبدیل کرنے لگے تو نقی نے

ان کے پاس جا کر بڑے اطمینان سے کہا:

''کیا خیال ہے ایک دو آدمی باہر درختوں پر نہ بٹھا دیں۔''

امان اللہ جو آج کل ٹیسٹ ایمپائر ہیں ٹیم کے نائب کپتان ہوا کرتے تھے نقی اور ان میں ہر وقت جملے بازی ہوتی رہتی تھی۔ ایک میچ میں دونوں آمنے سامنے کھیل رہے تھے اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے پر جملے بھی کستے جاتے تھے۔ مخالف کپتان نے ایک دم سے اپنے اچھے باؤلر تبدیل کر کے عام سے باؤلر لگا دیے۔ جب ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگے:

''یار ان کی باتوں کا اتنا مزہ آ رہا ہے کہ میں نہیں چاہتا یہ آؤٹ ہوں۔''

صائمہ عمّار

اسے اب چھوڑ کر وہ جا رہی ہے
وہ دنیا، اس نے جو دیکھی نہیں تھی

یہ شعر انور مسعود نے جس ہستی کے لیے کہا ہے وہ اس کی منجھلی بہو، مجھے اپنی بیٹیوں جیسی عزیز اور بریگیڈیئر نیاز اور ان کے خاندان کے لیے صائمہ عرف چھوٹو تھی۔ یہ بہت پیاری بچی جو دو برس کی عمر میں بینائی سے محروم ہو گئی تھی اور جس نے ساری زندگی تقدیر کے اس بھیانک مذاق کے باوجود انتہائی جرأت، دلیری، سلیقے اور دُنیا بھر کے بینائی سے محروم لوگوں کے لیے ایک قابلِ تقلید اور روشن مثال کے انداز میں بسر کی بالآخر 22 دسمبر کی صبح 40 برس کی عمر میں اس دارِ فانی سے رُخصت ہو گئی۔ اس کی رحلت ان تمام لوگوں کے لیے، جو زندگی کے کسی موڑ پر اس سے ملے یا انہیں اسے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا، یقیناً ایک ذاتی صدمہ ہے کہ اس کی زندگی سے بھرپور آواز اور ذہانت اور ہمت کا انداز ایسا تھا کہ کوئی اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے بصارت سے محرومی کے باوجود ملک اور بیرونِ ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنی بے مثال ذہانت اور پُرتاثیر گفتگو سے دُنیا بھر میں اپنا اور اپنے وطن کا نام روشن کیا۔

عمار مسعود سے اس کی شادی سے تقریباً ایک برس پہلے کا واقعہ ہے جب میں نابینا لوگوں کی مدد اور تعلیم و تربیت کے لیے قائم کردہ ایک ایسی این جی او میں اس سے ملا جس کی وہ روحِ رواں تھی۔ یہ ملاقات اس کی فرمائش پر عمار کی وساطت سے ہوئی جو اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی ملازمت کے ساتھ ساتھ اس کا ہاتھ بھی بٹایا کرتا تھا جو شاید ایک طرح سے اس کے قریب رہنے کا بہانا تھا کہ دونوں کے دلوں کے اندر وہ گھنٹی بج چکی تھی جس کا ایک معروف نام ''محبت'' ہے لیکن غالباً اس کا پتا اس وقت تک ان دونوں کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا۔

اگر عمار نے مجھے نہ بتایا ہوتا کہ میں جس لڑکی سے ملنے جا رہا ہوں وہ قوتِ بینائی سے محروم ہے تو شاید مجھے بہت دیر تک اس کی اس محرومی کا پتا نہ چل پاتا کہ میرے سامنے بڑی بڑی آنکھوں والی ایک ایسی خوب صورت، خوش لباس اور خوش مزاج لڑکی بیٹھی تھی جو خاصی پیچیدہ آڈیو ریکارڈنگ کی مشینوں کو اس تیزی، اعتماد اور مہارت سے حرکت دے رہی تھی کہ کوئی اچھے سے اچھا ساؤنڈ ریکارڈسٹ بھی کیا دے گا۔ اس نے شاعری اور ڈرامے کے حوالے سے میرا ایک ایسا انٹرویو ریکارڈ کیا جس کا ہر سوال

اس کی ذہانت، مطالعے اور اپنے موضوع پر مکمل گرفت کا حامل تھا۔ آخر میں جب کلام ریکارڈ کرانے کی باری آئی تو اس نے مجھے میری ایسی ایسی نظمیں اور غزلیں یاد دلائیں کہ عمار کی تمام تر محبت، عقیدت، رشتہ داری (کہ اس کا بڑا بھائی عاقب انور میرا داماد ہے) اور اس کے والد یعنی انور مسعود سے میری گہری دوستی کے باوجود ایک لمحے کے لیے میرے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ دونوں نوجوان مل کر میرے ساتھ کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہے۔ بھلا ایک لڑکی جو دو برس کی عمر سے نابینا ہے اس قدر شاعری کیسے پڑھ اور یاد کر سکتی ہے۔ بعد میں جب اس سے مزید گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کا مطالعہ بے حد وسیع ہے اور دُنیا بھر کے ادب، موسیقی اور نابینا لوگوں سے متعلق تنظیموں کے بارے میں اس کی معلومات ناقابلِ یقین حد تک گہری، وسیع اور تازہ ہیں۔ اس کی شخصیت کا یہ پہلا تاثر اس قدر گہرا تھا کہ میرا دل اس کی طرف کھنچتا چلا گیا اور میں نے محسوس کیا کہ اسے بھی میرا اس کو صائمہ بیٹی کہہ کر بلانا بہت اچھا لگا ہے۔

کچھ عرصہ بعد ایک دن عمار نے بہت جھجکتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ صائمہ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس ضمن میں اسے میری مدد کی ضرورت ہوگی کہ یہ بات اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے دونوں خاندانوں اور جان پہچان کے لوگوں کے لیے یقیناً بہت چونکا دینے والی ہوگی۔ میں نے اس سے صرف ایک بات کہی کہ اگر وہ یہ شادی انسانی ہمدردی کے جذبے سے متاثر ہو کر کر رہا ہے تو نہ کرے کیوں کہ ہنگامی نوعیت کے جذبے مستقل رشتوں کا بوجھ نہیں سہار سکتے لیکن اگر وہ اس رشتے سے متعلق ان تمام متوقع مسائل سے نمٹنے کا حوصلہ رکھتا ہے جو اس انتہائی خوب صورت اور غیر معمولی عمل کو برباد کر سکتے ہیں تو صرف اس صورت میں اسے یہ قدم اُٹھانا چاہیے۔ اس کا جواب تھا کہ اس نے نہایت سوچ بچار اور ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے صائمہ سے بہتر شریکِ حیات نہیں مل سکتی۔ یہاں میں انور مسعود اور صدیقہ بھابھی کو بھی آفرین کہنا چاہوں گا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی خواہش کو ان تمام اندیشوں پر مقدم جانا جو اس رشتے کے دامن سے لپٹے ہوئے تھے اور یوں اپنے خاندان میں ''چھوٹو'' کہلائی جانے والی صائمہ نیاز، صائمہ عمار بن گئی اور آئندہ پندرہ برس تک عمار کے دل، انور مسعود کے گھر اور ہم سب نئے رشتے داروں کے دامنِ احساس کو ایک گلِ صد رنگ کی طرح مہکاتی رہی۔

صائمہ کو دیکھ کر ہمیشہ مجھے اپنی مرحومہ خالہ سلیمہ یاد آجاتی تھی جو اسی کی طرح دو برس کی عمر میں بصارت سے محروم ہوئی اور ساری زندگی اندھیرے میں گزار کر اس دنیا سے رُخصت ہوگئی۔ صائمہ مرحومہ کے والدین صاحبِ حیثیت اور شوہر انتہائی خیال رکھنے والا تھا جبکہ خالہ سلیمہ کے نصیب میں یہ دونوں باتیں بھی نہیں تھیں۔ اس نے ساری زندگی قرآن مجید اور نعتیں پڑھنے اور بہنوں بھائیوں کے بچوں کو نت نئی کہانیاں سناتے گزار دی کہ اس کے اختیار میں یہی کچھ تھا لیکن بالفرض اگر کچھ ہوتا بھی تو کیا یہ ان دونوں کی اس محرومی کا مداوا ہو سکتا تھا جس کے سائے میں انہوں نے اپنی زندگیاں گزار دیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب میں گزشتہ تقریباً ساٹھ برس سے ڈھونڈ رہا ہوں لیکن ہر دروازے پر ''مشیت'' کا بھاری بھرکم تالہ لٹک رہا ہے اور چاروں طرف ایک ہی آواز گونج رہی ہے کہ ربِ کائنات اپنی مشیت کی وضاحت کے لیے نہ کسی کی سنتا ہے اور نہ کسی کو سوال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

صائمہ کی ایک عادت نے مجھے ہمیشہ حیران بھی کیا اور پریشان بھی۔ حیران یوں کہ اگرچہ خود اسے توجہ، تعاون اور مدد کی ضرورت تھی مگر وہ ہمیشہ آگے بڑھ کر خود اپنی اور دوسروں کی مدد کرتی تھی اور پریشان اس طرح کہ بصارت سے محرومی کے باوجود

وہ اپنی گفتگو میں آنکھ والوں سے بھی زیادہ بینائی کے حوالے اور استعارے استعمال کرتی تھی۔ میری بیگم کے کپڑوں کو چھو کر ہمیشہ ان کے رنگوں کی تعریف کرتی اور مجھ سے بات کرتے ہوئے اکثر کہتی کہ کل میں نے آپ کا ڈرامہ دیکھا یا فلاں کتاب یا نظم پڑھی۔ مہمانوں کو ہمیشہ خود سرو کرتی اور ڈشوں کا نام لے لے کر کہتی کہ یہ کھایئے، یہ لیجیے، اسے دیکھیے۔ وہ ایسا کیوں کرتی تھی یہ سوال میں نے بہت سے احباب سے پوچھا مگر سچی بات ہے میری کسی بھی جواب سے تسلی نہیں ہوئی۔

وہ گزشتہ تقریباً ایک برس سے ایک طرح کے فالج میں مبتلا تھی۔ سارے جسم میں سے صرف اس کی زبان اور دماغ کام کر رہے تھے لیکن اس عالم میں بھی مایوسی کے لمحاتی دوروں سے قطع نظر وہ ہمیشہ مسکرا کر اور حوصلے سے بات کرتی تھی۔ پتا نہیں ایسی ضبط کی طاقت اس نے کہاں سے حاصل کی تھی۔ اس کے سوئم کی تقریب میں تقریباً ہر شخص یہی کہہ رہا تھا کہ جس قدر تکلیف اس نے دُنیا میں دیکھ لی ہے وہ اس بات پر شاہد ہے کہ وہ سیدھی جنت میں جائے گی۔ میں بھی اسی دُعا کے ساتھ اپنی پیاری صائمہ بیٹی کو رُخصت کرتا ہوں۔ انور مسعود نے اس کے لیے کچھ شعر کہے ہیں، آپ انہیں میرے دل کی آواز بھی کہہ سکتے ہیں:

مثال اس کی کوئی ملتی نہیں ہے
اسے جو ہمتِ عالی ملی تھی
وہ تھی محروم و غم دیدہ پر اس کی
رضائے حق سے گہری دوستی تھی
سیہ بختوں اور افسردہ دلوں میں
اُمنگوں کے اُجالے بانٹتی تھی
وہ اپنی شدتِ تکلیف میں بھی
ہمیشہ دوسروں کا پوچھتی تھی
وہ سونی کر گئی بزمِ عزیزاں
وہ رونق تھی، مہک تھی، روشنی تھی

شفیق صاحب

شفیق الرحمن بھی اس عالم فانی سے پردہ کر گئے۔ ایسے زندہ اور مُسکراہٹیں بانٹنے والے شخص کے لیے جس نے پچاس برس تک اُردو ادب کی اقلیمِ مزاح پر حکمرانی کی ہو اور جس کی تحریر اور شخصیت کے ہم پر بے پناہ ذاتی احسانات ہوں، کتنا مشکل اور تکلیف دہ کام ہے اس کا اندازہ ہمیں اب سے دو گھنٹے پہلے تک نہیں تھا کہ گزشتہ دو گھنٹوں سے ہم جب بھی کالم شروع کرنے کے لیے جملہ سوچتے ہیں ہمارا ہاتھ لرز لرز جاتا ہے:

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

شفیق الرحمن صاحب سے ہماری بالمشافہ ملاقات تو تیس برس پر محیط ہے لیکن ان کی تحریروں سے ہمارا عشق اس وقت سے ہے جب ہم نے ابھی لفظوں کو جملوں کی صورت میں پڑھنا سیکھا ہی تھا۔ ان کے لکھے ہوئے کردار اور جملے ہماری شعوری عمر کے ہر دو میں ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ نثر میں ہمارے اوّلین اور مستقل استاد بھی تھے گزشتہ کچھ دنوں سے ہمیں بہت یاد آ رہے تھے اور ہم نے پکا تہیہ کر رکھا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اس بار اسلام آباد سے انہیں ملے بغیر واپس نہیں آئیں گے کہ ان دنوں بعض شدید نوعیت کے ذاتی صدموں کے باعث انہیں دوستوں اور غمگساروں کی جتنی ضرورت تھی اتنی شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔

ہم اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ ہمیں شفیق الرحمن صاحب سے عمروں کے فرق اور نیازمندی کے باوجود دوستی کا شرف حاصل ہوا۔ انہیں جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ اپنی تحریروں کے برعکس ذاتی زندگی میں بہت کم آمیز اور احباب کے انتخاب میں انتہائی جزرس تھے۔ ایک ہمارے محمد خالد اختر ہیں کہ جن سے ان کی دوستی، گہرائی اور طوالت کے اعتبار سے

منم کہ مدتے عمرے بیک ملال گزشت

جیسی تھی لیکن یہ شاید فوجی زندگی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ ان سے تعلقات میں بھی ایک ڈسپلن اور قاعدہ ضرور ملحوظ رکھتے تھے۔ انتہائی مسرت اور خوشی کی حالت میں بھی وہ جذبات پر مکمل قابو رکھتے تھے۔ ان کی آنکھیں مسکراتی اور پورا وجود کھلا پڑتا تھا لیکن آواز کے ٹھہراؤ میں بہت کم تبدیلی آتی تھی اور لُطف کی بات یہ ہے کہ لطیفے سناتے اور دوسروں کے سنائے ہوئے لطیفوں سے محظوظ ہوتے ہوئے بھی ان کا یہ اسٹائل برقرار رہتا تھا۔

ستر 70 کی دہائی میں جب وہ نیول ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں متعین تھے، عطاالحق قاسمی اور ہم جب بھی ان سے ملنے گئے۔ ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ ہمیں دروازے پر لینے یا رُخصت کرنے نہ آئے ہوں۔ یہ وضع داری ہم نے بہت کم بزرگوں میں دیکھی ہے۔ اسی کمرے میں ہم نے پہلی بار کسی کو کھڑے ہو کر لکھتے ہوئے دیکھا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی دُھوپ میں ان کا راسٹرم پر جھکا ہوا متبسم چہرہ اس وقت بھی ہماری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔

بہت دنوں سے انہوں نے لکھنا چھوڑ رکھا تھا۔ ہمارے بار بار اصرار پر وہ وعدہ کر تو لیتے تھے کہ بہت جلد کچھ لکھیں گے مگر ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ اب شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ بیگم کی مسلسل بیماری، ایک جوان بیٹے کی موت اور دوسرے کی موت سے بدتر حالت ایسے غم تھے جو انہیں اندر سے گھن کی طرح کھا گئے تھے۔ وہ مزاجاً اپنے آنسوؤں کو دُنیا کی آنکھوں سے پوشیدہ رکھنے والے تھے۔ سو ان کے اندر کا جل تھل انہیں کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیتا تھا۔

گزشتہ تیس برس میں ہماری سالگرہ ہو، عید یا نیا سال، ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کا مخصوص انداز کا انتہائی خوب صورت تحریر میں لکھا ہوا کارڈ ہمیں نہ ملا ہو۔ ان کے نیلے رنگ کے چھوٹے سائز کے لیٹر ہیڈ پر لکھے ہوئے درجنوں خط ہماری زندگی کے خوب صورت اثاثوں میں سے ہیں۔ تعریف کرنے کا ان کا ایک اپنا ہی انداز تھا۔ ایک بار انہوں نے ہمیں کسی ڈرامے کی تعریف میں ایک سطری خط لکھا لیکن اس واحد سطر میں موجود محبت ایک ایسی بارش کی طرح ہے جو روح میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے علاقے کی زبان کا ایک مخصوص طرزِ تخاطب استعمال کرتے ہوئے لکھا تھا۔

دولہا سائیں ..... خوش کیتا ای

جہاں تک ان کی ادبی حیثیت کا تعلق ہے تو اس کے لیے ان کی کتابوں، لہریں، کرنیں، پرواز، مدوجزر، پچھتاوے، شگوفے، حماقتیں، مزید حماقتیں، دجلہ اور ولیم سرویاں کی Human Comedy کا ترجمہ ''انسانی تماشا'' کے محض نام لے دینا ہی کافی ہے۔ ان کا کردار روفی عرف شیطان تو اُردو کے مزاحیہ ادب میں اپنی مثال آپ ہے لیکن انہیں محض ایک مزاح نگار کہہ دینا بھی زیادتی ہو گی کہ ''پچھتاوے'' اور ''دجلہ'' میں شامل طویل مختصر کہانیاں اور رپورتاژ اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ وہ انسانی ذات کی پیچیدگیوں کے ایک زبردست نباض اور رومان کی تہہ میں موجود عظیم المیے کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان کا ناولٹ ''برساتی'' اُردو افسانوی ادب کے کسی بھی انتخاب میں جگہ پا سکتا ہے کہ ایسی زندہ، منفرد، دلچسپ اور خیال افروز تحریریں ہمارے یہاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔

تین چار برس قبل ہم نے احمد ندیم قاسمی صاحب پر بنائی جانے والی ڈاکومنٹری کے لیے ان سے رابطہ کیا۔ حسبِ توقع ان کا جواب ملا کہ ''کیمرے کے سامنے مجھ سے بات نہیں ہوتی'' ہمیں پتا تھا کہ ٹی وی والے کئی بار انہیں انٹرویو کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکے ہیں، سو ہم نے ویڈیو کیمرہ ایک بیگ میں بند کیا اور ان کے گھر پہنچ گئے۔ چائے پینے اور تازہ لطیفوں کا تبادلہ کرنے کے بعد جب ہم نے ایک دم کیمرہ نکالا تو وہ پریشان سے ہو کر خاموش ہو گئے۔ ہم نے انہیں کیمرے کے مانیٹر پر محمد خالد اختر کا ریکارڈ شدہ انٹرویو دکھایا اور محترمہ حاجرہ مسرور اور مشفق خواجہ صاحب کی مثالیں دیں کہ یہ سب لوگ بھی آپ کی طرح کیمرے کے سامنے آنے سے انکاری تھے لیکن قاسمی صاحب سے اظہارِ محبت کے لیے انہوں نے اپنی گوشہ نشینی اور بے نیازی ترک کر دی ہے تو وہ بالآخر مان گئے۔

ان کی گفتگو ہمارے پاس محفوظ ہے۔ وہ دو منٹ بات کرنے پر راضی ہوئے تھے لیکن جوں جوں جھجک ختم ہوتی گئی، ان کی باتوں میں روانی آتی چلی گئی اور اگر آدھے گھنٹے بعد بیٹری ڈاؤن نہ ہو جاتی تو شاید وہ ابھی اور بہت کچھ کہتے جو یقیناً ایک قیمتی سرمایہ ہوتا کہ ایک بڑا ادیب اپنے ایک عظیم ہم عصر اور اس پورے عہد کے بارے میں بول رہا تھا جس میں ان دونوں نے ادب تخلیق کیا تھا۔ جس بچوں کی سی حیرت اور خوشی کے ساتھ انہوں نے اپنا یہ انٹرویو دیکھا اور رسنا، اس کا منظر دیکھنے کے قابل تھا۔

سیّد ضمیر جعفری اور کرنل محمد خاں کے بعد شفیق صاحب کے اُٹھ جانے سے اُردو ادب کا ایک پورا گوشہ خالی خالی سا ہو گیا ہے۔ خدا ان کی رُوح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے کہ اس کا وعدہ ہے کہ وہ ان بندوں سے زیادہ پیار کرتا ہے جو اس کے بندوں سے پیار کرتے اور ان کی زندگیوں میں خوشیاں اور آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔

مصحفیؔ

مصحفیؔ ہمارے اُن کلاسیکی شعرا میں سے ہے جن پر لکھا بھی بہت کم گیا ہے اور جنھیں سمجھنے میں بھی ہمارے نقادوں نے معمول سے زیادہ سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ فراقؔ کے ''اندازے'' والے مضمون سے قطع نظر کسی اور نقاد نے اُس کی شاعری کی گہرائی اور وسعت کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اکا دُکا مضامین میں کہیں کہیں ایک شعلہ سا لپکتا نظر آتا ہے لیکن کچھ یوں کہ ''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔'' اس کی ایک اہم وجہ تو کلاسیکی روایت کے بارے میں ہمارے نقادوں کا عمومی رویّہ ہے لیکن ایک اور وجہ بھی اس کمی کا باعث بنی ہے اور اس کا تعلق خود مصحفیؔ اور اُس کی شاعری سے ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا بیش تر کلام شاگردوں اور تلامذہ کی نذر ہو گیا کیونکہ اُسے پیٹ پالنے کے لیے اکثر اپنی شاعری کی ''کلیئرنس سیل'' لگانا پڑتی تھی۔ اس کے باوجود جو کچھ بچا ہے وہ بھی مقدار میں میرؔ کے دیوان سے زیادہ ہے آپ کو پتا ہے کہ میرؔ صاحب عاشقی سے زیادہ اپنی بسیار گوئی کی وجہ سے بدنام ہیں۔ مصحفیؔ کی غزل لکھنؤ اور دہلی کے شعری مزاج اور آہنگ کا سنگم کہی جاتی ہے کیونکہ وہ دلّی سکول کا پہلا بڑا شاعر ہے جو لکھنؤ میں آ کر صرف مقیم ہی نہیں ہوا بلکہ اُن کی طرح رہنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ میرؔ اور سوداؔ کی طرح دلّی اُس کے Nostalgia کا حصہ تھی لیکن زندگی کی کش مکش اور ہما ہمی نے اُسے لمحۂ موجود میں رہنے پر اس حد تک مجبور کیا کہ بالآخر اُسے ''سر جھکا دیے ہی بنی۔''

بدلے ہوئے وقت اور ماحول کے ساتھ مصالحت کا یہ روّیہ چونکہ ایک معاشرتی اور تاریخی جبر کا نتیجہ تھا اس لیے اپنی طبیعت کے تمام تر دھیمے پن کے باوجود وہ زندگی بھر اس کسک سے رہائی نہ پا سکا کہ اُس کی Belonging اس سے چھن گئی ہے۔ یہ ہجرت محض وطن سے بے وطن ہونے کا مسئلہ نہ تھا بلکہ ایک تہذیبی رویے سے ایک اور تہذیبی رویے کی طرف سفر تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد کی دلّی زنداں کی دیواروں کی طرح روز بروز اپنے باشندوں پر تنگ ہو رہی تھی لیکن اس عمل کو محسوس کرنے والے ذہن بہت کم تھے اور وہ لوگ تو اور بھی کم تھے جنھیں اس دم بدم آگے بڑھتی ہوئی تباہی کے اسباب و علل اور نتائج کا شعور بھی حاصل تھا۔ مصحفیؔ کا ذہنِ رسا ایک بظاہر مضبوط معاشرے کی پتھریلی اور بلند دیواروں سے پلستر جھڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے ننگی اینٹوں میں پڑتی ہوئی وہ بڑی بڑی درزیں صاف دکھائی دے رہی تھیں جن کے پار تاریکی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ کہتا ہے:

یارب شفا دے اس کو کہ عضووں کو چین ہو
خیلے خلل میں ہے سرِ ہندوستاں کا مغز

یہ شعر طب کی اصطلاحات کے حوالے سے بھی ایک انتہائی مکمل شعر ہے کیونکہ اس کے تمام تلازمات انسانی جسم کی فعلیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انسانی دماغ باقی اعضا کے لیے کنٹرول ٹاور کا کام کرتا ہے اور دماغ کی صحت باقی اعضا کی صحت کی ضامن بن جاتی ہے لیکن اس شعر میں جس خوبی اور فن کاری سے مصحفیؔ نے مرکز اور صوبوں کے باہمی تعلق اور اس سے پیدا

ہونے والی صورت حالات کو ان دو مصرعوں میں مصور کیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ دلّی شہر اُن دنوں مغل سلطنت کا دارالحکومت تھا اور بابر سے اورنگ زیب عالم گیر تک تمام ہندوستان پر حکومت یہیں سے ہوتی تھی۔ جب تک مرکز میں حکومت مضبوط رہی صوبے بھی قابو میں رہے لیکن اُدھر اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر اُس کے جانشینوں کی خانہ جنگی نے مرکز میں بدامنی کی فضا پیدا کر دی جس کے نتیجے میں چند ہی برسوں میں بہت سارے صوبے خود مختار ہو گئے۔ دلّی کی اس تباہی اور بربادی کا نوحہ یوں تو اُس وقت کے ہر اہم شاعر کے یہاں دکھائی دیتا ہے لیکن اس تباہی کے پس پردہ عوامل کا شعور بہت خال خال نظر آتا ہے۔ مصحفی کا یہ شعر اسی کمیاب شعور کی ترجمانی کر رہا ہے۔

مصحفی نے بہت زیادہ لکھا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کے کمزور شعروں کی تعداد اُس کے اچھے شعروں کی نسبت بہت زیادہ ہے لیکن یہ مسئلہ تو میر کے یہاں بھی ہے تو پھر میر کو اتنی شہرت اور نام وری کیونکر ملی؟ میں نے اس مسئلے کو سمجھنے کی خاصی کوشش کی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے ابھی تک اس کا کوئی معقول جواز نہیں مل سکا۔ میرے نزدیک مصحفی اور میر میں بحیثیت مجموعی بہت معمولی فرق ہے۔ دونوں کی کمزوریاں کم و بیش یکساں ہیں اور خوبیوں میں بھی کوئی اتنا واضح فرق نہیں ہے۔ الا یہ کہ میر کے یہاں ذات کا آشوب باقی تمام چیزوں پر حاوی ہو گیا ہے اور اگرچہ میر نے اس کے اظہار میں بھرپور کامیابی حاصل کی ہے تاہم یہ اُس کی شاعری کا ایک پہلو ہے، اور ایک پہلو کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو پورے وجود کی جگہ نہیں لے سکتا۔ میر کے یہاں اگر جذبے کا ارتکاز ہے تو مصحفی کے یہاں اسے پھیلاؤ ملا ہے۔ پھیلاؤ سے گہرائی کم تو ہوتی ہے لیکن وسعت بھی تو ملتی ہے جو ارتکاز میں کم ہی دستیاب ہوتی ہے۔ فردِ آشوب میر کا طغرائے امتیاز ہے لیکن آیئے چند لمحے مصحفی کے کلیات کی بھی سیر کر دیکھیں۔ دیکھیں تو سہی اس کے آئینے میں کیا کیا عکس چھپے ہیں:

جُوں اشکِ سرِ مژگاں ہم پھر نہ نظر آئے
از بسکہ یہاں وقفہ اک چشم زدن کا تھا

آتشِ غم میں بس کہ جلتے ہیں
شمع ساں اُستخواں پگھلتے ہیں

ہم کیا کریں چمن میں گر پھر ہَوا چلی ہے
اپنا دلِ فسردہ تصویر کی کلی ہے

ہو آشنائے غفلت چشمِ پُر آب کیوں کر
پانی کے بیچ آوے مچھلی کو خواب کیوں کر

ہے صحبت کا پریشانوں کے یہ رنگ
ہوا سے ہوویں جُوں برگِ خزاں جمع

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مصحفیؔ کے اس اظہارِ غم میں تلخی کے ساتھ ساتھ صبر اور کم ہمتی کو بھی خاصا دخل ہے۔ اس کے غم میں نہ تو میرؔ کی سی گہرائی ہے اور نہ دل گدازی، بس ایک ہلکی سی کسک، ایک غمگین سا تبسم، ایک داد سے بے نیاز قسم کی دردمندی ہے جو اس کے اشعار میں ایک رنگِ ملال لیے تیرتی پھر رہی ہے۔ اُس کے غم میں Concentrate کرنے کی فضا نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ وہ معاشرتی مزاج ہے جس میں مصحفیؔ کو اپنی زندگی کا بیش تر حصہ بسر کرنا پڑا۔ چھوٹے موٹے نوابوں کی مصاحبت، پرتکلف اور مصنوعی سوسائٹی جو صرف حال کے لمحے میں زندہ تھی۔ معاشی ناآسودگی اور فنی سطح پر اُستادی کے باوصف انشاؔ اور اُس کے شاگردوں سے مسلسل چپقلش، ان سب باتوں نے مل جل کر مصحفیؔ سے اُس کا سرمایۂ غم چھین لیا اور یوں ہم ایک بہت بڑے شاعر کے فردِ آشوب سے تو شاید محروم رہ گئے لیکن اس سارے عمل نے اُردو شاعری کو اس شاعر کے کچھ ایسے پہلوؤں سے بھی روشناس کروایا ہے جو اُسی سے آغاز ہوئے اور آج کی غزل میں بھی زندہ و تابندہ نظر آتے ہیں۔ یہ مطالعہ بڑا دلچسپ ہے کہ اگرچہ مصحفیؔ کو کبھی بھی میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے پایے کا شاعر نہیں سمجھا گیا لیکن آج کی غزل کے مجموعی مزاج میں اس کا اثر کسی طور بھی ان تینوں سے کم نہیں ہے بل کہ میں تو یہ کہوں گا کہ آج کے مقبول شعرا فراقؔ، فیضؔ اور فرازؔ پر سب سے زیادہ اثر مصحفیؔ ہی کا ہے۔ محبوب کے ہجر و وصال کے معاملات سے لطف لینے اور انھیں حقیقت سے قریب تر رہتے ہوئے دیکھنے کا یہ رویہ اُردو غزل میں مصحفیؔ ہی سے پختہ ہوا ہے۔ ولیؔ کے لاجواب شعر:

عجب کچھ لطف دیتا ہے شبِ خلوت میں دلبر سوں
سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

کے بعد آپ کو اس نوع کے خوب صورت منظر سب سے زیادہ بہتر انداز میں مصحفیؔ کے یہاں ہی نظر آئیں گے۔ اُس کے یہاں نہ تو میرؔ کا سا پاسِ ادب ہے (جو بعض اوقات اتنا بڑھ جاتا ہے کہ محبوب پیر و مرشد معلوم ہونے لگتا ہے) اور نہ نظیرؔ کی سی بے حجابی کہ عاشق و معشوق ہمیشہ ڈبل بیڈ پر نظر آئیں، مصحفیؔ نے وصل کے معاملات اور مناظر میں جس انسانی سطح کو برقرار رکھا ہے اُسی کا پرتو ہمیں آج کے اچھے شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ کچھ شعر دیکھیے:

جب پیرہن گلے سے اتارا مَیں اُس کے رات
اے مصحفیؔ اُسے بھی نہ تھا پیرہن کا ہوش

ہم تو کبھی کہیں نہ کہ کپڑے اُتاریئے
پہنا کریں گر آپ اِسی وضع کا لباس

مَیں تیرے ڈر سے نہ دیکھا اُدھر بہت شبِ وصل
ستارہ سحری مجھ کو آنکھ مار رہا

ہر چند کہ تھا قابلِ دیدن بدن اُس کا
پر آنکھ نہ ٹھہری جو کُھلا پیرہن اُس کا

میں نگاہِ پاک سے دیکھا تھا، ترے حسنِ پاک کو اس پہ بھی
مرے جی میں خواہشِ وصل تھی، مرے دل میں بوس و کنار تھا

اس شعر میں نگاہِ پاک کے ساتھ ساتھ خواہشِ وصل کے جسمانی پہلو کو جس خوب صورتی کے ساتھ مصحفی نے یک جا کیا ہے، یہ اردو غزل میں مرد اور عورت اور عاشق اور محبوب کے تعلقات کو حقیقت اور انسانی نفسیات کے قریب تر ہو کر دیکھنے کا آئینہ دار ہے۔ افلاطونی عشق اور آئیڈیل محبت کا تصور بہت خوش نما اور دل پذیر ہے لیکن جسم کی حقیقت اور تقاضوں سے چشم پوشی کرنا اور ہوس اور عشق کے مابین لکیر کو ایک خندق کے مانند دکھانا نہ تو عقلی لحاظ سے درست ہے اور نہ جمالیات کی سطح پر اسے مناسب اور موزوں کہا جا سکتا ہے۔ اصل فرق بات کہنے کے ڈھب میں پڑتا ہے۔ محبوب کے ساتھ ملاقات میں تمام تر آئیڈیلزم تقدس اور رکھ رکھاو کے باوجود ایسے لمحے یقیناً آتے ہیں۔ (اور جہاں نہیں آتے وہاں ضرور کوئی نہ کوئی جھوٹ بول رہا ہوتا ہے) جب عشق اپنا اظہار پیش دستی اور دست درازی سے اور حسن اپنی نمایش اپنے جلوۂ عریاں سے کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں محبت میں جینے اور مرنے کا فرق ختم ہو جاتا ہے اور آدمی محبوب کے دامن کو حریفانہ کھینچنے پر بے انتہا مستعد ہوتا ہے لیکن جیسا کہ مَیں نے پہلے عرض کیا ہے کہ یہی موڑ بہت نازک ہوتا ہے اور اس کے اظہار میں فن کار یا شاعر اگر ذرا سی بھی ٹھوکر کھا جائے تو بت کثیف (Crude) ہو جاتی ہے اور دو محبت کرنے والوں کے بجائے دو جسم باقی رہ جاتے ہیں۔ محبت کرنے والے جسموں اور محض جسموں کے معاملات میں جو نازک سا فرق ہوتا ہے وہی عشق اور ہوس کے درمیان اساسی فرق ہے۔ مصحفی کے یہاں اس تعلق کے مختلف مظاہر نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ وہ محض محبوب کے قرب سے شانت نظر آتا ہے، دوسری جگہ وہ محبوب کے جسمانی قرب کا خواہاں نظر آتا ہے، تیسری جگہ اُس کے جسمانی قرب کے لیے انتہائی بے قرار دکھائی دیتا ہے اور پھر کبھی کبھار ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب وہ محض جسم بن کر رہ جاتا ہے۔ ان چاروں منظروں کی ایک ایک جھلک ملاحظہ کیجیے:

لطف تب ہے کہ ہوا کھولتی جائے اس کو
اور تم پردے میں منہ اپنا چھپاتے جاؤ

کل اٹھ گیا وہ ہاتھ چھڑا میرے ہاتھ سے
آیا ہوا شکار گیا میرے ہاتھ سے

وہ آہوے رمیدہ مل جائے تیرہ شب گر
کُتا بنوں شکاری، اُس کو بھنبھوڑ ڈالوں

اب وصل کی خواہش یہی کہتی ہے، کسو سے
دھوکے میں تیرے اُٹھ کے لپٹ جایئے اک رات

مصحفی کا کمال یہ ہے کہ اس نے دلّی سکول کے شاعروں سے جو کچھ ورثے میں حاصل کیا اسے لکھنؤ کے مزاج سے اس طرح مربوط کیا ہے کہ دونوں دبستانوں کے اچھے پہلو یکجا ہو گئے ہیں۔ دلی والوں کی عینیت پسندی، دل گرفتگی

اور خوش سلیقگی اور لکھنؤ کی مادیت پسندی، حال پرستی اور تکلفات آپس میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ شعری خیالات، عام لوگوں کے احساسات اور تجربوں سے قریب تر آ گئے ہیں۔ محبوب ایک آسمانی مخلوق کے بجائے گوشت پوست کے روپ میں ڈھلنا شروع ہو گیا ہے اور عاشق فقیرِ راہ گزر کی طرح دیدار کی بھیک مانگنے والے سے سیٹی مارنے والے نوجوان اور بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لینے کا حوصلہ رکھنے والے ''انسان'' کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لینا چاہیے کہ محبوب کے ساتھ ملاقات دراصل ہاتھا پائی کا دوسرا نام ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عاشق اور معشوق کے تصورات کے ساتھ جیتے جاگتے سے افراد کی طرح Identification ہونی چاہیے۔ محبوب کی ملاقات اور محبوب کی تصویر یا تصور سے ملاقات میں جو فرق ہوتا ہے، اُسے شاعری میں نظر آنا چاہیے۔ مصحفی کے یہاں محبوب کا ناک نقشہ ابھر کر آنے کی ایک بہت بڑی وجہ لکھنوی سوسائٹی میں عورت کا زیادہ Exposure بھی ہے۔ یہاں ناچنے گانے والی عورتوں سے باقاعدہ عشق کرنے کی رسم بھی خاصی مقبول تھی اور چوں کہ دوسری پارٹی بھی اسی ضمن میں تکلفات اور حجابات کی زیادہ قائل نہیں تھی، اس لیے یہاں کے شعرا بعض اوقات معاملاتِ عشق کے بیان میں اعتدال اور حدود سے خاصا تجاوز کر جاتے تھے۔ مصحفی کے یہاں ایسے بہکے ہوئے لمحے بہت کم آئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری ہمیں آج کے دور میں اپنے سے قریب تر محسوس ہوتی ہے۔ انسانی نفسیات کے مطالعے میں مصحفی کو خاص درک حاصل تھا۔ اُس کی نظر مختلف حالتوں میں انسانوں کے بدلتے ہوئے طرزِ عمل اور اس کے محرکات پر بہت گہری ہے اس طرح وہ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کے ایسے ایسے روپ اور مظاہر بھی دیکھ لیتا ہے جو سب کے سامنے ہوتے ہیں لیکن ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ ہندوستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلیاں ذرائع ابلاغ کی کمی کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے بہت مبہم اور غیر واضح تھیں۔ خصوصاً انگریز کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ سے ملحقہ امکانی خطرات تو بہت ہی کم لوگوں کی نظر میں تھے۔ مصحفی کے یہاں اس امنڈتے ہوئے طوفان کی دھمک کے ساتھ ساتھ اُس طریقۂ واردات کا شعور بھی نظر آتا ہے جو انگریزوں نے اپنا رکھا تھا:

ہاتھ سے گوروں کے جانبر ہوویں کیوں کر اہلِ ہند
کام کرتے ہی نہیں ہرگز یہ بن کونسل کیے

گر ہو طمنچہ بند وہ رشکِ فرنگیاں
بانکے مغل بچے نہ کریں خانہ جنگیاں

نہ نکلے کیوں کے تری چشمِ سرمہ سا سے نگاہ
وقار ہند میں کمتر ہے اب سپاہی کا

حکمِ سلطاں ہے کہ اس محکمۂ عدل کے بیچ
دستِ فریاد کو اونچا نہ کرے فریادی

ہندستاں نمونۂ دشتِ بلا ہے کیا
جو اس زمیں پہ تیغ ہی چلتی ہے اب تلک

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ بھی تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

مصحفی کے کلام کے ایک پہلو کی طرف فراق صاحب نے خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور وہ اس کے یہاں تمثیل کاری (Imagery) کا حیرت ناک حد تک دل کش استعمال ہے۔ مصحفی کے یہاں انسانی حواسِ خمسہ میں سے قوتِ باصرہ پر بہت زیادہ زور ملتا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اُس نے آنکھوں سے نظر آنے والی ٹھوس اور شکل دار چیزوں کو ایسے تجریدی انداز میں پیش کیا ہے کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے تصویر سی کھنچ جاتی ہے مگر عام طور پر تصویر کے منظر اور پس منظر میں ایسی ایسی شکلیں ہوتی ہیں جنہیں اس سے پہلے آپ نے کبھی اس طرح نہیں دیکھا تھا:

بیٹھے بیٹھے جو ہو گیا وہ کھڑا
اک ستارا سا شب زمیں سے اٹھا

محبوب کی خوش قامتی پر ہمارے شعرا نے بڑے انوکھے اور دل کش پیرایوں سے طبع آزمائی کی ہے۔ کہیں سایے کی طرح سرو صنوبر ساتھ چلتے ہیں، کبھی ان کی قیامت قامتی لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی کی جھلک دکھاتی ہے اور کہیں اُن کی چال سے دلوں کو ٹھوکریں لگتی ہیں لیکن مصحفی نے جس طرح زمین سے ستارہ اٹھایا ہے اس کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ مصحفی کے یہاں یہ تصویر کاری محبوب تک محدود نہیں بل کہ عام زندگی کے ایسے مناظر جن سے ہم سب بخوبی آگاہ ہیں اُس کی تمثالوں کے ارژنگ میں نئے سے نیا روپ دھار کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک بے مثال تمثال دیکھیے:

بھلا دُرستیِ اعضاے پیر کیا ہووے
کہ جیسے رسّی سے ٹوٹا کواڑ باندھ دیا

اس شعر میں مصحفی نے رسّی کے ساتھ باندھے ہوئے کواڑ میں موجود کجی اور خمیدگی کو جس خوب صورت اور بھرپور انداز میں مجسم کیا ہے اُس کی داد نہ دینا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ انسان کی ڈھلتی ہوئی عمر سے اُس کے جسم میں جو ایک مخصوص طرز کی ناقابلِ اصلاح کجی پیدا ہو جاتی ہے، اس میں اور رسّی سے باندھے ہوئے کواڑ میں کتنی گہری اور ہمہ پہلو مشابہت ہے۔ اس پر غور کرتے جایئے پرتیں کھلتی جائیں گی۔

مصحفی کے یہاں متحرک تصاویر بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ ان تصویروں میں مختلف کردار نہ صرف حرکت میں نظر آتے ہیں بل کہ ان کی حرکات ایسے مناظر سے پیدا ہوتی ہیں جو خود بھی تصویر میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ بات بہ ظاہر شاید بہت معمولی محسوس ہو لیکن کبھی ذرا اسے تجربہ کر کے دیکھیے اور اگر آپ سے یہ نہ ہو سکے تو اچھے شعرا کا کلام دیکھیے، آپ کو اندازہ ہوگا کہ مصحفی نے اس انتہائی مشکل کام کو کس قدر آسان بنا دیا ہے۔ جیسے پکے راگ کو موسیقی کی گرائمر کے ساتھ گانے والے تو بہت مل جاتے ہیں لیکن امانت علی خاں کی آواز ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ امانت کی آواز کی مٹھاس مصحفی کی تمثال کاری میں تحرک کی شکل میں ڈھل گئی ہے:

ہوا نے رات دروازے کی یہ صُورت رکھی جس سے
تصوّر میں ترے شب کو مَیں سو سو بار اُٹھ بیٹھا

نتھ کے موتی یوں ہیں اس کے، مہ کے ہالے کے قریب
اک ستارے کے قریں ہو جوں ستارا دُوسرا

سانپ سی مہری کی زہ جو رات لہرانے لگی
کیا جھجک کر اُس نے ماری آستیں پر پشتِ دست

دیکھیے کاہے کو آئینہ جہاں کا جس میں
چہرہ بہتا ہو کبھی اور کبھی رخسار دراز

لچک سے اس کے قدِ سرخ پوش کا ہے یہ رنگ
ہوا سے شعلہ ہو جوں بار بار پست و بلند

آستیں اس نے جو کہنی تک چڑھائی وقتِ رقص
آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

دھو گیا کون یہ کل حوض پہ پاؤں کے تئیں
سارے فوارے ہیں حیران کھڑے پانی کے

ساعتِ عیسویاں ہے کہ مرا دل جس میں
خود بخود چوٹ لگی، خود بخود آواز آئی

جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر
ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی

ان چند مثالوں سے آپ اس شخص کی بے مثال قوتِ باصرہ کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ تمثال کاری یوں تو فنِ شاعری کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے لیکن مختلف چیزوں کو جمع کر کے ایسی تصویریں بنانا جو انسانی تجربے سے قریب اور اس کی نفسیات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سے زیادہ چیزوں اور کیفیات کا مجموعہ ہوں، بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا

ہے اور اس میدان میں مصحفیؔ اپنے تینوں بڑے پیش رووں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ سے یقیناً زیادہ کامیاب ہے۔

یوں تو اُس کی تمثالوں کا واضح اثر اس کے بعد کی اور ہماری آج کی غزل پر نظر آتا ہے لیکن بعض مقامات پر تو یہ اثر اتنا شدید ہو گیا ہے کہ توارد کا سا احساس ہونے لگتا ہے۔ مثلاً فیضؔ صاحب کا ایک مشہور شعر:

کہاں گئے شبِ ہجراں کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

پڑھتے ہوئے ذہن بے اختیار مصحفیؔ کے اس شعر کی طرف جاتا ہے:

میں تیرے ڈر سے نہ دیکھا اُدھر بہت شبِ وصل
ستارۂ سحری مجھ کو آنکھ مار رہا

یا ظفرؔ اقبال کا یہ شعر:

کاغذ کے پھول سر پہ سجا کر چلی حیات
نکلی بروُنِ شہر تو بارش نے آ لیا

مصحفیؔ کے اس شعر سے کس قدر قریب ہے:

بارش اسے گلا دے، آتش اسے جلا دے
کس کس سے پھر بچائیں یہ جسمِ کاغذی ہم

حسرتؔ کا شعر ہے:

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

مصحفیؔ کا شعر دیکھیے۔ یہاں تو زمین بھی مل گئی ہے:

اُس کے بدن سے حسن ٹپکتا نہیں تو پھر
لبریزِ آب و رنگ ہے کیوں پیرہن تمام

اور سب سے بڑھ کر غالبؔ بے مثل کے یہاں مصحفیؔ کا پرتو دیکھیے۔ غالبؔ کا شعر ہے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

مصحفیؔ کہتا ہے:

درِ جنّت پہ بھی زنہار نہ رکھوں میں قدم
گر ذرا چیں بہ جبیں صُورتِ رضواں دیکھوں

اب ایک جھلک اقبال کے یہاں بھی دیکھتے چلیے۔ اقبالؔ کا شعر ہے:

کب تک رہے محکومِ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے

مصحفیؔ کا شعر ہے:

مصحفیؔ رُوے زمیں پر یوں نہیں رہنے کا لطف
آسمان کو دُور کر یا آسماں سے دُور ہو

کسی شعری خیال، تمثال، تجربے یا پیرایے کا روایت کے تسلسل میں صدیوں تک مختلف مزاج کے شاعروں کے ہاں زندہ رہنا اور رونما ہونا اُس شاعر کے لیے یقیناً بڑے فخر کی بات ہے جس کے یہاں یہ پہلے پہل جلوہ نما ہوا تھا۔ مصحفیؔ کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی یہ ہوئی ہے کہ لوگوں نے اسے استاد شاعر کہہ کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔ وہ استاد یقیناً تھا لیکن اس کا ہنر ذوقؔ، ناسخؔ، جرأتؔ، رنگینؔ اور جانؔ صاحب وغیرہ کی طرح نہیں تھا کہ اپنے فنی اُسلوب یا مخصوص معاشرتی ماحول کی پابندیوں میں گرفتار ہو اور وہیں کا ہو کر رہ جائے۔ وہ ایک ایسا شاعر ہے جس کی روایت مسلسل آگے کی طرف سفر کر رہی ہے۔ بسیار گوئی اور رطب و یابس جو پرانے شعرا کے دیوانوں میں ہے کوئی نئی یا عجوبے کی بات نہیں۔ آپ آج کے بڑے شاعروں کو دیکھیں۔ جوشؔ، حفیظؔ اور فراقؔ نے کتنا لکھا ہے! اُن کے اچھے شعروں کی تعداد کتنی ہے؟

دیکھنے والی بات یہ ہے کہ مصحفیؔ کی شاعری کا منتخب حصہ کس قدر ہے اور اُس نے اپنے بعد کی شاعری کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ میرا یہ انتخاب مصحفیؔ کے آٹھ میں سے پانچ دیوانوں پر محیط ہے یعنی پہلے چار اور آٹھواں دیوان۔ پانچواں، چھٹا اور ساتواں اب تک میری رسائی میں نہیں آئے۔ جب بھی میرے ہاتھ لگے میں ان کا انتخاب بطور ضمیمہ علیحدہ ترتیب دوں گا۔ مصحفیؔ کے بارے میں ایک آخری بات یہ ہے کہ اس کے کلام کو پڑھتے وقت ہمیں اس کے وجود میں جاری اس مستقل کش مکش کو ذہن میں رکھنا چاہیے جو دو مختلف دنیاؤں میں رہنے کی وجہ سے اس کے دل و دماغ میں ہنگامہ آرا تھی۔ یہ کش مکش عملی اور تصوراتی دنیا کی کش مکش نہیں تھی بل کہ ایک ہی ملک اور علاقے میں بسنے والی دو مختلف تہذیبوں کے باہمی فرق کی پیدا کردہ تھی اور اس پر مستزاد اُس زمانے میں ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیاں تھیں جن کا ریلا تماشائی کو پاؤں جمانے اور نظر بھر کر دیکھنے کی مہلت دینے سے بھی انکاری تھا۔ مصحفیؔ کی غزل میں فرد کا آشوب ہے لیکن یہ فرد ایک ایسی مخصوص سماجی صورتِ حالات میں گرفتار تھا جس کو سمجھے بغیر ہم اُس کی شخصیت اور شاعری سے انصاف نہیں کر سکتے۔ مصحفیؔ کا ذہنی کینوس اتنا وسیع یقیناً نہیں تھا کہ وہ آبِ روانِ کبیر کے کنارے بیٹھ کر کسی اور زمانے کا خواب دیکھ سکے لیکن اُس کے اردگرد جو کچھ ہو رہا تھا اس کے عوامل اور مظاہر کی تہہ تک اترنا اور انھیں مستقبل کے حوالے سے دیکھنا اور دکھانا بھی اپنی جگہ پر ایک نہایت اہم کارنامہ ہے۔ مصحفیؔ نے اردو غزل کو مجرّد تجربوں کے ہجوم سے نکال کر اُسے معاشرتی حوالوں اور زندہ تجربوں سے روشناس کروایا ہے۔ وہ ہماری غزل کو انسان اور اس کی نفسیات سے قریب تر لایا ہے اور آج کی غزل میں انسانی فطرت کے جن مختلف پہلوؤں کا دل کش اظہار ملتا ہے، اُن کا ایک بڑا گہرا اور مضبوط رشتہ مصحفیؔ کی غزل سے بھی ہے۔